بنام خداوند جان آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر) ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر :- ظفر الملک علوی

جلد ۴۳	جنوری ۱۹۳۷ء	نمبر

فہرست مضامین

قیمت :- فی پرچہ ۵ر ۲ر

بنامِ خداوندِ جاں آفریں

نمبر ۱ جلد ۴۳ جنوری ۱۹۳۷ء

خلیفہ معتصم باللہ

(از مولوی محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے۔ پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

تجزیہ:۔ فوج نے معتصم کو خلیفہ تسلیم کرنے سے اُس وقت تک انکار کیا جب تک کہ عباس بن مامون نے اُس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرلی ــــ طوانہ تباہ کیا گیا ــــ قیصر تھیوفلوس (عربی: توفیل) سے صلح ــــ خرمیہ کے خلاف جنگ ــــ بازنطینی سپہ سالار مینوئل عربوں کی فوج میں شریک ہوا ــــ آذربائیجان میں بابک کے خلاف جنگ ــــ افشین نے بابک کو البذ کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا ــــ البذ کا محاصرہ اور اُس کی فتح ــــ بابک کی گرفتاری اور سامرہ میں اُس کا مصلوب ہونا ــــ معتصم کی مذہبی سختیاں ــــ معتصم کا اجیر سپاہیوں اور مملوکوں کو ترجیح دینا ــــ دارالخلافہ میں بے چینی ــــ تعمیر سامرا ــــ عربوں کی تلون المزاجی ــــ زیرین علاقہ فرات میں زط کا آباد ہونا ــــ اس قوم کی ابتدا ــــ عجیف بن عنبسہ کی ان کے خلاف جنگ ــــ زط کا ایشیائے کوچک کی طرف نقل مکان ــــ خراسان میں ایک علوی کا خروج ــــ خلیفہ کے حکم سے اُس کی گرفتاری اور انجام ــــ قیصر توفیل نے دوبارہ جنگ شروع کی ــــ دریائے فرات کی طرف ایک تباہی خیز مہم ــــ معتصم نے عجیف کو زبطرہ کی طرف روانہ کیا ــــ اس کے بعد خلیفہ خود ایشیائے کوچک گیا ــــ معتصم کے سپہ سالار افشین نے دزمون کے قریب توفیل کو شکست دی ــــ معتصم عموریہ پہنچا ــــ اس شہر کا محاصرہ ــــ اس کی

---

[1] ترجمہ از جرمن

بنام خداوند جان آفرین

الناظر

نمبر ۱ — جلد ۴۳ جنوری سنہ ۱۹۳۰ع

خلیفہ معتصم باللہ[1]

(از مولوی محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

تجزیہ — فوج نے معتصم کو خلیفہ تسلیم کرنے سے اس وقت تک انکار کیا جب تک کہ عباس بن مامون نے اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کر لی — طوانہ تباہ کیا گیا — قیصر تھیوفلوس (عربی: توفیل) سے صلح — خرمیہ کے خلاف جنگ — بازنطینی سپہ سالار تھیوفوبس عربوں کی فوج میں شریک ہوا — آذربائیجان میں بابک کے خلاف جنگ — افشین نے بابک کو البذ کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا — البذ کا محاصرہ اور اس کی فتح — بابک کی گرفتاری اور سامرہ میں اس کو مصلوب کیا جانا — معتصم کی مذہبی سختیاں — معتصم کا اجنبی سپاہیوں اور ملازموں کو ترجیح دینا — دارالخلافہ میں بے چینی — تعمیر سامرا — عربوں کی تلون المزاجی — زیریں علاقہ فرات میں زط کا آباد ہونا — اس قوم کی زندگی — عجیف بن عنبسہ کی ان کے خلاف جنگ — زط کا ایشیائے کوچک کی طرف نکالا جانا — خراسان میں ایک علوی کا خروج — خلیفہ کے حکم سے اس کی گرفتاری اور انجام — قیصر توفیل نے دوبارہ جنگ شروع کی — دریائے فرات کی طرف ایک تباہی خیز مہم — معتصم نے عجیف کو بصرہ کی طرف روانہ کیا — اس کے بعد خلیفہ خود ایشیائے کوچک گیا — معتصم کے سپہ سالار — افشین نے دزمون کے قریب توفیل کو شکست دی — معتصم عموریہ پہنچا — اس شہر کا محاصرہ — اس کی

---

[1] ترجمہ از جرمن

فتح اور بربادی ــــ قیصر توفیل نے صلح کی درخواست کی ــــ معتصم نے قیدیوں کا تبادلہ نہیں کیا ــــ معتصم اور اُس کی اجنبی فوج کے خلاف سازش ــــ عباس بن مامون نے خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی ــــ معتصم نے یہ سازش فرو کی ــــ عباس اور اُس کے ہمدردوں کی موت ــــ افشین اور عبداللہ بن طاہر ــــ طبرستان کے اسپہبد کی بغاوت ــــ اس رئیس کے خلاف جنگ ــــ اُس کی فوج اور سپہ سالاروں کی غداری ــــ اسپہبد کے بھائی نے اُسے معتصم کے سپرد کر دیا ــــ اُسے موت کی سزا دی گئی ــــ آذربائی جان میں شورش ــــ معتصم کے عہد کا عدالتی انتظام ــــ احمد بن ابی داؤد کا اثر ــــ افشین اور ابودُلف ــــ معتصم کا تشدد ــــ اُس کے وزراء اور علوم و فنون پر اُس کا اثر ــــ الکندی فلسفی ــــ معتصم کی وفات۔

مامون کی وفات[۵۲] کے بعد اُس کی وصیت اور انتظام کے مطابق اُس کے بھائی ابواسحاق محمد المعتصم کے ہاتھ پر بیعت کی جانی چاہیے تھی[۵۳]۔ لیکن فوج نے جو ایشیائے کوچک کی مہم میں مامون کے ساتھ تھی، اس پر اعتراض کیا، اور عباس بن مامون کو خلیفہ بنانا چاہا۔ عباس ۲۱۳ھ سے شمالی شام اور عراق عرب کا حاکم تھا، اور بازنطینی سلطنت کے خلاف جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ اُسے اُس کے باپ نے مقرر کیا تھا کہ وہ طوانہ کو آباد اور قلعہبند کرنے کی نگرانی کرے[۵۴]۔ لیکن اب معتصم نے اُسے بسرعت تمام واپس آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ عباس اپنے چچا کے پاس آگیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے معتصم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد فوج کو کوئی اعتراض نہ رہا، اور معتصم کی خلافت تسلیم کر لی گئی۔ معتصم کو یہ نامناسب معلوم ہوا کہ فوج کو دوبارہ عباس کے سپرد کیا جائے۔ اُس نے طوانہ کے قلعوں کو مسمار کرایا، اور عباس کو ساتھ لے کر بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ ماہ رمضان کے شروع میں یہ دونوں دارالخلافہ پہنچے۔ اس کے بعد قیصر توفیل نے صلح یا کم از کم عارضی صلح کی درخواست کی؛ اور یحییٰ نحوی کو نہایت

[۵۲] خلیفہ ہارون الرشید نے مامون کے بعد اُس کے ایک اور بھائی مؤتمن کو جانشین مقرر کیا تھا۔ تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ مامون نے اُسے کیوں برطرف کیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن اثیر کے خیال کے مطابق، وہ امین سے مل گیا تھا۔ اور امین کے قتل کے بعد اسی جرم میں اُسے ولی عہدی سے الگ کیا گیا۔ ابن جوزی (مرآۃ الزمان) کے مطابق مامون کا ایک اور بھائی ابواحمد ولی عہد مقرر کیا گیا تھا، مگر اُس نے ۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔ [۵۲] ابن اثیر مطبوعہ مصر۔ ج ۶۔ ص ۱۹۲۔ (مترجم)

[۵۳] ابن جوزی (مرآۃ الزمان) ورق ۱۰۰+ ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۹۱ + طبری مطبوعہ یورپ ج ۳۔ ص ۱۱۶۴ +

[۵۴] طوانہ کے فرار اور یحییٰ نحوی کی سفارت کے درمیان کا زمانہ، جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، بازنطینی سلطنت میں کچھ ایسا گذرا کہ حکومت کوئی خاص حکمت عملی اختیار نہ کر سکی، وہ وہاں برابر اختلاف برپا رہا۔ عرب اور رومی مورخوں کی مدد سے ان حالات کا پتہ لگ سکتا تھا، گو ان مورخوں نے اپنی عادت کے مطابق، نہ تو یحییٰ نحوی کی سفارت اور نہ ان خدمات کا ذکر کیا ہے جو طوانہ نے انجام دی تھیں، بہرکیف یہ تو معلوم ہے کہ مامون نے اگست ۸۳۳ء میں اُس وقت انتقال کیا، جبکہ وہ جنگ کو دوبارہ جاری کرنے اور طوانہ کو ایک عربی قلعے کی صورت میں

بیش قیمت تحائف دیکر بغداد بھیجا۔ اس سفارت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قیدیوں کے تبادلے کا انتظام کیا جائے، اور بازنطینی سپہ سالار منیوئل کو، جو قیصر سے ناراض ہوکر عربوں سے مل گیا تھا، دوبارہ قسطنطنیہ لایا جائے[1]۔

مذکورہ بالا واقعہ کے علاوہ دوسرے اسباب بھی تھے، جن کی بنا پر معتصم بازنطینی سلطنت کے خلاف جنگ ختم کرنا چاہتا تھا۔ مامون کے مذہبی خیالات نے، جن کی اُس نے اشاعت بھی کی تھی، ایک عام بے چینی پیدا کردی تھی، جس کے سبب سے وہ خود بھی دارالخلافہ میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ دریاے فرات کے زیریں علاقے میں زُطکی، اور خراسان میں علویوں کی شورشیں برپا تھیں، عراق اور آذربائی جان میں بابک کے پیرو خرمیہ کی بغاوت اب تک جاری تھی۔ سنہ ۲۱۸ھ میں مامون نے بغداد کے حاکم اسحاق بن ابراہیم کو، جو طاہر بن حسین کا چچازاد بھائی تھا، ایک زبردست فوج دے کر خُرمیہ کے خلاف روانہ کیا تھا۔ اس فوج نے غالباً منیوئل اور یونانی طریق جنگ کی مدد سے، ہمدان کی خطرناک بغاوت کا خاتمہ کیا تھا۔ اس لڑائی میں ساٹھ ہزار آدمی کام آئے تھے۔ بقیۃ السیف باغی کچھ تو بھاگ گئے، اور بعض نے بازنطینی علاقے میں پناہ لی[2]۔ اسی فتح کے بعد معتصم اس قابل ہوا تھا کہ آذربائی جان میں خود بابک کے خلاف، جو سولہ برس سے وہاں کا تقریباً خود مختار مالک بنا بیٹھا تھا، جنگ کی تیاری کرے۔

سنہ ۲۱۹ھ میں معتصم نے پہلے ابوسعید محمد بن یوسف کو اردبیل بھیجا تاکہ اس شہر اور زنجان کے درمیان جو قلعے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) تبدیل کرنے کی تیاری کر رہا تھا؛ معتصم نے اُس کی موت کے بعد فوجوں کو فوراً ایشیاے کوچک سے ہٹا کر بغداد کا راستہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ عرب مورخوں کی تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسی سال خُرمیہ نے عربوں سے شکست کھائی تھی۔

ابن جوزی ورق ۱۰۸ + ابن اثیر (مطبوعہ مصر ۶ - ص ۱۶۴ + ابن خلدون (؟) طبری۔ مطبوعہ یورپ ج ۳ - ص ۱۱۶۵ + بازنطینی ماخذوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ منیوئل کی فوجی قابلیت اور ان یونانیوں کی مدد سے، جو اُس وقت اُس کے ساتھ تھے، یہ عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔ مزید براں اُس زمانے کے بطریقوں کی فہرست دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یحییٰ نحوی سنہ ۸۳۳ء میں، بغداد سے واپس جانے کے بعد بطریق بنایا گیا تھا۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے اس میں ذرا شبہ نہیں رہتا کہ بغداد کو یحییٰ نحوی کی سفارت جہاں معتصم پہلے ہی، ۱۰ ستمبر سنہ ۸۳۳ء کو پہونچ چکا تھا، یقیناً اسی سال کے آخری مہینوں میں آئی ہوگی، اور منیوئل خرمیہ کی شکست کے تھوڑے ہی عرصہ بعد قسطنطنیہ واپس چلا گیا ہوگا۔ بعض تحریروں کے مطابق یہ فتح یحییٰ کے دمشق آنے سے پہلے اور بعض کے نزدیک اس کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ سیمیون مجسٹر، مصحوبہ بکر ص ۶۳۲ + بھی اس سے متفق ہے کہ یہ واقعہ قیصر توفیل کے پانچویں سنہ جلوس میں پیش آیا تھا۔ توفیل سنہ ۸۲۹ء میں قیصر بنایا گیا تھا۔

[1] ابن اثیر (مطبوعہ مصر ج ۶ - ص ۱۶۲) نے اسے معتصم کے زمانے کا واقعہ بتایا ہے۔ مترجم۔

[2] ابن اثیر (ج ۶ - ص ۱۶۴) کے مطابق یہ واقعہ سنہ ۲۱۸ھ میں پیش آیا۔ مترجم۔

ان پر دوبارہ قبضہ کرے، کیونکہ اس وقت ان سب پر بابک قابض تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان دونوں مرکزوں کے درمیان قلعوں میں فوج مقرر کر کے سلسلۂ رسل و رسائل قائم رکھا جائے[۵۱]۔ اس کے علاوہ محمد بن لاشعث[۵۲] کو بھی آذربائجان بھیجا گیا۔ محمد نے اپنا فرض اس طرح ادا کیا کہ عصمہ نام ایک دہقان کو بدعہدی سے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا۔ عصمہ زمیندار تھا، بابک سے ملا ہوا تھا، اور اُس کی فوج کا ایک سپہ سالار بھی تھا۔ معتصم نے بابک کے خلاف تمام فوجی مہموں میں عصمہ کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کیا۔ اب اُس کی مدد سے بابک جیسے خطرناک باغی سے لڑنا بہت آسان ہو گیا۔ اس کے بعد بہت جلد یعنے ۲۲۰ھ میں خلیفہ نے حیدر بن کاؤس کو جبال کا حاکم مقرر کیا، اور بابک کے خلاف جو فوج لڑ رہی تھی اُس کا افسر[۵۳] بنایا۔ حیدر بن کاؤس عام طور پر افشین کے نام سے مشہور ہے، اور اس سے قبل وہ مامون کے عہد میں مصر کی ایک بغاوت فرو کر چکا تھا[۵۴]۔ افشین کی کوشش یہ تھی کہ بابک کے جاسوسوں کو رشوتیں دے کر جہاں تک ہو سکے اُسے کمزور کر دیا جائے۔ بہت جلد افشین کو اس کا موقع بھی مل گیا۔ تفصیل یہ ہے کہ معتصم نے ترک سپہ سالار بُغا کو فوج کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کے لیے بہت سامال دے کر افشین کے پاس بھیجا۔ بابک کے جاسوسوں نے اس کی اطلاع بابک کو دی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ بُغا کا مال لوٹ لیا جائے مگر ایک جاسوس نے، جو افشین سے ملا ہوا تھا، بابک کے قصد کی اطلاع افشین کو کر دی۔ وہ فوراً تیار ہو گیا، اور مقررہ دن اچانک بابک کی فوج پر جو بغا کو لوٹنے آئی تھی، حملہ کر کے اُس کے بے شمار آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ بابک کو مجبوراً پھر موقان یا موغان[۵۵] میں پناہ لینی پڑی، جہاں سے وہ بعد میں بھاگ کر اپنے مستحکم قلعہ البذ[۵۶] کو آیا۔ بابک اب درحقیقت دو طرف سے خطروں سے گھر گیا تھا۔ ایک طرف تو افشین البذ سے صرف چھ میل کے فاصلے پر چھاؤنی

---

[۵۱] ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۶۴ + ابن خلدون۔ مطبوعہ بولاق۔ ج ۳۔ ص ۲۵۸ + مترجم۔

[۵۲] طبری۔ (ج ۳۔ ص ۱۱۷۱) اور ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) نے اس سپہ سالار کا نام محمد بن بعیث بتایا ہے۔ مترجم +

[۵۳] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) کے مطابق افشین نے برزند کے مقام پر چھاؤنی قائم کی تھی۔ غالباً یہ مقام برزند ہے۔ برزند ادریسی کی تحریر کے مطابق، اردبیل کے شمال مغرب میں صرف ۴۵ میل کے فاصلے پر تھا۔ اردبیل اور برزند کے درمیان بہت سے قلعبند مقامات تھے۔ جہاں فوجیں مقیم تھیں + (مصنف نے ابن اثیر کے قلمی نسخہ سے استفادہ کیا ہے + مطبوعہ نسخے میں اس شہر کا نام برزند ہی لکھا ہے۔ مترجم) +

[۵۴] ابن اثیر، ابن خلدون (اور طبری) نے اس کا یہی نام لکھا ہے۔ مگر رائٹکے نے اس میں شبہ ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ اس مقام کا نام بُدس یا بُدیا بُدس لکھا ہے۔ مقدسی بُدو لکھتا ہے۔ ہر بلوت نے بظاہر بُد یا بَد پڑھا ہے، کیونکہ وہ بابک کے کشابُد میں گرفتار ہونے کا ذکر کرتا ہے تو اس میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ اُس کا مطلب قصبہ بُد سے ہے۔ میں اس بارے میں رائٹکے سے متفق نہیں ہوں کہ کشابد سے قصبہ بد کے سوا کچھ اور بھی مراد ہو سکتی ہے۔ بُد کا جائے وقوع معلوم نہیں۔ لیکن کوچ کے جو تفصیلی حالات معلوم ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر اردبیل کے شمال مغرب میں تقریباً تین دن کی مسافت پر ارمینیہ کی سرحد کے قریب، کوہستان عارس کے شمال میں واقع تھا + [۵۵] ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۶۹ + ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۵۹ + طبری ج ۳۔ ص ۱۱۹۳ + مترجم۔

ڈالے پڑا تھا، اور دوسری طرف بابک، دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ ان پہاڑوں میں گھوم رہا تھا، جو البذ کے گرد واقع تھے۔ بہرکیف، ۲۲۱ھ کے موسم سرما میں بابک نے ان فوجوں کو نہ صرف شکست دی، بلکہ انھیں مجبور کیا کہ البذ کا محاصرہ اُٹھالیں، اور مراغہ میں ٹھہر کر کمک کا انتظار کریں۔ اس کے بعد افشین کا سلسلہ رسل و رسائل اردبیل سے منقطع ہوگیا؛ اور اُسے مراغہ سے رسد کا انتظام کرنا پڑا۔ لیکن اسی سال افشین نے بابک کے ایک سپہ سالار طرخان کو، جو مراغہ کے قریب ایک گاؤں میں موسم سرما بسر کر رہا تھا، غداری سے قتل کرا دیا۔ چونکہ معتصم نے دو سپہ سالاروں، ایتاخ اور جعفر الخیاط کی سرکردگی میں تازہ دم فوج اُس کی مدد کے لیے بھیج دی تھی، اس لیے ۲۲۲ھ کے آغاز میں افشین نہایت احتیاط سے آگے بڑھا۔ باغیوں نے خفیف سی مزاحمت کی، اور محصور فوج سے معمولی سی جنگ کے بعد افشین نے اُس پہاڑی تک جس پر البذ واقع تھا تمام کوہستانی دروں پر قبضہ کر لیا[۵۱]۔ ایک مرتبہ پھر کوشش کی گئی کہ اُس پہاڑ پر، جو البذ پر چھایا ہوا تھا، سپہ سالاروں کے ذریعے سے قبضہ کر لیا جائے۔ جعفر الخیاط نے متعدد مرتبہ کوشش کی کہ حملہ کر کے قلعہ پر قابض ہو جائے، لیکن ہر مرتبہ نقصان اُٹھا کر پسپا ہوا۔ ان ناکامیوں کا اثر یہ ہوا کہ سپاہیوں نے شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا، اور مختلف تکالیف و مصائب اور رسد کی کمی کی بھی شکایت کی۔

افشین نے ایسی حالت میں البذ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا؛ اور بابک نے، جس کے آدمی برابر اُس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے، خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ افشین چاہتا تھا کہ بابک کو مع اُس کے اہل خاندان اور مال و متاع کے گرفتار کرے۔ لیکن اُس کی فوج کا ایک حصہ، جیسا کہ دمشق کے محاصرہ میں ہو چکا تھا، غداری سے ایک دوسری طرف سے البذ پر حملہ کر رہا تھا[۵۲]۔ بابک قلعہ سے فرار ہوا؛ اور تھوڑی مدت کے لیے آذربائیجان اور ارمینیہ کے درمیان جنگلوں میں اور اس کے بعد ارمینیہ کے پہاڑوں میں سرگرداں رہا[۵۳]۔ آخر شوال ۲۲۲ھ (ستمبر ۸۳۷ء) میں وہ اپنے پیشرو خلفا کی

---

۵۱ ابن اثیر کی تحریر کے مطابق افشین نے پہلے کلان رود میں اور پھر مرد الرود میں چھاؤنی قائم کی تھی۔ ابن خلدون نے مرد الرود کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک دریا کا نام ہے جو مراغہ کے قریب بہتا ہے۔

۵۲ قدرتی طور پر عرب مورخ اس غداری کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ لکھتے ہیں کہ جب افشین بابک سے خط و کتابت کر رہا تھا اُسے یہ اطلاع ملی کہ فوج کے ایک حصے نے، جو ایک پہاڑی پر البذ کے پیچھے خیمہ زن تھی، ایک طرف سے شہر پر حملہ کر دیا ہے، اور قلعہ پر حملہ کی تیاری کر رہی ہے۔

۵۳ اس اثنا میں کہ بابک ایک جنگل میں، جس کا نام ابن اثیر نے غداہ لکھا ہے، آوارہ پھر رہا تھا، معتصم کا معافی نامہ وصول ہوا؛ افشین نے اُسے بابک کے پاس بھیج دیا۔ مگر بابک نے دو قاصدوں میں سے ایک کو قتل کرایا، اور اپنے آپ کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے بیٹے کو، جسے عربوں نے گرفتار کر لیا تھا، اور جو اپنے باپ کو ترغیب دے رہا تھا کہ اپنے کو عربوں کے حوالے کر دے، لکھا کہ "اے فاحشہ کے بیٹے تو اگر میرا بیٹا ہوتا تو میرے ساتھ رہتا۔ لیکن تو میرا بیٹا ہی نہیں۔ اگر تو صاحب اقتدار ہو کر ایک دن زندہ رہے تو اس سے بہتر ہے کہ ذلیل غلام کی حیثیت چالیس برس تک زندگی بسر کرے۔" (ابن اثیر۔ ج ۶، ص ۴۷۱۔ مترجم)

ان پر دوبارہ قبضہ کرلے، کیونکہ اس وقت ان سب پر بابک قابض تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان دونوں مرکزوں کے درمیان قلعوں میں فوج مقرر کرکے سلسلۂ رسل و رسائل قائم رکھا جائے[۵۱]۔ اس کے علاوہ محمد بن البعیث[۵۲] کو بھی آذربائجان بھیجا گیا۔ محمدؔ نے اپنا فرض اس طرح ادا کیا کہ عصمہ نام ایک دہقان کو بدعہدی سے گرفتار کرکے بغداد بھیج دیا۔ عصمہ زمیندار تھا، بابک سے ملا ہوا تھا، اور اُس کی فوج کا ایک سپہ سالار بھی تھا۔ معتصم نے بابک کے خلاف تمام فوجی مہموں میں عصمہ کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کیا۔ اب اُس کی مدد سے بابک جیسے خطرناک باغی سے لڑنا بہت آسان ہوگیا۔ اس کے بعد بہت جلد یعنی ۲۲۰ھ میں خلیفہ نے حیدر بن کاؤس کو جبال کا حاکم مقرر کیا، اور بابک کے خلاف جو فوج لڑ رہی تھی اُس کا افسر[۵۱] بنایا۔ حیدر بن کاؤس عام طور پر افشین کے نام سے مشہور ہے، اور اس سے قبل وہ مامون کے عہد میں مصر کی ایک بغاوت فرو کرچکا تھا[۵۳]۔ افشین کی کوشش یہ تھی کہ بابک کے جاسوسوں کو رشوتیں دے کر جہاں تک ہوسکے اُسے کمزور کردیا جائے۔ بہت جلد افشین کو اس کا موقع بھی مل گیا۔ تفصیل یہ ہے کہ معتصم نے ترک سپہ سالار بُغا کو فوج کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کے لیے بہت سامال دے کر افشین کے پاس بھیجا۔ بابک کے جاسوسوں نے اس کی اطلاع بابک کو دی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ بُغا کا مال لوٹ لیا جائے مگر ایک جاسوس نے، جو افشین سے ملا ہوا تھا، بابک کے قصد کی اطلاع افشین کو کردی۔ وہ فوراً تیار ہوگیا، اور مقررہ دن اچانک بابک کی فوج پر جو بُغا کو لوٹنے آئی تھی، حملہ کرکے اُس کے بے شمار آدمیوں کو قتل کرڈالا۔ بابک کو مجبوراً پھر موقان یا موغان[۵۴] میں پناہ لینی پڑی، جہاں سے وہ بعد میں بھاگ کر اپنے مستحکم قلعہ البذ[۵۵] کو آیا۔ بابک اب درحقیقت دو طرف سے خطروں سے گھر گیا تھا۔ ایک طرف تو افشین البذ سے صرف چھ میل کے فاصلے پر چھاؤنی

---

[۵۱] ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۶۴ + ابن خلدون، مطبوعہ بولاق۔ ج ۳۔ ص ۲۵۸ + مترجم۔

[۵۲] طبری۔ (ج ۲۔ ص ۱۱۷۱) اور ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) نے اس سپہ سالار کا نام محمد بن بعیث بتایا ہے۔ مترجم +

[۵۳] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۴) کے مطابق افشین نے برزند کے مقام پر چھاؤنی قائم کی تھی۔ غالباً یہ مقام برزند ہے، برزند ادریسی کی تحریر کے مطابق، اردبیل کے شمال مغرب میں صرف ۴۵ میل کے فاصلے پر تھا۔ اردبیل اور برزند کے درمیان بہت سے قلعہ بند مقامات تھے۔ جہاں فوجیں مقیم تھیں + (مصنف نے ابن اثیر کے قلمی نسخہ سے استفادہ کیا ہے۔ مطبوعہ نسخے میں اس شہر کا نام برزند ہی لکھا ہے۔ مترجم) +

[۵۴] ابن اثیر، ابن خلدون (اور طبری) نے اس کا یہی نام لکھا ہے۔ مگر راشکے نے اس میں شبہ ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ اس مقام کا نام بُدس یا بُدیا بَدس لکھا ہے۔ مقدسی بُدّو لکھتا ہے۔ ہربلوت نے بظاہر بُدیا بَد پڑھا ہے، کیونکہ وہ بابک کے کشا بُد میں گرفتار ہونے کا ذکر کرتا ہے تو اس میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ اُس کا مطلب قصبہ بَد سے ہے۔ میں اس بارے میں راشکے سے متفق نہیں ہوں کہ کشا بد سے قصبہ بد کے سوا کچھ اور بھی مراد ہوسکتی ہے۔ بَد کا جائے وقوع معلوم نہیں۔ لیکن کوچ کے جو تفصیلی حالات معلوم ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر اردبیل کے شمال مغرب میں تقریباً تین دن کی مسافت پر ارمینیہ کی سرحد کے قریب، کوہستان قارس کے شمال میں واقع تھا +

[۵۵] ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۶۹ + ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۵۹ + طبری ج ۲۔ ص ۱۱۹۳ + مترجم۔

ڈالے پڑا تھا، اور دوسری طرف بغا، دو دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ ان پہاڑوں میں گھوم رہا تھا، جو البذ کے گرد واقع تھے۔ بہرکیف، ۲۲۱ھ کے موسم سرما میں بابک نے ان فوجوں کو نہ صرف شکست دی، بلکہ انھیں مجبور کیا کہ البذ کا محاصرہ اُٹھالیں، اور مراغہ میں ٹھہر کر کمک کا انتظار کریں۔ اس کے بعد افشین کا سلسلہ رسل و رسائل اردبیل سے منقطع ہوگیا؛ اور اُسے مراغہ سے رسد کا انتظام کرنا پڑا۔ لیکن اسی سال افشین نے بابک کے ایک سپہ سالار طرخان کو، جو مراغہ کے قریب ایک گاؤں میں موسم سرما بسر کر رہا تھا، غداری سے قتل کرا دیا + چونکہ معتصم نے دو سپہ سالاروں، ایتاخ اور جعفر الخیاط کی سرکردگی میں تازہ دم فوج اُس کی مدد کے لیے بھیج دی تھی، اس لیے ۲۲۲ھ کے آغاز میں افشین نہایت احتیاط سے آگے بڑھا۔ باغیوں نے خفیف سی مزاحمت کی، اور محصور فوج سے معمولی سی جنگ کے بعد افشین نے اُس پہاڑی تک جس پر البذ واقع تھا تمام کوہستانی دروں پر قبضہ کرلیا[1]۔ ایک مرتبہ پھر کوشش کی گئی کہ اُس پہاڑ پر، جو البذ پر چھایا ہوا تھا، سپہ سالاروں کے ذریعے سے قبضہ کرلیا جائے۔ جعفر الخیاط نے متعدد مرتبہ کوشش کی کہ حملہ کرکے قلعہ پر قابض ہو جائے، لیکن ہر مرتبہ نقصان اُٹھا کر پسپا ہوا۔ ان ناکامیوں کا اثر یہ ہوا کہ سپاہیوں نے شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا، اور مختلف تکالیف و مصائب اور رسد کی کمی کی بھی شکایت کی۔ افشین نے ایسی حالت میں البذ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا؛ اور بابک نے، جس کے آدمی برابر اُس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے، خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ افشین چاہتا تھا کہ بابک کو مع اُس کے اہل خاندان اور مال و متاع کے گرفتار کرے۔ لیکن اُس کی فوج کا ایک حصہ، جیسا کہ دمشق کے محاصرہ میں ہو چکا تھا، غداری سے ایک دوسری طرف سے البذ پر حملہ کر رہا تھا[2]۔ بابک قلعہ سے فرار ہوا؛ اور تھوڑی مدت کے لیے آذربائیجان اور ارمینیہ کے درمیان جنگلوں میں اور اس کے بعد ارمینیہ کے پہاڑوں میں سرگرداں رہا[3]۔ آخر شوال ۲۲۲ھ (ستمبر ۸۳۷ء) میں وہ اپنے پیشرو خلفا کی

---

[1] ابن اثیر کی تحریر کے مطابق افشین نے پہلے کلان رود میں اور پھر مرد الرود میں چھاؤنی قائم کی تھی۔ ابن خلدون نے مرد الرود کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک دریا کا نام ہے جو مراغہ کے قریب بہتا ہے۔

[2] قدرتی طور پر عرب مورخ اس غداری کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ لکھتے ہیں کہ جب افشین بابک سے خط و کتابت کر رہا تھا اُسے یہ اطلاع ملی کہ فوج کے ایک حصے نے، جو ایک پہاڑی پر البذ کے نیچے خیمہ زن تھی، ایک طرف سے شہر پر حملہ کر دیا ہے، اور قلعہ پر حملہ کی تیاری کر رہی ہے +

[3] اس اثنا میں کہ بابک ایک جنگل میں، جس کا نام ابن اثیر نے غداہ لکھا ہے۔ آوارہ پھر رہا تھا، معتصم کا معافی نامہ وصول ہوا۔ افشین نے اُسے بابک کے پاس بھیج دیا۔ مگر بابک نے دو قاصدوں میں سے ایک کو قتل کرا یا، اور اپنے آپ کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے بیٹے کو، جسے عربوں نے گرفتار کر لیا تھا، اور جو اپنے باپ کو ترغیب دے رہا تھا کہ اپنے کو عربوں کے حوالہ کر دے، لکھا کہ "اے فاحشہ کے بیٹے تو اگر میرا بیٹا ہوتا تو میرے ساتھ رہتا۔ لیکن تو میرا بیٹا ہی نہیں۔ اگر تو صاحب اقتدار ہو کر ایک دن زندہ رہے تو اس سے بہتر ہے کہ ذلیل غلام کی حیثیت سے چالیس برس تک زندگی بسر کرے۔" (ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۲۰۱ + مترجم) +

آپ کو خلیفہ کی فوج کے حوالے کر دیا، جو برابر اُس کا تعاقب کر رہی تھی[51]۔ معتصم کے حکم کے مطابق بابک سے نئے دار الخلافہ سامرہ میں زندہ لایا گیا۔ اُسے ہاتھی پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا گیا، اور پھر ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد اُس کا سر قلم کیا گیا۔ سر خراسان بھیج دیا گیا، اور جثہ سامرہ میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اہل بغداد نے بھی اس قسم کا ایک نظارہ دیکھا۔ کیونکہ بابک کا بھائی عبداللہ وہاں بھیجا گیا تھا۔ اور وہیں اُسے پھانسی دی گئی تھی۔ بابک نے بیست سالہ بغاوت کے دوران میں دو لاکھ پچپن ہزار پانچ سو مسلمان قتل کیے، اور چھ سپہ سالار یکے بعد دیگرے اُس کے خلاف بھیجے گئے۔ بابک کے ساتھ تین ہزار تین سو نو باغی گرفتار ہوئے اور سات ہزار چھ سو عورتیں اور بچے، جو اُس کی قید میں تھے آزاد کیے گئے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے اس میں تعجب کی گنجائش نہیں رہتی کہ کیوں افشین کی، جس نے اس خطرناک بغاوت کا خاتمہ کیا، اس قدر عزت افزائی کی گئی۔ خود خلیفہ معتصم اور اُس کے بیٹوں، اور خصوصاً اُس بیٹے نے جو بعد میں واثق کے لقب سے خلیفہ ہوا، ہر طرح کے تحائف سے سرفراز فرمایا۔ سامرہ کے راستے میں جہاں کہیں افشین کا قیام ہوتا تھا، خلیفہ کا ہرکارہ اُسے ملتا، اور خلیفہ کی طرف سے ایک خلعت اور ایک گھوڑا تحفہ میں دیتا۔ واثق نے بھی راستے میں اُسے تحائف دیے۔ چنانچہ اُس نے ایک تاج اور دو کمربندوں کے علاوہ بیس لاکھ درہم خود افشین کے لیے اور ایک کروڑ درہم اُس کی فوج کے لیے بھیجے[52]۔

اس کے بعد وہ بے چینی شروع ہوئی جس کے فرو کرنے میں معتصم کو بہت سا وقت صرف کرنا پڑا، اور تمام فوجی قوت خرچ کرنی پڑی۔ لیکن چونکہ ان معاملات کے متعلق ہماری معلومات بہت سطحی ہیں اس لیے ہم انھیں تفصیل سے بیان نہیں کر سکتے۔ اکثر مرتبہ بغداد کے دیندار لوگوں نے اُس مذہبی ظلم و ستم کے خلاف، جو معتصم نے اپنے بھائی مامون کی وفات کے بعد جاری کر رکھا تھا، بدامنی پیدا کی۔ یہ مذہبی تعدی اور تعذیب اس قدر بڑھ گئی تھی کہ حضرت امام احمد بن حنبل جیسے پارسا اور برگزیدہ بزرگ بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ امام صاحب نے خلق قرآن کے مسئلے کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ اس کی سزا میں اُنھیں تازیانے لگوائے گئے تھے[53]۔

بے چینی کا ایک دوسرا سبب وہ بے شمار غلام تھے، جنھیں خلیفہ نے ترکستان اور ماوراءالنہر سے خریدا تھا، اور ان سے اپنی محافظ فوج مرتب کی تھی۔ ان اجنبی غلاموں کی وجہ سے عربوں کی عزت و توقیر میں کمی آ گئی تھی، حالانکہ عربوں کو

---

[51] جس غدار نے بابک کو اپنے قلعہ میں پناہ لینے کی ترغیب دلائی تھی، اور پھر اُسے عربوں کے حوالہ کر دیا تھا، اُس کا نام سہل بن سپید، یا سینٹ مارٹن کی تاریخ کے مطابق سہل بن سمبد تھا۔ اسی طرح بابک کے بھائی عبداللہ کو بیلقان کے رئیس عیسٰے بن یونس بن اصطفانوس نے اپنے ہاں دعوت دی، اور پھر غداری سے اُسے افشین کے حوالے کر دیا (ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۰۴، ۱۰۵ + مترجم)

[52] ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۹۱ + ابن اثیر ج ۶ ص ۱۰۵ + مترجم۔

[53] ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۹۳۔ مترجم +

علم وفضل کے لحاظ سے ان غلاموں پر ہر طرح کی ترجیح حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اہل بغداد ان سپاہیوں سے جن کا رسوخ اور اثر بڑھتا جا رہا تھا، ناراض تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر آخر معتصم نے فیصلہ کیا کہ پُرانے بدامن اور بے چین دار الخلافہ کو خیر باد کہے، اور نیا دار الخلافہ تعمیر کرے۔ نیا دار الخلافہ بغداد کے شمال میں تین منزل کے فاصلے پر بنایا گیا۔ سُرّ من رأیٰ اس کا نام رکھا گیا۔ یہی نام آخر میں سامرہ یا سامَرہ بن گیا[1]۔ معتصم، اپنے پیشرو خلفا کی

---

[1] ابن خلدون۔ (ج ۳۔ ص ۲۵۰) نے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "معتصم نے مصر و مغرب کے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی جو مغاربہ کہلاتے تھے۔ اس کے بعد اُس نے سمرقند، اشروسنہ اور فرغانہ سے ایک فوج مرتب کی جو الفراغنہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان نوجوان سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور وہ اپنے گھوڑے شہر کی سڑکوں پر اس تیزی سے بھگاتے تھے کہ بہت کی عورتیں اور بچے ان کے پیروں میں روندے جاتے۔ اس کے بدلے میں اگر کبھی کوئی سپاہی اکیلا مل جاتا تو اہل شہر اُسے قتل کر دیتے۔ شہر میں ان واقعات کی وجہ سے بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، اور بعض مرتبہ لوگ علانیہ طور پر معتصم کو بُرا بھلا کہہ دیتے۔ ان وجوہ کی بنا پر آخر معتصم نے القاطول کو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ شہر اس سے قبل ہارون الرشید نے بسانا شروع کیا تھا، لیکن تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی، اور شہر دوبارہ ویران ہو گیا تھا۔ معتصم نے ۲۲۱ھ میں اسے پھر بسانے کا ارادہ کیا، اور اس کا نام سُرّ من رأیٰ رکھا۔ عوام نے اسے بگاڑ کر سامرہ کر لیا۔ یہ شہر معتصم اور اُس کے جانشینوں کا دار الخلافہ رہا" اسی قسم کے حالات ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۹۹) نے بھی ظاہر کیے ہیں۔ طبری بھی ایک حد تک اس سے متفق ہے۔ لیکن Col. G. Ath. [illegible] کے بیان کے مطابق ایک زاہد و عابد شخص معتصم کے پاس آیا، اور اُس سے کہا کہ اے امیر المومنین مجھے خوف ہے کہ عوام تجھے مار ڈالیں گے۔ معتصم نے جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے، جب میرے پاس ایک فوج موجود ہے جو میرے ہر حکم کی تعمیل کے لیے آمادہ ہے۔ زاہد نے کہا وہ تجھے اپنی بددعاؤں سے مار ڈالیں گے جو ہر رات مسجدوں سے بلند ہو کر آسمان تک پہنچتی ہیں۔ یہ سُن کر معتصم نے تلاش کے بعد سُرّ من رأیٰ کی جائے وقوع کو پسند کر کے وہاں بسرعت تمام شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا" مذکورہ بالا اسناد، طبری، ابن اثیر اور دوسرے مورخوں کے مطابق سب سے پہلے ہارون الرشید نے قاطول پر ایک شہر بسانا شروع کیا تھا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں بعد میں معتصم نے سُرّ من رأیٰ آباد کیا۔ ادریسی (مطبوعہ یورپ۔ ج ۲۔ ص ۱۴۶) نے غلطی سے لکھ دیا ہے کہ خلیفہ منصور، بانی بغداد نے اس شہر کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے علاوہ فرانسیسی ترجمہ میں بھی بجائے ابو العباس کے ابن عباس لکھ دیا گیا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس جگہ پہلے سے ایک شہر موجود تھا جس کا نام کستلم سمیری (Castellum Sumere) یا بطلیموس اور زوسیموس کے مطابق سُما (Suma) تھا۔ یہ نام بھی نیا نہیں۔ ممکن ہے کہ بعد میں اسی کو سُرّ من رأیٰ کر لیا گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل بغداد چڑانے کے لیے اس شہر کو سُرّ من رأیٰ کہنے لگے ہوں، کیونکہ اس شہر کی تعمیر سے اہل بغداد کو معتصم کی عزیز مگر مفسد فوج سے نجات مل گئی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نہر قاطول، ابو الفدا کی تحریر کے مطابق، سامرہ سے جنوب کی طرف جہاں تک بہتی تھی (دیکھو رٹر (Ritter) کی کتاب Erkunde ج ۲۔ ص ۲۰۹)۔ طبری لکھتا ہے کہ یہ نہر اسی نام سے شمال کی جانب

حکمت عملی کو ترک کر کے اس اجنبی فوج کو لے کر نئے شہر میں منتقل ہوگیا۔ عام طور پر اس نقل مکان کو ایک فاش غلطی تصور کیا جاتا ہے، اور ان تمام خرابیوں کا جو اس فوج کی وجہ سے خلافت اور خاندان خلافت میں پیدا ہوئیں، معتصم ہی کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عباسیوں نے خراسانیوں کی مدد سے بنی امیہ کو خلافت سے برطرف کیا تھا اور ان کی جگہ لی تھی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر مامون نے ایرانیوں کی مدد سے اپنے بھائی امین پر [illegible] عاصم کی تقویت ہوئی۔ اس کے علاوہ خلافت عباسیہ کے مشہور ترین سپہ سالاروں [illegible] ایرانیوں یا بربروں میں بھی حقیقی عربوں کا نام دکھائی نہیں دیتا۔ خود ترک غلاموں کی خریداری بھی مامون کے عہد میں شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ عربوں کی تلون المزاجی اُسے پسند نہ تھی، اور ایرانیوں پر بھی وہ پورا بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اُس نے ترکی غلام بھرتی کرنے شروع کیے تھے[۱]۔ لیکن معتصم کے زمانے میں ان ترک غلاموں کی طاقت کا پورا اظہار ہوا۔ اُس نے مملوکوں کی جن کی تعداد ستر ہزار تک پہونچ گئی تھی، ایک فوج مرتب کی۔ معتصم غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے صرف اطاعت شعار لوگوں پر بھروسہ کرنا مفید ہوگا، اور عرب اپنے مختلف قبائلی عناد اور قومی جھگڑوں میں ایسے مبتلا تھے کہ ان سے بھلائی کی امید رکھنا بیکار تھا۔ اس زمانے میں کوئی باقاعدہ فوج بھی نہ تھی، اس لیے یہ ضروری تھا کہ ایسی فوج بھی مرتب کی جائے جو بیرونی جنگوں کے لیے وقف ہو، اور اندرونی فسادات کو فوراً فرو کر سکے۔ باقاعدہ فوج نہ ہونے کے نتائج بابک خرمی کی بغاوت میں دیکھے جا چکے تھے۔ عرب اور ایرانی اس وقت تک فوج میں کام کرتے تھے۔ مگر اب ان کی جگہ ان بیرونی مملوکوں نے لے لی۔ بدوؤں نے صدر اسلام کی جنگوں میں بہت بڑا حصہ لیا تھا لیکن اب چونکہ مال غنیمت کی کوئی امید نہ رہی تھی اس لیے یا تو وہ اپنے ریگستان کو واپس چلے گئے تھے، اور یا مفتوحہ علاقوں، خصوصاً ان بے شمار نئے شہروں میں اندلس، افریقیہ، مصر اور دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر بسائے گئے تھے، یا بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس کے ساحلوں پر آباد ہوگئے تھے۔ ان مقامات میں مستقل بود و باش اختیار کرنے کے بعد، یا شائستہ زندگی کے سبب یہ لوگ بہت کمزور ہوگئے اور رفتہ رفتہ سپاہیانہ مشاغل ترک کر کے علم و فن، تجارت، زراعت اور بالخصوص تجارت اور لین دین کی طرف راغب ہوگئے۔ کیونکہ ان دونوں پیشے انتہائے عروج کو پہونچے ہوئے تھے، اور بہت جلد عربوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷) موصل جاتی تھی۔ یہ صنف لکھتا ہے کہ سامرہ نہایت قدیم زمانے میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک ویران شہر تھا۔ موصل کے علاقہ میں دریائے دجلہ سے نکلی ہوئی ایک بہت بڑی نہر بہتی تھی جسے تامرا کہتے تھے۔ اسی نہر سے موصل کو پانی ملتا تھا۔ گو سامرہ دجلہ کے کنارے واقع تھا مگر وہاں بھی نہر تامرا ہی سے پانی پہونچتا تھا۔

[۱] مامون پہلا خلیفہ تھا جس نے ترکوں کو اپنی خدمت پر مقرر کیا۔ ان میں سے اکثر کو اس نے ایک لاکھ اور دو لاکھ درہم میں خرید تھا۔

انھیں بالکل اپنا کر لیا تھا۔ اُس زمانے میں بغداد نہ صرف خلافت کا، بلکہ جیسا کہ عرب مورخوں نے لکھا ہے، تمام دنیا کا مرکز تھا، اور دنیا کی تجارت یہاں مرکوز ہو گئی تھی۔ ہر حکمراں کا فرض تھا کہ قافلے کے تمام راستوں کی حفاظت اور امن و امان کا ذمہ دار ہو۔ یہ قافلے ایران کے مختلف صوبوں، مثلاً اندرون فرغانہ، اور بخارا بلکہ چین و تبت کی طرف سے آتے تھے، اور شمال مغرب اور بازنطینی سلطنت کی صنعتوں کے نمونے اپنے ساتھ لاتے تھے۔ پھر دریائے فرات اور دجلہ کی بے شمار نہروں میں سے ہوتے ہوئے موصل اور رقہ پہونچتے تھے۔ جنوب اور خصوصاً عرب کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔ کیونکہ حج کے موسم میں حاجی بکثرت عرب جاتے تھے، اور قدرتی طور پر ان کا مقصد حج کرنے کے علاوہ تجارت بھی ہوا کرتا تھا۔ مصر لوبیہ اور شمالی افریقہ کے تاجر یا تو شمالی شام کے علاقے میں اُترتے تھے، اور وہاں اپنا مال کشتیوں میں بار کر کے دریائے فرات کے راستے بغداد آتے تھے، یا دریائے نیل سے ہو کر بحیرۂ قلزم پہونچتے اور پھر ریگستان کے راستے سے عراق آتے۔ بغداد اور بصرہ میں بھی بحری تجارت کی کمی نہ تھی۔ یہ راستہ خلیج فارس میں ہو کر مکران کے ساحل کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ کے دہانے تک پہونچتا تھا۔ یہاں دیبل اور منصورہ جیسے بڑے بڑے شہر موجود تھے، جہاں عربوں کی تجارتی کوٹھیاں اور گودام تھے، جن میں ہندی اور چینی مال ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ یہ نئے اور ایک حد تک پرخطر مشاغل اور صنعت و حرفت کی ترقی ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے عرب فوجی خدمات سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس خدمت میں نہ کچھ فائدہ رہ گیا تھا، اور نہ اس سے عزت و مال میں کسی طرح کا اضافہ ہو سکتا تھا۔

عربوں کے خصائل کی اس پوری کایا پلٹ سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو خلفا کو گذشتہ پچاس برس کے عرصہ میں اپنی فوج کو ایسے نئے سپاہی بھرتی کر کے تقویت دینی پڑی، جن میں جنگ و جدل کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو، اور دوسری طرف قدرتی طور پر قدیم فاتحین محض نام کے مالکان ملک رہ گئے۔ درحقیقت وہ اب مفتوح تھے۔ اصل قوت ان غلاموں کے ہاتھ میں تھی جو فوجی لحاظ سے ان فاتحوں سے رفیع و اعلیٰ تھے۔

اب ہم معتصم اور توفیل قیصر قسطنطنیہ کی جنگجوئی کے حالات دوبارہ شروع کرنے سے پہلے، زُط اور علویوں کی شورش اور بغاوت کے حالات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ زُط دراصل ایک ہندوستانی قوم کا نام ہے۔ یہ لوگ کسی زمانے میں دریائے سندھ کے علاقے میں آزاد گھومتے پھرتے تھے۔ اُنھوں نے ہندوستان کے ایک گوشہ میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی، اور پھر شمال اور مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا تھا۔ اس قوم زُط کا ایک حصہ ایران کی طرف آیا، اور ایرانیوں سے شکست کھا کر بطور قیدی ملک میں لایا گیا۔ یزدجرد اور مسلمانوں کی جنگوں کے دوران میں ایرانی فوج میں زُط اور ان کے علاوہ دو اور جنگجو ہندی قبیلوں کے نام سُنے .... جاتے ہیں۔ انھیں اساورہ اور سیابجہ کہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ الاشعری سُوس کا محاصرہ کر رہے تھے تو یہ

سب قبائل اہواز میں مقیم تھے۔ فتح سوس کے بعد وہ عربوں سے مل گئے، لیکن درحقیقت ان کی زیر سیادت نہیں آئے۔ اساورہ، جو بہت جلد دوسرے ایرانی مفرورین میں مل گئے تھے، بصرہ میں بس گئے؛ زُط (جاٹ) کسکر کے نواح میں، اور بصرہ اور واسط کے درمیان بطیحہ کے دلدلی علاقہ میں رہنے لگے[1]۔ مگر اس اجنبی قوم نے مختلف اوقات میں بہت سی لڑائیاں، خصوصاً بازنطینی سلطنت کے خلاف لڑی تھیں؛ اور اسی زمانے سے شام اور عراق عرب کے بعض سرحدی قلعوں پر قابض تھی۔ ۲۱۹ھ میں، غالباً ایشیائے کوچک سے واپسی کے وقت، یہ لوگ عراق میں سے گذرے، اور طرح طرح کے ظلم و ستم کے مرتکب ہوئے۔ انھوں نے قریوں اور شہروں کو تاراج کیا، اور بصرہ سے عرب جانے والے قافلوں اور جہازوں کو بھی لوٹا[2]۔ چونکہ ان جنگ جو لٹیروں کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس لیے معتصم کو ان کے خلاف ایک بڑی فوج بھیجنی پڑی، جس کا سپہ سالار عجیف بن عنبسہ تھا۔ عجیف نے واسط کو فوجی نقل و حرکت کا مرکز بنایا۔ یہ جنگ مہینوں تک جاری رہی۔ ۲۱۹ھ[3] (جنوری ۸۳۴ء) کے آخر یا ۲۲۰ھ کے شروع میں، بہت سی خونریز لڑائیوں کے بعد زُط کے سردار محمد بن عثمان اور سماق مغلوب ہوئے۔ عجیف ان کے تمام خاندانوں کو، جن کی تعداد ستائیس ہزار تھی، کشتیوں میں سوار کرا کے خلیفہ کے پاس بغداد لے گیا۔ معتصم نے انہیں انازربہ کی طرف جلا وطن کر دیا، جہاں بہت جلد وہ بازنطینیوں کے ہاتھوں فنا ہو گئے۔

---

[1] یہ سب قومیں بنو تمیم کی موالی بنیں۔ لیکن اس قبیلے سے الگ ہو کر، زُط اور سیابجہ حنظلہ کے، اور اساورہ سعد کے موالی ہو گئے۔ صاحب قاموس نے اساورہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ یہ ایک ایرانی قوم کا نام ہے، جو بصرہ میں بس گئی تھی، اور کوفہ کے احامرہ کی طرح ان کا نام ان کے جائے قیام کے مطابق اساورہ ہو گیا تھا۔ اس مصنف کا بیان ہے کہ انھیں اساورہ اس وجہ سے کہا جاتا تھا کہ وہ نہایت اچھے نشانہ باز تھے۔ اساورہ کا لفظ "اسور" یا "اسوار" سے مشتق ہے، جس کے یہی معنی ہیں۔ ان کا سردار، جس کا نام بلاذری نے سیاہ الاسواری لکھا ہے، یزدجرد کی فوج میں مقدمۃ الجیش کا افسر تھا۔ شاید اسی سردار کے نام پر اس قبیلے کا نام سیابجہ پڑ گیا تھا۔ "زُط" اور "سیابجہ" کے الفاظ مشہور قاموس میں نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ بلاذری نے ایک اور قوم کا ذکر کیا ہے جس کا وطن مکران اور سیستان کی سرحد پر تھا، اور اندجار کہلاتا تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، بلاذری۔ مطبوعہ مصر ص ۳۸۰۔ ۳۸۴۔ مترجم)۔

[2] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۳) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۵۷) + ابو الفدا اور المکین نے زُط کی لڑائی کا ذکر نہیں کیا۔ بلاذری (مطبوعہ مصر، ص ۳۸۲) نے لکھا ہے کہ انھوں نے مامون کے عہد میں تاخت و تاراج شروع کی تھی۔

[3] ابن خلدون نے یہی سنہ لکھا ہے۔ مگر ابن اثیر نے ۲۲۰ھ بیان کیا ہے + (ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۵۷ اور ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۶۳۔ دونوں نے ۲۱۹ھ ہی لکھا ہے۔ نہ معلوم مصنف نے ۲۲۰ھ کیسے پڑھ لیا۔ مترجم) +

اس زمانے میں ایک علوی نے خلافت کا دعوےٰ کیا۔ وہ حضرت امام حسین کی اولاد سے ایک شخص محمد[1] بن قاسم تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے، تقریباً گم نامی کی حالت میں، مدینہ میں رہتا تھا؛ خراسان کے ایک حاجی نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ امامت کا دعویٰ کرے۔ یہ خراسانی محمد بن قاسم کے ساتھ بہت عزت و احترام سے پیش آیا، اور تمام خراسان سے مدد دلانے کا وعدہ کیا۔ محمد بن قاسم باتوں میں آگیا، اور ان سازشیوں کے ہمراہ جوزجان پہونچا؛ یہاں چند روز تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے بعد جب سازشیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو محمد نے علانیہ طور پر خلافت کا دعوےٰ کیا، یا یوں کہنا چاہیے کہ "الرضا من آل محمد" کے لیے دعوت کا آغاز کیا گیا۔ عبداللہ بن طاہر نے جو اُس وقت خراسان کا حاکم تھا، محمد کے خلاف فوج بھیجی۔ محمد شکست کھا کر بھاگا، مگر آخر گرفتار ہوا۔ عبداللہ نے اُسے خلیفہ کے پاس بھیج دیا، جس نے اُسے قید کر دیا۔ مگر غرہ شوال ۲۱۹ھ (۸۳۴ء) کی رات کو وہ قید سے فرار ہوا اور ایسا گیا کہ پھر اس کا پتہ نہ لگا۔

---

[1] اس کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:۔ محمد بن قاسم بن علی بن عمر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب۔ یہ ابن خلدون کا بیان ہے۔ مسعودی (مطبوعہ یورپ ج ۷، ص ۱۱۶)۔ ابن خلدون (ج ۳، ص ۲۵۷) سے متفق ہے۔ مگر ابن اثیر (ج ۲، ص ۱۶۲) اور طبری (ج ۲، ص ۱۱۶۵) نے یہ نسب نامہ یوں بیان کیا ہے:۔ محمد بن قاسم بن عمر بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (مترجم) ابن خلدون نے جس طرح یہ واقعہ نقل کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعی روایات سے بہت متاثر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "۲۱۹ھ میں محمد بن قاسم معتصم سے ڈر کر بھاگا، اور زندگی زہد و عبادت میں گذارتا رہا۔ اس کے بعد وہ خراسان آیا؛ پھر طالقان گیا۔ یہاں لوگوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ زیدیہ فرقہ کے لوگ اُس سے مل گئے۔ عبداللہ بن طاہر نے اُس پر فوج کشی کی۔ محمد بن قاسم کو شکست ہوئی۔ اور گرفتار ہو کر معتصم کے پاس لایا گیا۔ خلیفہ نے اُس کی موت تک اُسے قید میں رکھا، اور بقول بعض اُسے زہر دے دیا۔ (مصنف نے اس بیان کو ابن خلدون سے منسوب کیا ہے، مگر مطبوعہ تاریخ میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن مسعودی (ج ۷، ص ۱۱۶) نے یہ واقعہ اسی طرح لکھا ہے۔ مترجم)۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم قید کر دیا گیا تھا۔ لیکن وہ غرۂ شوال کی رات کو قلعہ سے، جہاں وہ قید تھا، بھاگ گیا۔ المکین کا بھی یہی بیان ہے۔ لیکن اس مصنف نے محمد بن قاسم کو ابن علی لکھ دیا ہے۔ یہ امر خلاف قیاس نہیں کہ معتصم نے، جو اس سے قبل بہت سے لوگوں کو قتل کی سزا دے چکا تھا، محمد بن قاسم کو بھی قید میں قتل کرانے کے بعد اس کے بھاگ جانے کی خبر مشہور کرا دی ہو۔ (مگر ابن خلدون (ج ۳، ص ۲۵۷) ابن اثیر (ج ۲، ص ۱۶۲) اور طبری (ج ۲، ص ۱۱۶۶) سب نے یہی لکھا ہے کہ محمد بن قاسم قید سے بھاگ گیا تھا۔ کسی نے زہر خورانی کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ صرف مسعودی (ج ۷، ص ۱۱۶) نے محض ایک روایت نقل کر دی ہے۔ یہ روایت بے معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔ وقد تنوزع محمد بن القاسم فمن قائل یقول انہ قتل بالسم۔ مترجم)

[2] ابن خلدون۔ ج ۳، ص ۲۵۷۔ مترجم۔

خلافت کی ان پریشانیوں سے توفیل، قیصر قسطنطنیہ نے فائدہ اٹھایا، اور چاہا کہ مامون کے عہد کی شکستوں کا بدلہ لے۔ چنانچہ عین اُس وقت جب معتصم کی بہترین فوجیں اور سپہ سالار آذربائیجان میں بابک کے خلاف لڑ رہے تھے، قیصر نے بلا کسی بہانے کے، محض بابک کی فرمائش پر، دریائے فرات کے اسلامی علاقوں پر حملہ کیا، اور زبطرہ اور سمیاط کو فتح کرکے اس علاقہ کو اس طرح لوٹا کہ ملطیہ سے شام اور عراق عرب کی سرحد تک کا سب علاقہ تہ و بالا ہو گیا۔ جو مال غنیمت قیصر نہ لے جا سکا اُسے برباد کر ڈالا۔ فوجی خدمت کے لائق جو مسلمان اُس کے ہاتھ لگے انھیں قتل کرایا، اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ مگر ان تمام بے رحمیوں کو توفیل اور اُس کے یونانیوں سے منسوب نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قتل و غارت میں اس نواح کے عیسائی باشندے بھی ایرانیوں اور دوسرے باغیوں کی دست برد اور ظلم و ستم سے محفوظ نہ رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہی ایرانی اور باغی، ہمدان کے قرب و جوار میں خلافت کی فوجوں سے شکست کھانے کے بعد یونانی علاقے میں پناہ گزیں ہوئے تھے، اور اس وقت توفیل کی فوج کا ایک حصہ انھیں پر مشتمل تھا۔ چونکہ معتصم کی بہترین فوجیں آذربائیجان میں برسر پیکار تھیں اس لئے ناممکن تھا کہ وہ اُس وقت توفیل کے

سلہ بازنطینی مورخوں، (ابن اثیر، ابن خلدون، اور طبری) میں سے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ ملطیہ کے مسلمان حاکم نے اس سے قبل یونانی علاقہ پر حملہ کیا تھا۔ حالانکہ اس یونانی مہم کے متعلق انھیں عرب مورخوں کے لکھے ہوئے حالات سب سے زیادہ مستند ہیں معتصم کے لئے اُس زمانے میں (۲۲۳ھ) جبکہ وہ ہر طرح صلح و آشتی کا آرزومند تھا، قیصر کے خلاف فوج کشی شروع کرنا ناممکن تھا۔ بارہبروس (Bar Herbaus) نے اپنی کتاب تاریخ شام (Chron. Syr) (ص ۱۵۹) میں اس مہم کا حال لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ توفیل بھی موقعہ پیکار جنگ میں موجود تھا۔ مگر اُس کا بیان مستند نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس مصنف نے مہم کے اسباب بیان نہیں کئے۔ لیکن اُس کی تحریر کے مطابق زبطرہ پر پہلا حملہ ۸۳۳ء میں ہوا تھا۔

سلہ بازنطینی اس شہر کو زبطرہ کہتے ہیں۔ اس کی جائے وقوع کے متعلق ادریسی اور ابوالفدا میں اختلاف ہے۔ ادریسی (ج ۲۔ ص ۱۳۱) کے مطابق زبطرہ، حصن منصور سے پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ اور حصن منصور، سمیساط، اور ملطیہ کے درمیان سمیساط سے بائیس میل اور ملطیہ سے تیس کے فاصلے پر تھا۔ ابوالفدا (مطبوعہ یورپ ص ۲۳۳) نے لکھا ہے کہ زبطرہ، حصن منصور سے مغرب کی طرف، تقریباً دو دن کی مسافت پر، ایک میدان میں واقع تھا، اور اُس کے گرد پہاڑ تھے۔ چونکہ ابوالفدا نے بذات خود ۷۱۵ھ میں اس شہر کو شکستہ حالت میں دیکھا تھا اس لئے اُس کا بیان زیادہ مستند ہے۔

سلہ طبری (ج ۲۔ ص ۱۲۳۵) اور ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۶) سے مصنف کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مترجم۔

خلاف جنگ کا اعلان کرے[1]۔ لیکن اُس کی مصیبت زدہ رعایا کی فریاد، اور خصوصاً ایک قیدی ہاشمی عورت کی دہائی نے معتصم کو مجبور کیا کہ عمر الفرغانی اور عجیف بن عنبسہ کو کچھ فوج دے کر سرحد کی طرف روانہ کرے تاکہ وہ اس قتل و غارت کا سدباب کریں، حالانکہ تونیل اس ہولناک قتل عام کے بعد فوراً اپنے دارالسلطنت کو واپس ہوگیا تھا، اور صرف تھیوفوبوس کو اپنے ایرانی حلیفوں کے ساتھ ایشیائے کوچک میں چھوڑ گیا تھا۔ اس عرصہ میں خلیفہ نے قیصر کے خلاف جنگ کی تیاری مکمل کی۔ خلافت کے تمام صوبوں سے فوجیں جمع کی گئیں، اور جونہی وہ فوجیں جو بابک کے خلاف لڑ رہی تھیں مستقر کو واپس آئیں ۲۲۳ھ (۸۳۸ء) کے موسم بہار میں خلیفہ بذات خود انھیں لے کر ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوگیا۔ مقدمۃ الجیش پر اشناس اور محمد بن ابراہیم بن مصعب کو، میمنہ پر ایتاخ کو، میسرہ پر جعفر بن دینار بن عبداللہ الخیاط کو، اور قلب پر عجیف بن عنبسہ کو افسر مقرر کیا۔

---

[1] عرب مورخ اس سے متفق نہیں، وہ کہتے ہیں کہ تونیل نے پہلے ۲۲۲ھ (۸۳۷ء) میں زبطرہ اور سمیساط فتح کیا تھا۔ لیکن ان مورخوں میں خود اس طرح اختلاف واقع ہوتا ہے کہ وہ پہلے عجیف اور عمر الفرغانی کا یونانیوں کے خلاف بھیجا جانا بیان کرتے ہیں، اور پھر لکھتے ہیں (ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۷۷، ابن خلدون ج ۳۔ ص ۲۶۲) کہ بابک پر فتح پانے کے بعد معتصم نے عموریہ پر فوج کشی کا حکم دیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عجیف اور عمر کی پہلی مہم بابک کی جنگ کے خاتمہ سے پہلے عمل میں آئی تھی۔ لیکن ہم بیان کرچکے ہیں کہ بابک کا شوال ۲۲۲ھ میں خاتمہ ہوا تھا، اور ۲۲۳ھ کے شروع میں افشین اُسے اپنے ساتھ لے کر سامرہ پہونچا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زبطرہ کی تباہی یقیناً ۲۲۲ھ (مطابق ۸۳۷ء) میں واقع ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ زبطرہ کی تباہی اور معتصم کی مہم کے درمیان، جس میں افشین اور دوسرے سپہ سالاروں نے جو بابک کے خلاف لڑ رہے تھے، حصہ لیا تھا، دو برس کا وقفہ گذرا تھا یعنی تونیل کی یورش ۸۳۶ء میں ہوئی تھی، اور عموریہ کا محاصرہ ۸۳۸ء میں پیش آیا تھا۔ اس دو برس کے وقفہ کو عرب مورخ مانتے ہیں۔ بازنطینی مورخ ان سے متفق ہیں۔ کیونکہ Theo Contin (ص ۱۲۵) نے Simeon Magister کی کتاب (ص ۶۴۴) کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ زبطرہ کی فتح تونیل کے سات سنہ جلوس میں، اور عربوں کی فوج کشی نو سنہ جلوس میں پیش آئی تھی۔ اس کے علاوہ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۶) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۲) نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ بابک نے تونیل کو لکھا تھا کہ معتصم کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اُس نے اپنے درزی (جعفر) اور باورچی (ایتاخ) کو سپہ سالار بنا کر اُس سے لڑنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس لیے اگر جنگ کا ارادہ ہو تو اس سے بہتر دوسرا موقع نہیں ملے گا۔ یہ یقیناً ۲۲۲ھ کا واقعہ ہے کیونکہ معتصم نے اسی سال ان دونوں سپہ سالاروں کو آذربائیجان بھیجا تھا (مصنف نے اس سے قبل بھی ذکر کیا ہے کہ تونیل نے زبطرہ اور سمیساط پر حملہ کیا تھا۔ لیکن ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۶)، طبری (ج ۲۔ ص ۱۲۳۴)، مسعودی (ج ۷۔ ص ۱۳۴) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۲) نے سمیساط کے بجائے ملطیہ پر یونانی حملے کا ذکر کیا ہے۔ یہی درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مصنف نے خود لکھا ہے کہ اس تباہی خیز مہم کی بدولت ملطیہ سے شام کی سرحد تک کا تمام علاقہ تہ و بالا ہوگیا تھا۔ اس کی تصدیق طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۲۳۵۔ سے ہوتی ہے۔ مترجم) +

معتصم نے اپنی چھاؤنی سلوقیہ کے مقام پر قائم کی۔ یہ جگہ طرسوس سے ایک دن کی مسافت پر دریائے ایڈونس (نہر البسن) کے کنارے واقع تھی[1]۔

جب تمام عرب فوج، جو بازنطینی اندازے کے مطابق دو لاکھ پچاس ہزار تھی، ایک جگہ جمع ہو گئی تو معتصم نے تیس ہزار آدمیوں کو افشین کی سرکردگی میں سروج اور درب الحدث کے راستے سے ملطیہ کی طرف روانہ کیا۔ اشناس اور وصیف کو دریائے سلیسیا کے راستے کپادوشیا بھیجا، اور حکم دیا کہ وہ طوانہ کی طرف جائیں۔ اشناس ۲۲ رجب کو روانہ ہوا۔ اُسے حکم تھا کہ صفصاف[2] میں خلیفہ کا انتظار کرے۔ اس کے دو دن بعد خلیفہ بذاتِ خود روانہ ہوا۔ چونکہ اُسے معلوم تھا کہ بازنطینی اُس کے قراول پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اُس نے اشناس کو قیام کرنے کا حکم دیا، تاکہ یونانی فوج کی چھاؤنی کا پتہ لگایا جائے۔ اشناس نے عمر الفرغانی کو دو سو آدمی دے کر آگے بھیجا۔ ان لوگوں نے کپادوشیا میں ادھر اُدھر چھاپے مارے، اور چند قیدی ساتھ لے کر واپس آئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ قیصر کپادوشیا میں جنگ کی تیاری کر رہا تھا، لیکن جب اُسے افشین کے ارمینیہ جانے کی خبر معلوم ہوئی تو وہ بھی اسی طرف روانہ ہو گیا ہے[3]۔
اب معتصم نے افشین کے پاس قاصد بھیجا اور حکم دیا کہ وہ آگے نہ بڑھے۔ لیکن باوجود اس کے کہ قاصد سے دس ہزار دینار کا وعدہ کیا گیا تھا وہ افشین تک نہ پہونچ سکا۔ اس اثنا میں معتصم نے اشناس کو فوج کا ایک حصہ دے کر آگے روانہ کیا۔ وہ انقرہ[4] پہونچا۔ وہاں کے تمام باشندے بھاگ نکلے تھے۔ اور بستی غیر آباد تھی۔ اشناس نے مفرورین کو اکٹھا کر کے ان کی تمام دولت اور کھانے پینے کا ذخیرہ ان سے چھین لیا۔ انقرہ میں ہی اشناس کو اطلاع ملی کہ افشین نے قیصر کو شکست دی ہے۔ اس جنگ میں پہلے یونانیوں کا پلہ بھاری معلوم ہوتا تھا، مگر ترک تیر اندازوں کی ہمت اور کوشش سے حالت بدل گئی، اور آخر

---

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۳) کہتے ہیں کہ اُس نے نہر البسن کے کنارے اپنا معسکر قائم کیا تھا۔ بازنطینی مورخ لکھتے ہیں کہ معتصم کا معسکر طرسوس کے قریب تھا۔

[2] میرا قیاس ہے کہ صفصاف طرسوس اور طوانہ کے درمیان غالباً دریائے سلیسیا کے ایک جانب واقع ہے۔

[3] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۲) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۴) اس واقعہ کے متعلق بازنطینی مورخوں سے متفق ہیں۔

[4] انقرہ نام ایک شہر شمالی گلاتیا میں اور ایک فرنگیا میں ہے۔ لیکن مورخوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان دونوں مقامات میں سے کسی سے بھی مراد نہیں ہے۔ تمام اسناد میں جو حالات بیان ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انقرہ کا شہر طرسوس اور انگونیم کے درمیان ہوگا۔ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۸) کے مطابق وہ عموریہ سے سات مراحل تھا۔ ادریسی (ج ۲۔ ص ۳۰۱) نے انقرہ کا ذکر کیا ہے جو قونیہ اور انطاکیہ کے درمیان واقع تھا۔

میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ یونانیوں کی فوج بالکل تباہ ہوگئی، اور قیصر نے بھاگ کر اپنی جان بچائی[1] معتصم کو اس فتح کی خبر اُس وقت ہوئی جب وہ انقرہ کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ افشین بھی بہت جلد خلیفہ کے پاس آگیا۔

معتصم اپنی فوج تین حصوں میں تقسیم کرکے عموریہ کی طرف بڑھا۔ عموریہ قیصر تونیل کا جائے پیدائش تھا۔ خلیفہ نے زبطرہ سے عموریہ تک کا تمام علاقہ پامال کر ڈالا، تاکہ بازنطینیوں سے ان کے گزشتہ قتل و غارت کا قرارواقعی انتقام لے۔ افشین میمنہ پر، اشناس میسرہ پر، اور خود معتصم قلب پر افسر تھے۔ تونیل نے افشین کے خلاف روانہ ہونے سے قبل سب سے استدعا کی تھی کہ عموریہ کو بچانے میں اُس کی مدد کریں۔ عموریہ کو نہایت استحکام کے ساتھ چاروں طرف سے قلعبند کیا گیا تھا، اور یوتیوس دوسرے بہادر سپہ سالاروں کے ساتھ یہاں کی مقیم فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ قیصر نے فودِ دُر ولیم (دورولیہ) کے قریب ایک مستحکم چھاؤنی قائم کی تھی۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ وہ دشمن کا، جس کی تعداد اُس سے تین گنا تھی، نہ مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ محصورین کو کسی قسم کی مدد پہنچا سکتا ہے۔ اس اثناء میں، باوجود مایوسی کے، محصورین نے نہایت ثابت قدمی دکھائی، اور اگر دو غدار اسلامی فوج سے مل کر شہر کی فتح کو آسان نہ بنا دیتے تو غالباً محاصرہ طول کھینچتا۔ ان میں سے ایک عیسائی عرب تھا، جو مسلمانوں سے مل گیا، اور انھیں فصیل شہر کا

---

[1] یہ نہایت مستند مورخوں کا بیان ہے۔ اسلامی فوج میں ترکوں کے موجود ہونے کا واقعہ نہ صرف بازنطینی مورخوں نے، بلکہ ابن اثیر نے بھی بیان کیا ہے۔ ترکوں کے افسر کا نام ایتاخ تھا، یہی شخص افریقیہ کے سپاہیوں کا افسر بھی تھا۔ عربوں نے میدان جنگ کا نام نہیں لکھا۔ مگر Theoph Contin (ص ۱۲۶) نے اسے "دزیمونا" (Dasemona) لکھا ہے۔ ایک دوسری جگہ انزسے (Anzen) تھی، جہاں سے قیصر تونیل تمام عرب فوج کو دیکھ سکتا تھا۔ ان دونوں مقامات کا صحیح محل وقوع معلوم نہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ افشین ملطیہ کی طرف سے آکر قیصر سے لڑا تھا، اور اس جنگ کے بعد، ایرانی معاون فوج کے غدر کی وجہ سے قیصر نے اماسیہ کے قریب خلوکم میں پناہ لی تھی، اس لئے میدان جنگ غالباً سیواس اور قیصریہ کے قریب کہیں واقع ہوگا۔ یونانیوں کے خلاف ایرانیوں نے جہاں سازش کی تھی اُس جگہ اور میدان جنگ کے قریب ہونے کا ذکر گبن اور شلاسر (Schlosser) نے بھی کیا ہے۔ اس جنگ میں ترکوں نے متعدد مرتبہ قیصر کی جان بچائی، اور بالآخر خود قتل ہوا۔ ابن اثیر کے مطابق یہ جنگ ۲۵ شعبان ۲۲۳ھ (۲۲ جولائی ۸۳۸ء) کو ہوئی تھی۔

[2] بازنطینی مورخوں نے لکھا ہے کہ اس مہم کے آغاز میں معتصم نے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ اپنی ڈھالوں پر عموریہ کا نام لکھوا لیں۔ ابن اثیر (ج ۶ ص ۴۸۰) لکھتا ہے کہ ایک کو مناسب کرنے کے بعد معتصم نے دریافت کیا تھا کہ یونانی سلطنت میں کون سا شہر سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں نے عموریہ کا نام لیا تھا، جہاں اس وقت تک اسلامی فوج نہیں پہنچ سکی تھی۔

وہ حصہ دکھا دیا جو طغیانی کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا۔ معتصم نے محاصرہ کے تمام آلات فصیل کے اسی حصہ پر لگا دیے۔ یوتیوس خوب جانتا تھا کہ وہ شہر کو بہت دنوں تک محفوظ نہیں رکھ سکتا، اور چاہتا تھا کہ رات کو شہر کے دروازے کھول کر باہر آ جائے اور مسلمانوں کی صفوں کو چیرتا ہوا نکل جائے۔ مگر یوتیوس کی یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ قاصد جسے اُس نے اطلاع دینے کی غرض سے قیصر کے پاس بھیجا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ ادھر اسی وقت اس سپہ سالار نے جو شکستہ فصیل کی حفاظت پر مامور تھا، معتصم کے ساتھ خط و کتابت شروع کر کے لڑائی موقوف کر دی۔ مگر اس دوران میں مسلمان برابر فصیل شہر سے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ یونانی سپاہی اپنے افسر کے حکم کے منتظر بیٹھے تماشا دیکھا کیے۔ جب انھیں اُس کی غداری کا حال معلوم ہوا تو معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا، اور مسلمانوں کو پسپا کرنا ناممکن تھا۔ عرب بغیر کسی مزاحمت کے شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ یوتیوس نے بھی مقابلہ بیکار سمجھ کر ہتھیار ڈال دیے۔ اب مسلمان شہر پر قابض تھے، اور معتصم کو کوئی چیز بدقسمت شہریوں سے ان کے قیصر کی بداعمالیوں کا بدلہ لینے سے نہ روک سکتی تھی[۱]۔

---

[۱] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۷۶۔۱۰۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۲۔۲۶۴) نے فتح عموریہ کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں۔ عرب عیسائی غدار کا نام انھوں نے نہیں لکھا۔ مگر دوسرے غدار کا نام وندو یا ویدو بتایا ہے۔ بازنطینی مورخوں نے اس کا نام بودیس (Boidissa) لکھا ہے۔ اس سپہ سالار نے کاغذ کا ایک پرچہ مسلمانوں کے لشکر میں پھینک کر انھیں اس جگہ کی اطلاع دی تھی جہاں وہ متعین تھا، اور دعوت دی تھی کہ اسی جگہ پر حملہ کیا جائے۔ عربوں نے اس کا نام بالکل مسخ کر دیا ہے، مگر مسخ شدہ نام نہایت آسانی سے Boidises یا Woidises سمجھا جا سکتا ہے Simeon Magister: Geog. Monach دونوں نے اُس کا نام بودیس اور مینی کونیگس (Manicophagus) لکھا ہے۔ بربروس (Ber Herivaus) نے اسے بودن (Boden) لکھا ہے۔ عربوں نے غداری کا الزام ایک عیسائی پر رکھا ہے اور فتح شہر کو ایک غدار وندو یا ویدو سے منسوب کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس غداری کی خاص طور پر تشہیر کرنا چاہتے ہیں۔ بازنطینی مورخ بھی بودیس کی غداری کے قائل ہیں، اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ معتصم نے اُسے رشوت دی تھی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس اثنا میں جبکہ وندو معتصم کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا، عبدالوہاب بن علی نے جو مسلمانوں کا قریب ترین افسر تھا، شہر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یونانی ابھی خط و کتابت ہی میں مشغول تھے کہ مسلمان دھاوا کر کے شہر میں داخل ہو گئے، حالانکہ وندو کو حکم تھا کہ لڑائی روک دے۔ جب وندو نے یہ دیکھا تو اُس نے معتصم سے کہا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ معتصم نے کہا کہ تیری تمام آرزوئیں پوری کر دی جائیں گی۔ اس طرح مسلمان دھاوا کر کے شہر میں داخل ہوئے، اور ایک گرجا کو جسے عیسائی خاص طور پر مقدس سمجھتے تھے، آگ لگا دی۔ یونانی سپہ سالار تیتوس (Tatius) یا ایتوس (Aetius) نے بھی، جو اب تک ایک برج پر قابض تھا، ہتھیار ڈال دیے۔ خلیفہ نے اُسے تازیانہ کی سزا دی۔

عرب مورخ لکھتے ہیں کہ یہ محاصرہ صرف پچپن روز رہا تھا، اور اواخر شوال ۲۲۳ھ (۲۳ ستمبر ۸۳۸ء) کو شہر فتح ہوا۔ جن معزز خاندانوں سے زرِ فدیہ کی بڑی بڑی رقمیں وصول ہونے کی امید تھی انھیں گرفتار کیا گیا۔ عوام الناس میں سے جو ہتھیار اُٹھانے کے قابل تھے، قتل کیے گئے؛ اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ شہر عموریہ کو، مال و دولت سے خالی کرنے کے بعد آگ لگا دی گئی۔ معتصم موسمِ سرما کے آغاز سے قبل ہی شام کی طرف واپس ہوا۔ اس غیر معمولی واپسی کی وجہ یہ ہوئی، کہ اُس کے غیاب میں فوج نے اُس کے بھتیجے، عباس بن مامون کو خلیفہ بنانے کے لیے ایک سازش کی تھی۔ عرب مورخوں نے اس جنگ کے بعد معتصم اور بازنطینیوں کی کسی خط و کتابت کا ذکر نہیں کیا۔ یونانی مورخوں کے مطابق توفیل نے اب صلح کی درخواست کی تھی؛ لیکن معتصم نے جو شرائط پیش کی تھیں وہ ناقابلِ قبول تھیں۔ اسی وجہ سے قیدیوں کا تبادلہ بھی نہ ہو سکا۔ بازنطینیوں کی حالت اب ایسی تھی کہ وہ نئے سرے سے جنگ شروع بھی نہ کر سکتے تھے، حالانکہ آئندہ سال ان کی دوسری سفارت خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ مگر بے نیل مرام واپس ہوئی، اور صلح نہ ہو سکی[1]۔

قیصر کو فرنیک قوم سے مدد کی امید تھی، جو پوری نہ ہوئی، اور بذاتِ خود وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اکیلا جنگ جاری نہ رکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف معتصم اندرونی فسادوں کو دور کرنے میں مشغول تھا، اور طبرستان کے رئیس کے خلاف جنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔

---

[1] Theo Contin ص ۱۲۱، Cedren ص ۱۲۷، مجھے اس بیان کی صداقت میں بہت شبہ ہے۔ کیونکہ ابن اثیر اور ابن خلدون، جو ہمیشہ قیدیوں کے تبادلے کا ذکر کرتے ہیں، سب سے پہلے ۲۳۱ھ میں واثق کے عہد میں اس قسم کے تبادلے کا حال لکھتے ہیں۔ حالانکہ اس دوران میں مسلمانوں اور یونانیوں میں کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ عرب اور بازنطینی مورخوں کے اس متفقہ بیان کو دیکھتے ہوئے ہم کسی اور سند کو کوئی وقعت نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد ۸۴۲ء (۲۲۸ھ) میں ابوسعید نے یونانی علاقہ پر ایک یورش کی اور بہت سے قیدی پکڑ کر لے گیا۔ لیکن بعد میں ابوسعید کو یونانیوں نے گرفتار کر لیا، اور مرعش اور ملطیہ کے علاقوں کو پامال کر ڈالا۔ اس وقت توفیل نے ایک سفارت، بہت سے تحفے دے کر، خلیفہ کی خدمت میں بھیجی۔ گو اب بھی باقاعدہ طور پر قیدیوں کا تبادلہ نہیں ہوا۔ لیکن دونوں حکمرانوں نے محض اپنی خوشی سے ایک دوسرے کو بہت سے قیدی تحفے میں پیش کر دیے۔ ایک صلح نامہ بھی مرتب ہوا۔ لیکن یہ سب واقعات ۸۴۵ء (۲۳۱ھ) اور ۸۴۶ء (۲۳۲ھ) میں واثق اور تھیوڈورا کے عہد میں پیش آئے۔ عموریہ کے بیالیس شہدا کا تعلق ان واقعات سے نہیں ہے۔ لیکن یہ واضح ہونا چاہیے کہ روایت کے مطابق یہ شہدا سات برس، یعنی ۲۲۳ھ سے ۲۳۰ھ تک قید رہے تھے۔ تبادلے کے وقت غلطی سے بیالیس عیسائی باقی رہ گئے تھے۔ یہ یا تو قید ہی میں مر گئے، اور یا بوڈمیس کی خواہش پر اُس کے حوالے کر دیے گئے۔ اس طرح بیالیس شہدا کی حکایت مشہور ہو گئی۔

(جناب حاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے، پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(۳)

مولوی نور الحسن جولائی ۱۸۹۱ء سے کیننگ کالج لکھنؤ کے بی۔اے کلاس میں داخل ہوئے۔ قیصر باغ میں قیام بدستور تھا۔ منشی شیدا علی عباسی بھی ساتھ رہتے تھے۔ مولوی مقبول الدین علوی کاکوری سے مڈل پاس کر کے انٹرنس کی تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے اور منشی شیدا علی کے ساتھ اُن کی نگرانی میں رہے۔ وہ کاکوری کی قدیم تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے اور علم الانساب سیکھنے کا شوق تھا۔ مولوی نور الحسن اُن کی قابلیت بڑھانے کے لیے گھنٹوں اُن سے گفتگو کرتے اور انگریزی علوم کا شوق دلاتے تھے۔

کاکوری کے دو بگڑے ہوئے رئیس منشی امجد حسین اور منشی اصغر حسین (جو منشی عاشق علی خاں سفیر بادشاہ اودھ متعینہ دربار گورنر جنرل کے لائق صاحبزادے امیر حسن خاں تسکین حریف و ہم عصر غالب کے نواسے تھے اور کلکتہ میں تعلیم پاتے تھے) بزرگوں کی جائداد تلف ہونے کے بعد دو سال ہوئے وطن آئے تھے۔ امجد حسین نے انٹرنس پاس کر لیا تھا اور اصغر حسین نے بھی انگریزی اور اُردو ادب میں اچھی لیاقت پیدا کی تھی۔ علم مجلس میں دونوں بھائی ماہر کامل تھے اور موسیقی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ تاش کھیلتے۔ ٹانگیں ہلاتے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے اور گنگناتے جاتے تھے کہ "رات بالم ہم سے رُوٹھے"۔

دونوں بھائی لڑکپن میں مولوی نور الحسن کے جلیس و انیس تھے۔ کلکتہ سے واپس آئے تو اپنے قدیم دوست کے پاس اکثر آتے اور دل بہلایا کرتے تھے۔ منشی امجد حسین تھوڑے ہی عرصے کے بعد بھوپال چلے گئے اور ریاست میں ملازم ہو گئے لیکن منشی اصغر حسین مدت تک کاکوری میں مقیم رہے۔ کبھی لکھنؤ آتے تو مولوی نور الحسن سے گھنٹوں ادب اُردو اور انگریزی ناولوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ مولوی نور الحسن کاکوری جاتے اور یہ وہاں موجود ہوتے تو صبح شام ان سے پُرلطف صحبت رہتی تھی۔ اُنھوں نے رسالہ حَسَن حیدرآبادی میں اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھے تھے۔ اودھ پنچ کی نامہ نگاری کی تھی۔ کہتے تھے کہ کلکتہ کے بعض انگریزی اخباروں میں بھی مراسلات شائع کرائے تھے۔ ہر علم میں دخل ظاہر کرتے تھے اور مولوی نور الحسن کو بھی اُن سے بات چیت کے لیے ہمہ دانی کی ضرورت پیش آتی تھی۔ انگریزی ناولوں کے پڑھنے اور لٹریچر سے ذوق پیدا کرنے کے محرک اول اصغر حسین تھے اور اسی وجہ سے ان اوراق میں ان کا اسم گرامی درج کیا گیا۔
ایک جملہ معترضہ سُنیے کہ چند سال کے بعد منشی اصغر حسین کی زندگی میں انقلاب ہوا۔ تلاش معاش میں

راجپوتانہ گئے تھے۔ اجمیر پہونچ کر ایسی قلب ماہیت ہوئی کہ گھر بار چھوڑ عزیزوں دوستوں سے مُنہ موڑ کر چشتی چمن کی سرحلے میں فقیر بن بیٹھے۔ برسوں اُن کی خبر نہ ملی ۱۹۰۲ء میں راقم الحروف اجمیر گیا تو اُن کا نام سُنا۔ خدمت میں حاضر ہوا۔ تاریک کوٹھری میں برہنہ بیٹھے تھے۔ ستر کے لیے سوائے ایک کمبل کے کچھ نہ تھا۔ نہایت ضعیف دلاغر ہو گئے تھے۔ بال ''وبال'' سے بڑھے تھے اور ایک مجنوں یا وحشی کی سی صورت ہو گئی تھی۔ راقم کو فوراً پہچان لیا اور اپنے دوست مولوی نور الحسن کا حال دریافت کیا۔ بیس برس کے بعد دوبارہ ۱۹۲۲ء میں زیارت نصیب ہوئی۔ عزلت و خلوت ترک کر چکے تھے۔ ہندو ہوٹل اجمیر میں فروکش تھے۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی شروع ہو گئی تھی مگر ذوق تصوف بدستور تھا اور خواجہ غریب نواز کی ثنا وصفت سے عشق۔

راقم کی خاطر مدارات کی مگر بار بار اپنے دوست کا حال پوچھتے تھے۔ ایک حاضر مجلس سے فرمایا کہ میں اس شخص کی خاطر یوں کرتا ہوں کہ یہ میرے ایک مخلص رفیق کا بھانجا ہے اور میں نے اس لڑکے کو اپنے دوست کے ساتھ دیکھا ہے۔ ؎ گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری۔

قصہ مختصر۔ مولوی نور الحسن کالج میں پڑھتے تھے مگر صحت خراب تھی۔ نزلے کی شکایات مدت سے تھیں۔ مسوڑھے متورم ہو جاتے تھے۔ کئی کئی روز دانتوں میں سخت درد رہتا تھا۔ اب اس مرض کا دورہ جلد جلد ہونے لگا اور یہ عادت پڑ گئی کہ بغیر نشتر دیے درد کو سکون نہ ہوتا تھا۔ معدہ نہایت کمزور تھا۔ ریاضت کے لیے ٹینس کھیلنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور دو تین برس سے اس کی مشق کرتے تھے۔ کبھی کبھی مگدر بھی ہلاتے تھے لیکن تندرستی میں نمایاں ترقی نہ تھی۔ اسی زمانہ میں اُن کے چچا مولوی محمد احسن کا انتقال ہو گیا۔ وہ بھوپال سے بیمار ہو کر آئے اور ۸ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ کو (نومبر ۱۹۱۰ء کے دوسرے ہفتہ میں) بمقام کاکوری راہی جنت ہوئے۔

گفت دل ہر گہ کہ آمد در زوال آں آفتاب — مردہ در گوراست احسن زندہ در گور من[۱]

اس صدمے نے قلب و دماغ کو بھی کمزور کر دیا۔ مولوی محمد محسن اپنے عزیز بھائی کی خبر رحلت سن کر سخت بیمار ہوئے۔ زندگی کی آس نہ رہی۔ مولوی نور الحسن ان کی تیمارداری کے لیے مین پوری گئے اور یہ کاکوری میں تنہا تھے۔ منشی اصغر حسین روزانہ آتے اور خیالات تبدیل کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر ان کو قرار نہ آتا تھا۔ نہ کاکوری میں دل لگتا تھا نہ لکھنؤ میں اور اس سراسیمگی نے معدے کی حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی۔ دسمبر میں مولوی نظیر الحسن خلف مولوی محمد احسن مرحوم کی شادی قرار پائی اور ان کو تمام مراسم میں شریک ہونا پڑا۔ برات کے ساتھ بجنور گئے اور ثقیل غذائیں استعمال کرنے پر مجبور رہے۔ اس موقع پر اپنے ماموں زاد بھائی حاجی ذکی الدین کے

---

[۱] دوسرے مصرعے کے اعداد بقاعدۂ جمل ۱۷۴۴ ہیں۔ اس میں سے ''آں آفتاب'' کے اعداد یعنی ۴۲۵ منہا کیے جائیں تو ۱۳۲۰ حاصل ہوتا ہے اور وہی سنہ مقصود ہے۔

مشورے سے یہ طے کیا کہ معدے کی اصلاح اور نزلے کی شکایات دور کرنے کے لیے فنجرف کا تجربہ کرنا چاہیے
چنانچہ جنوری ۱۹۰۵ء میں کانپور جاکر یہ علاج کیا۔ گھی اور دودھ کثیر مقدار میں ہضم کرنے لگے۔ نزلے کی شکایت
گھٹی اور صحت نسبتاً درست ہوگئی۔

امیر اللغات کا دوسرا حصہ جس میں الف مقصورہ کے الفاظ مع مرکبات تھے اس سال شائع ہوا غور سے
پڑھا اور امیر مینائی کی موشگافیوں کی داد دی لیکن اُس پر کوئی ریویو نہیں لکھا۔ سارا وقت انگریزی ادب پر صرف
کرتے اور مغرب کی فلاسفی کا مشرق کے فلسفے سے موازنہ کیا کرتے تھے۔

کیننگ کالج میں مسلمانوں کا ایک جداگانہ لٹریری کلب تھا اور مولوی انوار الحسن ایک سال اُس کے
سکرٹری رہے تھے۔ یہ اُس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور انگریزی میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ گرمیوں
کی تعطیل میں حسب دستور مین پوری گئے اور جولائی ۱۹۰۶ء سے بی۔ اے کے دوسرے سال میں قدم رکھا۔ راجہ ہڑاہا
کا مکان سکونت کے لیے نہ مل سکا۔ نظیر آباد میں ایک نواب کی نظیر اکرایہ پر لے کر قیام کیا۔ شہر کا سیر و تماشہ چھوڑا
فرائض و نوافل موکدہ ۔۔ بعد جو وقت بچتا وہ کورس کی تیاری میں صرف کرتے۔ لسان ثانی ہنوز عربی تھی۔ "اقبال میڈل"
حاصل کرنے کی آس لگائے تھے کہ ایک سانحہ سخت پیش آیا۔ وچار ہوئے۔ اُن کے قدیم ہم سبق اور مخلص عزیز شیخ
اکرام علی اپنی ضرورتوں سے لکھنؤ آئے تھے۔ ناگاہ ہیضہ ہوا اور دو دن میں خلد کی جاگیر عنایت ہوگئی۔ نعش کے
ساتھ بجنور گئے اور عالم بدحواسی میں بار بار کہتے تھے کہ "زندگی بھر کے رفیق سے مفارقت ہوئی" ایں ماتم سخت
است کہ گویند جواں مرد۔

نظیر آباد والے مکان سے نفرت ہوگئی۔ اور عمارتیں اُٹھوا کر چودھری محمد عظیم تعلقدار سندیلہ کی عالی شان محلسرا
واقع قیصر باغ میں سکونت اختیار کی۔ رفع ملال اور تفریح خاطر کے لیے انگریزی اخبارات پڑھتے تھے۔ لیورپول
سے ایک نو مسلم انگریز نے اخبار جاری کیا تھا۔ اُسکو خرید کرتے اور من اولہ الی آخرہ پڑھتے۔ لاہور سے ایک
اسلامی اخبار انگریزی میں نکلنا شروع ہوا تھا اُس کے بھی خریدار تھے۔ ادب اُردو سے بالکل تعلق قطع کر لیا تھا۔
راقم الحروف اُس وقت مڈل کلاس میں تھا۔ اُس کو بھی اُردو کی کتابیں دیکھنے سے منع کرتے اور صحیح انگریزی
لکھنے کا شوق دلاتے تھے۔ چند ماہ کے بعد بی۔ اے کے امتحان کی فیس روانہ ہوئی اور انھوں نے طے کیا کہ کورس
کی تیاری کے لیے الٰہ آباد میں قیام کرنا چاہیے کیونکہ امتحان دینے وہاں بہر صورت جانا ہوگا اور قبل از وقت
پہونچنے سے یونیورسٹی کالج کے پروفیسروں کا انداز تعلیم معلوم ہوگا اور ممکن ہے کہ وہاں کے طلبا سے ایسی
معلومات دستیاب ہو جائیں جن سے امتحان کی کامیابی میں مدد ملے۔ چنانچہ آغاز بہار ۱۹۰۷ء سے
دونوں بھائی الہ آباد گئے اور چوک کے قریب بابو ...ان پرشاد وکیل کی کوٹھی میں فروکش ہو گئے۔

ہنومان پرشاد اُس وقت ہائیکورٹ میں درجہ اول کے وکیل تھے اور اُن کی شہر میں وہی قدر و منزلت تھی جو بعد کو بابو سندر لال یا موتی لال وغیرہ کو نصیب ہوئی۔ وہ مولوی محمد محسن کے قدیم دوست تھے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی صاحب کو بھی ایک اپیل کے سلسلہ میں الہ آباد جانے کی ضرورت ہوئی۔ وہ بھی اسی جگہ رونق افروز ہوئے۔ جلال آباد ضلع شاہجہانپور کے ایک صوفی مزاج مولوی عبداللہ خاں نام مدت سے مولوی محمد محسن کے متوسلین میں تھے۔ وہ بھی الہ آباد جانے لگے اور آقازادوں کی کامیابی امتحان کے لیے انھوں نے اعمال خوانی شروع کی۔

مولوی نورالحسن نے الہ آباد کالج کے طلبہ سے ملاقات پیدا کی اور وہاں کے پروفیسروں کی تعلیمات وہدایات سے فائدہ اُٹھایا۔ امتحان سے ایک دن قبل ہواخوری کے لیے خسروباغ گئے تھے۔ اثنائے راہ میں ایک سائل ملا۔ فطرتاً سخی تھے اور ردّ سوال گناہ تصور کرتے تھے۔ اُس کو خیرات دی۔ مولوی عبداللہ خاں نے خواب میں دیکھا کہ امتحان کا پرچہ اُس فقیر سے خرید لیا گیا۔ صبح کو یہ قصہ بیان کیا۔ سُننے والوں کا دل خوش ہوا اور اطمینان قلب کا ثمرہ جوابات کی تحریر کے وقت ظاہر ہوا۔

"دعا برائے تسکین قلب است۔ او سبحانہ تعالیٰ میداند کہ چہ می باید کرد"

دونوں بھائیوں نے پرچے بہ دلجمعی تمام حل کیے اور امتحان سے بخیریت فراغت ہوئی۔ مولوی محمد محسن مین پوری تشریف لے گئے اور یہ دونوں بھائی لکھنؤ آئے۔ یہاں نظیر آباد کی سڑک پر کرایہ کے مکان میں مولوی نظیرالحسن، منشی ناصر علی اور راقم الحروف ساکن گزیں تھے۔ وہیں تشریف لائے۔ منشی ناصر علی نے شکایت کی کہ امیر احمد نے دو مہینے سے کچھ نہیں پڑھا ہے اور آموختہ بھی فراموش کر دیا ہے۔ نہایت ناراض ہوئے۔ شاگرد کو اپنے ساتھ ناکوری لے گئے اور زجر و توبیخ کے بعد اُس سے امتحان مڈل کی تیاری کرائی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ خود روزہ رکھتے مگر دن کا بیشتر حصہ کورس یاد کرانے میں صرف کرتے تھے۔ انگریزی، تاریخ اور قواعد وجغرافیہ خود سُنتے اور دیگر مضامین کی بھی تاکید کرتے تھے مگر وہ بازی پسند اس قید میں بھی اُستاد کی آنکھ بچا کر لہو ولعب میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اُس کے دوست[1] گھات دیکھ کر آتے اور شطرنج کی دو ایک بازی کھیل جاتے تھے۔

عید کے بعد بی۔ اے۔ کا نتیجہ آیا۔ مولوی نورالحسن اور انوارالحسن دونوں کامیاب ہو گئے۔ سُنتے ہی

[1] اشارہ ہے منشی اعجاز حسین ناکوروی کی طرف جو اُس وقت تک وطن میں ایام گذاری کر رہے تھے۔ چند روز کے بعد وہ حیدرآباد پہونچے اور وہاں مدت سے سب جسٹرار ہیں۔ وہ بچپن سے شاعر تھے۔ اُن کی دلچسپ مثنوی "یاد وطن" مولوی نورالحسن کی اصلاح کے بعد شائع ہو چکی ہے۔ اُنھوں نے ابتداء میں مولوی محمد محسن سے بھی اصلاح لی تھی مگر بعد کو ہمیشہ اُستاد مرحوم کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔

سجدۂ شکر ادا کیا۔

امتحان کا وقت قریب آیا تو راقم کے ساتھ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ روزانہ امتحان کے پرچے نظر غور سے دیکھتے اور جوابات سن کر مسرور ہوتے تھے۔ ریاضی کا پہلا پرچہ بگڑ گیا تو جس قدر افسوس شاگرد کو تھا اُتنا ہی شفیق استاد کو بھی ہوا۔ فرمایا کہ خدا کرے دوسرا پرچہ آسان ہو ورنہ کامیابی کی توقع نہیں۔ اُن کی دعا قبول ہوئی۔ دوسرے پرچے کے جوابات شافی دیے گئے اور استاد کے دل کو صبر آیا۔

منشی ارتضا علی شررؔ کاکوروی۔ مولوی نور الحسن کے عزیز۔ ہم سن اور دوست اُس وقت لکھنؤ میں انسپکٹر آبکاری تھے۔

توبہ توبہ سے شعر کریں توبہ اور خدمت ہو آبکاری کی

وہ روزانہ تشریف لاتے اور اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ ۔ قم الحروف کے امتحان کا زمانہ تھا اسلیے جب وہ غزلخوانی شروع کرتے تو یہ کمرہ سے ہٹا دیا جاتا تھا تاکہ پڑھنے میں ہرج نہ ہو مگر یاد ہے کہ ایک دن اُنھوں نے غزل سنائی تھی جس کا مطلع تھا:۔

جا بجا آپ رقیبوں کو بٹھاتے آئے آج آئے بھی تو اک آگ لگاتے آئے

اور یہ شعر بھی سنایا تھا۔

لیا ہے دل تو نہ اب فکر کرو جگر کے لیے بس ایک داغ یہ کافی ہے عمر بھر کے لیے

شررؔ بڑے ذہین۔ تیز طبع اور نازک خیال تھے۔ داغؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے مگر شروع میں چند غزلیں جلالؔ لکھنوی اور امیرؔ مینائی کو بھی دکھائی تھیں۔ چند سال کے بعد وہ "باغی بارہ" اور "پیاری برسات" وغیرہ مسلسل نظمیں لکھ کر تمام اودھ میں مشہور ہوئے لیکن اُس وقت تک اُن کی شاعری اور سخن سنجی کی دھوم نہ تھی۔ وہ "اودھ پنچ" کی نامہ نگاری کرتے تھے مگر بیشتر مضامین گمنام شائع ہوتے تھے اس لیے ملک کو اُن کی طبیعت کی خبر نہ تھی۔

اسی زمانہ کے قریب اودھ پنچ میں "عشق سہ ارانی" کا ایک قصہ شائع ہوا تھا اور اُس کا یہ شعر بہت مشہور ہو گیا تھا:۔

ماہ نو تجھ کو دُمدار ستارہ چھاتا مشتری پر تمھیں سرکار مبارک باشد

شررؔ نے اقبال کیا کہ یہ مشہور مضمون اُنھیں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور استاد نے ظرافت کی داد دی۔

الغرض امتحان سے فراغت کے بعد راقم کو ہمراہ لے کر مین پوری تشریف لے گئے اور امتحان وکالت ہم

۱؎ ولادت [illegible] وفات ۲۰ اگست ۱۹۲۱ء مطابق ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ۔ مدفن سیتاپور متصل عیدگاہ

شرکت کے لیے پروگرام بنانے لگے۔ بی اے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قانون کے درجہ میں حاضری دی تھی مگر امتحان ایل ایل بی میں شریک ہونے کے لیے جس قدر فی صدی حاضری درکار تھی وہ پوری نہ ہوئی تھی اس لیے خیال تھا کہ ایک سال اور لکھنؤ میں قیام کرنا ہوگا۔ بقرعید کے دن ۲۵ر جون کو مڈل کا نتیجہ آیا۔ گزٹ خود ہی کھولا اور اپنے شاگرد کا نام اس میں دیکھ لیا تب گزٹ دوسروں کو چھونے دیا۔ لڑکے کی پہلی کامیابی تھی سب اعزہ مسرور ہوئے مگر مولوی نورالحسن کے چہرے پر وہ بحالی تھی جو خود اُن کے بی اے پاس ہونے کے دن دیکھی گئی تھی۔

وسط جولائی میں لکھنؤ پہنچے۔ قیصر باغ میں شیخ اکرام علی تعلقدار رسید نپور کا مکان قیام گاہ ہوا۔ ہفتہ میں دو تین بار قانون کا لیکچر سننے ایک گھنٹے کے لیے کالج جاتے تھے۔ وہاں تعلیم کچھ نہ ہوتی تھی۔ نہ استاد کوشش کرتا تھا کہ طالب علم پڑھیں نہ شاگرد چاہتے تھے کہ وہ کچھ سیکھیں۔

ہو رہی ہے بحث واں اسلام کے قانون کی　　　　چھڑ گئی ہے یاں کسی کافر کی رنگیں داستاں
کر رہا ہے شرح قانون شہادت لیکچرر　　　　یاں ہے تیغ غمزہ سے دل کی شہادت کا بیاں

طلبا کو صرف حاضری کی مقررہ تعداد پوری کرنے کی فکر رہتی تھی۔

حاضری کے "پی" کی ہے اُن کو رجسٹر میں تلاش　　　　ہیں یہ قانونی پپیہے بولتے ہیں "پی کہاں"

مولوی نورالحسن بیشتر وقت انگریزی ادب کی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ انجمن تعلقداران اودھ کی طرف سے ایک انگریزی اخبار نکلتا تھا اُس میں اپنے مضامین چھپواتے تھے۔ اُس زمانہ میں بحث چھڑی ہوئی تھی کہ سول سروس کا امتحان ہندوستان اور انگلستان میں بیک وقت ہوا کرے۔ مولوی نورالحسن اس تجویز کو مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے تھے اور ایک مدلل مضمون اس کے خلاف "ایکسپریس" میں شائع کرایا تھا۔

خان بہادر منشی اطہر علی[1] کاکوروی لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور اُس وقت شہر کے اول درجہ کے وکلاء میں اُن کا شمار تھا۔ انجمن تعلقداران اودھ کے مشیر قانونی تھے۔ نازک خیالی اور دیانت داری میں اقران و اماثل سے سبقت لے گئے تھے۔ مثنوی مولانا روم سے ذوق تھا اور کیمیائے سعادت اکثر پڑھا کرتے تھے۔ لڑکوں کو جھوٹ بولنے سے منع کرتے اور ہر خویش و بیگانہ کو مذہبی پابندی، صدق و خلوص کی نصیحت کیا کرتے تھے۔

مولوی نورالحسن سے رشتہ داری تھی۔ وہ گاہ گاہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور اُن کی بیش بہا تعلیمات سے فیضیاب ہوتے تھے۔

---

[1] ولادت۔ شوال ۱۲۶۱ھ　وفات ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۱ھ۔ بمقام مدینہ طیبہ۔ کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ فرماتے ہیں :-

ہر گھر میں روشنی ہے ترے ہی جمال کی　　　　ڈھونڈوں میں تجھ کو اے مہ کامل کہاں کہاں

اُن کا دسترخوان وسیع تھا اور کوٹھی مہمان خانہ۔ مولوی نورالحسن کے ایک عزیز مولوی سمیٰ علیؔ اسی خوانِ نعمت سے مستفید تھے۔ وہ جوبلی اسکول کے سیکنڈ کلاس میں راقم کے ہم سبق تھے اور لسان ثانی عربی تھی۔ مولوی نورالحسن شام کے وقت روزانہ اُن کو الف لیلہ عربی جس کا ایک حصہ اُن کے کورس میں تھا پڑھایا کرتے تھے۔

مولوی مقبول الدین کا نام ان اوراق میں پہلے آچکا ہے وہ بھی اسی مہمان سرا میں مقیم تھے۔ ایف اے میں پڑھتے تھے۔ قدیم تعلقات کی وجہ سے اکثر مولوی نورالحسن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ سائنس پڑھتے تھے اور عقائد میں خلل کا خطرہ تھا۔ مولوی نورالحسن اُن کو فہمائش کرتے اور مذہبی پابندی کا شوق دلایا کرتے تھے۔

مولوی محمد محسن کی مثنوی "شفاعت و نجات" منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کے مطبع شام اودھ میں چھپ رہی تھی۔ اُس کی کاپی اور پروف کی صحت مولوی نورالحسن کے سپرد تھی اس وجہ سے منشی سجاد حسین سے اکثر ملاقات ہوتی اور ذوقِ ادب تازہ ہوتا تھا۔

غرض لکھنؤ میں ایام گذاری ہو رہی تھی کہ وسط ستمبر ۱۸۹۳ء میں مولوی نورالحسن کی والدہ بیمار ہوئیں دس بارہ دن علیل رہ کر ستمبر کے آخری ہفتہ میں عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں۔

پنجشنبہ ہفدہ از ماہ ربیع اولیں — شد جناب والدہ راہی سوے دارالسلام
بود بر اوج جلال و مکرمت مہر منیر — بر سر افلاک مہر مرحمت ماہ تمام
ہر دم از یاد خدا اندر رکوع و در سجود — دیدہ گریاں قلب بریاں اشک ریزاں صبح و شام
ہاتفے تاریخ رحلت گفت از نورالحسن — جانِ پاک او بود خلد آشیاں والامقام

والدہ کی موت نے لکھنؤ کی زندگی بے لطف کر دی۔ طبیعت کی افسردگی سے صحت خراب ہوئی۔ شنجرت دوبارہ استعمال کیا مگر اب کے سود مند نہ ہوا۔ لا کلاس کی حاضری پوری ہو چکی تھی امتحانِ وکالت کی تیاری کے لیے مین پوری سے بہتر مقام نہ تھا کیونکہ وہاں والد ماجد سے قانون کے دقائق بہ آسانی حل کیے جا سکتے تھے۔ لہٰذا دسمبر ۱۸۹۳ء میں لکھنؤ چھوڑا اور شروع ۱۸۹۴ء سے قانون کی کتابیں دیکھنے کا آغاز کیا۔

امتحان وکالت کی تیاری | مولوی محمد محسن عرضی نالش۔ بیان تحریری۔ موجبات اپیل وغیرہ صاحبزادوں سے لکھواتے۔ فرضی مسلیں مرتب کراتے اور قانون شہادت کی باریکیاں زود فہم مثالوں سے سمجھاتے تھے۔

سلہ وہ منشی اطہر علی کے ماموں زاد بھائی حکیم حبیب علی کے صاحبزادے تھے۔ حکیم صاحب کا اسم مبارک ابتدائی اوراق میں آچکا ہے۔ مولوی سمیٰ علی ۸ر نومبر ۱۸۶۸ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۲۳ء کو انتقال کیا۔ وہ نسب نامۂ مخدوم زادگان کاکوری موسوم بہ "نفحات النسیم فی تحقیق اولاد عبدالکریم" کے مؤلف تھے اور راقم الحروف کے مخلص خیر طلب دوست تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بیشتر وقت ضابطہ دیوانی کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا مگر فرصت کے اوقات میں انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں پڑھتے انگریزی کے مشہور رسائل دیکھتے اور لاہور کے "مسلم آبزرور" کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے۔

اُن کو تعلیم اطفال کا بہت شوق تھا۔ زندگی کا شاید ہی کوئی سال ایسا گذرا ہو جس میں کوئی نو عمر بچہ تربیت کے لیے اُن کی نگرانی میں نہ ہو۔ تعلیمی مسائل سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ عربی کا درس نظامیہ پسند نہ تھا۔ منطق میں وقت صرف کرنا تضیع اوقات تصور کرتے تھے۔ مولوی شبلی نعمانی نے اسی زمانہ میں ندوۃ العلما کے لیے ایک جدید کورس تجویز کیا تھا اُس کے مداح تھے اور چاہتے تھے کہ اسی طرز پر اُن کے فرزندوں کی تعلیم ہو۔ امیر احمد اب مشن اسکول مین پوری میں پڑھتا تھا اُس کو زیادہ امداد کی ضرورت نہ تھی۔ مولوی نظیر الحسن عم مکرم کی خدمت میں حاضر رہتے اور عدالتی کارروائی سے واقفیت پیدا کرتے تھے لہذا اس سال سے اُنھوں نے اپنی چھوٹی ہمشیر کے لڑکے وزیر احمد[1] کی تعلیم اپنے ذمہ لی۔ اُس کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہو چکی تھی مگر ہنوز انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ فارسی کی استعداد بھی تھوڑی تھی مگر کیمیا ساز اُستاد نے چند روز میں مس خام کو کندن بنا دیا۔ آج وہ صاحبزادہ گریجویٹ ہے اور درجہ اول کا تحصیلدار!!

اکتوبر ۱۸۹۴ء میں کاکوری تشریف لے گئے اور راقم کی تقریب عقد[2] میں شریک ہوئے۔ مراسم شادی سے فراغت کے بعد شاگرد کو مین پوری واپس کیا اور خود وطن میں مقیم رہے۔ چند ہفتوں کے بعد دونوں بھائی الٰہ آباد گئے۔ ایل ایل بی کا امتحان دیا مگر "اصول قانون و انصاف" کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں فیل ہو گئے۔ اور ۱۸۹۵ء کے آغاز سے دوبارہ امتحان کے لیے تیاری شروع کی۔

آپ کے بڑے صاحبزادے مولوی احمد حسن اب نو دس برس کے تھے اور ہنوز کاکوری میں مولوی سید اسد خاں جلال آبادی سے پڑھتے تھے۔ مولوی انوار الحسن کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد حسن جو اپنے چچا زاد بھائی احمد حسن سے پانچ مہینے چھوٹے تھے وہ بھی اُن کے ہم سبق تھے۔ اب یہ دونوں لڑکے مین پوری بلا لیے گئے اور مولوی نور الحسن کی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی۔

مولوی محمد محسن کے دو بھانجے شیخ ابو الحسن اور عزیز الحسن (پسران شیخ مہدی علی صدیقی بجنوری) بھی تربیت کے لیے ان کے سپرد ہوئے۔ شیخ ابو الحسن بدو فطرت سے گونگے تھے۔ مولوی محمد محسن کی نگرانی میں انکو لکھنا پڑھنا سکھلایا گیا۔ وہ نستعلیق میں خوش نویس ہوئے اور اپنے دیہات کا حساب کتاب دیکھنے سمجھنے کے چند سال میں قابل ہو گئے۔

---

[1] منشی وزیر احمد بن حاجی رشید الدین علوی کاکوروی۔ تاریخ ولادت ۳۔ ذی قعدہ ۱۲۹۹ھ روز یکشنبہ مطابق ۷ر ستمبر ۱۸۸۲ء۔

[2] تاریخ عقد ۱۸ر اکتوبر ۱۸۹۴ء مطابق ۷ر ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ۔

شیخ عزیز الحسن۔ مولوی احمد حسن و محمد حسن کے ساتھ عربی اور فارسی کی تعلیم میں شریک ہوئے اور چند روز کے بعد انھیں کے ساتھ انگریزی پڑھنے لگے۔ مختلف مولوی اور ماسٹر یکے بعد دیگرے مقرر کیے گئے لیکن اخلاق و عادات کی نگرانی مولوی نور الحسن بذات خاص کرتے تھے۔

مولوی محمد حسن کے پھوپھی زاد بھائی حکیم محب علی کے دو صاحبزادے منشی منظور علی اور مشکور علی اس زمانہ میں زیر تعلیم تھے۔ ان میں سے شیخ منظور علی سرکاری مدرسہ میں پڑھتے۔ اور انگریزی میں مدد لینے مولوی نور الحسن کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ اور مشکور علی۔ احمد حسن وغیرہ کے مولوی سے فارسی پڑھتے تھے۔

غرض اس زمانہ میں چھ لڑکوں کی تربیت اُستاد مرحوم کے سپرد تھی۔ خود قانون کے یاد کرنے میں مصروف رہتے اور اس قدر فرصت نہ پاتے تھے کہ ان سب لڑکوں کی طرف کافی توجہ کر سکیں۔ ایک خیر اندیش نے شکایت کی کہ آپ نے جس قدر کوشش امیر احمد کی تعلیم میں کی اتنی اپنے لڑکوں کے لیے کیوں نہیں کرتے تو ارشاد ہوا کہ "امیر احمد اکیلا تھا۔ اس وقت چھ سات لڑکے میرے سپرد ہیں۔ اگر ان سب کا سبق روزانہ سنوں تو اپنا کام سب کر دوں"

باایں ہمہ نگرانی میں کوتاہی نہ تھی۔ خبر گیری رکھتے تھے کہ لڑکے لہو و لعب میں وقت ضائع نہ کریں۔ نماز پنجگانہ ادا کریں۔ صبح کو تھوڑی دیر تلاوت کلام مجید کریں۔ اور رات کو نو بجے سے پہلے بستر پر نہ جائیں۔ اس زمانہ میں محلسرا کا زنانہ حصہ خالی تھا۔ امیر احمد۔ وزیر احمد اور نظیر حسن وغیرہ اُس حصہ میں رہتے تھے۔ رات کو نو دس بجے یکایک اُس طرف تشریف لاتے اور لڑکوں کے شوق کی جانچ کرتے تھے۔ اگر دیکھتے کہ لڑکے پڑھتے نہیں بلکہ باتیں کر رہے ہیں یا سو رہے ہیں تو سخت زجر و توبیخ کرتے تھے۔ احمد حسن وغیرہ کا سبق بھی گاہ گاہ سنتے۔ اور مولویوں کو ضروری ہدایتیں فرمایا کرتے تھے۔

اس نگرانی سے سب شاگردوں کو فائدہ پہونچا۔ امیر احمد انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوا حالانکہ اُس سال مشن ہائی اسکول مین پوری سے سوائے اُس کے کوئی دوسرا طالب علم انٹرنس میں پاس نہ ہوا تھا۔ نتیجہ دیکھ کر فرمانے لگے کہ "اس کی ابتدائی تعلیم کام آئی ورنہ مدرسہ کی حالت تو اس شرمناک نتیجہ سے ظاہر ہے"

دوسرے شاگردوں نے بھی لیاقت و قابلیت میں ترقی کی۔ مگر خود اُستاد قانون پر زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ چھوٹے بھائی دسمبر ۱۸۹۵ء میں ایل ایل بی ہو گئے مگر وہ ناکام رہے۔ امتحان دینے الہ آباد گئے تھے۔ وہیں سے دگنڈھ ضلع الہ آباد میں اپنے شیخ سلسلہ حضرت شاہ باسط علی قلندر کے مزار پر حاضری دی۔ واپسی کے وقت اجمیر شریف کی زیارت سے فیض اندوز ہوئے۔ روحانی برکتیں شاید حاصل ہوئی ہوں لیکن کوئی مادی نفع ظاہر نہ ہوا۔

امتحان میں فیل ہونے کا سخت قلق تھا۔ صحت پہلے ہی خراب تھی۔ دانتوں اور مسوڑھوں میں درد کا دورہ تقریباً ہر ماہ ہوتا تھا۔ قبض دائمی تھا۔ اب ناکامی کے رنج نے قلب و دماغ دونوں مضمحل کر دیے۔ کتب بینی ترک کی اور احباب کی صلاح سے تفریح طبع کے لیے موسیقی کا شوق پیدا کیا۔ قانون ستار کا ایک ماہر استاد نوکر رکھا اور اپنا بیشتر وقت ہارمونیم کی مشق میں صرف کرنے لگے۔ چند روز میں اصطلاحات فن پر عبور ہو گیا اور ہارمونیم کے اصول و قواعد سے کماحقہ واقفیت۔

کہا جا سکتا ہے کہ ان کے زائچہ ولادت کے خانۂ پنجم میں عطارد اور زہرہ کا اجتماع تھا اس لئے موسیقی کی طرف رغبت ہوئی لیکن دقیقہ شناس سمجھتے ہیں کہ کارکنان ازل نے شاعر و ادیب بنا کر بھیجا تھا۔ زبان کی اہم بالشان خدمت ان کے ہاتھوں مقدر تھی۔ کلام میں روانی نغمہ سے آشنائی کے بغیر نہیں آتی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ان کو موسیقی کا ماہر بنایا جائے اور نغمہ و سرود سے ذوق پیدا کرایا جائے۔ وہ پابند شریعت، متقی اور پرہیزگار تھے۔ شباب کے وقت محفل رقص و سرود سے احتراز کا عہد کر چکے تھے۔ اعزہ اور احباب کے یہاں بھی باوجود اصرار شدید کے ناچ کے جلسوں میں شریک نہ ہوتے تھے اس لئے ان کو موسیقی سے لطف اندوز بنانے کی بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ وہ امراض گوناگوں میں مبتلا کیے جائیں اور دوا کے طور پر سرود و نغمہ کا چاشنی خور بنایا جائے۔

گر خضر در بحر کشتی را شکست صد درستی در شکست خضر ہست
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد آنچہ در وہمت نیاید آن دہد

مولوی انوار الحسن نے وکالت شروع کر دی اور والد ماجد کا کام سنبھالا۔ یہ مکان پر تنہا رہتے اور ہارمونیم سے وقت بچتا تو انگریزی ناول اور رسالے پڑھا کرتے تھے۔

بدایوں کے ایک موزوں طبع رضی الدین نام تحصیل مین پوری میں قانونگو تھے۔ وہ اکثر خدمت میں حاضر رہتے اور اپنا نعتیہ کلام سنایا کرتے تھے۔

محکمۂ نمک کے ایک خوشرو نوجوان انسپکٹر بھی اکثر تشریف لاتے تھے۔ وہ شہر کی ایک پردہ نشین شریف زادی پر عاشق تھے۔ لڑکی تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھی۔ انسپکٹر صاحب سے خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ ایک محبت نامہ میں عاشق نے لکھا تھا۔

خون جب تھوکتا ہوں بوئے حنا آتی ہے جس پہ پستی تھی تری مہندی وہی دل ہے تجھے

شعر میں معنی ہوں یا نہ ہوں مگر وصف یہ تھا کہ ایک مصرعے میں معشوقہ اور دوسرے میں معشوقہ کی ہمشیرہ کے خوبصورت ناموں کا ایک ایک حصہ نظم ہو گیا تھا۔

وہ مولوی نورالحسن کو اپنی داستان عشق سُناتے اور معاملات محبت کے رو براہ ہونے کے لیے مشورے طلب کیا کرتے تھے۔ اُستاد مرحوم شکستن خاطر احباب گناہ سمجھ کر صلاح نیک سے دریغ نہ کرتے تھے۔ انجام یہ ہوا کہ دوستوں کی سعی مشکور ہوئی اور عاشق و معشوق کا نکاح ہو گیا۔

۱۸۹۶ء قریب ختم کے آیا مگر موسیقی سے سیری نہ ہوئی تھی۔ امتحان وکالت کے لیے فیس روانہ کرنے سے انکار کیا۔ والد ماجد نے ارشاد فرمایا کہ "ایل ایل بی کے لیے تیار نہیں ہو سکتے ہو تو پلیڈر شپ کے امتحان میں جو نسبتاً آسان ہے شریک ہو جاؤ" مگر یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور خرابی صحت کے باعث زیادہ اصرار بھی نہیں کیا گیا۔

اس عرصہ میں ترکی اور یونان کی لڑائی شروع ہوئی۔ روزانہ اخبارات پڑھتے اور ترکی افواج کی کامیابی پر اظہار مسرت فرماتے تھے۔

معمول تھا کہ گرمیوں کی تعطیل میں راقم حروف مین پوری جاتا تو اُس سے گھنٹوں جرح کر کے مختلف حیلوں اور منطقی چالوں سے شاگرد کی اخلاقی حالت، مذہبی پابندی اور انگریزی قابلیت کی جستجو کیا کرتے تھے۔ اُس سال راقم کے چند مضامین لکھنؤ کے بعض اخبارات میں شائع ہوئے تھے جس سے بعض بزرگان وطن کی اہانت ہوتی تھی لہذا زبان قلم پر قابو رکھنے کی نصیحت کرتے اور ملال آفریں مضمون نگاری سے منع فرماتے تھے۔ راقم کو تاریخ گوئی کا شوق تھا اُن کے اشارے سے ترکوں کی کامیابی پر ایک مصرعہ تاریخ کہا گیا۔

"ہلال تیغ چمکا بدر میں گویا محمدؐ کا"

مگر اُس میں ۹۹ کا تخرجہ تھا۔ اگر تاریخ پوری کی جاتی تو مصرعہ ناموزوں ہوا جاتا تھا۔ مولوی محمد محسن سے عرض کی گئی۔ اُنھوں نے اس خوبی سے تضمین کی کہ تخرجہ پر لطف ہو گیا۔ سُنیے :

طلب ہے جنگ کا تاوان یوناں سے یہ مشکل ہے　　خزانہ میں نہیں اک روپیہ باقی کسی مد کا

کہیں ننانوے کی پھیر سے تاریخ یونانی　　ہلال تیغ چمکا بدر میں گویا محمد کا

قطعۂ تاریخ کے دوسرے اشعار نقل کرنا بے سود ہے لیکن ایک شعر اور لکھ دینا چاہیے کیونکہ اُس کے بغیر مصرعۂ تاریخی کا لطف آشکارا نہیں ہوتا۔

ہلالی معرکہ ہے شہ کا لا یعلو ولا یعلیٰ　　ہے رشتہ معرکہ سے بدر کے جس کے اب و جد کا

"ایکمین یونین کلب" نام ایک دارالتفریح مین پوری میں مدت سے قائم تھا۔ وہاں مولوی نورالحسن بھی ٹینس کھیلنے جاتے تھے۔ اُس کے علمیہ مذاکروں میں شریک ہوتے اور انگریزی میں تقریریں کیا کرتے

تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی شصت سالہ جوبلی کا جشن ہوا۔ اُس میں بھی انگریزی حکومت کے برکات پر ایک معنی خیز تقریر کی۔ صحت کسی قدر بہتر ہوئی۔ دماغ میں قوت آئی تو دوبارہ قانون کی طرف توجہ مبذول کی۔ ہارمونیم چھوڑا اور سارا وقت کتابوں کی ورق گردانی میں صرف کرنے لگے۔ تیسری بار امتحان وکالت میں شرکت کا عزم بالجزم کیا۔

بیٹھے ہیں تو اک روز پلٹ جائے گا پانسہ　　ہمت نہیں ہارا ہے دل زار ابھی تک

دسمبر ۱۸۹۹ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور طالب علمی کا عہد ختم ہوا۔

پیشۂ وکالت کا آغاز

موسم بہار ۱۹۰۰ء سے وکالت شروع کی۔ چھوٹے بھائی سال ڈیڑھ سال سے عدالت دیوانی میں کام کرتے تھے اور والد ماجد کے موکل ان کے ثنا خواں تھے۔ یہ فوجداری کے مقدمات کی پیروی کرنے لگے اور حکام ضلع سے میل جول بڑھایا۔

سید زین الدین ایم اے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو کر مین پوری آئے۔ علی گڈھ کالج کے گریجویٹ سرسید کے دست راست کے فرزند اور صوم وصلوٰۃ کے پابند!! ان کی مذہب پرستی اور خوش اعتقادی کا شہر میں شہرہ ہوا۔ مولوی نور الحسن سے دوستانہ مراسم ہوئے روزانہ ایک دوسرے سے ملاقاتیں ہونے لگیں مگر وکالت میں کامیابی نہ ہوئی اور پیشہ میں فروغ حاصل نہ ہوا۔

مولوی انوار الحسن مین پوری کی کساد بازاری سے دل برداشتہ ہو کر جنوری ۱۸۹۹ء میں لکھنؤ چلے گئے اور یہ دیوانی عدالت میں بھی حاضری دینے لگے۔

راقم الحروف اُسی سال بی اے پاس ہوا تھا۔ ملازمت کی جستجو میں مین پوری گیا۔ اُنھوں نے نوکری کی تلاش سے منع کیا اور قانون یاد کرنے کی صلاح دی۔ ضابطۂ دیوانی کے دلچسپ نکتے بیان فرماتے اور طرح طرح سے پیشۂ وکالت کے محاسن دکھاتے تھے مگر "با سیہ دل چہ سود گفتن وعظ" شاگرد پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس نے مولوی محمد محسن سے علم جفر کا درس لیا اور حکام کو مسخر کرنے کے اعمال سیکھے۔ وہ لکھنؤ واپس جانے لگا تو ضابطۂ دیوانی یاد کرنے اور ہائیکورٹ کے امتحان میں شریک ہونے کی فہمائش کی۔ شفقت ومحبت سے حصول دولت کا ایک عمل "شجرۂ زر" نام جو اُن کو مارہرہ ضلع ایٹہ کے ایک بزرگ شاہ ابو الحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ سے ہدیتاً پہونچا تھا رخصت کے وقت مرحمت فرمایا۔ اُس عمل کے خاتمہ پر تحریر تھا "برخوردار نور الحسن را زکوٰۃ معاف کردہ شد۔ اگر دیگرے راہ بند زکوٰۃ معاف نہ کنند" ارشاد فرمایا کہ تم کو اس عمل کی زکوٰۃ دینا چاہیے لیکن اس قدر محنت نہ ہوسکے تو بغیر زکوٰۃ کے ہی اس کو پڑھا کرو۔ افسوس ہے کہ راقم اس بیش بہا عطیہ سے اپنی کاہلی

اور آرام پسندی کے باعث کبھی مستفید نہ ہوا۔

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل کہ خضر از چشمۂ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

اُس وقت تک مین پوری میں ریل نہ تھی۔ اٹاوہ شکرم پر جانا ہوتا تھا اور وہاں سے ٹرین ملتی تھی۔ مولوی نظیر الحسن مین پوری میں مقیم تھے۔ اپنے لڑکپن کے دوست کو رخصت کرنے شکرم کے اڈے تک آئے اور دعا دی کہ جس طرح امتحانات میں پاس ہوئے ہو ویسے ہی حصولِ ملازمت میں بھی کامیابی ہو۔ شکرم روانہ ہوئی تب اُنھوں نے واپسی کے لیے مُنھ پھیرا اور اُس محبت کرنے والے دوست سے راقم کی یہی آخری ملاقات تھی۔ دوسرے ہی مہینہ میں ۷ ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸ اپریل ۱۸۹۹ء کو تین روز بیمار رہ کر وہ فرشتہ صفت رفیق ملاءِ اعلیٰ میں منزل نشین ہو گیا۔

نہ تھے تیرے مرنے کے یہ دن نظیر خدا جانے کس کی نظر کھا گئی[1]

اس سانحۂ جاں فرسا نے اعزہ و اقارب کا دل ہلا دیا۔ چچا دل خستہ اور نیم جاں ہو گئے۔ مولوی نور الحسن بمشکل ہوش و حواس درست رکھ سکے۔ حیاتِ مستعار کی بے اعتباری دل پر نقش ہوئی اور بندگیِ حق کا شوق بڑھا۔

والد ماجد وکالت ترک کر چکے تھے پر موکلوں کے اصرار سے با دلِ ناخواستہ کچہری جاتے اور مقدمات کی پیروی کرتے تھے۔

حضرت اکبر حسین الہ آبادی ڈسٹرکٹ جج ہو کر مین پوری آئے۔ خود سخن گو سخن فہم اور مولوی محمد محسن کے قدر شناس تھے۔ کئی بار مداحِ رسول کی زیارت کے لئے دولت کدہ پر تشریف لائے۔ وہ بھی بازدید کے لئے اُن کی کوٹھی جاتے اور اپنے بیٹے پوتوں کو بھی لے جاتے تھے۔ اکبر مرحوم بڑے دیندار تھے اور فقہ پر عبور رکھتا تھا۔ مولوی احمد حسن خلف مولوی نور الحسن اُس وقت شرح وقایہ پڑھتے تھے اُن کا دینیات میں امتحان لیا اور لڑکے کی ذہانت کی باپ دادا سے تعریف کی۔ کبھی کبھی مولوی نور الحسن کو اپنا تازہ کلام سُناتے اور اُن سے "شفاعت و نجات" کے اشعار سُنا کرتے تھے۔

مولوی نظیر الحسن کی جوانا مرگی کا غم فراموش نہ ہوا تھا کہ ۱۰ شعبان ۱۳۱۷ھ (دسمبر ۱۸۹۹ء) کو اُن کی ہمشیرہ یعنی اہلیہ مولوی نور الحسن کا انتقال ہو گیا۔ دو لڑکے احمد حسن، حامد حسن اور دو لڑکیاں اس بطن سے یادگار رہیں۔ چھوٹی لڑکی شیر خوار تھی اور اُن کے وداع کے وقت صرف ۲۰ یا ۲۲ دن کی تھی۔ اُس کی پرورش مولوی محمد احسن مرحوم کی بیوہ (یعنی لڑکی کی نانی) نے اپنے ذمہ لی۔

---

[1] دوسرے مصرعہ کے آخری چار لفظوں سے تاریخ نکلتی ہے یعنی "کس کی نظر کھا گئی" = ۱۳۱۶ھ

مولوی نورالحسن اس مصیبت سے سراسیمہ و بدحواس ہو گئے۔ خانہ ویرانی کی آفت ناقابل برداشت ہے اوراس زحمت و کلفت کا صحیح اندازہ وہی کر سکتا ہے کہ ہمیں مصیبت گرفتار آید۔

اُن کی صورت دیکھ کر جیتے تھے تم تو لے جلیل   اب کھو گیا دل یہ گزری اُن کا مدفن دیکھ کر

بھائی بہنوں نے نکاح ثانی کے لیے اصرار شروع کیا۔ یہ اولاد کو تکلیف پہونچنے کا اندیشہ ظاہر کرتے اور جدید ذمہ داری سے انکار کرتے تھے۔ آخر کار والد ماجد کو دخل دینا پڑا اور اُن کے حکم سے مجبور ہو کر ازدواج پہ راضی ہوئے۔

۲۴, رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو منشی محفوظ علی علوی ڈپٹی کلکٹر[1] کی بڑی صاحبزادی سے نکاح ہو گیا۔

خانہ آبادی کے بعد جدید ذمہ داریوں کا احساس ہوا۔ وکالت میں فروغ حاصل کرنے کی تمنا ہوئی۔ نظائر قانونی کے مطالعہ میں وقت صرف کرتے اور موکلوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے۔ ذہن رسا تھا اور حاضر جوابی کی نعمت فطرت نے عطا کی تھی۔ جرح خوب کرتے اور فریق مخالف کے بیجا سوالات پر دنداں شکن اعتراضات وارد کرتے تھے۔

مولوی محمد محسن کی ایک قدیم موکلہ (رانی کشوری رئیسہ لکھنان ضلع اٹاوہ) کا ایک سخت نزاعی مقدمہ داخلخارج کا اٹاوہ میں چل رہا تھا۔ یہ عین پوری سے اس مقدمہ کی پیروی کے لئے اٹاوے بھیجے گئے اور باوجودیکہ عدالت کا میلان فریق مخالف کی طرف تھا قانون شہادت کے ایسے دقیق اور نازک نکتے اُنھوں نے بر سر اجلاس بیان کیے کہ حاکم مرعوب ہو گیا اور تمام ضلع میں اُن کی قانون دانی کی دھوم مچ گئی۔

اسی زمانہ کے قریب "بابائے خلافت" مولانا شوکت علی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اُس وقت محکمۂ افیون میں سب ڈپٹی ایجنٹ تھے۔ انگریزی لباس زیب تن رہتا تھا۔ کرکٹ کا شوق تھا۔ مکان پر گیند بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ فرنگی معاشرت اور مذہب سے بیگانگی!! مولوی نورالحسن

---

[1] وہ منشی امتیاز علی مرحوم وزیر ریاست بھوپال کے چھوٹے بھائی تھے۔ منشی سجاد حسین کے جلیس وہم صحبت تھے۔ اودھ پنچ اُن کے مشورے سے جاری کیا گیا اور عرصہ تک اُس کی نامہ نگاری کرتے رہے۔ ایک کتاب انگریزی اور اُردو میں سلطنت روس کی مذمت میں شائع کی۔ گورنمنٹ نے عہدۂ ڈپٹی کلکٹری سے سرفراز کیا۔ پنشن لے کر خانہ نشین ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔ وہ بڑے طباع۔ عالی دماغ اور مدبر تھے۔ کیمیا سازی کا بھی شوق تھا اور اس تلاش میں فقیروں اور جوگیوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

"احیاء العلوم" کے شیدائی۔ تو ہے ہنسوڑ میں ہوں مُقَطَّع میرا تیرا میل نہیں!!! اتفاق سے اُس وقت مین پوری کے محکمہ انہون میں بھی ایک مسلمان افسر تھے اور وضع قطع میں بابائے خلافت کے مقلد۔ اُن پر تغلب اور خیانت مجرمانہ کا مقدمہ چلا۔ مولوی نور الحسن نے بہ تقاضائے اخوت اسلامی اُس مظلوم کی طرف سے حسبۃً للہ پیروی کی۔ سشن جج بھی حشمت اللہ تھے جو اُستاد مرحوم کی بہت خاطر و تکریم کرتے تھے۔ بہ ہزار کوشش اُس بے گناہ کی گلو خلاصی ہوئی اور اس وسیلہ سے چند بار مولانا شوکت علی سے صلاح مشورے کی نوبت آئی۔

اسی دوران میں مولوی نور الحسن نے اپنے جدِ امجد کے عطا فرمودہ اعمال و وظائف کی مشق شروع کی۔ نماز تہجد و سحر خیزی کی عادت ڈالی۔ تین بجے شب سے بیدار ہو کر طلوعِ آفتاب تک اوراد و اشغال میں مصروف رہتے اور دن میں سوائے نماز پنجگانہ کے کوئی وظیفہ نہ پڑھتے تھے۔ دن کا بیشتر حصہ فکر معاش اور رات کا آخری ٹکڑا عبادت کے لیے وقف کیا اور یہ معمولات زندگی بھر قائم رہے۔

دعائے حزب البحر کے عامل تھے اور اپنے عزیزوں کو اس ورد کی ہدایت کرتے تھے۔ راقم الحروف کو بھی اس دعا کی اجازت دی اور مداومت کی تاکید کی۔

بڑی تعطیلوں میں وطن تشریف لاتے اور اعزہ کو شرف ملاقات سے بہرہ مند فرماتے تھے ورنہ سال کا بیشتر حصہ مین پوری میں صرف ہوتا تھا۔

مولوی نظیر الحسن کے انتقال کے تقریباً دو مہینہ بعد اُن کی بیوہ کے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ بڑی منتوں اور مرادوں کا نونہال تھا۔ نبی حسن نام رکھا گیا اُس کی تہنیت ولادت کی یادگار میں ہر سال وسیع پیمانہ پر وطن میں ایک مجلس میلاد شریف ۲۰ رجب کو منعقد ہوتی تھی جس میں اُستاد مرحوم شریک ہوتے اور نعت خوانی فرماتے تھے۔ اُس کی تقریب بسم اللہ خوانی دھوم دھام سے ہوئی۔ شاہ سلیمان پھلواروی اور علامہ شبلی نعمانی نے بھی قدم رنجہ فرمایا۔ ان باکمالوں سے ظاہری ملاقات کا پہلا موقع تھا۔ شاہ سلیمان کا وعظ ہوا۔ علامہ شبلی نے سیکڑوں اشعار فارسی اور اُردو کے سُنائے۔ مثنوی شفاعت و نجات دل لگا کر سُنی اور خوب داد دی۔ راقم الحروف کا ایک مضمون "اردو شاعری" پر اردوئے معلّٰی علیگڈھ میں اُسی زمانہ کے قریب شائع ہوا تھا اور علامہ کی نظر اقدس سے گذرا تھا اُستاد مرحوم سے اُس مضمون کی تعریف کی اور مضمون نگار سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ علامہ تعریف کرتے تھے اور اُستاد فرماتے تھے کہ "جی ہاں لڑکا ہے۔ خوب لکھا ہے"

المختصر۔ مین پوری میں مستقل قیام تھا۔ صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ معدہ کمزور تھا۔ مسوڑھوں کے

درد کا دورہ ہوا کرتا تھا۔ دانتوں کی تکلیف سے عاجز آکر ایک دن سب دانت اُکھڑوا ڈالے اور مصنوعی دانت استعمال کرنے لگے۔

ادب اُردو سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔ انگریزی اخباروں کی مراسلہ نگاری بھی ترک کر دی تھی۔ البتہ لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں انہماک بدستور تھا۔

منشی وزیر احمد اعلےٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ چلے گئے تھے اور کیننگ کالج میں پڑھتے تھے۔ منشی منظور علی سلسلۂ تعلیم ختم کرکے محکمۂ زراعت میں نوکر ہو چکے تھے۔ چند روز کے بعد ہندوستان میں مؤلف "واقعات کربلا" کے لقب سے مشہور اور بزم احباب میں "منجم" کے خطاب سے معروف ہونے والے تھے۔ صرف احمد حسن، محمد حسن اور عزیز الحسن کے لیے نگرانی کی ضرورت تھی۔ وہ انگریزی مدرسہ میں پڑھتے تھے مگر کبھی کبھی اُن کا امتحان لیا جاتا تھا اور پابندی صوم و صلوٰۃ کی تاکید ہوتی تھی۔ اب اپنے چھوٹے صاحبزادے مولوی حامد حسن اور بھتیجے مولوی مصطفےٰ حسن کو جو اُس وقت سات آٹھ برس کے تھے مین پوری بلا یا۔ ان کی تربیت کی طرف توجہ مبذول کی اور عربی پڑھانے کے لیے مولوی مقرر کیے۔

اس عرصہ میں مولوی انوار الحسن لکھنؤ کا قیام ترک کرکے اُناؤ چلے گئے تھے اور وہاں اُن کی وکالت روز افزوں ترقی پر تھی۔ مگر مولوی نور الحسن ابھی تک اپنے پیشہ میں کامیاب نہ تھے۔ موروثی جائداد کی آمدنی اتنی کثیر تھی کہ فکر معاش سے فراغ تھا۔ راقم الحروف سے ایک دن برسبیل تذکرہ ارشاد فرمایا تھا کہ میری آمدنی ہزار روپیہ ماہوار سے کسی طرح کم نہیں ہے اور ایک تحصیلدار کی تنخواہ میں لڑکوں کی تعلیم میں خرچ کرتا ہوں۔

اطمینان سے عبادت کرتے اور راحت سے زندگی گذار رہے تھے کہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۰ء سے مولوی محمد محسن اسہال کبدی میں مبتلا ہوئے۔

اُن کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ امراض پیری میں عرصے سے گرفتار تھے۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے مگر دل حب رسول سے جوش زن تھا اور دماغ فکر نعت سے گرم۔ ۱۹۱۰ء میں ایک صوفیانہ نظم "انیس آخرت" لکھی تھی جس کی تشبیب میں در پردہ اپنے عشق و محبت کا اظہار تھا۔

نہیں آساں اُٹھانا عشق کی چوٹیں دل و جاں پر　　کلیجا ہاتھ بھر کا لائے جو ہو مرد میداں کا
ستم محبوب سے پہونچے تو سمجھے مہربانی ہے　　چلے سر پر جو آرہ بار ہو گردن پہ احساں کا
یہ وہ مقتل ہے جس میں اہل دل مرتے ہیں مرنے پر　　نکلنا جان ہی کا ہے نکلنا پورے ارماں کا

مرض کو طول ہوا۔ ایک عزیز نے دریافت خیریت کے لئے خط بھیجا تو جواب میں اپنے قلم سے تحریر فرمایا:۔

اسی دارالشفا میں ہے یہ نسخہ حفظ صحت کا — کہ صد ہا درد ہوں لیکن خیال آئے نہ درماں کا

اشتداد مرض کی خبر سن کر مولوی انوار الحسن اُنّاؤ سے آئے۔ دونوں صاحبزادیاں حاضر ہوئیں۔ مولوی ذکی الدین اور منشی رشید الدین بھی پہونچ گئے۔ دوا علاج۔ تیمار داری اور خدمت گذاری میں کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی گئی لیکن

ہر دوا در کار خود بے کار بود — ضعف از حسبِ جواہر می فزود

۲۳ اپریل کو بعد نماز مغرب مولوی نور الحسن سے فرمایا کہ "مبطون" کو درجۂ شہادت نصیب ہونے کی بابت ایک حدیث میں بشارت ہے اُس کی تفصیل کسی کتاب سے تلاش کر کے سناؤ۔ خلف رشید نے دُرِّ مختار سے باب الشہید نکال کر پڑھا۔ دوسرے روز دوشنبہ کے دن ۱۰ ربیع صفر ۱۳۲۳ھ کو دس بجے دن کے "راہی باغ جناں ہوئے" اور عیدگاہ مین پوری کے صحن میں دفن کیے گئے۔

راقم الحروف اُس زمانہ میں انسپکٹر قانونگویاں تھا اور پیرانہ ضلع مظفر نگر کا دورہ کر رہا تھا۔ وہیں انتقال کا تار پہنچا۔ جمنا کو عبور کر کے پانی پت گیا اور وہاں سے بذریعہ ریل مین پوری آیا۔ سوم کا دن تھا۔ فاتحہ خوانی ہو چکی تھی۔ شہر کے دشیخ و شریف رخصت ہو گئے تھے۔ محل میں سناٹا تھا۔ ہر در و دیوار پر اُداسی چھائی تھی۔ دونوں صاحبزادے محزون و غم زدہ بیٹھے تھے۔ راقم روتا ہوا پہونچا تو وہ بھی اشکبار ہوئے۔ دیر تک متوفی کے آخری وقت کا احوال بیان کرتے رہے۔ سہ پہر کو مزار اقدس پر حاضر ہوا۔ "مزار مولوی محمد محسن غفر لہ" بے ساختہ تاریخ ذہن میں آئی۔ اُستاد سے عرض کی کہ یہ تاریخ لوح پر کندہ کرائی جائے۔ ارشاد ہوا کہ لوح پر کوئی نفیس نظم لکھی جائے گی اور عنوان پر یہ تاریخ بھی کندہ کرا دی جائے گی۔

ایک ہفتہ کے اندر سب مہمان رخصت ہو گئے۔ مولوی احمد حسن اُس سال انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے وہ راقم کے ساتھ ہی شکوہ آباد تک گئے اور وہاں سے آگرے چلے گئے جو امتحان کا مرکز تھا۔ کامیابی کے بعد وہ علیگڈھ پڑھنے گئے۔ شیخ ابو الحسن اور عزیز الحسن کو اُن کی والدہ نے بجبور طلب کر لیا۔ مولوی محمد حسن ایک سال تک مقیم رہے اُس کے بعد انٹرنس پاس کر کے وہ بھی لکھنؤ چلے گئے اور دونوں بھائی کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ صرف دو خورد سال لڑکے مولوی حامد حسن اور مصطفےٰ حسن اُستاد مرحوم کی نگرانی میں رہے اور مین پوری کی دنیا بدل گئی۔

داڑھی مونچھ

کچھ دن ہوئے میں نے "دکن ٹائمز" میں ایک مزاحیہ مقالہ "مونچھوں" کے متعلق دیکھا تھا، مقالہ نگار کی جدت طرازی جگہ جگہ بہت دلچسپ تھی لیکن داڑھی کے شامل نہ ہونے کے باعث مقالہ قدرے تشنہ تھا اُسے پڑھ کر میں نے بھی "بشمول ریش" طبع آزمائی کی ٹھان لی اور نتیجہ ملاحظے میں پیش ہے۔ اس کو ترجمہ یا تلخیص تو نہیں کہا جا سکتا تاہم مجھے اس کا اقرار ہے کہ جگہ جگہ میں نے انگریزی مقالے میں مندرج واقعات سے مدد ضرور لی ہے۔

خاکسار "ص۔ع۔"

ترقی اور تہذیب کے اس پُر غلط تخیل والے زمانے میں داڑھی مونچھ کی بقا یا فنا کا مسئلہ بھی ایک خاص اہمیت کا مالک ہے، شاید دورِ حاضر کے "نام نہاد متمدن" مرد نے ان دونوں کا صفایا کر کے دورِ حاضر کے "ترقی پذیر" طبقۂ صنفِ نازک کے مطالبۂ مساوات کو سب سے زیادہ سراہا ہے۔ موجودہ دور "مساواتِ اصناف" کا دور ہے اور گذشتہ پچیس سال میں "جنسِ لطیف" نے کشمکشِ حیات کی ہر رزمگاہ میں "جنسِ کثیف" کے دوش بدوش کام کرنے کی تعلیم حاصل کی ہے۔ آج زندگی کے ہر شعبے اور حیات کے ہر پیشے میں عورتیں اچھی خاصی تعداد میں نظر آتی ہیں۔ کوئی تجارت اُن کے لیے مشکل نہیں، کوئی پیشہ اُن کے واسطے محال نہیں، قانون داں اُن میں پائے جاتے ہیں، انجینیر اُن کی صف میں ملتے ہیں، معلم اُن کے زمرے میں موجود ہیں، طبیب اُن کے طبقے سے نکلے جا سکتے ہیں، (شاید موخر الذکر کے متعلق مجھ سے فروگذاشت ہوئی کیونکہ طب میں تو عورت کو ہمیشہ سے مہارت حاصل تھی) یورپ سے یہ طوفان ابر اٹھا تھا اور دیکھتے دیکھتے تمام اُفقِ عالم پر چھا گیا۔ اور گو ابھی مشرقی ممالک مغرب کی برابری کے مدعی نہیں ہو سکتے جہاں عورتیں اب سول سروس میں بھی شریک ہونے کی مجاز ہیں تاہم "منزلِ مقصود" ہی کی طرف رُخ ہے رہی ہے۔ ع۔ آخر تو پیچھے پیچھے اُسی کارواں کے ہیں۔ اگر چارلس لنڈ برگ نے مرد ہوا بازوں کی صف میں ایک خاص امتیاز حاصل کیا تھا تو مسز امی جانسن مالیسن نے عورت ہوا بازوں کے زمرے میں وہی نام پیدا کیا ہے۔ برطانوی دارالعوام میں اگر مسٹر چرچل ہندوستانی آزادی کے مخالفین کے سرگروہ ہیں تو ڈچز آف ایتھول عورتوں کی جانب سے اس معتبر عہدے کی کرسی نشین ہیں، گول میز کانفرنس میں اگر پنڈت مالوی نے ہندوستانی قوم پرور دل کے پردے میں ہندو مہا سبھا کی نمائندگی کی تھی تو بیگم شاہ نواز نے بالکل بے پردہ ہو کر ہندوستانی عورتوں کی رہنمائی کا بارِ گراں اپنے شانوں پر اٹھایا تھا، اور ابھی زیادہ دن نہیں گذرے جب جنگ حبش و اطالیہ کے دوران میں حبش کی ماؤں

بیویوں اور بیٹیوں نے میدان کارزار میں اپنے بیٹوں، شوہروں اور باپوں کے دوش بدوش استادہ ہو کر لڑائی میں برابر کا حصہ لیا۔ غرض مفکرین کی نظر میں اب مرد اور عورت میں کوئی چیز ما بہ الامتیاز نہیں رہی ہے حتے کہ مغرب کے "متمدن" ممالک اور جاپان کے مخصوص کلبوں کے داخلوں پر بھی اب بجائے اس نوٹس کے کہ "عورتوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے" یہ نوٹس آویزاں ہونے لگے ہیں کہ "ہندوستانیوں اور کتوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں" یعنے ہر شعبۂ حیات میں بے بس اور بے یار و مددگار مرد کو "دندان سگ" اور "عورت کی قینچی" سے مقابلہ کرنے کے واسطے یکہ و تنہا چھوڑ دیا گیا ہے درانحالیکہ ابھی اس غریب کو اس کا بھی صحیح اندازہ نہیں کہ دونوں میں سے کونسا زخم زیادہ مسموم اور کس کے کاٹے کا علاج مشکل تر ہے۔

لیکن گو عورت نے ہر میدان میں مرد کو پچھاڑ دیا تھا (استثنائے کلیہ کا ثبوت ہی ملتا ہے)، تاہم فطرت کے روبرو وہ سر جھکانے پر مجبور تھی، اس نے ہر شعبۂ حیات میں کامیابی کے ساتھ مرد کی نقل اتاری۔ ہر شعبۂ زندگی میں بڑے حسن سے مرد کا مذاق اڑایا، اور کہیں اسکو ایسی دقتوں سے سابقہ نہیں پڑا جن پر وہ آسانی سے ظفر یاب نہیں ہو سکتی تھی، وہ مرد کا سا لباس پہننے لگی، مرد کے سے بال کتروانے لگی، مرد کی طرح حقے اور سگریٹ کا استعمال کرنے لگی، مردوں کے کھیل تماشوں میں حصہ لینے لگی لیکن باوجود اسکے ایک چیز میں مرد سے پیچھے رہی، وہ منہ پر داڑھی مونچھ نہیں پیدا کر سکی، اس کا "بالائی لب" "گنج" کے مرض سے صحت نہ پا سکا "عارض" "بے نموئی" کے عیب کو نہ مٹا سکے، اور ادھر مرد کا یہ رنگ کہ اس کی مونچھوں کی "اینٹھ" میں روز افزوں اضافہ ہوتا ہی گیا، داڑھی کے "حسن" میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہی ہوتی رہی، اور اس میدان میں وہ بڑا شرکت صنفے اپنی برتری کے جھنڈے اڑاتا رہا۔ لیکن بالآخر اسی بولان گاہ میں فطرت کی اس "شریف ترین آفرینش" —— مرد —— کی فطری فیاضی کا اعلٰے ترین مظاہرہ دیکھنے میں آیا، اس نے اپنے اس "فطری تفوق" سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا اور بلا لحاظ اس امر کے کہ اس کے "صنفی امتیازات" پر روز آنہ کتنی غاصبانہ یورشیں ہو رہی ہیں اور اس کے حقوق کس کس طرح پامال کیے جا رہے ہیں، اس نے اس حسین دیوی کی بنائی ہوئی "قربان گاہ ادعائے مساوات" پر اپنے واحد باقی امتیاز —— داڑھی مونچھ —— کو بھی بخوشی بھینٹ چڑھا کر صرف اس ایک ایثار سے "جنس لطیف" کو پوری پوری طرح اس کا اہل بنا دیا کہ وہ ہر طرح مرد کے ہم پلہ ہو سکے۔ اب روز صبح کو ہر مرد کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے اس خود ساختہ مندر میں جا کر کچھ دیر پوجا پاٹ کر لے یعنے "جنس لطیف" کو گراں گذرنے والے اس "صنفی افتخار" کی "مرئی شہادت" کو برباد کر دے گویا "سفر حیات" کے ہر حصے (دن) کا آغاز کرے تو صاف اور سادہ کلک کے ساتھ۔

دیکھو اس عہد کے مخنث کو مردِ خوش حال اسکو کہتے ہیں
چار ابرو کا سب صفایا ہے فارغ البال اسکو کہتے ہیں (اکبر الہ آبادی)

اگر آج ہمارے باپ دادا کو چند لمحوں کے واسطے از سرِ نو زندگی عطا کی جا سکتی اور وہ لحد کے "خواب گرانبار" سے جاگ کر ہم لوگوں کی "ہیئت کذائی" کو ملاحظہ کر سکتے تو شاید اُن کو سب سے زیادہ اچنبھا اور غم و غصہ ہمارے اسی فقدان پہ ہوتا جس کی خاطر اُن کے عہد کے مرد اتنی محنت اور اتنی توجہ کرنے کے عادی تھے کیونکہ درحقیقت اُس زمانے میں داڑھی مونچھ "مردانہ صفات" اور "صنفی افتخار" کا نشان تصور ہوتی تھیں، بالفاظِ دیگر یہی دونوں "زیبائشیں" مرد کی شخصیت کا پیمانہ سمجھی جاتی تھیں "شدنی خوشنما منیں" اپنے "شدنی داماد وں" کی مونچھوں کے "پیچ و خم" اور داڑھیوں کی "فراخی" اور "گھنگھری" کا ہر ممکن موقع پہ بغور مطالعہ کیا کرتی تھیں اور جس طرح ہر انسان کی پوشاک اس کے نیاط کے کمالات کی آئینہ دار ہوتی ہے یا اُسکا لب و لہجہ اس کے وطنِ مالوف کے محل کا، اور اس کے اخلاق اُس کی تعلیم و تربیت کا، ٹھیک اسی طرح مرد کی داڑھی مونچھیں اُسکے تمام و کمال عیوب و صفات کے لیے جامِ جہاں نما کا کام کرتی تھیں، اور انھیں سے مرد کے جملہ خصوصیات روشن ہوا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں مونچھ رکھنے کے طریقوں اور داڑھی کی "بوقلمونی" کی کوئی انتہا نہیں تھی، مونچھیں، "نمائشی" محض "برائے بیت"، دھبوں سے لے کر جاپانی امیر البحر کی طرح "چھ فٹی" تک ہوتی تھیں۔ داڑھی "قوس قزح" کے سات رنگوں کی ترجمانی کیا کرتی تھی اور مہندی کے گہرے سرخ سے لے کر (ماورائے نارنجی کے متعلق ابھی تحقیق نہیں ہو سکی ہے) "خضاب زدہ" گہرے سیاہ یا اودے (بالائے بنفشی کی بابت بھی کوئی بادثوق اطلاع نہیں) تک ہر رنگ عورت کی چُندری یا مرد کی داڑھی میں مل سکتا تھا۔ مونچھ کی "تراش خراش" میں کسی خاص وضع کو انتخاب اور اختیار کر کے مرد گویا اپنی جملہ خصوصیات کا اظہار کر دیا کرتا تھا، مثلاً "غلطی ہوئی معاف کیجیے گا" والی مونچھوں والے عموماً بہت صلح کل اور صلح جو مرد ہوتے تھے، علیٰ ہذا داڑھی کی نوک پلک بھی مرد کے تمام عیوب و صفات کی نمائندگی نہایت کامیابی کے ساتھ کرتی تھی، جیسے "فرنچ کٹ" داڑھی والے عام طور سے "فرنچ رخصت" کے زیادہ شائق ہوتے تھے۔ لاریب کہ جس طرح آج ہم اس مقولے کی صداقت کے قائل ہیں کہ "مغربی یا مغرب زدہ مرد کی چند یا ہمکو دکھا دو اور ہم اُسکی بیوی کی انتاد مزاج سے واقف ہو جائیں گے"، اسی طرح ہمارے آبا و اجداد اس مقولے کی سچائی کے معترف تھے کہ "مرد کی داڑھی مونچھ دیکھ کر اُس کا تمام کچا چٹھا بیان کر سکتے ہیں"۔

افسوس کہ آج یہ سب کچھ محض خواب و خیال ہے، ہر "کیسر دنما چہرہ" یکساں معلوم ہوتا ہے اور کوئی خصوصیت ایسی نہیں جس کی مدد سے دورِ حاضر کے مرد کے "منسوب و زشت" کی جانچ کی جا سکے، یعنے داڑھی مونچھ سے

بے نیاز چہرہ گویا ایک بے سُراغ معمہ یا بغیر اشاروں کی ایک پہیلی ہے اور یہ "جنونِ تہذیب" اعلےٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب کے دماغوں میں سرایت کر چکا ہے۔ میرے خیال میں آنجہانی شہنشاہ جارج پنجم کی وفات کو "دورِ ریش و بروت" کا اختتام متصور کرنا چنداں بیجا نہ ہوگا، کیونکہ ہمارے نئے ملک معظم[1] کی رسائی میں "ریش و بروت" کا "بارگراں" اُن کے طفلانہ چہرے کی معصومیت کے لیے چنداں موزوں نہیں اور الحمدللہ کہ کم سے کم اس ایک معاملے میں ہمارے جدید "سبزہ آغاز" یا "سبزہ انجام" صدر کانگریس بھی "تاج برطانیہ" کے ہمنوا ہیں۔ داڑھی مونچھ رکھنا اب منجملہ عجائبات شمار ہونے لگا ہے، ہر روز صبح ان گنت اُسترے اپنا کام بے خوف و خطر انجام دیتے ہیں اور اس سانحۂ "کرزنیت" کی کامیابی کا بڑا سہرا "جی لیٹ اینڈ کمپنی" کے سر ہے۔

داڑھی مونچھ کی بقا و فنا کی اس جنگ صلیبی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ پیشینگوئی کرنا چنداں مشکل نہیں کہ ایک آدھ قرن میں یہ دونوں بھی "دم" کی طرح "اعلی اللہ مقامہ" ہو جائیں گی، اس لیے وہ معدودے چند اصحاب جو اس وقت بھی رسالہ عامہ کے خلاف داڑھی مونچھ رکھتے ہیں اگر وقتاً فوقتاً ان کی بقا اور ترویج کی خاطر "داڑھی یا مونچھ ٹورنامنٹ" منعقد کیا کریں تو نامناسب نہ ہوگا، موجودہ زمانہ نسوانیت حقیقی میں "بقائے ریش و بروت کی انجمنیں" خاصی قدر و عزت کی نظر سے دیکھی جائیں گی، اور مجھ کو یقین ہے کہ اس دورِ قحط الرجال میں بھی ایسے فیاض نفس سرپرستوں کی کمی نہ ہوگی جو "ریش و بروت" کے "مسابقوں" میں طلائی اور نقرئی جام عطا کرنے کی عزت حاصل کریں۔ ابھی کچھ ہی دن گذرے کناڈا میں اسی قسم کی ایک انجمن کی جانب سے ایک "ٹورنامنٹ" کا اعلان ہوا تھا جو بہت کامیاب رہا، تقریباً دو درجن امیدواروں نے اس "مسابقے" میں شرکت کی، سب کو ایک مقررہ وقت پر "مجلس حکما" کے روبرو داڑھی مونچھیں صاف کرا دینا پڑیں۔ تین ہفتوں کے بعد "مجلس حکما" نے ہر امیدوار کی "ریش و بروت" کا پھر معائنہ کیا۔ اس وقفہ کے دوران میں ہر امیدوار کو اس باب میں کامل آزادی تھی کہ "ریش و بروت" کی ترقی کے واسطے جو ذرائع چاہے اختیار کرے۔ جیتنے والے کو انعام میں ایک طلائی جام اور ایک "شیونگ سٹ" پیش کیا گیا۔ میری رائے میں اگر ہندوستان میں تمام اسلامی نشرگاہیں اس امر کا تہیہ کر لیں کہ مہینے میں ایک بار ضرور ایک تقریر "ریش و بروت" کی بقا کے فوائد پر نشر کیا کریں گی تو اس تحریک کی بڑی ہمت افزائی ہوگی خصوصاً اگر دہلی سے چند ذی شہرت اصحاب اپنے مخصوص انداز میں ہر ماہ ایک تقریر اس موضوع پر کیا کریں اور پھر اس تقریر کے متعلق نصف شب کے قبل باہر سے آئی ہوئی آرا کو ادارۂ نشرگاہ ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کر دیا کرے۔ دیگر نشرگاہیں بھی اس سلسلے میں کم سے کم اتنا تو کر سکتی ہیں کہ کبھی کبھی "بقائے ریش و بروت" کے عنوان کے تحت کچھ تحت اللفظ کلام نشر کرا دیا کریں۔

ممکن ہے بعض اصحاب میرے اس مضمون کو پڑھ کر یہ خیال فرمائیں کہ میں نے ایک غیر ضروری موضوع پر

---

[1] یہ مضمون دسمبر ۱۹۳۶ء سے پہلے وصول ہوا تھا۔ اس وقت ایڈورڈ ہشتم بادشاہ تھے۔

قلم اُٹھایا، اگر اُن کا ایسا خیال ہو تو وہ غلط ہے، اور مجھ کو امید ہے کہ غور و فکر کے بعد وہ خود اپنی اس غلطی کو محسوس کر لیں گے کہ داڑھی مونچھوں کا مسئلہ ذرا بھی غیر اہم نہیں، درحقیقت "جزئیات ہی سے افسانے" بنتے ہیں، صرف مونچھ ہی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ کچھ دن گذرے وہ ایک پارلیمانی بحث و تمحیص کا موضوع بنی تھی۔ جب ایک "کولڈ اسٹریم گارڈ" نے مونچھ منڈوانے پر کورٹ مارشل کو ترجیح دی۔ یہ شخص یقیناً بے حد تعریف کا مستحق ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ شاید انگلستان کے درباری شاعر کی طویل خاموشی کا راز یہی ہے کہ وہ بہت عرصے سے اسی شخص کی توصیف میں ایک معرکۃ الآرا نظم لکھنے میں مصروف ہیں۔ مونچھوں کی اہمیت کو اس سے اور تقویت ہوتی ہے کہ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب انگلستان کے ایک بڑے لارڈ، ایسے گوروڈن نے ایک خطیر رقم ادا کر کے اپنے ایک دوست مسٹر رابرٹ ہوپ جانسن کی مونچھوں کو خریدا تھا۔ یہ مونچھیں مخمل اور زربفت پر چپکا کر ایک طلائی کیس میں محفوظ کی گئی ہیں اور سنا ہے کہ اُن کے سابق مالک اب بھی گاہ گاہ اُن پر حسرت بھری نظر ڈالنے بلیکن کلب جایا کرتے ہیں۔ داڑھی مونچھوں کی بابت بہت سے پر لطف اور ہنسانے والے قصے مشہور ہیں لیکن داڑھی کے لیے تو جونپور کے قاضی صاحب کے لطیفے سے زیادہ دلچسپ اور کوئی لطیفہ نہیں اور مونچھوں کے بارے میں انگلستان کے ایک مشہور رکن دار العوام کے واقعے سے بڑھ کر معنی خیز کوئی قصہ نہیں، یہ رکن صاحب ایک شب ایک خوبصورت، شوخ و شنگ، بت طناز کو تھیٹر لیے جا رہے تھے، ٹیکسی میں بیٹھ کر جب "رفع شرم و حجاب" کے ابتدائی منازل طے ہو چکے تو مس صاحبہ نے شوخی سے حضرت کی طرف دیکھ کر کہا کہ "آپ میں دو چیزیں ایسی ہیں جن کو میں پسند نہیں کرتی"۔ "کون کون" حضرت نے دریافت کیا "آپ کا سیاسی نصب العین اور آپ کی مونچھیں" "مائی ڈیر" حضرت نے بڑے سکون سے جواب دیا "آپ اس بارے میں ذرا بھی خود کو متفکر نہ بنائیں کیونکہ آپ کو ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی سابقہ پڑنے کا امکان نہیں"۔

لیکن میری اس تمام بحث و تمحیص کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ "جنس لطیف" کی یہ "مساعی جمیلہ" جنکی منزل مقصود "صنفی مساوات" ہے، قابل اعتراض ہیں، درحقیقت عورت نے اس معاملے میں بہت غور و خوض کے بعد ایک بڑا مبارک اقدام کیا ہے جس کا مرکزی اصول ہے "نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری"۔ تاریخ عالم دو اہم حقیقتوں کی شاہد ہے۔ پہلی حقیقت یہ کہ دنیا کے تمام جھگڑوں کی بنا "زر، زن اور زمین" ہیں، اسی چیز کا اگر اور وسیع نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل ان تینوں کے بجائے صرف ایک "زن" کا لفظ رکھنا زیادہ معنی خیز اور جامع ہوگا کیونکہ زر اور زمین، نفس الامر میں حصول زن ہی کی خاطر درکار ہوتے ہیں ؏

جلوہ را ایک آرزو باشد و ایں را جلوہ ہا

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ازمنۂ ماضیہ میں ہر دور میں مرد نے حتی الوسع عورت کے حقوق کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا بدلہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ پہلا موقع ملتے ہی عورت مرد سے انتقام لینے کی غرض سے حتی المقدور اُس کے ہر حق کو پامال کیا کرتی لیکن عورت کی فطرت میں اللہ نے بڑی فیاضی پوشیدہ رکھی ہے اُس نے سوچا کہ انتقام لینے والا تو وہ منتقم حقیقی ہے، البتہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر کم سے کم اس امر کا اطمینان ضرور کر لینا چاہیے کہ پھر آئندہ کبھی مرد اپنے مظالم کا اعادہ نہ کرے گا، اس کے واسطے اس سے بہتر کیا ترکیب ہو سکتی تھی کہ "اصناف" کے امتیاز ہی کو فنا کر دیا جائے، جس سے ادھر تو "زر، زمین، زن" کا جھگڑا مٹ جاتا ہے اور اُدھر مرد عورت کا امتیاز اُٹھتے ہی کسی ایک صنف کے دوسری صنف پر مظالم توڑنے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا ہے ع لیلیٰ بہ یک نگاہ دو مجنوں نشانہ کرد

اس لئے تخیل اور اس ایک مطمح نظر کو پیش رکھ کر اُس نے کام کرنا شروع کیا، اور ہمت کی بلندی، ارادوں کے استقلال، اور نیت کے خلوص کے سبب ہر جگہ فتح پائی "داڑھی مونچھوں" اور دیگر "جسمانی تفاوتوں" کے موقع پر جب وہ مجبور ہو گئی۔ تو اُس نے مرد کو بھی اپنا شریک اور راز داں بنایا اور مرد نے اپنی علو حوصلگی اور عالی ہمتی سے پہلا کام تو یہ کیا کہ "سبزہ ریش در بدرد" ہونے کا تہیہ کر لیا، اُدھر عورت نے "بال تراشی" شروع کر دی تاکہ کچھ تو درست ہو کچھ اُدھر سے اور کچھ ہمارا ہاتھ آ جائے ؎

اِدھر منڈی ہوئی زلف، اُدھر کٹی ہوئی ... دونوں نے دھول جھونک دی دیدۂ امتیاز میں

لیکن اس قدر کچھ [illegible] عورت کی ہمت اس منزل پر ایک دن بھی نہ رکی بلکہ بہت آگے بڑھ گئی، اُس نے [illegible] چند سال کی مختصر مدت میں بھی پورا اٹھایا، اور گو وہ ابھی پوری طرح کامیاب [illegible] اب وہ ہمہ تن اس کوشش میں مصروف ہے کہ تمام مردوں کو عورت بنا لے یا تمام عورتوں کو مرد، لیکن چونکہ اس صورت میں توالد و تناسل کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ اُس کی بھی سعی کر رہی ہے کہ اس سلسلے کو بھی "اصناف" کے "امتیاز" سے بے نیاز کر دے۔ بہرحال ان مساعی کا ابھی زمانہ طفلی ہے لیکن اس میں کلام کی گنجائش نہیں کہ ریش ترشوانے اور مونچھ منڈوانے کی ترغیب مرد کو عورت نے یا عورت کی سعی ہی نے دلائی، کیونکہ وہ اُس کے مبارک اور بلند ارادوں سے واقف ہونے کے بعد یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ صرف چند "موئے سیاہ" عورت کے تمام ارادوں کے حصول کی راہ میں روڑے اٹکائیں۔ اس لئے اُس نے ان چند بالوں پر اُسترا پھیرنا گوارا کیا مگر عورت کے ارمانوں پر پانی پھیرنا نہیں۔

"۵۶۰"

دیوان معروف

جناب معروف جن کا نام نامی خواجہ میرزا نواب الٰہی بخش خاں صاحب چشتی فخری دہلوی ہے اپنی خاندانی امارت، شرافت عارفانہ و متصوفانہ زندگی کے لیے بدرجۂ اتم مشہور و معروف ہیں۔ اطراف عالم خصوصاً ادبی دنیا میں بھی مرحوم سے سب واقف ہیں۔ صوفیہ کرام کی صحبت سے فیضیاب ہو کر باوجود امیرانہ زندگی اور اسباب معیشت کی فراہمی کے فقیرانہ و زاہدانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ انتظام خانہ داری دوسرے متعلقان قریبی کے سپرد تھا۔ علاوہ تصوف کے دیگر علوم دینی و عربی کے نیز فنون لطیفہ سے بھی دلدادہ تھے۔ بلکہ شاعری شغف [illegible] ایک تھا۔ ایسا شخص جو صوفیائے کرام اور دنیا کے عظماء سے روحانی فیض حاصل کر چکا ہو اس کے حسن اخلاق اور پاکیزہ زندگی کا کیا کہنا۔ شاعری کا بہترین جوہر تصوف ہے۔ حضرت [illegible] بغیر اس کے کلام میں اصلی دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی اور نہ [illegible] تاثیر ہوتی ہے۔ اردو زبان کے شعراء میں متصوفانہ مذاق کے شعر کہنے والے کمتر ہیں۔ حضرت معروف کے دیوان میں متصوفانہ اشعار زیادہ تر ہیں۔ مگر ایسے اشعار بھی ہیں جو غیر متصوفانہ کہے جا سکتے ہیں۔ متصوفین شعرائے زمانہ کا کلام بھی دورنگی سے کم بچا ہے یعنی عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی کی جھلک پیدا ہو گئی اسی سے عشق مجازی کو عشق حقیقی کی نردبان کہا گیا ہے۔

حضرت معروف کو مشہور شاعر شاہ نصیرالدین مرحوم سے تلمذ تھا۔ ایک نظم مندرجہ دیوان ہذا میں معروف نے اس عقیدت کو ظاہر کیا ہے جو اُن کو اپنے استاد سے تھی۔ معروف کی عمر اسی سال سے متجاوز ہوئی ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔ بعض اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ذوق سے بھی معروف نے مشورہ سخن کیا ہے اس خیال کی تردید بھی اسی دیوان میں باحسن الوجوہ کی گئی ہے۔ خیر اس اختلاف پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں۔

معروف کو فرائض شاعری ادا کرنے کی قابلیت بامعہ تھی، اور جس نے شاہ نصیر ایسے اُستاد سے مشورہ سخن کیا ہو وہ دوسرے کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ ان کے دیوان میں ہر رنگ کے اشعار ہیں میر و سودا وغیرہ کے رنگ میں جو کچھ کہا ہے وہ نقادان فن کے نزدیک قابل قبول ہے۔ اور ہر سخن فہم اس کی تعریف و تحسین کرے گا۔

اس دیوان میں غزلیات کے علاوہ ایک مختصر مثنوی اور ایک نظم مسمّٰی بہ تسبیح زمرد اور ایک نظم عشق مجازی کی حالت میں لکھی ہے۔ مخمس بر غزلیات اساتذہ۔ متفرق اشعار۔ قطعات۔ رباعیاں اور تقریظات و تاریخ ہیں۔

ناظرین کو پہلے یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ شاعر دور اولین کا ہے اور کلام پونے دوسو برس اُدھر کے مذاق سخن اور بول چال اور بندش کا نمونہ ہے اس کا تطابق زمانہ حال کی اُردو سے نہیں ہو سکتا صرف خیالات کی بلندی مضامین آفرینی مذاق کی لطافت توحید و عرفان اور تصوف کی چاشنی دیکھنا چاہیے۔ مشہور اساتذہ

اُردو کے رنگ و مذاق میں جو اشعار کہے ہیں وہ معروف کی سخن طرازی کا عمدہ نمونہ ہیں اور اس سے اُن کی قادر الکلامی بدرجہ اتم ثابت ہوتی ہے۔ دیوان معروف کی اشاعت سے ادبی دنیا میں ایک پسندیدہ اضافہ ہوا ہے۔ مولانا شاہ عبدالحامد صاحب قادری بدایونی کی مساعی جمیلہ قابل داد ہیں کہ دیوان معروف مطبوع ہو کر شائع ہوا اور معروف کے نام کو زندہ کیا۔ تذکرہ جات مطبوعہ میں تذکرہ نویسوں نے معروف کا ذکر بہترین طریقہ سے کیا ہے۔ تفریح ناظرین کے لیے کسی قدر انتخاب دیوان معروف سے کیا جاتا ہے۔

مبصرین سخن کا یہ اولیں فرض ہے کہ وہ کسی شاعر کے کلام کو صرف اپنے مذاق کے موافق نہ دیکھیں بلکہ شاعر کی سخن پردازانہ طبیعت کو جانچیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے معیار فن سے گرا ہوا ہے یا نہیں اگر وہ لوازم شاعری کے حدود میں ہے تو اس کی استادی یا کمال کو تسلیم کرنا چاہیے۔ رہی کلام پر نکتہ چینی یہ سہل بھی ہے اور مشکل بھی اچھی بھی اور بُری بھی اور میرے خیال میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے کلام میں نکتہ چینی کی گنجائش نہ ہو۔ اس سے مشہور شعرائے فارسی بھی محفوظ نہیں رہے ہیں نہ اساتذۂ اُردو۔ چونکہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ مبصر و نقاد اس لیے نکتہ چینی سے محترز ہوں۔ یہ تنقید ضرورتاً لکھی ہے۔

انتخاب کلام معروف

(حمد)

کرم سے اُس کے اپنے پر ہے نازاں　　اثر فریاد و لہائے حزیں کا
کہاں چھوں شمع فانوسی چھپے ہے　　فروغ حسن اس پردہ نشیں کا
بنایا جس نے بہر دشمن و دوست　　فلک کا خوان اور سفرہ زمیں کا

پہلا شعر گو حمدیہ ہے مگر رنگ تغزل کی جھلک بھی پیدا ہے کہتے ہیں کہ عشاق محزوں کی فریاد کا اس کے کرم پر اثر ہوا دعا مقبول ہوئی یا گناہ معاف ہوئے۔ دوسرا شعر بھی صاف ہے خدا بہت گہرے حجابات میں ہے مگر اس کی قدرت اور ضیائے حسن ازل عیاں ہے۔ تیسرا شعر سعدی کے اس شعر کے مفہوم سے ملتا ہوا ہے۔

ادیم زمیں سفرۂ عام اوست　　چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

(نعت)

شافع محشر کا یاں دیکھو جمال نقش پا　　تا رہے خواب عدم میں بھی خیال نقش پا

اس مطلع کا مفہوم اصلی صرف اتنا ہے کہ اگر تم (مسلمان) دنیا میں اپنے رسول مقبول کا خیال اور آپ کے ارشادات کا خیال رکھو گے اور پیروی سنت کی کروگے تو خواب عدم یا قیامت میں بھی کامیاب ہوگے۔ واقعی دنیا میں احکام نبوی کی پابندی اور احکام نبوی کی پیروی عین احکام خدا کی اطاعت ہے۔

من یعلم اللہ الخ۔

(دیگر)

ہووے اگر نہ وعدۂ دیدار درمیاں وہ دوزخی ہے نام جو لے پھر بہشت کا

مسلمانان اہل سنت کا اعتقاد راسخ ہے کہ بہشت میں دیدار خداوند تعالیٰ ہوگا عارف اور متقی صرف اسی خیال سے بہشت کے طالب ہیں نہ کہ وہاں کے سامان عیش و راحت کے (وہ دوزخی ہو) کا ٹکڑا تناسب الفاظ کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ اسی زمین میں یہ دو شعر بھی قابل داد ہیں۔

صحبت میں عارفوں کی زبس پائی ہے تمیز کچھ ہم کو امتیاز نہیں خوب و زشت کا

تکمیل تصفیہ نفس کے بعد انسان سب کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے اور تزکیہ نفس بغیر صحبت عرفا کے نہیں ہو سکتا۔

بیخود پھروں ہوں عشق بتاں میں یہاں تلک کعبہ میں پوچھتا ہوں میں رستہ کنشت کا

(دیگر)

شکل عکس و آئینہ مسجد تھی یا بتخانہ تھا آپ تو مہمان تھا اور آپ صاحب خانہ تھا

حسن سے تیرے ہوا ہے عشق کا بازار گرم تو اگر جلوہ نہ کرتا ہم کو بھی سودا نہ تھا

کس قدر بے پردہ ہے ہر رنگ میں شوق ظہور گل پہ بلبل تھا کبھی گہ شمع پہ پروانہ تھا

توحید و معرفت اور عشق و محبت کے لحاظ سے ہر سہ اشعار قابل تحسین ہیں۔

(دیگر)

آپ کو پہچان مشت خاک کو ایسا نہ جان دل نے تیرے بھی لقب پایا ہے بیت اللہ کا

عابدوں کو دین کا غم، عاشقوں کو دل کا خوں درد سے ہے سب کو توشہ اپنی اپنی راہ کا

پہلے شعر میں حضرت علی کے اس ارشاد (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) کا مفہوم موزوں کیا ہے۔ واقعی اس مشت خاک (انسان کامل) نے وہ مراتب اعلیٰ پائے ہیں جو فرشتوں نے بھی نہیں پائے اور دل کو بیت اللہ اور شعرا نے بھی کہا ہے۔ دوسرا شعر تصوف و معرفت کے جذبات کے ساتھ تغزل کا رنگ بھی لیے ہوئے۔ بالکل زمانہ حال کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

(دیگر)

ذیل میں بعض شعر ایک غزل سے لکھے جاتے ہیں، در اصل یہ ساری غزل مرصع ہے اور معروف کی طباعی نازک خیالی مضمون آفرینی کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو میں اساتذہ فارسی کا رنگ دکھا کر ریختہ کی شان قائم رکھنا استادی کی بین دلیل ہے۔ ان کو اساتذہ اردو کا ہمپایہ کہنا بالکل صحیح و درست ہے۔

مثل زر دل ہے گداز اس بندۂ درگاہ کا نقش ہے منقوش خاطر ضرب الا اللہ کا

یہ مطلع بظاہر سیدھا سادا ہے۔ مگر معروف نے اس میں لطف معنوی پوشیدہ رکھا ہے جو کسی قدر صراحت کا محتاج ہے۔ بعض وقت انسان کو نہ ہنستے بنتا ہے نہ روتے یہ حالت انتہائی اضطراب ورنج میں ہوتی ہے وہ اپنے خدا سے کہتے ہیں کہ میں ایک حالت پر ہوتا تو اس دورنگی سے چھوٹ جاتا اور مصائب کم ہو جاتے۔

(ولہ)

ربط خوبان عشوہ گر چھوٹا دیکھنے کا نہ لپکا پر چھوٹا
نہ وہ گھر کا ہوا نہ باہر کا یار کا اپنے جس سے در چھوٹا
نام لوں گا نہ زندگی کا پھر قید ہستی سے میں اگر چھوٹا

معروف کی کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس میں توحید و معرفت اور دنیا کی بے ثباتی نہ پائی جاتی ہو۔

(ولہ)

روح کب جسم میں آتی ہے نظر اے غافل یار گھر میں ہے ترے جان نہ گھر سے باہر

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار کا مفہوم نظم کیا ہے۔ واقعی اہل نظر عارف ہی حسن ازل کا نظارہ کرتا ہے۔

(ولہ)

دکھلاتی اس کے کوچہ میں پھرتی تھی ساتھ ساتھ تھی آہ آتشیں سے مجھے مشعل تمام رات

(ولہ)

ذیل کے شعر میں جو خوب عارفانہ رنگ پیدا کی ہے اس کا اظہار لفظوں میں دشوار ہے۔ اللہ اکبر فرشتوں کو بیان نہ رہے بلکہ فرشتہ صورت کی شکل بن کر آئے تو جان دیں گے ۔۔۔ ایسے نازک اشعار بہت کم نظر سے گذرے ہیں یعنی

ہستی کیا جان کر فرشتہ سے جائے بڑھ کے جب تک کہ نہ آشفتہ وہ اس کی صورت

(ولہ)

شب ہجراں کی وحشت اور گھبراہٹ کو ذیل کے شعر میں کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

سینہ میں گھبرا گیا ہوں دل کے گھبرانے سے آج لے در و دیوار بھاگو میرے کا شانے سے آج

(ولہ)

ہوا ہے آکے مری آستین کا پیوند یہ طفل اشک الٰہی ہو ناک کا پیوند

(ولہ)

ہو گیا حد سے زیادہ دل ویراں آباد بس غم و یاس و الم خانہ احساں آباد

معروف کا یہ مطلع میر درد کے اس مطلع سے کچھ کم لطیف نہیں ہے۔

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا   بس ہجوم یاس دل گھبرا گیا

دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

صاحب خانہ نہ جس گھر میں ہو وہ سونا ہے   خانۂ تن ہے ترے دم سے ہی اے جاں آباد

(ولہ)

یاد کر صبح چمن میں نفس سرد مرے   سر پہ خاک اپنے اڑاتی ہے صبا میرے بعد
کوئی مجھسا نہیں اطراف چمن میں یکسو   کچھ اگر ہے بھی تو ہے قبلہ نما میرے بعد

(ولہ)

جس سرزمیں پہ تیرے نقش قدم ہوں ظاہر   آنکھوں کی واں بناؤں درگاہ ہر قدم پہ

اسی کے قریب قریب جامی نے بھی ایک شعر کہا ہے مگر اسلوب بندش میں فرق ہے۔

بمقامے کہ نشان کف پائے تو بود   سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

(رندانہ)

جام دے اور نہ کر وقت پہ تکرار کہ بس   ساقیا ابر اٹھا ہے یہ دھواں دھار کہ بس

(ولہ)

زبان تیشہ فولاد کہتی تھی یہی ہر دم   نکلتی ہے یہ عشق کوہکن کے سنگ سے آتش

(ولہ)

کرتا ہے نہ کچھ سوئے عدم تو ہی سفر پیش   اے نقش قدم سب کو یہی راہ ہے درپیش
ہوں قاعدۂ عشق سے مجبور بہ تصور   ہے صفحۂ رخسار ترا شام و سحر پیش

(ولہ)

کاش کے سینہ میں جل کر ہو دل بیتاب خاک   یعنے پھر اکسیر ہے ہو جائے گر سیماب خاک

مذکورہ بالا شعر میں دل بیتاب کو صبر کی تلقین دی ہے صبر بہترین شے ہے سیماب اگر خاک ہو جائے تو اکسیر کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔ اسی طرح آدمی اگر صابر ہو جائے تو شان ارفع حاصل ہو سکتی ہے صبر پیغمبروں اور اولیاء اللہ کا شیوہ ہے صبر کی بلند پائگی واصبر علے ما اصابک انک من عظم الامور سے ظاہر ہے۔

(انقلاب روزگار)

موج دریا ہے انھوں کے گھر میں نقش بوریا   جو کہ بیٹھے ہیں سمجھ کر مسند سنجاب خاک

(انجام حیات)

یاں زمیں پر فرق کرے تو گدا و شاہ کا پر ہے منزل زیر خاک اے ہمسفر دونوں کی ایک

سعدی نے بھی قریباً اس مضمون کو خوب تر کہا ہے۔

نہ این است حال دہن زیر گل شکر خوردہ انگار با خون دل

(عاشقانہ)

تم کو دل کی بھی ہے کسی کے خبر دل میں خوش ہو کہ دلربا ہیں ہم
حیرت افزا ترا تصور ہے شکل آئینہ چشم وا ہیں ہم
لے چلو سوے شہر خاموشاں کشتۂ چشم سرمہ سا ہیں ہم

(متصوفانہ توحید)

حق کی ہستی میں ہو گئے نیست کیونکہ ناپائدار ہیں ہم

(ولہ)

ہے کہاں ملک عدم دور کہ مانند حباب طرفۃ العین میں پہونچے ہے بیکبار وہاں
گر یہیں تجکو نہ دیکھا تو بیران آنکھوں سے خاک دیکھے گا ترا طالب دیدار وہاں

دوسرے شعر (گر یہیں الخ) میں من ھذہ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی کے مفہوم کو موزون کیا ہے۔ ناصحانہ اور عارفانہ خیال ہے اور اس پر عمل کی ضرورت ہر مسلمان کو ہے۔ جس نے خدا کو یہاں نہ پہچانا وہ آخرت میں کیا پہچانے گا۔

(ولہ)

نگین دل پہ ترا نام کھودتے ہیں ہم جہاں میں تیشہ زنی بت تراش کرتے ہیں

قدیم زبان اور محاورات اشعار ذیل میں ملاحظہ ہوں مگر مذاق عشق کی چاشنی موجود ہے۔

اشک کی آنکھوں سے بوندیں کیا یہ ڈھلیاں دیکھیاں موتیا کی آج کلیاں ہم نے جلیاں دیکھیاں
یہ ہوئی بلبل ترانہ سنج گلشن میں سحر گردنیں غنچوں کی تم پر ہم نے ہلیاں دیکھیاں

آخری شعر (یہ ہوئی) میرے خیال میں نازکخیالی کا بہترین نمونہ ہے بلبلوں کی ترانہ سنجی سحر کو اس قدر دلکش تھی کہ اس کے تال سُم پر غنچوں کی گردنیں وجد میں ہلتی تھیں۔ نسیم سحر سے غنچوں بلکہ تمام ریاحین و اشجار میں جنبش ہوتی ہے بلبلوں کی ترانہ سنجی نے اس طربناک وقت میں خاص وجدانی حالت پیدا کر دی۔ اردو میں ایسے شعر ناظرین نے شاذ و نادر دیکھے ہوں گے۔ بالکل میر کا طرز بیان معلوم ہوتا ہے۔

لہ شاید کلیاں ہے۔

(ولہ)

قسمیں ہی جس شخص نے ملنے کی ہو کھائیاں — کیا کرے واں صلح کار ہیچ ہیں حیرانیاں
عشق میں جو ہجر کے غم سے ڈرا کرتے تھے لوگ — آہ وہی باتیں اب آگے مرے آئیاں
دام سے تھا زلف کے دل کو سرو کار کیا — ہائے یہ آنکھیں مرے سر پہ بلا لائیاں
خون جگر جائے سے کیوں نہ ہوں یار بن — غم کی ہیں اب بدلیاں سر پہ مرے چھائیاں
بھیس بدل کر وہاں جاتے تھا معروف تو — ہم نے تری چوریاں رات کو سب پائیاں

(ولہ)

جیسے متاع گم شدہ کی جستجو کریں — پھر دل یہ آرزو ہے کہ کیا آرزو کریں
گر ہجر ہو تو وصل کی ہم آرزو کریں — دلبر ہو جب بغل میں تو کیا جستجو کریں
بلبل نے دیکھ پاک گریبان گل کیا — کاش اس کو میرے تا نفس ہے رفو کریں
رسوائے عشق کی کبھی گر پاویں خاک پا — اُس خاک پر تو اپنی نثار آبرو کریں
کثرت میں دیکھتے ہو جو وحدت تو ہم ابھی — آئینہ پاش پاش ترے روبرو کریں
ہو جس کو اس سے دل کے لگانے کی آرزو — یکبار غنچہ تو اُس کے ذرا روبرو کریں

(ولہ)

ذیل کی مشکل طرح میں عاشقانہ رنگ اور لطف بیان ملاحظہ ہو۔ معشوق کے ساتھ گفتگو کس محبت اور پیار کر رہے ہیں۔

کیونکہ ہم بول مہر و مہ پوچھیں تو مست بتا کہ یوں — جب شب مہ ہو مہروش مُنہ سے نقاب اُٹھا کہ یوں
کوندتی ہے برق کس طرح پوچھیں تو مست بتا کہ یوں — مُنہ کو چھپا کے کھول دے کھول کے پھر چھپا کہ یوں
جو سکے کہ جذب عشق کیونکہ اثر دکھائے ہے — میرے گھر آ اور اپنے ساتھ اس کو بھی کھینچ لا کہ یوں
گر یہ کہیں کہ بعد مرگ دیجئے کسی کو کیونکہ دُکھ — غیر کے ساتھ ایک بار قبر پہ میری آ کہ یوں

(عاشقانہ اضطراب و شوق)

دیکھو وفور شوق ابھی لکھ رہا ہوں خط — دل مضطرب ہے پہلو میں خط کے جواب کو
اب دور سے بھی دیکھنے سے اُس کے رہ گیا — کیا کوسوں آہ اپنی میں چشم پُر آب کو

جب عرصہ دراز کے بعد دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات ہوتی ہے تو دونوں پر مسرت آمیز حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ کو معروف نے ذیل کے شعر میں نظم کیا ہے۔

بعد از مدت کل جو یکایک وصل ہوا تو ہم اور وہ — یوں تھے حیراں آپس میں جیسے دھرے آئینے دو

(ناصحانہ)

مے پرستاں وہ جا ہے رونے کی　　جس جگہ آب جو نہ ہووے گی

مصرعہ ثانی میں جس جگہ سے مراد میدان قیامت ہے یعنی دنیا میں شراب نوشی مسرت ہے مگر قیامت میں تم کو شراب (ام الخبائث) سے رونا پڑے گا۔ وہاں شراب کیسی آب جو بھی نہ ہوگی کہ تمھاری پیاس بجھے چشمۂ کوثر وغیرہ تو پرہیز گاروں کے لیے ہے۔

(ولہ)

جمادات کی غیر ممکن رفتار کو ذیل کے شعر میں کس خوبی سے ثابت کیا ہے۔

خرق عادت اپنے دیوانے کی دیکھ　　جس طرف کو وہ چلے پتھر چلے

(تلقین کسر نفسی)

اس کو یہ جان تو کہ کچھ ہی نہیں　　جو کہ اپنے گمان میں کچھ ہے

(اجتماع ضدین)

ناتوانی سے تو جوں کاہ بنا ہوں لیکن　　کوہ ہوں بارِ غمِ عشق اٹھانے کے لیے

اسی زمین میں ذیل کا شعر ملاحظہ کیجیے بالکل نیا آئینہ خانہ بنایا ہے۔ معشوق سے تخاطب قابل دید ہے۔

دل ہوا تیغ نگہ سے صد لخت　　مجھے لڑنا تھا تو اک آئینہ خانے کے لیے

(ولہ)

یہ غم فرقت سے آہ پُر اثر میں درد ہے　　جو مرے پہلو میں ہے اس کے جگر میں درد ہے
ہاتھ گلچیں نے مبادا گل پہ ڈالا ہو کہیں　　آج پھر کچھ نالۂ مرغ سحر میں درد ہے
ناز سے ماری تھی ٹھوکر دستۂ گل میں سحر　　جب سے اب تک ناخن رشک قمر میں درد ہے
اب میں جس کے پاس جاتا ہوں عجب ہوتی ہے سیر　　بس کہ اے معروف میرے شعر تر میں درد ہے

(ولہ)

دید دنیا حباب کی سی ہے　　اس کی تعبیر خواب کی سی ہے
ساقیا مے کہاں ہے شیشے میں　　روشنی آفتاب کی سی ہے
ساقیا جام مے سے ہاتھ نہ کھینچ　　ابھی تربت حباب کی سی ہے
دشت میں فیض گریہ سے میرے　　چاندنی سطح آب کی سی ہے

(رباعی)

فرقت میں تری جو ہم پہ دلبر گذری　　کیا تجھ سے کہوں کہ آہ کیونکر گذری

دل کو تو کبھی آہ کی تکلیف نہ دی   جو کچھ گذری سو آہ جی پر گذری

(دیگر)

کہا میں قرض دے بوسہ تو مجھ کو   اگر ہے تجھ کو مجھ سے کچھ بھی الفت
تو بولا ہے مثل معروف مشہور   کہ انّ القرض مقراض المحبت

(دیگر)

وہ مہروش اپنی زلف کھولے   کوٹھے پہ چڑھا ہوا کھڑا ہے
ساقی یہ دن ہے مے کشی کا   کیا ابر گھرا ہوا کھڑا ہے

(فارسی)

تا چند بگویم سحر و شام ترا   معروف خبر نیست ز انجام ترا
بگریز بحق کہ مو سفیدی آورد   از مرگ رسیدہ است پیغام ترا

اشارہ بہ آیہ ففروا الی اللہ آئمہ

(قطعہ)

رستے میں اتفاقاً وہ مل گئے جو ہم کو   بوسے ضرور آنا کل تم مرے مکان پر
ہم آج جو گئے تو انبوہ تھا نہایت   یکبار اُٹھ کے بولے بیٹھو مری زبان پر

(راقم ایک غیر معروف معروف کا ہمنام)

بادۂ کہن

(جناب مولانا فیض اللہ صاحب فیض خضری تونسوی)

کیوں عبث مصروف زاہد سعی لاحاصل میں ہے   ہیں دکھاوے کی نمازیں حب دولت دل میں ہے
موجزن اک درد بے پایاں کا دریا دل میں ہے   ہر خلش ہر آرزو ہنگامہ آرا دل میں ہے
آنکھ ہے وہ آنکھ جو دیکھا کرے صورت تری   دل وہی دل ہے کہ تو جلوہ نما جس دل میں ہے
تیرہ بختی ہے ازل سے قسمت اہل کمال   دیکھ لو دھبہ سیاہی کا مہ کامل میں ہے
ہم نشینی ہم کناری کے تو ہیں قابل کہاں   اک قدم بوسی کی حسرت ہے سو دل کی دل میں ہے
ایک تیری یاد ہے دار و مدار زندگی   نام تیرا لب پہ ہے تیرا تصوّر دل میں ہے
شکر ہے گو میں نہیں ہوں باریاب و فیضیاب   ذکر تو میرا مگر اُس شوخ کی محفل میں ہے

"سرودِ زندگی" اور حضرت آزاد کاکوروی

(جناب چودھری حامد حسین صاحب پیشکار جنگلات بلرامپور)

جناب ایڈیٹر صاحب الناظر - السلام علیکم - میں اصغر صاحب کے انتقال پر ملال کا تار پاکر ۱۷ دسمبر ۱۹۳۶ء کو الہ آباد آیا - مجھے اصغر صاحب کے لکھنے کی میز پر اور کتابوں کے ساتھ رسالہ "الناظر" لکھنو ماہ جولائی ۱۹۳۶ء ملا - شغل بیکاری کے طور پر نظر ڈالی تو فہرست مضامین میں "سرودِ زندگی" کے محاذ میں جناب منشی اظہر علی صاحب آزاد کاکوروی کا نام پایا - اصغر صاحب کے معاملہ میں لکھنؤ سے میرے توقعات کچھ بہت زیادہ مایوس کن ہیں - اور کاکوری کو لکھنؤ ہی سمجھنا چاہیے - اس لیے میں نے امید وبیم کی حالت میں (جس میں بیم کا حصہ زیادہ تھا) جلد جلد مضمون پر نظر دوڑائی اور پہلا تمہیدی صفحہ دیکھ کر قدرے اطمینان تو ہوا - کیونکہ حضرت آزاد نے اصغر صاحب کے محاسن کے اظہار میں کوئی کمی نہیں فرمائی - اور یہ فرما کر کہ "مجھے اصغر صاحب سے کوئی خلش نہیں ہے" اپنا مقصد واضح فرمایا ہے کہ

"مجھے بعض اشعار میں کچھ شبہات ہیں اور نقاد کا کام ہے کہ اگر عروس نظم کے حسین چہرے پر اُسے کہیں کہیں کچھ بدنما داغ نظر آتے ہوں تو اُن پر پردہ ڈالنے کی سعی لاحاصل نہ کرے - بلکہ آئینہ کی طرح انھیں صاف پیش کر دے - تاکہ یہ داغ دور کر دیے جائیں - حسن اپنی دلفریب رعنائیوں کے ساتھ چودھویں رات کا چاند بن کر آسمان ادب پر جلوہ افروز ہو جائے - اور گرد و پیش کی دنیا اس کی نورانی شعاعوں سے دیدہ و دل منور کر سکے"

لیکن ایک خلش میرے دل میں اب بھی باقی تھی - کیونکہ ادعائے باطل کے بہت سے نمونے پیش نظر تھے - اور شکر میں لپیٹ کر کونین پیش کرنے کی روش بہت عام ہے - لیکن حضرت آزاد کے تنقیدی نوٹ پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی - کیونکہ موصوف نے کسی موقع پر بھی جادۂ اعتدال سے قدم باہر نہیں رکھا - اور معلوم ہو گیا کہ وہ حقیقتاً طالب اصلاح ہیں نہ کہ معترض - اور یہی وہ طرز تنقید ہے جس کی اس وقت اردو کو ضرورت ہے -

کاکوری شریف سے مجھے یوں بھی عقیدت ہے - کیونکہ یہ وہ خطۂ پاک ہے جو ہمارے عہد اقبال سے آج تک علم دین اور تصوف کا گہوارہ رہا ہے اور ہے - اُس پر حضرت آزاد نے بار بار اپنی نسبت "فقیر" لکھ کر میرا سر نیاز اور بھی جھکا دیا ہے -

خوش قسمتی سے "نشاط روح" پر اعتراضات کے جوابات بیشتر میں نے ہی دیے ہیں اور چونکہ تنقیدوں میں حد درجہ کھینچ تان سے کام لیا گیا تھا - لہذا قلم سے بے اختیار شوخ فقرے نکل ہی گئے ہیں - لیکن حضرت آزاد

سے جو کچھ عرض کرنا ہے نہایت مودبانہ عرض کروں گا۔

میرے خیال میں جو عیوب ظاہر کیے گئے ہیں اُن میں زیادہ تر غلط فہمی معلوم ہوتی ہے جس کا رفع ہو جانا ضروری ہے اسی خیال سے میں جو کچھ آتا ہے عرض کرتا ہوں۔

شعر اصغر | کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی　　جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا

ارشاد حضرت آزاد | فقیر کو شبہ ہے کہ آگ دینا محاورہ ہے۔ پہلا مصرع کہتا ہے کہ ہوس میں کچھ یعنی بقدر قلیل آگ کا اضافہ [illegible] قدرے کر دیا۔ اور اس طرح عشق کی تعمیر عمل میں آئی۔ دوسرا مصرع بتاتا ہے کہ کچھ آگ لگا دینے کے بعد جب ہوس جل کر خاک ہو گئی تو عرفان بن گئی۔ اب یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ہوس ایسی شے نہیں جس کا جل کر خاک کی صورت میں تبدیل ہو جانا ممکن ہو۔ جسم خاکی۔ دل یا جگر نہیں اگر آگ لگ گئی ہوتی تو البتہ وہ جل کر خاک بن سکتا تھا۔ پھر ہوس اور عشق سے بُعد المشرقین ہے۔ ایک نار ہے تو دوسری چیز نور ہے۔ ہوس میں اگر آگ کا اضافہ کیا بھی جائے تو حاصل کیا ہوگا۔ ہوس ترقی کر کے نار جہنم کا ایک شعلہ بن جائے گی اور جب نوبت اس حد تک پہونچ جائے گی تو وہاں عشق کا نام لینا ہی بیکار معلوم ہوتا ہے کیا ہوس بازوں کے طوفان بے تمیزی کا دوسرا نام عشق ہے۔

گزارش | محاورہ کی بابت شبہ غیر ضروری ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ آدمی جو کچھ بولے محاورہ ہی بولے۔ کوئی سیدھی سادی بات زبان سے نہ نکال سکے۔ اب مطلب کی بابت عرض ہے کہ ایک چنگاری خواہ وہ کتنی ہی "بقدر قلیل" ہو ایک شہر کو جلا سکتی ہے۔ سادہ سادہ مطلب یہی ہے کہ ہوس میں آگ دی اور اُس کو مشتعل کر کے عشق کی تعمیر کی۔ دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ پر مستقل بالذات ہیں۔ ایک دوسرے کا نتیجہ نہیں جس کا یہ مطلب لیا جائے کہ جب ہوس جل کر خاک ہو گئی۔ کیونکہ شاعر نے اگر یہ سلسلہ رکھا ہوتا تو بجائے خاک کے "راکھ" کہتا۔ خاک کر دیا کا مطلب ہے نیست و نابود کر دیا۔ مٹا دیا وغیرہ اب مطلب واضح ہے تشریح کی ضرورت نہیں۔

شعر اصغر | اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن　　آج اُس کو حُسن و عشق کا ساماں بنا دیا

ارشاد حضرت آزاد | اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے "محو خواب" فرمائیے اگر پسند ہو۔ موجزن تو اُس وقت ہوئی جب حُسن و عشق کا سامان بنی۔

گزارش | حضرت آزاد ہی انصاف فرمائیں کہ برق جیسی مضطرب اور بیقرار چیز کے لیے "محو خواب" ہونا کہاں تک موزوں ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اپنی فطرت کے موافق فطرت کے ضمیر میں بھی "موجزن" ہی تھی۔ تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

شعر اصغر | زخم آپ لیتا ہوں۔ لذتیں اُٹھاتا ہوں　　تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

ارشادِ حضرت آزاد | زخم لینا شاید غلاف محاورہ ہو زخم کھانا نا لبا صحیح محاورہ ہو۔

گذارش | میں پھر عرض کروں گا کہ بستہ محاورے کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت آزاد کو شاعر کے مفہوم پر توجہ فرمانا چاہیے۔ اصغر صاحب کی بابت یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ موصوف یہ محاورہ نہیں جانتے تھے جسے ہر اُردو خواں جانتا ہوگا پھر محاورے کو چھوڑ کر "زخم لیتا ہوں" کہنے کی کوئی وجہ ہونا چاہیے "زخم آپ کھاتا ہوں" کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ "میں اپنی خوشی سے زخم کھاتا ہوں" لیکن شاعر کا مفہوم اس سے بلند ہے وہ کہتا ہے کہ میں کوشش کر کے اور اسباب پیدا کر کے زخم کھاتا ہوں۔ قاتل کو چھیڑ کر اور غصہ دلا کر مجبور کرتا ہوں کہ وار کرے۔ وار کسی اور پر ہوتا ہے میں دوڑ کر خود ہدف بن جاتا ہوں اور یہ مفہوم "زخم آپ لیتا ہوں" ہی سے ادا ہو سکتا تھا۔

شعرِ اصغر | جز دل حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں　　ایک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

ارشادِ حضرت آزاد | اگر "یہ" کے بجائے "کچھ" ہوتا تو غالباً بہتر ہوتا۔

گذارش | ممکن ہے بظاہر "کچھ" اچھا معلوم ہوتا ہو۔ لیکن "کچھ" میں عمومیت ہے۔ اور شاعر نے "یہ" سے صرف اپنے دوسرے مصرع کے مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کیفیت کی کسی کو خبر نہیں اور اس اشارہ خاص کے لیے "یہ" ہی بہتر ہے۔

شعرِ اصغر | خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغر　　جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے

ارشادِ حضرت آزاد | "طرز" کی جگہ اگر "وہم" ہوتا؟

گذارش | یہ تو عرض نہیں کر سکتا کہ وہم غلط ہے کیونکہ فلسفہ کا ایک نظریہ یہ بھی ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی صرف "وہم" کافی ہے۔ "وہم نظر" کچھ نامناسب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُس کے لیے "طرزِ نظر" ہی درست ہے۔ ایک گروہ دنیا کو "سجن المؤمنین اور جنۃ الکافرین" کہتا ہے۔ تو دوسرا جنت اور دوزخ کو ڈھکوسلا ہی سمجھتا ہے وہ کہتا ہے کہ اسی دنیا میں جنت بھی ہے دوزخ بھی۔ غرضکہ دنیا کو ہر شخص اپنے نقطۂ خیال سے دیکھتا ہے۔ اور یہی طرزِ نظر ہے۔

شعرِ اصغر | چاہیے داغِ معصیت اُس کے حریم ناز میں　　پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

ارشادِ حضرت آزاد | سرمد فرما چکے ہیں

مے خور سے خورد اگر خدا میخواہی　　ناکردہ گناہ پیش قاضی نہ برند

شاعر صاحب یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ "مستحق کرامت گناہگار انند" لیکن مصرع اولیٰ میں جو الفاظ ہیں وہ شاید ان معانی کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اس مصرع کی نثر کیا ہوگی؟ "اُس کے حریم ناز میں داغِ معصیت چاہیے"

معنی بظاہر بہت صاف ہیں۔

گذارش | بیشک شاعر کا وہی مقصد ہے جو حضرت آزاد سمجھے۔ "اُس کے حریم ناز میں داغ معصیت چاہیے" میں کیا خرابی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ "اُس کے حریم ناز میں داغ معصیت کی طلب ہے" یا "اُس کے حریم ناز میں داخلہ کے لیے داغ معصیت چاہیے۔ آخر شاعر کو اس کی اجازت ہے یا نہیں کہ ایک آدھ لفظ مقدر بھی رکھے یا خواہ مخواہ اُسے ہٹ ہی کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

شعرِ صفر | گم ہے حقیقت آشنا بندۂ دہر بے خبر ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

ارشادِ حضرت آزاد | حقیقت آشنا یعنی اہل اللہ تو اس معنی میں گم کہے جاسکتے ہیں کہ سوا ذات باری تعالیٰ کے دنیا وما فیہا سے انھیں مطلب نہ تھا۔ اس جہان فانی کے عارضی لذات یہاں کے فانی اور غیر حقیقی رنج و آلام اور مسرتوں سے وہ کوئی غرض اور واسطہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ایک لمحے کے لیے ادھر متوجہ ہونا پسند کرتے تھے اب رہے دنیا دار جنھیں شاعر صاحب بندۂ دہر فرما رہے ہیں وہ کیونکر بے خبر ٹھہرے اگر اس وجہ سے بے خبر فرمائے گئے کہ وہ حقیقت آشنا نہیں ہیں تو "ہوش کسی کو بھی نہیں" قابل غور ہے۔ اگر وہ بیہوش ہیں تو اس کے ساتھ "بندۂ دہر" بھی تو ہیں۔ بیہوش ہوتے تو دنیا کے کاروبار بحیثیت "بندۂ دہر" ہونے کے وہ کیونکر انجام دے سکتے تھے؟

گذارش | نہایت سیدھی سی بات تھی جس میں حضرت آزاد اس طرح اُلجھ گئے۔ حقیقت آشنا تو گم ہیں اور "بندۂ دہر" بے خبر ہے کس سے؟ حقیقت سے۔ لہذا دونوں کو ہوش نہیں ہے۔ اب حقیقت کا پتہ کوئی کس سے پوچھے۔ بیہوش کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دماغ خراب گیا ہے۔ یوں تو دنیا کے کاروبار جیسے بندۂ دہر کرتے ہیں حقیقت آشنا بھی کرتے ہیں خواہ کتنے ہی بے تعلق کیوں نہ ہوں۔

شعرِ صفر | موجِ نسیم صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے اور بھی جان پڑ گئی کیفیت نماز میں

ارشادِ حضرت آزاد | "نسیم صبح" کی جگہ اگر "نسیم کعبہ" ہوتا؟

گذارش | مجھے حضرت آزاد جیسے خوش مذاق اور صوفی مشرب بزرگ سے ایسی خشک اصلاح کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ "نسیم کعبہ" اگر ہوتا تو شعر غارت ہو جاتا۔ اس لیے کہ "صنم کدہ" ہی شعر کی جان ہے۔ اس کو اگر نکال ڈالا جائے تو شعر قالب بے روح ہو جاتا ہے۔ ایک رند مشرب شاعر اور بلند نظر صوفی جو کعبہ و صنم کدہ کی تفریقات سے بالاتر ہو چکا ہو "صنم کدہ" ہی کہہ سکتا تھا اور اسی میں لطف بھی تھا۔ "نسیم کعبہ" کے اول تو کوئی معنی نہیں جب تک "کعبہ سے آئی ہوئی نسیم صبح" نہ کہا جائے۔ اُس وقت تک مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اور بفرض محال ادا بھی ہوتا ہو تو زیادہ سے زیادہ "کریما بہ بخشائے بر حالِ ما" کی قسم کا شعر ہو سکتا ہے۔ شعریت سے اُس کو کیا علاقہ۔

"بوئے کعبہ" تو نماز میں بنیادی طور پر شامل تھی۔ لیکن کیفیت نماز میں جان بوئے کعبہ اور بوئے صنم کدہ کی متضاد کیفیات نے ڈالی۔

شعرِ اصغر | حسن ہزار طرز کا ایک جہان اسیر ہے　　ملحد با خبر بھی گم جلوۂ لا الٰہ میں

ارشادِ حضرت آزاد | اس شعر میں تجلیات صفات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اسم ذات ایک ہی ہے جسے اسم اعظم بھی کہتے ہیں۔ بعضوں کے نزدیک اللہ اسم ذات ہے۔ بقیہ اسمائے گرامی مثلاً ستار۔ غفار۔ رحمٰن۔ خالق۔ کریم۔ ذو الجلال والاکرام اسمائے صفات ہیں۔ خدا کی تجلیات کو شاعر نے حسن ہزار طرز فرمایا ہے۔ لیکن حسن ہزار طرز فارسی ترکیب ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اساتذہ عجم کے نزدیک اس موقع پر کون سا لفظ برمحل سمجھا جا سکے گا خالص اصفہانی فرماتے ہیں ؎

غبار راہ گشتم۔ سرمہ گشتم توتیا گشتم　　بچندیں رنگ گشتم تا بچشمش آشنا گشتم

"حسن ہزار طرز" کی جگہ اگر "حسن ہزار رنگ" ہوتا، ملحد بظاہر باخبر کہنے کے قابل تو نظر نہیں آتا۔ وہ تو شاید بے خبر ہی رہے گا۔ اگر باخبر ہوتا تو ایک لمحہ بھی ملحد رہنا گوارا نہ کرتا۔ سعدی نے خوب فرمایا ہے ؎

ایں مدعیاں در طلبش بے خبر انند　　آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

گذارش | اس معاملہ میں حضرت آزاد نے زیادتی فرمائی ہے۔ آپ نے مثال جو پیش فرمائی اُس میں "رنگ" کا لفظ "بچندیں" کے ساتھ ہے "ہزار" سے اُس کا کیا تعلق۔ اور پھر خالص اصفہانی نے "بچندیں رنگ" کہہ کر کوئی ممانعت تو کر نہیں دی ہے کہ سوائے "ہزار رنگ" کے "ہزار طرز" کوئی نہ کہے۔ ورنہ غالب کی جرأت کیسے ہوتی کہ ع رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود۔ فرماتے لہذا اگر "ہزار شیوہ" پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو "ہزار طرز" نے کیا قصور کیا ہے۔ دوسرا اعتراض "ملحد باخبر" پر ہے۔ التماس ہے کہ شاعر اُسے خود "باخبر" کا خطاب نہیں دیتا بلکہ یہ لفظ طنزیہ ہے یعنی "بزعم خود باخبر" ملحد ذات باری کے انکار سے گویا اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ باخبری کا مدعی ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ شاید اصغر صاحب کی حیات میں حضرت آزاد کے اس فقرہ پر کہ "اگر اہلِ نظر نے کافی دلچسپی لی تو ممکن ہے کہ یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہے" ممکن ہے کہ موصوف کے آئندہ مضامین کا خیر مقدم کرتا لیکن اب تو اصغر صاحب ایسے عالم میں پہونچ گئے ہیں کہ رد و قبول سے بے نیاز ہیں۔ نیز اگر کوئی مشورہ قابلِ قبول ہوتا تو مرحوم خود ہی اپنے کلام میں تغیر و تبدل کر سکتے تھے اب تو یہ حق کسی کو بھی نہیں اس لیے میں جناب آزاد سے دبستہ استدعا کروں گا کہ اصغر صاحب کے کلام کے حسین و جمیل پہلو کو مدنظر رکھ کر اُس سے لطف اندوز ہوں اور عیوب سے چشم پوشی فرما کر مرحوم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ کیونکہ سہو و خطا خاصہ بشری ہے جس سے کوئی بڑے سے بڑا انسان بچ نہیں سکتا۔ والسلام

ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری

سنہ ۱۹۳۶ء ہی نہیں عصر حاضر کی تاریخ میں ۱۰ دسمبر ایک یادگار دن رہے گا جب شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم نے تخت و تاج سے اپنی دست برداری کا اعلان کیا۔ یہ عظیم الشان واقعہ تاریخ برطانیہ میں عدیم المثال ہے۔ پہلی مرتبہ ایک برطانوی بادشاہ نے برضا و رغبت تخت و تاج چھوڑا۔ یوں بھی تاریخ عالم میں اس کی نظیر ملنا دشوار ہے قصہ کہانیوں میں تو سُنا کرتے تھے کہ فلاں بادشاہ نے کسی کے فراق میں سلطنت چھوڑ کر فقیری لے لی لیکن واقعات کی دنیا میں ایسی مثال دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ ایڈورڈ ہشتم نے ثابت کر دیا کہ ابھی دنیا میں معجزوں کا دور ختم نہیں ہوا۔ نپولین نے فرانس کے لیے جوزیفائن کو، مصطفےٰ کمال نے ترکی کے لیے سلطنت کو چھوڑا تھا لیکن ایڈورڈ ہشتم نے مسز سمپسن کے لیے سلطنت برطانیہ کو تج دیا۔ نپولین اور مصطفےٰ کمال کی قربانیاں عظیم الشان سہی ایڈورڈ کا ایثار بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں۔

یہ واقعہ مختلف حیثیتوں سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس آئینہ میں دنیا والوں نے دنیا کی سب سے زبردست سلطنت کے ہر دلعزیز بادشاہ کی مجبوری و بیکسی کا منظر دیکھا۔ وہ تاجدار جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ اپنی مرضی سے شادی کر سکے۔ دنیا میں سب سے زیادہ آزاد خیال ملک میں آزادی رائے کے علمبرداروں نے اپنے محبوب حکمراں کو انتخاب ازدواج میں آزادی دینے سے انکار کر دیا۔ اور رسم و رواج کی قربان گاہ پر ایک جلیل القدر فرمانروا کو بھینٹ چڑھا دیا۔ ۱۰ دسمبر سے ایک روز قبل تک برطانوی رائے عامہ متفقہ آواز سے ایڈورڈ ہشتم کی معزولی کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیتی رہی لیکن اس کے بعد اس نے سکون قلب سے اس دست برداری کو دیکھا اور اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

کیا یہ عبرت کا مقام نہیں کہ جس ملک میں ہر فرد کو اپنے نجی معاملات میں قطعی آزادی حاصل ہو وہاں کا فرمانروا رسم و رواج کے بندھنوں میں اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ قدم نہیں اُٹھا سکتا۔

مسز سمپسن ایک امریکن نژاد خاتون ہیں اور طبقۂ عوام سے تعلق رکھتی ہیں ان کے پہلے دو شوہر ہنوز بقید حیات ہیں جن سے وہ طلاق حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی بارگاہ حسن میں ایڈورڈ ہشتم نے بھی نذرانۂ دل پیش کیا۔ اخلاقیات عامہ کے خود ساختہ محافظ اس کی اجازت کب دے سکتے تھے۔ ادھر شہنشاہ کے دل میں اس سودے کی لگن تھی۔ مجبوراً اُن کو تخت و تاج بعینامہ میں دینا پڑا اور وہ یہ کہتے ہوئے اپنے ملک اپنی قوم اور اپنی حکومت سے رخصت ہوئے۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم　　شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ہندوستانیوں میں چھوت چھات سے ذات پات کی تفریق ہے۔ فرقہ بندیاں ہیں انھیں میں سے کچھ لوگوں کے متعلق ترجمان حقیقت نے کہا ہے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

یہاں شادیوں پر پابندیاں ہیں۔ نوجوانوں اور لڑکیوں کو اپنی مرضی سے شریک حیات کے انتخاب کا حق حاصل نہیں ہے۔ مہذب انگلستان اپنے باشندوں کو آزادی رائے اور آزادی عمل کی نعمتیں بخشنے کا مدعی ہے لیکن دنیا نے دیکھا کہ ہندوستانی تو راجہ کے گھر آئی رانی کہلانے کے قائل ہیں اور انگلستان کا شہنشاہ محض اس وجہ سے شادی نہیں کر سکتا کہ اس کی ہونے والی بیوی طبقہ عوام سے ہے اور مطلقہ ہے غیر ملکی ہونا تو کوئی وجہ اختلاف نہیں خود ملکہ میری بھی نسلاً انگریز نہیں بلکہ شاہی خاندان کا ہونا بھی ضروری نہیں کہ اکثر بیگمات برطانیہ کو یہ شرف حاصل نہیں تھا۔ عام ہندوستانیوں کے نزدیک بادشاہ کا تخیل یہ ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ انھیں حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ اتنا مجبور ہے کہ اپنی رائے سے شادی بھی نہیں کر سکتا۔

آج جب ایڈورڈ ہشتم محض ڈیوک آف ونڈسر ہیں ہر شخص ان کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرنے کے لیے آزاد ہے جتنے منہ اتنی باتیں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سلطنت کے فرائض کو چھوڑ کر اور ایک معمولی عورت سے رشتہ محبت کو استوار کر کے کمزوری اور عدم اہلیت کا ثبوت دیا لیکن معترض بھولتے ہیں

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عشق والوں کی دنیا میں عقل کی کوئی گنجائش نہیں۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

ایڈورڈ ہشتم بادشاہ ہونے کے باوجود ایک انسان کے پہلو میں دل رکھتے تھے پھر جب وہ دل مسز سمپسن کے حسن کا دیوانہ سا پروانہ ہو چکا تھا اور وہ شادی کا عہد کر چکے تھے کیا عہد شکنی کرتے اور اگر یہ ممکن بھی ہوتا تو پھر دنیا میں منہ دکھانے کے قابل بھی رہتے کیا دنیا انھیں "رسوائے جہاں عاشقی" کے لقب سے یاد نہ کرتی اور یہ سب کچھ بھی برداشت کر لیا جاتا تو کیا مسز سمپسن کی لگن ان کے دل سے نکل جاتی۔ ممکن تھا کہ وہ اپنا دل خون کرنے کو تیار ہو جاتے لیکن کیا اس کی تلخ یاد ان کی شاہانہ زندگی کو اجیرن نہ بنا دیتی کیا قدم قدم پر انھیں اپنی مجبوریوں کا دلشکن احساس نہ ہوتا۔ کیا وہ اس کے بعد دیانتداری سے سلطنت کی خدمات انجام دے سکتے تھے۔ سلطنت چھوڑ دینے میں سوائے اپنی ذات کے کسی کا نقصان

جہاں تک قانون کا تعلق ہے صورت حال یہ ہے کہ بادشاہ ہی مطلق العنان ہے۔ پارلیمنٹ کا کوئی بل بغیر شاہی منظوری کے قانون نہیں بن سکتا۔ بادشاہ جس کو چاہے سفیر مقرر کر سکتا ہے۔ فوج کا تقرر اور بیرونی شائستگی غیر ممالک سے صلح ناموں کی تکمیل اور اعلان جنگ کا اختیار، امراء کا تقرر، مقدمات کا آخری اپیل، یہ سب امور بادشاہ کے اختیارات خصوصی میں شامل ہیں۔ لیکن یہ کاغذی باتیں ہیں عملی دنیا میں ان کا کوئی اثر نہیں۔ اگر مجلس وزراء کے فیصلے کے خلاف بادشاہ ان میں سے کسی ایک اختیار پر بھی عمل پیرا ہونا چاہے تو شاید ایک دن بھی اپنی حکومت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ صدیوں سے ان کا استعمال نہیں ہوا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ جس طرح سلطنت مغلیہ کے زوال اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد عروج میں "ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" تھا اسی طرح برطانیہ کے غیر تحریری آئین میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ "ملک بادشاہ کا اور حکم وزیر اعظم بہادر کا"۔ منٹو مارلے اصلاحات کے عہد میں جب پہلی مرتبہ وائسرائے اور گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ میں ایک ہندوستانی رکن مسٹر سنہا کے تقرر کا سوال پیش ہوا تو شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم نے آخر وقت تک نہایت جوش اور خلوص کے ساتھ اس تجویز کی مخالفت کی لیکن کابینہ کے متفقہ فیصلہ کے سامنے اُن کو جھکنا پڑا اور بالآخر مسٹر سنہا کا تقرر ہو کر رہا۔

بادشاہ کو اتنا بھی اختیار نہیں کہ اپنی زبان سے کوئی لفظ عوام کے سامنے کہہ سکے۔ اس کی تقریر میں وہی ہوتا ہے جو اس کے وزراء اس کے منہ سے کہلانا چاہتے ہیں۔ پارلیمنٹ کو جو شاہی پیغامات موصول ہوا کرتے ہیں وہ دراصل حکومت وقت کے خیالات ہوتے ہیں جو بادشاہ کی زبان سے ادا کروائے جاتے ہیں ورنہ بادشاہ کو پارلیمنٹ سے براہ راست تخاطب کا کوئی حق نہیں۔ ایڈورڈ ہشتم کی الوداعی تقریر کا پہلا جملہ اسی زباں بندی کی غمازی کر رہا ہے۔

"بالآخر آج میں کچھ اپنے جی کی کہہ سکتا ہوں۔"

ایڈورڈ ہشتم نے جس زمانہ میں پرورش پائی وہ جمہوریتوں کا زمانہ تھا۔ جنگ عظیم کے بعد سے یورپ کے براعظم نے متعدد انقلابات دیکھے ہیں۔ ایڈورڈ نے اپنی آنکھوں سے بہت تاج و تخت مٹتے اور بادشاہتیں ختم ہوتے دیکھیں۔ ان کے زمانہ میں معمولی سپاہی اور آہنگر بڑی بڑی سلطنتوں کے ڈکٹیٹر بنے انھوں نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی آویزش کا تماشا دیکھا تھا۔ زار و قیصر کے استبداد کی دھجیاں ان کے سامنے بکھیری گئی تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دنیا اب تکلفات قیود اور استبداد سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ یہی چیز ان کی زندگی میں نمایاں تھی۔ سریر آرائے حکومت ہونے کے بعد سے انھوں نے اپنی جدت پسندی کا اظہار کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا اور ہمیشہ روایات قدیم کی دھجیاں اڑانے کی کوشش کرتے رہے۔

اس تھوڑے ہی عرصہ کی حکومت میں ان سے بہت سے ایسے کام سرزد ہوئے جن کی توقع برطانیہ کے قدامت پرست بادشاہ سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مزدوروں سے ملنا۔ عوام سے ملانیہ ہمدردی کا اظہار کرنا۔ امور سلطنت میں اثر انداز ہونا حکومت وقت کے لیے اضطراب وکشمکش کا باعث ہو سکتا تھا۔ مسٹر اسٹینلے بالڈون نے اکثر ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ تاج برطانیہ اپنے بہت سے خصوصی اختیارات سے محروم ہو چکا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ بھی غالباً اس کو سمجھتے تھے اور ترک سلطنت سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ آئین ملک کا اُن کی نگاہ میں کس قدر احترام تھا اور وہ اپنی قوم کے جذبات کی کتنی پاسداری کرتے تھے۔

اُن کی شادی میں کوئی آئینی دقت سد راہ نہ تھی۔ برطانیہ کی کتاب القوانین میں کوئی آئین ایسا موجود نہیں ہے جس کی رو سے بادشاہ وقت کو اپنی شادی کے لیے کسی دوسرے کی منظوری حاصل کرنا پڑے صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ بادشاہ کی بیوی پروٹسٹنٹ ہو گی۔ اگر وزیر اعظم اور ان کی حکومت بادشاہ کی شادی سے متفق نہیں تھے، تو وہ ان کو مستعفی ہونے پر مجبور کر سکتے تھے اور پارلیمنٹ کی کسی دوسری پارٹی سے ترتیب وزارت کا کام لے سکتے تھے اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہوتی تو اُن کو یہ اختیار تھا کہ وہ پارلیمنٹ کو برخاست کر دیتے اور اپنی شادی کے مسئلہ کو بنائے انتخاب قرار دے کر عوام کی رائے حاصل کرتے۔ عوام کے طبقہ میں ان سے ہمدردی کا جذبہ موجود تھا کشمکش کے زمانہ میں ان کو ہزاروں پیغامات ہمدردی کے موصول ہوتے رہے لیکن اُنھوں نے اس کا فائدہ اُٹھانا مناسب تصور نہ کیا۔ کیونکہ ایسی صورت میں ملک کے اندر ایک بادشاہ پارٹی وجود میں آتی اور خانہ جنگی پھیل جاتی۔ یورپ جس نازک مرحلے سے اس زمانہ میں گزر رہا ہے اُس میں یہ چیز حکومت برطانیہ کی استقامت کے لیے مضر ثابت ہوتی۔ ایڈورڈ کو اپنی ذات سے زیادہ اپنے ملک کا پاس تھا۔

ایڈورڈ ہشتم کی شادی کی مخالفت وزیر اعظم نے تنہا اپنی ذمہ داری پر کی۔ اس میں اُنھوں نے اپنے رفقار کار سے بھی مشورہ نہیں لیا۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی جو وزیر اعظم نے اپنے سر لی۔ مسٹر چرچل نے بہت زور دیا کہ انقطاعی فیصلہ سے قبل پارلیمنٹ کی رائے ضرور حاصل کر لی جائے۔ کرنل ویجوڈ نے تو اس موضوع پر بادشاہ کی حمایت میں ایک ریزولیوشن دارالعوام میں پیش کرنے کا نوٹس بھی دیا لیکن حکومت اس نازک مسئلہ پر عام بحث و مباحثہ مناسب نہیں سمجھتی تھی اس لیے اُس کی پیشی کی نوبت نہیں آئی۔ برطانوی قوم نے اس نازک موقع پر جس قدر ضبط اور نظام کا ثبوت دیا ہے وہ حیرت انگیز ہے اگر کوئی اور ملک ہوتا تو خدا جانے کیا صورتیں پیش آتیں۔ یہ واقعہ آئین برطانیہ کے استحکام کی ایک ناقابل تردید شہادت ہے۔

نظرے خوش گذرے

ادھر چھ ہفتے سے طبیعت برابر بدمزہ رہی۔ اس پر انتخابی مہم کے سلسلہ میں دو ہفتے متواتر عام جلسوں میں شریک ہو کر تقریریں کرنا پڑیں، نتیجہ یہ کہ الناظر کی خدمت میں ہرج واقع ہوا، اور اس نمبر کے لئے کچھ لکھنے کا وقت نہ ملا۔

مرزا داغ کے شاگردانِ رشید میں منشی محمد حیات بخش رسا بھی شامل تھے۔ وہ کاسنہ ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے کچھ عرصہ تک ریاست رامپور سے تعلق رہا اور سنہ ۱۹۱۶ء میں انتقال کر گئے۔ کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی اور نہ کوئی عزیز رہا۔ شاگردوں کے پاس ان کا کلام ہے، انھوں نے جو چھپوانے کی زحمت گوارا نہیں کی حالانکہ اُن کے شاگردوں میں حضرت جگر مراد آبادی، مولانا تاجور نجیب آبادی اور نواب آفسر میرٹھی جیسے حضرات بھی ہیں۔ اب مکرمی جناب مولوی محمد اظہار الحسن صاحب شکیل [illegible] آبادی نے مولانا احسن مارہروی اور پروفیسر عبداللہ صاحب کامل کی امداد سے جو کلام فراہم کیا ہے اُس سے سردست ایک مجموعہ مرتب ہو گیا ہے اور اس خیال سے الناظر میں شائع کیا جاتا ہے کہ ایک خوشگو شاعر کا کلام محفوظ ہو جائے۔ بقیہ کلام بھی اگر دستیاب ہو گیا تو آئندہ کسی وقت مکمل دیوان کی اشاعت ہو سکے گی۔

مولانا حسرت موہانی نے اپنے سلسلہ منتخبات میں رسا کا کچھ کلام شائع کیا تھا اور تذکرۃ الشعراء میں منتشر حالات قلمبند کئے ہیں۔ خمخانہ جاوید میں لالہ سری رام صاحب نے بہت کچھ ستائش و صفت کی ہے اور تمام اللہ میں بھی مرحوم کا ذکر داغ کے ممتاز تلامذہ کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ مولوی اظہار الحسن صاحب کا ارادہ ہے کہ اس مجموعہ کی طباعت کے بعد دیباچہ تحریر فرمائیں گے جس میں شاعر کے ضروری سوانح بھی آ جائیں گے۔

یہ مجموعہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ امید ہے کہ اسی شش ماہی کے اندر شائع ہو جائے گا۔

عزیزی محمد عارف سلمہ خلف منشی منظور علی صاحب (مولف واقعات کربلا) بی اے میں پڑھتے ہیں۔ اُن کے ادبی ذوق کا نتیجہ "غریب" ہے۔ اس ننھی سی کتاب میں غریب، قربانی، آزادی اور مزدور کے عنوان سے چار عجیب ادبی سبق آموز طبعزاد افسانے ہیں، افسانوں کی زبان صاف اور سلیس ہے تو خیالات عمدہ اور نفیس۔ جو صاحب چاہیں ۲ کے ٹکٹ بھیج کر دفتر الناظر سے طلب کرلیں۔

۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلامِ رسا

ہاتھ اُٹھے تو ادا حرفِ تمنا نہ ہوا (۱) اس دعا گو کو دعا کا بھی سلیقہ نہ ہوا

شکر ہے دے کے انھیں دل کوئی جھگڑا نہ ہوا
میرا تیرا نہ ہوا اپنا پرایا نہ ہوا

کون سا عشقِ بتاں میں ہمیں صدمہ نہ ہوا
دردِ فرقت نہ ہوا غم نہ ہوا کیا نہ ہوا

ہم سے بڑھ کر کہیں آوارہ وطن میں یہ بُت
جب سے نکلے ہیں میسر انھیں کعبہ نہ ہوا

دل ہوا چاک تو ارماں کہیں کے نہ رہے
پھر کسی گھر بھی غریبوں کا ٹھکانا نہ ہوا

غیر نے بات تو کی بات تو پوچھی میری
خیر سے تم کو تو اتنا بھی سلیقہ نہ ہوا

بیٹھے بیٹھے بھی رہی شغلِ جنوں سے ہم کو
گھر میں ہم خاک اُڑاتے ہیں جو صحرا نہ ہوا

خواب میں بھی تو نظر بھر کے نہ دیکھا اُن کو
یہ بھی آدابِ محبت کو گوارا نہ ہوا

محوِ حیرت ہیں تو دونوں ہیں تری محفل میں
ہم سے پردہ ہوا آئینہ سے پردا نہ ہوا

جوشِ پرشان کرمی جو سرِ حشر آئی
پیش پھر کاتبِ اعمال کا لکھا نہ ہوا

کیا توقع ہے کہ وہ زینتِ پہلو ہوگا
جو تصور میں ہم آغوشِ تمنا نہ ہوا

آگئے آپ دمِ نزع بڑی خیر ہوئی
کہ ہمارا ملک الموت سے جھگڑا نہ ہوا

کر دیا آپ پہ صدقے دلِ ناداں اپنا
لاکھ پیارا تھا مگر آپ سے پیارا نہ ہوا

کاش اچٹ کر ہی ترا تیر نظر آ جاتا
ہائے اس دل کے برابر یہ کلیجا نہ ہوا

ان کی یہ خوبیِ اخلاق کہ وعدہ تو کیا
میری یہ شومیِ تقدیر کہ ایفا نہ ہوا

جوشِ وحشت میں بھی اشکوں کی روانی نہ گئی
خشک دم بھر کے لیے دامنِ صحرا نہ ہوا

جذبۂ عشق سے ہم اُن کو بلا لیتے رساؔ
یہ بھی کمبخت طبیعت کو گوارا نہ ہوا

اُن کا ہر بات پہ تصویرِ حیا ہو جانا (۲) کہہ رہا ہے کہیں وعدہ کا وفا ہو جانا

جس کی حسرت ہو محبت میں فنا ہو جانا
ایسے بیمار کو مشکل ہے شفا ہو جانا

ہونے والی ہے کسی دیکھنے والے کی نظر
ہوشیار اے نگہِ ہوش رُبا ہو جانا

کسی صورت سے پہونچ بابِ اثر تک اے آہ
کچھ نہ بن آئے تو دشمن کی دعا ہو جانا

آج تو وصل کی ہے رات نہ روٹھو ہم سے
پھر خفا ہونے کو سو بار خفا ہو جانا

لیجئے جان تو حاضر ہے مگر شرط ہے یہ
آج سے قائلِ اربابِ وفا ہو جانا

آئینہ دیکھ کے اُن کے تو بجا ہوش نہیں
تو نہ بیخود نگہِ ہوش ربا ہو جانا

دو قدم چل کے دکھا دو تو دکھا دیں تم کو
فتنۂ حشر کا قدموں پہ فدا ہو جانا

بن گئی دم پہ تو آئے وہ عیادت کے لیے
راس آیا ہمیں جینے سے خفا ہو جانا

قید سے چھوٹنے والا ہے ہمیں بھی صیاد
ابھی اے فصلِ بہاری نہ ہوا ہو جانا

تم اگر لاکھ کہو ہم سے تو کیا ہوتا ہے
سخت مشکل ہے تصور سے جدا ہو جانا

طعنے کیا دیتے ہو آئینہ کو حیرانی پر
دیکھنا تم نہ کہیں محوِ ادا ہو جانا

اے رسا بام پہ وہ جلوہ دکھائیں گے ضرور
کہیں بیہوش نہ اے مردِ خدا ہو جانا

اپنی مصیبتوں کا کریں ہم خیال کیا (۳) جس میں خوشی ہو آپ کی اُس کا ملال کیا

کہتے ہیں اب چھپاؤ گے تم [illegible]
ہاتھ آ گئی ہے لوحِ طلسمِ خیال کیا

میں نے کہا کہ مرتا ہوں بولے مجال کیا
یہ بھی سہی تو خیر کسی کو ملال کیا

ہر بات پر وہ کہتے ہیں تیری مجال کیا
یہ حال ہے تو اُن سے کروں عرضِ حال کیا

جو دل میں ہے وہ شکل سے ہے عیاں لیجیے
صورت سوال ہے تو کروں میں سوال کیا

یہ دن اسی لیے ہیں یہ سن ہے اسی لیے
جب آ گیا شباب تو عذرِ وصال کیا

تم بے وفا ہوئے جو مرا ساتھ چھوڑ کر
دے گا نہ میرا ساتھ تمہارا خیال کیا

کیسی نویدِ وصل کہاں کا غمِ فراق
جب دل ہی چھن گیا تو خوشی کیا ملال کیا

خنجر کا نازکی سے سنبھلنا محال ہے
مجھ سخت جاں کو آپ کریں گے حلال کیا

لایا اگر نہ قلزمِ رحمت کو جوش میں
پھر کام آئے گا عرقِ انفعال کیا

چلتے ہوئے وہ حضرتِ دل اُٹھ کے بزم سے
بیٹھے ہو سر جھکائے ہوئے تم نڈھال کیا

سن لو تو ہے غریب نوازی نہیں تو خیر　　کیا میں غریب اور مرا عرض حال کیا
تم چودھویں کا چاند اگر ہو ہوا کرو　　مل جائے گا کسی کو تمہارا کمال کیا
ہم تو اسی خیال میں دنیا سے چل بسے　　اب بھی نہ ہوگا تم کو ہمارا خیال کیا

اس سے نہیں وفا کی توقع ہے اے رسا
پوچھا کبھی نہ جس نے کہ ہے تیرا حال کیا

(۴)

حال دیکھا جو غم عشق میں غمخواروں کا　　پھٹ گیا اور کلیجہ جگر افگاروں کا
جس طرف دیکھیے انبوہ ہے غمخواروں کا　　ناک میں دم ہے ستمگر ترے بیماروں کا
ہم سے اے پیر مغاں عظمت میخانہ نہ پوچھ　　تو سلامت ہے تو کعبہ ہے یہ میخواروں کا
عرق شرم سر حشر بڑے کام آیا　　دھل گیا دفتر اعمال گنہگاروں کا
وہ جو آئے تو ہر اک جان سے قربان ہوا　　اب مری لاش پہ ماتم ہے عزاداروں کا
نگہ یاس سے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں　　حال دیکھا نہیں جاتا ترے بیماروں کا
جان دی ہم نے محبت میں تو حیرت کیا ہے　　یہ تو شیوہ ہے مری جان وفاداروں کا
ہم کو جنت میں بھی میخانہ بہت یاد آیا　　ہائے وہ بزم وہ جلسہ ہے کہاں یاروں کا
زاہدو اور کہیں اپنا ٹھکانا کر لو　　خلد کہتے ہیں جسے گھر ہے گنہگاروں کا
کر دیا تجھ سے ستمگر کو مسیحائے زماں　　ہے یہ ادنیٰ سا کرشمہ ترے بیماروں کا
سو جفائیں ہوں اگر آہ نہ کرنا اے دل　　حوصلہ پست نہ ہو جائے ستمگاروں کا
ابھی موجود ہیں ہم جنس وفا کے گاہک　　نام باقی ہے محبت کے خریداروں کا
اس کو جنت بھی عطا ہو تو جہنم سمجھے　　جس پہ سایہ ہے ترے کوچہ کی دیواروں کا
ناز سے جنبش ابرو پہ کسی کا کہنا　　وار روکے کوئی چلتی ہوئی تلواروں کا

حشر کے روز بھی اپنا نہیں کوئی افسوس
کچھ ٹھکانا ہے رسا ان کے طرفداروں کا

(۵)

وہ بت، مجھ پہ کیا مہرباں ہو گیا　　عدو اک جہاں کا جہاں ہو گیا
بلا سے مری جان جاتی رہی　　تمہیں تو چلو امتحاں ہو گیا
مرے دم سے شان آپ کی بڑھ گئی　　یہ در قابل پاسباں ہو گیا
نئی بات لو حضرت دل سنو　　وہ نا مہرباں مہرباں ہو گیا

جھجکتا ہے اپنے بھی سایہ سے تو   یہ کیا تجھ کو اے بدگماں ہو گیا
مرے دل کی حسرت ملی خاک میں   مکیں سے یہ خالی مکاں ہو گیا
نہ بچے جان کیونکر کہ دشمن مرا   ادھر تو اُدھر آسماں ہو گیا
جھکا ایک عالم تجھے دیکھ کر   ترا آستاں آستاں ہو گیا
محبت وہ کیا ہے جو دل میں نہیں   وہ کیا راز ہے جو عیاں ہو گیا
مرے قتل پر سب نے فتوے دیے   زمانہ ترا ہمزباں ہو گیا
سمجھ لیں گے کافر تجھے ایک دن   جو اپنا خدا مہرباں ہو گیا
ہم اور اُن سے کہتے بھلا حال دل   خدا جانے کیونکر بیاں ہو گیا
بنا دی جنوں نے یہ حالت مری   تماشائے اہل جہاں ہو گیا

وہ کہتے ہیں آزار ہے کیا تجھے
رسا تو بہت ناتواں ہو گیا

اپنی وحشت پہ بجا ہے اب تو اترانا مرا (۱)   جن کا دیوانہ ہوں وہ کہتے ہیں دیوانا مرا
چپ ہوں میں اور ارمان دل ہر اک نے جانا مرا   یہ خموشی بھی مری گویا ہے افسانا مرا
نام ہے مشہور اک دنیا میں دیوانا مرا   قیس کا افسانہ وحشت ہے افسانا مرا
راس آیا ہے مجھے وحشت میں مرجانا مرا   وہ مجھے روتے ہیں یہ کہہ کر ہائے دیوانا مرا
غیر کو ساقی نے جب بھر کر دیا جام شراب   آنسوؤں سے ہو گیا لبریز پیمانا مرا
بیخودی میں وہ ہوا دیتے ہیں دامن کی مجھے   ہوش میں آئیں کہاں اب ہوش میں آنا مرا
میرے رونے پر وہ اُن کا مسکرانا بار بار   اور بلائیں لے کے وہ قدموں پہ گر جانا مرا
کیونکر اتنوں میں کہوں میں داستان درد و غم   تا بروز محشر ہو یارب اور افسانا مرا
عشق کی آفت سے بچنا اب بہت دشوار ہے   میں ہوں دیوانہ کسی کا یہ ہے دیوانا مرا
یہ مری تقدیر ہے صیاد کی تقصیر کیا   کھینچ کر لایا قفس میں آب اور دانا مرا
اشک حسرت بزم میں پینا مئے کے عوض   دل بھر آیا ہو گیا خالی جو پیمانا مرا
حضرت ناصح کی باتیں میں سمجھتا ہی نہیں   ناسمجھ ہیں دل لگی سمجھے ہیں سمجھانا مرا

۱؎ رسا وہ بھی شریک محفل ماتم ہوئے
خضر بھی مرتے ہیں جس پر ہے وہ مرجانا مرا

نہیں ہوتا نہیں ہوتا وہ ستمگر اپنا (۷) پھوڑ ڈالیں گے کسی روز مقدر اپنا

ہم نے کچھ تم سے کہا تھا جو سمجھ کر اپنا — ہائے قسمت وہی افسانہ ہے گھر گھر اپنا

آئیے اپنی وفا کے بھی دکھا دوں جوہر — لائیے آج اُٹھا لائیے خنجر اپنا

دفتر کاتب اعمال کھلا رکھا ہے — کس طرح حال چھپاؤں سر محشر اپنا

تو نے عزت اسے بخشی ہے نہ تیغ کیا — تیرے قدموں کے بھی قابل تو نہ تھا سر اپنا

ہم سے کیا پوچھتے ہیں آپ ہمارا مسکن — کر لیا خانہ خرابی نے وہاں گھر اپنا

جب کسی کا کوئی ارمان نکلتے دیکھا — حسرت دل نے کہا ہائے مقدر اپنا

کیسی حیرت ہے انھیں میری گراں جانی سے — دست نازک میں لیے بیٹھے ہیں خنجر اپنا

ان کے دربان نے پہچان لیا جان لیا — ہم وہاں لاکھ گئے بھیس بدل کر اپنا

دل دیا ہم نے انھیں حضرت ناصح کو غرض — اپنا شوق اپنی طبیعت دل مضطر اپنا

ہائے وہ کرتے ہیں برباد ہمارے دل کو — جن کے ارمان سمجھتے ہیں اُسے گھر اپنا

اُف رے نخوت دم رفتار وہ جل جاتے ہیں — سایہ جب دیکھتے ہیں اپنے برابر اپنا

داغ فرقت سے جدا زخم محبت سے جدا — دل دکھایا نہیں جاتا ہے ستمگر اپنا

اے رسا عشق میں کیا کیا ہوئی ذلت ہم کو
غیر بھی اب تو سمجھنے لگے نوکر اپنا

یہاں آتے ہی پھر جانا کسی کا (۸) کچھ آنے میں ہے یہ آنا کسی کا

دکھا کر شکل چھپ جانا کسی کا — رہے گا یاد تڑپانا کسی کا

در دشمن پہ بھی کر لیں گے سجدہ — سر آنکھوں پر ہے فرمانا کسی کا

مجھے دیکھا تو بولے مسکرا کر — چلا آتا ہے دیوانا کسی کا

خدا رکھے سلامت تجھ کو ساقی — رہا خالی نہ پیمانہ کسی کا

کبھی آئینہ سے بیزار ہونا — کبھی تصویر بن جانا کسی کا

شباب آتے ہی آرائش کی سوجھی — کوئی دیکھے تو اترانا کسی کا

بڑھاتا ہے ہماری بدگمانی — عدو کے آگے شرمانا کسی کا

نہ سمجھا ہم سے دیوانوں کو ناصح — سمجھتے ہیں یہ سمجھانا کسی کا

بلائیں لوں کسی نقش قدم کی — بتاتا ہے کہیں جانا کسی کا

وفا کی داد ہے اے حضرت دل — جفا کے بعد پچھتانا کسی کا
غرض کیا تھی ہمیں ذکر عدو سے — مزا دیتا ہے جھنجھلانا کسی کا
قیامت ڈھا گیا دل پر ہمارے — دم رخصت وہ سمجھانا کسی کا
نہ کیوں نازاں ہوں میں قسمت پہ اپنی — کہ ہوں مشہور دیوانا کسی کا

رسا کیا لطف دیتا ہے سر حشر
سپتے کی سن کے شرمانا کسی کا

(۹) بزم میں آپ کا انداز نظر دیکھ لیا — آپ نے دیکھنے والوں کا جگر دیکھ لیا
ہم نے بھی آپ کا انداز نظر دیکھ لیا — آپ کی بندہ نوازی کہ ادھر دیکھ لیا
یوں مری حسرت دیدار نکلتی ہے کہیں — کیا ہوا ان کو تصور میں اگر دیکھ لیا
آہ کی ہم نے تو وہ اور خفا ہم سے ہوئے — تو نے اے بے اثری اپنا اثر دیکھ لیا
اُن کی رفتار پہ ہوتی تھی قیامت صدقے — یہ تماشا بھی سر راہ گذر دیکھ لیا
نہ کیا ضبط محبت کا کبھی تو نے لحاظ — ہم نے سو بار تجھے دیدۂ تر دیکھ لیا
دادخواہوں کی اُدھر ہو گئیں آنکھیں نیچی — اس نے ہنگامۂ محشر میں جدھر دیکھ لیا
ماہ کامل بھی لیے پھرتا ہے دل میں حسرت — شاید اس نے بھی تجھے رشک قمر دیکھ لیا
تاک میں اُن کی در غیر پہ ہم جا پہونچے — بدگمانی کا بُرا ہو کہ یہ گھر دیکھ لیا
میان میں تیغ ستم کی نہ مرے قاتل نے — اپنے قدموں پہ نہ جب تک مرا سر دیکھ لیا

داغ دل سب کو دکھاتے ہوئے پھرتے ہو رسا
تم نے کچھ عشق و محبت کا ثمر دیکھ لیا

(۱۰) میسر ہے اُسے ہر دم نظارہ روئے جاناں کا — ہمارا کیا مقدر ہے مقدر ہے نگہباں کا
کہوں کیا وصل کی شب اضطراب اس آفت جاں کا — کبھی منھ ڈھانک کر کھولا کبھی منھ کھول کر ڈھانکا
جہاں دیکھو وہیں چرچا ہے میرے عشق پنہاں کا — ڈبو دی چشم گریاں نے بُرا ہو چشم گریاں کا
پڑی ہے ہر کسی کو اپنی اپنی جوش وحشت میں — گریباں ہے نہ دامن کا نہ دامن ہے گریباں کا
کوئی تدبیر اُن کے وصل کی اب بن نہیں آتی — دل بسمل خدا حافظ ہے تیرا تیرے ارماں کا
پڑی ہیں تیر بن بن کر نگاہیں اس کلیجے پر — یہ کس نے آج مجھ کو روزن دیوار سے جھانکا
دم رخصت نہ پوچھے کوئی ہم سے ہم پہ کیا گذری — کسی کا اُٹھ کے چلنا اور اُٹھنا درد ہجراں کا

مرے زخموں پہ تم چھڑکو نمک اچھا بہت اچھا — مجھے بھی امتحاں منظور ہے ظرفِ نمکداں کا
گھٹایا ہے یہاں تک زور وحشت ناتوانی نے — کہ مشکل ہو گیا ہے توڑنا تارِ گریباں کا
تجھے مجھ سے یہ بیرحمی تجھے مجھ سے یہ بیدردی — ستمگر درد ہونا چاہیے انساں کو انساں کا
عدو کا منہ تکا کرتا ہوں پہروں ہاتھ مل مل کر — جو کوئی حرف سنتا ہوں میں اپنے رازِ پنہاں کا
بنایا آبلہ پائی نے وہ ایذا طلب مجھ کو — چبھو لیتا ہوں گر چبھتا نہیں کانٹا بیاباں کا
خدا کے واسطے اے ضبطِ گریہ مجھ کو رونے دے — نکلنا آنسوؤں کا ہے نکلنا میرے ارماں کا
مجھے اس کا نہیں شکوہ کہ وہ مجھ سے نہیں ملتے — غضب یہ ہے نہیں ملتا مزاج اُن کے نگہباں کا

رسا اپنے مقدر پر کرے جو فخر تھوڑا ہے
کہ دامن ہاتھ آیا ہے شہ حامد علی خاں کا

(۱۱)

نگہ شرم سے ہر ایک کو بسمل دیکھا — عجب اندازِ حیا کا سرِ محفل دیکھا
آئینہ آئینہ پر ان کے مقابل دیکھا — اپنے انداز پہ خود ہی اُنھیں مائل دیکھا
ہو کے بیزار سرِ راہگذر پھینک دیا — اس نے جب دل کو نہ میرے کسی قابل دیکھا
کبھی دل تھام کے ہم بیٹھ گئے غربت میں — کبھی اُٹھ کر طرف دوری منزل دیکھا
دوڑ کر شوقِ شہادت نے بلائیں لے لیں — دستِ قاتل میں مگر خنجرِ قاتل دیکھا
اس کی پھوٹی ہوئی تقدیر کو روئے ہم بھی — جس کے دل کو کسی سفاک پہ مائل دیکھا
آئینہ دیکھتے ہی نیچی نگاہیں کر لیں — کیسے شرمائے ہیں جب اپنا مقابل دیکھا
جان دینے کی ہوئی اہلِ عزا کو حسرت — میرے ماتم میں جو اس شوخ کو شامل دیکھا
کھو کر اپنا دل گم گشتہ ہوا ہے یہ حال — اشک بھر آئے کسی کا جو کہیں دل دیکھا
روک لی تیغِ ستم غیر کی دیتے ہی قسم — بات کی بات میں قاتل کو نہ قاتل دیکھا
پیاری صورت جو تھی ہم نے بھی بلائیں لے لیں — پیار آیا جو تمھیں پیار کے قابل دیکھا
کوچۂ زلفِ بتاں ہے کہ کوئی زنداں ہے — اچھے اچھوں کو یہاں پا بہ سلاسل دیکھا
مجھ سے نفرت ہے یہاں تک کہ سمجھ کر وہ مجھے — چھپ گئے گھر میں جو دروازہ پہ سائل دیکھا
سچ ہے کوئی نہیں ہوتا ہے مصیبت کا شریک — اپنے پہلو سے شبِ ہجر جدا دل دیکھا
نہ کھلی ہائے کسی سے مری قسمت کی گرہ — کبھی حل ہوتے نہ یہ عقدۂ مشکل دیکھا
دیکھا ہر کام کا دنیا میں نتیجہ ہم نے — لیکن اس عشق و محبت کا نہ حاصل دیکھا

لے رسا تیرِ ستم اپنے کلیجہ پہ لگا
غیر کی سمت جب اس نے سرِ محفل دیکھا

ساقی جو دیے جائے یہ کہہ کر کہ پیے جا (۱۲) تو میں بھی پیے جاؤں یہ کہہ کر کہ دیے جا
جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دیے جا — اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کیے جا
کچھ اور نہ کر مجھ پہ جفائیں تو کیے جا — کچھ اور نہ لے میری دعائیں تو لیے جا
گستاخ نہ ہو وصل میں اے دستِ تمنا — کچھ دیر ابھی ان کی بلائیں تو لیے جا
کیا لذتِ تعذیر نے مجبور کیا ہے — آتا ہے یہی جی میں کہ تقصیر کیے جا
کہتا ہے کسی شوخ کا مجھ سے یہ لڑکپن — ارمان کیے جا ابھی ارمان کیے جا
کمبخت رسا تیری رسائی نہیں ان تک
تو خوب سا اس نام کو بدنام کیے جا

ان کی خلوت میں رسا بھی ہوگا (۱۳) کبھی یوں حکم خدا بھی ہوگا
رازِ الفت کا چھپاتے ہو عبث — یہ چھپائے سے چھپا بھی ہوگا
مجھ پہ جو تو نے ستم ڈھایا ہے — کہیں دنیا میں ہوا بھی ہوگا
صبر والوں کا بھی دن آئے گا — ایک دن روزِ جزا بھی ہوگا
آپ سا کوئی نہیں دنیا میں — آپ نے یہ تو سنا بھی ہوگا
محفلِ شعر میں ہو آئیں چلو
آج سنتے ہیں رسا بھی ہوگا

آہ ہوتی مرے لب پر نہ یہ نالا ہوتا (۱۴) ایک بھی تو نے جو ارمان نکالا ہوتا
ہو گئے ضد سے مری سیکڑوں تیرے عاشق — میں نہ ہوتا تو کوئی چاہنے والا ہوتا
کیا سنبھالو گے کسی کے دلِ بیتاب کو تم — اپنے ابھرے ہوئے جوبن کو سنبھالا ہوتا
اپنی محفل سے مجھے تم نے نکالا تو کیا — کوئی ارمان مرے دل کا نکالا ہوتا

ہیں وہ خود بھی لاجواب اُن کا دہن بھی لاجواب (۱۵) اب کہاں کا نامہ کس کا نامہ بر کیسا جواب
گذری اک مدت نہیں آیا مرے خط کا جواب — ہو گیا پیدا مبر عنقا پر عنقا جواب
اس سے بہتر تھا نہ دیتے وہ مرے خط کا جواب — غیر کا لکھا ہوا آیا تو کیا آیا جواب

بنام خداوند جہاں آفرین
جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں
(تاریخ اجراء الناظر سنہ ۱۳۲۷ھ) (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

جلد ۴۳	فروری ۱۹۳۷ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ [illegible]

پُرانے رسالے

حسب ذیل رسائل کا ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ جن صاحب کو ضرورت ہو طلب فرمائیں (محصول وغیرہ ذمہ خریدار ہوگا)

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ اردو

نمبر	جلد	ماہ و سنہ		قیمت
نمبر۲	جلد اول	اپریل سنہ ۲۱ء		عار
۱۳	جلد ۴	جنوری سنہ ۲۴ء	مجلد	عار
۱۴		اپریل سنہ ۲۴ء		عار
۱۵		جولائی سنہ ۲۴ء		عار
۱۶		اکتوبر سنہ ۲۴ء		عار
۱۷	جلد ۵	جنوری سنہ ۲۵ء		عار
۱۹		جولائی سنہ ۲۵ء		عار
۲۰		اکتوبر سنہ ۲۵ء		عار
۲۱	جلد ۶	جنوری سنہ ۲۶ء		عہر
۲۲		اپریل سنہ ۲۶ء		عہر
۲۳		جولائی سنہ ۲۶ء		عہر
۲۵	جلد ۷	جنوری سنہ ۲۷ء		عہر
۲۶		اپریل سنہ ۲۷ء		عہر
۲۷		جولائی سنہ ۲۷ء		عہر
۲۹	جلد ۸	جنوری سنہ ۲۸ء		عہر
۳۰		اپریل سنہ ۲۸ء		عہر
۳۱		جولائی سنہ ۲۸ء		عہر
۳۳	جلد ۹	اپریل سنہ ۲۹ء		عہر
نمبر۳۵		جولائی سنہ ۲۹ء		عہر
۳۶		اکتوبر سنہ ۲۹ء		عہر
۳۷	جلد ۱۰	جنوری سنہ ۳۰ء	مجلد	عہر
۳۸		اپریل سنہ ۳۰ء		عہر
۳۹		جولائی سنہ ۳۰ء		عہر
۴۰		اکتوبر سنہ ۳۰ء		عہر
۴۱	جلد ۱۱	جنوری سنہ ۳۱ء		عہر
۴۲		اپریل سنہ ۳۱ء		عہر
۵۵	جلد ۱۴	جولائی سنہ ۳۴ء		عہر
۵۶		اکتوبر سنہ ۳۴ء		عہر
۵۷	جلد ۱۵	جنوری سنہ ۳۵ء	مجلد	عہر
۵۸		اپریل سنہ ۳۵ء		عہر
۵۹		جولائی سنہ ۳۵ء		عہر
۶۰		اکتوبر سنہ ۳۵ء		عہر

ہندستانی اکیڈمی کا سہ ماہی رسالہ ہندستانی

نمبر	جلد	ماہ و سنہ		قیمت
نمبر۱	جلد ۱	جنوری سنہ ۳۱ء	مکمل جلد	عہ
۲		اپریل سنہ ۳۱ء		عہ
۳		جولائی سنہ ۳۱ء		عہ
۴		اکتوبر سنہ ۳۱ء		عہ

الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

بنام خداوند جاں آفریں

نمبر ۲ جلد ۴۳ فروری ۱۹۳۷ء

خلیفہ معتصم باللہ

(جناب مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے معلم تاریخ اسلامی جامعہ عثمانیہ)

(بسلسلہ ماہ گذشتہ)

سب سے پہلے اُس سازش کا ذکر کرنا ضروری ہے جو عباس بن مامون کے حق میں کی گئی تھی، کیونکہ افشین اور عُجَیف بن عنبسہ کے درمیان اسی وجہ سے دشمنی پیدا ہوئی تھی۔ افشین ماوراءالنہر کے صوبۂ اشروسنہ[1] کا رہنے والا تھا، اور اُس کا تعلق قدیم ایرانی شاہی خاندان سے تھا۔ وہ خلیفہ کا ندیم اور معتمد علیہ تھا، اور اس سے قبل سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے مصر میں نام پیدا کر چکا تھا۔ اس کے بعد بابک کی طول و طویل بغاوت کا خاتمہ بھی اُسی کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اب چونکہ معتصم نے افشین کو فوج کے میمنہ کا افسر مقرر کیا تھا، اس لیے وہ دوسرے سپہ سالاروں پر فائق تھا، اور فوجی ضبط و تنظیم میں بھی اُس کی بہت اہمیت تھی۔ اُس کی یہ ترقی عرب سپہ سالار عُجَیف بن عنبسہ کو، جسے تھوڑی سی فوج دے کر زبطرہ بھیج دیا گیا تھا، ناگوار گذری۔ کیونکہ اب فوج میں اُس کی حیثیت محض ماتحت افسر کی سی رہ گئی تھی۔ عُجَیف نے عباس کو، جسے مامون کی وفات کے بعد فوج کے ایک حصہ نے خلیفہ بنانا چاہا تھا، خلافت کا دعوے کرنے پر اُکسایا، اور اُسے

---

[1] دیکھو اوریی (فرانسیسی ترجمہ) ج ۲ - ص ۲۰۳ + اشروسنہ خجند اور سمرقند کے تقریباً بیچ میں واقع تھا۔ ابن جوزی (ورق ۱۱۷) کے مطابق افشین کوئی خاص نام نہ تھا، بلکہ اشروسنہ کے رئیسوں کا عام لقب تھا؛ اس کا اصلی نام حیدر بن کاؤس ہے۔

غیرت دلائی کہ وہ باپ کی وفات پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا، اور لوگوں کو معتصم کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اجازت دے دی۔ عباس بھی آخر راضی ہو گیا۔ بہت سے عرب سپہ سالار اور بھی ایسے تھے، جنھیں ایتاخ اور اشناس کا عروج ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، کیونکہ وہ غیر عرب تھے، اور غلامی سے ترقی کر کے سپہ سالار بن گئے تھے۔ یہ لوگ بھی اس سازش میں شریک ہو گئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جوں ہی موقع ملے معتصم اور ان سپہ سالاروں کو، جو اُس کے ساتھ تھے، قتل کر دیا جائے۔ چونکہ معتصم اُس وقت دریائے سلیسیا کے کنارے کوچ کر رہا تھا، اور افشین کی ترکی فوجیں ططیہ کے علاقے میں تھیں، اس لیے عجیف چاہتا تھا کہ فوراً کارروائی شروع کر دی جائے۔ مگر عباس، باوجود اس کے کہ حکومت کا خواہشمند تھا، یہ نہ چاہتا تھا کہ خانہ جنگی شروع ہو۔ کیونکہ خلیفہ کے قتل سے یقیناً یہی ہوتا، اور فوج کے اتحاد کا خاتمہ ہو جاتا۔ محاصرہ عموریہ کے دوران میں احمد بن خلیل اور عمر الفرغانی دونوں سپہ سالاروں کی بے عزتی ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ معتصم تو افشین اور اُس کی ترکی فوجوں کی بہادری کا معترف تھا؛ اور دوسری طرف اشناس نے ان دونوں سپہ سالاروں کو، جو اُس کے ماتحت تھے، ولدالزنا کہہ دیا تھا۔ احمد بن خلیل مدتوں سے عباس اور اُس کے ہمدرد حرث السمرقندی سے ملا ہوا تھا، اور اس واقعہ کے بعد عمر الفرغانی بھی اس سازش میں شریک ہو گیا تھا۔ عموریہ کی فتح کے بعد عجیف نے انتظام کیا کہ مالِ غنیمت لوٹ لیا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس طرح اہلِ فوج کو معتصم کے خلاف بھڑکائے، اور بے چینی سے فائدہ اُٹھا کر اپنا مقصد حاصل کرے۔ مگر سازشیوں کی یہ تجویز بارآور نہ ہو سکی۔ اول تو خود مفسدوں کا تذبذب سدِ راہ ہوا، اور پھر معتصم کے ذاتی تہور نے اُسے پورا نہ ہونے دیا۔ معتصم نے تلوار ہاتھ میں لے کر تمام فساد ختم کر دیا، اور

سلہ ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۸۰ + ابن خلدون۔ ج ۳۔ ص ۲۶۴ +

سلہ ایتاخ پہلے سلام الابرش کا غلام اور باورچی تھا۔ ۱۹۹ھ یا ۲۰۰ھ میں معتصم نے اسے خریدا اور اپنا باورچی بنایا۔ پھر بابک کے خلاف فوج دے کر بھیجا۔ اس کے بعد ایتاخ ترکی فوج میں ترقی کرتا گیا۔ اس کا نام ایتاخ، ایناخ اور ایتاغ لکھا جاتا ہے۔

سلہ یہ بھی ترکی غلام تھا۔ اس نے مامون کے عہد میں حلب کے قریب سندیس یا سندوس کا قلعہ فتح کیا تھا، اور وہاں کا حاکم مقرر ہوا تھا، یہ ابن اثیر کا بیان ہے۔ اس نے قلعہ کا نام سدس بھی لکھا ہے۔

سلہ ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۴) نے بالکل صاف لکھا ہے کہ یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جب معتصم درہ میں سے گذر رہا ہو تو اُسے قتل کیا جائے۔ مگر ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۰) لکھتا ہے کہ یہ کام اُس وقت انجام پاتا جب کہ افشین طلیہ سے ایشیائے کوچک جاتا، اور اُس کے بعد انقرہ پہنچتا، جہاں خلیفہ اُس کا انتظار کر رہا تھا +

سلہ ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۷۹ +

کسی فرد بشر کو اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے بعد خلیفہ کے حکم سے تمام مال غنیمت مساوی طور پر تقسیم کیا گیا[1]۔ اس واقعہ کے بعد عمر الفرغانی کی بے احتیاطی سے خلیفہ کو سازش کا علم ہو گیا۔ معتصم کے خدام میں ایک نوجوان تھا، جس سے عمر کو بہت محبت تھی۔ مال غنیمت کے تاراج کی جو کوشش کی گئی اُس کے دوسرے دن شام کو عمر کی ملاقات اس نوجوان سے ہوئی۔ اس لڑکے نے تمام واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے معتصم کے عزم و حزم کی تعریف کی۔ عمر نے یہ سُن کر اُسے مشورہ دیا کہ ایسے شور و شغب سے دور رہا کرے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو خود خلیفہ کی خدمت میں زیادہ رہنے سے بھی پرہیز کرے۔ عمر اور احمد کی واپسی کے بعد چونکہ ان دونوں نے اشناس کے ہاتھوں اپنی بے حرمتی کی شکایت کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں کسی دوسرے سپہ سالار کے ماتحت کر دیا جائے، اس لیے اس نوجوان کو عمر کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔ اُس نے تمام باتیں خلیفہ کے سامنے عرض کر دیں۔ اس کا علم ہوتے ہی معتصم نے عمر کو بلایا، اور اُس سے پوچھا کہ اُس شور و شغب کی رات کو اُس نوجوان سے کیا کیا کہا تھا۔ عمر اُس وقت اتنا مدہوش تھا کہ اُسے معلوم نہ ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور تمام گفتگو خلیفہ کے سامنے دُہرا دی۔ معتصم نے عمر کو ایتاخ کے پاس نظر بند کر دیا۔ احمد بن خلیل نے جب یہ سُنا تو اُس نے خلیفہ کی خدمت میں باریابی کی درخواست کی۔ چونکہ اشناس مانع ہوا، اس لیے اُس نے حرث السمرقندی سے اس سازش کے متعلق جو کچھ سُنا تھا اشناس کو بتا دیا۔ اب حرث کو گرفتار کیا گیا۔ اُس نے جرم کا پورا اقبال کیا، اور مفسدوں کے نام بھی بتا دیے۔ لیکن ان مفسدوں میں افسران فوج کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ معتصم کو یقین نہ آیا۔ واقعہ کی صداقت معلوم کرنے کی غرض سے اُس نے عباس کو خوب شراب پلائی، اور بہت سے وعدے کر کے حقیقت حال دریافت کی۔ حرث نے جو کچھ کہا تھا، عباس نے اُس کی تصدیق کی۔ اب معتصم کو اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے فوراً مجرموں کو یکے بعد دیگرے گرفتار کرایا، چند کو موت کی سزا دی، اور بعض کو زنجیروں سے جکڑوا کر وحشی درندوں کے سامنے ڈلوا دیا۔ عباس افشین کے سپرد کیا گیا۔ اُس نے اُسے منبج میں قید کیا، کھانے کو پیٹ بھر کر دیا، مگر پیاسا مار ڈالا۔ یہی انجام عُجیف بن عنبسہ کا ہوا۔ عمر الفرغانی کو نصیبین میں زندہ دفن کرا دیا گیا۔ باقی ماندہ مجرم افسران فوج قتل ہوئے۔ اُس وقت سے عباس کو لعین کہا جانے لگا۔ اُس کے سب بھائی بہنوں کو بھی قید کر دیا گیا۔ صرف حرث کو خلیفہ نے معافی دی، کیونکہ اُسی نے سب سے پہلے سازش کی پوری اطلاع خلیفہ کو دی تھی۔

---

[1] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۰) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۵) نے لکھا ہے کہ عباس مال غنیمت کی لوٹ کے دوران میں معتصم کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

معتصم کے خلاف اس گہری فوجی سازش کا یقیناً ایک نتیجہ یہ تھا کہ فوج کو نئے سرے سے ترتیب دینا ضروری سمجھا گیا۔ خلیفہ کو پورا اندازہ ہو گیا کہ عرب شیوخ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، اور انھیں بے دخل کر کے فوج کا انتظام ترکوں اور ایرانیوں کو سپرد کرنا لازمی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نو دولت اجنبی غلاموں میں بھی اتحاد اور یگانگت بہت دنوں تک قائم نہ رہی۔ رشک و حسد، بلند نظری، مال و دولت کا لالچ، اور قوت حاصل کرنے کا جذبہ، یہ سب باتیں بے اثر نہ رہیں۔ یہ لوگ ملک و ملت میں اجنبی تھے، اس لیے انھیں ان کی بہبودی کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ہم خلافت کے اُس المناک دور تک پہونچ گئے ہیں جب کہ اہم ترین واقعات عموماً سیاسی یا مذہبی تخیل سے پیش نہیں آتے تھے، اور خلیفہ کی ذات بھی قابل توجہ نہیں رہی تھی۔ اب واقعات کا سرچشمہ وہ مختلف سازشیں اور فتنے ہیں جو صوبوں کے والی اور سپہ سالار ذاتی مفاد کے لیے برپا کرتے تھے۔

افشین کو عبداللہ بن طاہر کے والی خراسان ہونے پر حسد تھا۔ اُس نے طبرستان کے اسپہبد، مازیار بن قارن کو خلیفہ کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا، اور وعدہ کیا کہ وہ اپنی فوج سمیت اُس سے مل جائے گا۔ کیونکہ افشین سمجھتا تھا کہ جب حالت نازک ہو گی تو اُسی کو فوج دے کر بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیا جائے گا، اور فتح پانے کے بعد عبداللہ بن طاہر کو آسانی سے بے دخل کیا جا سکے گا۔ مازیار خود بھی بغاوت پر آمادہ تھا۔ کیونکہ فتح طبرستان کے بعد دفتری لحاظ سے خلیفہ اور اسپہبد میں عبداللہ بن طاہر حائل تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ والیٔ خراسان ہونے کی حیثیت سے عبداللہ طبرستان کا بھی والی تھا۔ مگر مازیار کو یہ گوارا نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا تعلق براہ راست خلیفہ سے رہے، اور خراج بجائے خراسان بھیجنے کے خلیفہ کے پاس بھیجا کرے[51]۔ دوسری طرف افشین اور عبداللہ بن طاہر میں ان بن تھی۔ بابک کی بغاوت کے دوران میں افشین بڑی بڑی سرکاری رقمیں غبن کر کے اپنے وطن اشروسنہ بھیجتا رہتا تھا، اور عبداللہ اس کی اطلاع ہمیشہ خلیفہ کو دیتا تھا۔ ایک مرتبہ یہاں تک ہوا کہ افشین نے کچھ رقم چند آدمیوں کے ہاتھ اشروسنہ بھیجی۔ ان لوگوں کو عبداللہ نے چوروں کے بہلنے سے گرفتار کر لیا، اور جو رقم اُن کے پاس نکلی اُسے اپنی فوج میں تقسیم کر دیا[52]۔ بہرکیف مازیار بن قارن کی بغاوت اتنی خطرناک تھی کہ خوف تھا کہ اُس کی وجہ سے تمام آذربائیجان اور شمالی میسوپوٹامیا میں آگ لگ جائے گی۔ مگر عبداللہ بن طاہر اُسے فرو کرنے، اور ملک میں امن قائم رکھنے کے لیے بالکل تیار رہتا تھا۔ خود طبرستان میں

---

[51] ابن اثیر ج ۶ - ص ۱۸۶ + ابن خلدون ج ۳ - ص ۲۶۵ +

[52] ابن اثیر ج ۶ - ص ۱۸۸ + ابن خلدون ج ۳ - ص ۲۶۸ +

ایک زبردست فریق مازیار کا مخالف تھا، کیونکہ وہ خانہ جنگی برپا کرکے، اور اپنے پیشرو کو قتل کرکے اسپہبد بنا تھا[۱]۔ خلیفہ کی اطاعت سے انحراف کے بعد مازیار نے اپنی رعایا سے خود مختار بادشاہ ہونے کی حیثیت سے وفاداری کی قسمیں دوبارہ لیں، اور اس خیال سے کہ وہ اپنی قسموں سے پھر نہ جائیں اُن سے یرغمال لیے۔ اس کے علاوہ جنگ کی تیاری کے لیے اُن پر بھاری محصول لگائے۔ جو شہر میدان میں واقع تھے، اور جن کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ وہ اُن کی حفاظت نہ کر سکے گا، اُن کی فصیلیں مسمار کرا دیں اور باشندوں کو مجبور کیا کہ کوہستان میں پناہ لیں۔ اس طرح اُس نے آمل اور ساریہ کے باشندوں کو، ان دونوں شہروں کے درمیان ایک کوہستانی مقام ہرمز آباد[۲] میں منتقل کیا۔ اُس نے طمیس[۳]، آمل اور ساریہ کی فصیلیں بھی مسمار کرا دیں، اور ایک فصیل، جو بحیرۂ خزر تک پھیلی ہوئی تھی، اور جسے ایرانیوں نے ترکوں کی یورشوں سے محفوظ رہنے کے لیے تعمیر کرایا تھا، اُس کی مرمت کرائی۔

عبداللہ بن طاہر نے اپنے چچا حسن بن حسین کو ایک زبردست فوج دے کر جرجان کی طرف بھیجا،

---

[۱] خلیفہ منصور کے عہد میں طبرستان فتح ہوا۔ مہدی کے زمانہ میں ۱۶۲ھ میں یہاں کے دو رئیسوں ونداہرمز اور شروین نے شورش پھیلائی۔ ہادی نے انھیں مطیع کیا۔ ۱۸۹ھ میں عہد ہارون الرشید میں مہرویہ الرازی کو طبرستان کی ولایت سے معزول کر کے اُس کی جگہ پہلے عبداللہ بن سعید کو، اور پھر عبدالملک بن مالک کو وہاں کا والی بنایا۔ ۲۰۱ھ میں مامون کے زمانہ میں عبداللہ بن خرداد بہ طبرستان کے کوہستانی علاقے پر قابض ہوا، اور وہاں کے رئیس شہربان (یا شہریار) بن شروین کو مجبور کیا کہ وہ میدانوں میں رہے۔ اس کے علاوہ اُس نے ایک اور شہزادہ، مازیار بن قارن بن وندہرمز کو مامون کے پاس بھیج دیا۔ ۲۱۰ھ میں، جب محمد بن موسیٰ بن حفص، طبرستان کا والی تھا، شہریار بن شروین نے، جو کوہستانی علاقے کا مالک تھا، وفات پائی؛ اُس کا بیٹا سابور اُس کا جانشین ہوا۔ مگر مازیار بن قارن نے بغاوت کی اور سابور کو برطرف کر کے طبرستان کا مالک بن گیا۔ یہ تمام واقعات ابن اثیر اور ابن خلدون نے مختلف سنین کے تحت نقل کیے ہیں۔

[۲] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۰۳) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۵، ۲۶۶) نے اس کا نام ہرمز یار لکھا ہے۔

[۳] ادریسی (ج ۲۔ ص ۱۷۶، ۱۷۷) طمس یا طامس نام ایک شہر کا ذکر کرتا ہے، جو طبرستان میں واقع تھا۔ فرانسیسی مترجم نے اس کا نام ایک جگہ تمش اور دوسری جگہ تمسا لکھا ہے۔ لاطینی ترجمہ میں تیسم (Taisam) ہے۔ ادریسی نے لکھا ہے کہ طمس، ساریہ اور استرآباد کے درمیان راستے میں واقع تھا، اور استرآباد سے ساریہ جاتے ہوئے یہ شہر سب سے پہلے آتا تھا۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ طمس جرجان کی سرحد پر تھا۔ اسی سے ہم قدیم قلعہ بند فصیل کے جائے وقوع کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے مصنفوں نے بھی اس فصیل کا ذکر کیا ہے، اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ فصیل کسی زمانے میں ضرور موجود تھی۔ دیکھو رٹر (Ritter) کی کتاب (Erdkunde) ج ۸۔ ص ۴۵۹۔ ابوالفدا (جغرافیہ ص ۴۲۰) نے طبرستان کے مشرقی شہر کا نام تمیشہ لکھا ہے۔

تاکہ وہ اُس طرف سے مازیار کا راستہ روک دے۔ پھر اُس نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام حیان بن جبلہ کے ساتھ چار ہزار آدمی قومس کے راستے کوہستان شروین[1] بھیجے۔ خود معتصم نے حکم دیا کہ ایک فوج براہ دنباوند[2] روانہ کی جائے، تاکہ جنوب مغرب کی طرف سے مازیار پر حملہ ہو سکے۔ باوجود ان حملوں اور تیاریوں کے مازیار اگر اپنی رعایا کی وفاداری اور خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو طبرستان کے ناقابل گذار پہاڑوں میں مدتوں تک خلیفہ کی فوجوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے آپ کو ظالم و جابر ثابت کیا، اور رعایا اُس سے متنفر ہو گئی۔ ہر طرف لوگوں نے دغابازی سے کام لینا شروع کر دیا۔ مازیار نے ایک فوج اپنے سپہ سالار سرخاستان کی سرکردگی میں ان خندقوں کی حفاظت کے لیے مقرر کی تھی جو طمس اور سمندر کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے یہی فوجیں حسن بن حسین سے مل گئیں اور سرخاستان اور اُس کے بھائی کو حسن کے حوالے کر دیا۔ پھر اس کے بعد ہی مازیار کے چچا زاد بھائی، قارن بن شہریار نے، جس کا باپ کسی زمانے میں طبرستان کا مالک رہ چکا تھا، حیان بن جبلہ سے خط و کتابت شروع کی، اور کہا کہ اگر اُس کے آبا و اجداد کی ریاست اُسے واپس دیے جانے کا وعدہ کیا جائے تو وہ کوہستان شروین اور ساریہ حیان کے حوالے کر دے گا۔ حیان نے اس کی اطلاع عبداللہ بن طاہر کو دی اور اُس نے یہ شرط منظور کر لی۔ قارن بن شہریار نے بہت سے فوجی افسروں، اور مازیار کے بھائی عبداللہ بن قارن کو جو اُس نواح کا سپہ سالار تھا کھانے کی دعوت دی، اور انھیں گرفتار کر کے حیان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد حیان نے کوہستان شروین اور ساریہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ خود مازیار کے بھائی قوہیار نے قارن کی پیروی کی۔ بغاوت کے آغاز میں عرب والی محمد بن موسےٰ بن حفص کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ قوہیار نے اُسے رہا کر کے

---

[1] شروین غالباً کوہستان البرز کے جنوب مغربی حصہ کا نام ہے۔

[2] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۳) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۶) نے دنباوند لکھا ہے، دماوند نہیں لکھا۔ حالانکہ اس پہاڑ کو عام طور پر دماوند ہی کہتے ہیں۔ ادریسی (ج ۲۔ ص ۱۶۷، ۱۰۰) نے دماوند ہی لکھا ہے۔ ابن خلکان نے ابوبکر شبلی کے ترجمہ میں دنباوند لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ بہت سے لوگ رے کے علاقے کے اس شہر کو دماوند کہتے ہیں، لیکن اس کا صحیح املا دنباوند ہی ہے۔ یہی بیان ابوالفداء (جغرافیہ ص ۴۴۰) کا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنباوند اور دنیاوند دونوں ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں صرف نقطوں کا فرق ہے۔ اسی وجہ سے مختلف قلمی نسخوں میں یہ لفظ دنیاوند اور دنباوند دونوں طرح لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔

[3] ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۲۶۶) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۱۸۴) نے قارن بن شہریار کو مازیار کا بھتیجا بتایا ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ قارن غالباً اُس شاپور یا سابور کا بھائی تھا جسے مازیار نے حکومت سے برطرف کیا تھا۔

حیان کے پاس بھیج دیا۔ اس کے صلے میں اُس نے استدعا کی کہ کوہستانی علاقے کی حکومت، جو اُس سے قبل اُس کے آباؤ اجداد کے ہاتھ میں تھی اُسے دے دی جائے، اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کو بھی حیان کے حوالے کر دے گا۔ ممکن تھا کہ اس تجویز کو قبول کر لیا جاتا۔ مگر حیان نے غلطی سے قوہیار کے ایک قاصد کا گھوڑا چھین لیا، قوہیار نے قسم کھائی کہ وہ ایسے شخص سے کوئی معاہدہ نہ کرے گا۔ چنانچہ قوہیار مقررہ دن حیان کے پاس نہ آیا، بلکہ حسن بن حسین سے خط و کتابت شروع کی۔ حسن بسرعت تمام خرم آباد آیا، جہاں قوہیار نے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ان تمام باتوں کی جن کا وعدہ حیان کر چکا تھا توثیق کر دی۔ اب قوہیار نے اپنے بھائی مازیار کو یقین دلایا کہ اُس کے پاس مازیار کے لیے خلیفہ کے پاس سے معافی نامہ آ چکا ہے ان باتوں پر اعتبار کر کے مازیار خود عربوں کے عسکر میں آ گیا[1]۔ ان لوگوں نے اُسے انھیں زنجیروں میں جکڑا جو اُس نے اپنی خود مختاری کے اعلان کے وقت والی طبرستان محمد بن موسیٰ بن حفص کو مقید کرنے میں استعمال کی تھیں۔ مازیار کو اس طرح گرفتار کرنے کے بعد دنباوند کا فوجی افسر محمد بن ابراہیم اُسے لے کر سامرہ گیا۔ یہاں اُسے بابک کے پہلو بہ پہلو مصلوب کیا گیا[2]۔ لیکن مازیار کا بے شمار خزانہ خلیفہ کے ہاتھ نہ آیا۔ کیونکہ قوہیار، اپنی غداری کے بعد، جب یہ خزانہ عربوں کی فوج میں لے جا رہا تھا تو مازیار کے ملوکوں نے اُسے قتل کر دیا اور خزانہ آپس میں تقسیم کر کے دیلم بھاگ گئے۔

---

[1] یہ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۲۶۷) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۱۸۴، ۱۸۵) کا بیان ہے۔ ابن خلدون نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ایک روایت کے مطابق مازیار کے ایک چچا زاد بھائی نے دغا کی تھی۔ یہ شخص طبرستان کے تینوں پہاڑوں کی حکومت کا حقیقی مولیٰ تھا، اور مازیار کو صرف میدانوں پر حکومت کرنے کا حق تھا۔ مگر اس نے اس چچا زاد بھائی کو بے دخل کر دیا تھا۔ اب جب مازیار نے عربوں کی حکومت سے انحراف کیا تو اس نے اس بھائی کو بلایا، اور اس خیال سے کہ وہ عربوں کے خلاف اُس کی مدد کرے گا اُسے ایک بڑا عہدہ دے دیا۔ لیکن اس شخص نے حسن کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی، اور افشین اور مازیار کے درمیان جو نامہ و پیام ہوا تھا اُس کا ذکر کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کا آبائی علاقہ اُسے واپس دے دیا جائے تو مازیار کا ساتھ چھوڑنے کو تیار ہے۔ مامون کے وزیر حسن بن سہل نے طبرستان کی حکومت مازیار کے سپرد کی تھی، اور مازیار نے اپنے برادر عمزاد کو اُس کے آبائی علاقوں سے بے دخل کیا تھا۔ حسن بن حسین نے عبداللہ بن طاہر کی ایک تحریر اس غدار کے حوالے کی، جس میں تمام دعووں کی توثیق کی گئی تھی، اور انھیں تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے درہ ہائے کوہ کو غیر محفوظ چھوڑ دیا۔ عربوں نے مازیار کا محاصرہ کیا، آخر باغی نے اپنے آپ کو خلیفہ کی فوج کے حوالے کر دیا۔ ایک بیان کے مطابق اُسے شکار میں گرفتار کیا گیا تھا (ابن خلدون۔ ج ۳۔ ص ۲۶۷)۔

[2] مازیار کو فوراً قتل نہیں کیا گیا۔ بلکہ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا افشین کے مقدمہ کے بعد مازیار کو سزا دی گئی۔ جس کی نوعیت کچھ اور ہی تھی۔ معلوم نہیں کہ مصنف نے مصلوب کیوں لکھ دیا ہے۔ مترجم

طبرستان کی بغاوت ۲۲۴ھ میں ختم ہوئی۔ لیکن اسی دوران میں ایک اور شورش آذربائیجان میں ہوئی۔ اس میں بھی افشین کا ہاتھ تھا، یا کم از کم اس بغاوت کی ذمہ داری اُسی پر عائد ہوتی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ بابک کی جنگ کے خاتمہ پر خلیفہ نے افشین کو آذربائیجان کا والی مقرر کیا تھا۔ یہاں وہ خود نہیں گیا، بلکہ اپنے ایک رشتہ دار منکجور[51] کو بطور نائب بھیج دیا۔ منکجور نے خلیفہ کو اطلاع دیے بغیر بابک کے خزانہ پر قبضہ کر لیا، اور جب صاحب البرید نے حسب ضابطہ اس کی اطلاع خلیفہ کو دی تو اُسے بھی قید کر دیا، اور چاہتا تھا کہ قتل کر دے۔ اُدھر جب اہل اردبیل نے منکجور کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا تو وہ اُن سے بھی لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ایسی حالت میں معتصم نے افشین کو مجبور کیا کہ وہ منکجور کو آذربائیجان سے واپس بُلا لے چونکہ منکجور نے اطاعت سے انحراف کیا تھا اس لیے خلیفہ نے بُغا ترک کو فوج دے کر اُس کے خلاف بھیجا۔ بُغا نے اُسے اردبیل سے نکال دیا۔ پھر منکجور نے بابک کے ایک قلعہ پر، جسے اُس نے دوبارہ مستحکم کر لیا تھا قبضہ کر کے وہاں پناہ لی۔ مگر مازیار کی طرح اُس کے چند ساتھیوں نے غداری کی اور ۲۲۵ھ میں اُسے بُغا کے حوالے کر دیا۔ بُغا اُسے سامرہ لے آیا، یہاں اُسے قید کر دیا گیا[52]۔

یہ دونوں بغاوتیں، اور افشین کے خلاف عبداللہ بن طاہر کے الزامات، درحقیقت افشین کی نکبت کے باعث بنے۔ افشین کو اس کا بخوبی علم تھا، اور اسی بنا پر وہ چاہتا تھا کہ ارمینیہ بھاگ جائے، کیونکہ یہ علاقہ اُس کی حکومت میں شامل تھا، اور پھر وہاں سے بحیرۂ خزر کو عبور کر کے اپنے وطن اشروسنہ چلا جائے۔ لیکن جلدی ہی اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ معتصم کے جاسوس سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، اور اُن سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے بہت بڑے پیمانہ پر ایک دعوت کی اور تمام اُن سرکردہ لوگوں کو جن کی جاسوسی سے وہ خائف تھا، بلایا۔ اُسے اُمید تھی کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر وہ بچ نکلے گا۔ لیکن سوء اتفاق سے اُسی دن اُس نے اپنے ایک غلام کے ساتھ ایسا بے رحمی کا سلوک کیا کہ اُس نے افشین کی تمام تجویزیں من و عن ایتاخ سے بیان کر دیں۔ ایتاخ نے خلیفہ کے حکم سے افشین کو گرفتار کر لیا[53]۔ لیکن اس واقعے کو

---

[51] ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۷۰) نے اس کا نام منکجور رکھا ہے۔

[52] ایک اور بیان کے مطابق منکجور نے بُغا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ یہ غالباً اُس وقت ہوا جب کہ اُس کے ساتھی اُس سے منحرف ہو چکے تھے۔

[53] ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۶۸) ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۸۹) کے مطابق افشین چاہتا تھا کہ خلیفہ اور تمام فوجی افسروں کو زہر دے دے۔ لیکن اُس کے ایک دوست ادا بن الاشروسی نے اس شقاوت کی علانیہ مخالفت کی۔ ایک ملازم نے جو ادا جن کی باتیں سُن رہا تھا، افشین کو اس کی اطلاع کر دی۔ اُس نے چاہا کہ ادا جن کو قتل کر دیا جائے۔ مگر ادا جن کو اس کی اطلاع

اُس کے بیٹے حسین کی گرفتاری تک راز میں رکھا گیا۔ حسین ماوراء النہر کا والی تھا، اور افشین کی طرح اُس کے پاس بھی موالی کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ خلیفہ نے عبداللہ بن طاہر کو لکھا کہ کسی طرح دھوکا دے کر حسین کو گرفتار کرے۔ عبداللہ نے حسین کو بخارا کا والی مقرر کیا، اور اس کے ساتھ ہی نوح بن اسد کو، جو اس وقت بخارا کا والی تھا، لکھا کہ حسین کو گرفتار کر کے اُس کے پاس بھیج دیا جائے[1]۔ اب چونکہ اس طرف سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا، اس لیے باضابطہ طور سے افشین پر غداری کا الزام لگایا گیا۔ مگر غداری کی کافی شہادت موجود نہ تھی، اور معتصم یہ چاہتا تھا کہ افشین کے بڑے بڑے موالی کو، جن پر اُس کی قوت کا انحصار تھا، اس کے مجرم ہونے کا یقین دلا دے، تاکہ آئندہ ان کی طرف سے فساد کا اندیشہ نہ رہے۔ اس لیے افشین کے ارتداد کو بھی فردِ قرارِ جرم میں شامل کر لیا گیا۔ اس مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک خاص عدالت قائم کی گئی۔ اس عدالت کی کارروائی بہت تفصیل سے ہم تک پہونچی ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ معتصم کے زمانے تک ایران میں اسلام کے پہلو بہ پہلو قدیم زردشتی مذہب زندہ تھا، اور ماوراء النہر میں اس کے پیرو علانیہ طور پر اپنی مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ قاضی احمد بن ابی داؤد، وزیر محمد بن عبدالملک بن الزیات اور تمام بڑے بڑے فوجی اور شہری افسروں کے سامنے عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے سغد کے رہنے والے دو مستغیث عدالت کے سامنے آئے۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ ان میں ایک مسجد کا امام اور دوسرا موذن ہے، اور انھیں افشین نے ان کے وطن میں درے لگوائے تھے۔ چنانچہ ان کے بدن پر اس سزا کے نشان موجود تھے۔ ابن الزیات نے افشین سے اس سزا کی وجہ پوچھی۔ اُس نے جواب دیا کہ ان دونوں نے ایک عبادت گاہ کو جبراً مسمار کر کے مسجد بنا لیا تھا۔ اسی لیے میں نے انھیں سزا دی تھی، کیونکہ عہد نامے کے مطابق یہ عبادت گاہ اہلِ شہر کے لیے محفوظ تھی۔ ابن الزیات نے دریافت کیا کہ وہ مطلا اور مرصع کتاب کیا ہے جو تمھارے گھر میں موجود ہے اور بے دینی کی تعلیم دیتی ہے۔ افشین نے کہا کہ وہ کتاب مجھے میرے باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہے، اور اس میں بڑے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم ہے۔ جیسی مطلا و مرصع وہ مجھے ملی تھی ویسی ہی اب تک ہے۔ میں نے اُس سے صرف اخلاق سیکھا، اور اُس کی بے دینی کی باتوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) افشین کے ایک اور ملازم سے مل گئی۔ وہ فوراً معتصم کے پاس گیا، اور سب باتیں اُس سے کہہ دیں۔ مگر افشین کے مقدمہ کے حالات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوشش یہ تھی کہ افشین کو ملزم ثابت کر دیا جائے۔ اس لئے ابن اثیر کا بیان قابلِ اعتبار نہیں، اور زہر خورانی کی حکایت بعد کی ساختہ پرداختہ ہو۔ غالباً اس سے مقصد یہ تھا کہ افشین کو موت کی سزا دی جاسکے۔

[1] ابن اثیر ج ۶۔ ص ۱۸۹، ابن خلدون۔ ج ۳۔ ص ۲۶۸۔

توجہ نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں میں نے کسی طرح اسلام سے انحراف نہیں کیا۔ اب ایک موبد عدالت میں حاضر ہوا۔ اُس نے اظہار دیا کہ افشین مختنقہ جانوروں کا گوشت کھاتا ہے۔ بلکہ اُس نے اُسے بھی یہ گوشت کھانے کی یہ کہہ کر ترغیب دلائی تھی کہ ایسا گوشت مذبوحہ جانور کے گوشت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے ایک دن یہ بھی کہا تھا کہ میں نے مجبوراً عربی پڑھی، زیتون کا تیل استعمال کیا، اور جوتا پہننا شروع کیا؛ مگر باوجود اس کے مسلمان مجھے ختنہ کرانے پر مجبور نہ کر سکے۔ افشین نے قاضی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ ایک مسلمان کے خلاف بے دین مجوسی کی شہادت کہاں تک قابل سماعت ہے؟ موبد کے بعد سغد کا ایک رئیس عدالت میں آیا۔ اُس نے افشین سے پوچھا کہ آیا اشروسنہ کے باشندے اُسے خداوند کہتے ہیں یا نہیں۔ افشین نے جواب دیا کہ ہاں۔ یہ درست ہے۔ مگر یہ لوگ اپنے رؤسا کو اسی لفظ سے مخاطب کرنے کے عادی ہیں، اور میں نے انھیں اس وجہ سے منع نہیں کیا کہ کہیں میرے رعب میں کمی نہ آئے، اور یہ لوگ بغاوت نہ کر بیٹھیں۔ اب مازیار کو، جو اس وقت قیدی کی حیثیت سے دارالخلافہ میں تھا، عدالت میں لایا گیا۔ اُس نے کہا کہ افشین کے بھائی نے اُس کی طرف سے مازیار کے بھائی قوہیار کو لکھا تھا کہ "ہمارا قدیم مذہب بابک، تمہارے اور میرے ذریعہ سے دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔ بابک کی میں مدد نہ کر سکا، اس لیے وہ اپنی جہالت سے مغلوب ہو گیا۔ اب تم بغاوت کر دو۔ میرے سوا تمہارے مقابلے کے لیے اور کسی کو نہ بھیجا جائے گا، اور میں اپنے بہادر سپاہیوں سمیت تم سے مل جاؤں گا۔ پھر ہم دونوں مل کر عربوں، اہل افریقہ اور ترکوں سے لڑیں گے۔ عرب محض کتے ہیں، اور چند ٹکڑے دے کر اُن سے ہر طرح کا کام لیا جا سکتا ہے۔ مغاربہ، یعنی اہل افریقہ، پلک مارتے تباہ کیے جا سکتے ہیں۔ رہ گئے ترک؛ وہ اُسی وقت تک مقابلہ کریں گے جب تک اُن کے پاس تیر باقی ہیں۔ اس کے بعد انھیں رسالہ فوج سے روند کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد قدیم ایران اور اُس کا مذہب دونوں زندہ ہو جائیں گے۔" اس الزام کا جواب افشین نے یہ دیا کہ تحریر بغیر اُس کی مرضی اور دانست کے اُس کے بھائی کی ہے؛ اور وہ دوسروں کی تحریریں کا جواب دہ نہیں ہے۔ اگر خود اُس کی یہ تحریر ہوتی تو بھی اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک نیم مفتوحہ صوبے کو مستقل طور پر فتح کر کے وہ خلیفہ کے وقار میں اضافہ کرنا چاہتا تھا، جیسا کہ عبداللہ بن طاہر کی مہم میں ہوا۔

سلہ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۹۰) لکھتا ہے کہ یہ موبد اُس وقت تک اپنے قدیم مذہب پر قائم تھا، اور بالآخر متوکل کے عہد میں مسلمان ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایرانی موبد اُس خلیفہ کے دربار میں علانیہ طور پر موجود تھا، جس نے حضرت امام احمد بن حنبل کو اس وجہ سے تازیانے کی سزا دی تھی کہ اُنھوں نے قرآن شریف کے متعلق دربار کے علما سے اختلاف کیا تھا۔

ان شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی افشین کو موت کی سزا قانوناً دینا ناممکن تھا۔ اُسے دوبارہ بُغا کی نگرانی میں نظر بند کیا گیا، مگر کھانا اتنا کم دیا گیا کہ آخر اُس نے ماہ شعبان ۲۲۶ھ میں فاقوں سے وفات پائی۔ مرنے کے بعد اُس کے گھر سے ایک بُت، اور زردشتی مذہب کی ایک کتاب برآمد ہوئی۔ اس کی پاداش میں نعش کو مصلوب کرنے کے بعد جلا دیا گیا۱؎۔ معتصم غالباً افشین کے خلاف مازیار کی فیصلہ کن شہادت کا منتظر تھا، کیونکہ عدالت میں اظہار دینے کے بعد ہی مازیار کو ڈنڈوں سے مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ افشین کے باضابطہ عدالت میں پیش ہونے کی یہ وجہ نہ تھی کہ معتصم انصاف کا دلدادہ تھا۔ بلکہ درحقیقت وہ افشین کے بے شمار موالی سے خائف تھا، اور چاہتا تھا کہ انھیں ظاہری طور پر عدل و انصاف کا یقین دلا دیا جائے۔ بہ حیثیت مجموعی معتصم اپنے پیشرو خلفاء کے مقابلے میں کچھ کم مطلق العنان نہ تھا۔ عدالت تمام تر خلیفہ اور اس کے بعد وزیر اور سپہ سالار اور پھر قاضی اور قاضی القضاۃ کے زیر اقتدار تھی؛ حالانکہ معتصم قاضی القضاۃ محمد بن ابی داؤد کی بہت قدر کرتا تھا، اور قاضی بھی ایک حد تک خلیفہ پر حاوی تھا۔ اس کی ہم آئندہ ایک مثال بھی دیں گے۔ مگر اس سے پہلے دو بغاوتوں کا ذکر ناضروری ہے۔ یہ دونوں بغاوتیں معتصم کے عہد میں شروع ہوئیں لیکن ان میں سے ایک اُس کے بعد فرو ہوئی اس لیے وہ اس میں زیادہ دخل نہ دے سکا۔ اس کے علاوہ معتصم نے ان واقعات کے بعد یونانیوں سے ایک اور جنگ لڑی۔

صوبۂ موصل میں کردوں نے جمع ہو کر جعفر بن فہرجس کو اپنا سرغنہ بنایا۔ تمام صوبے کے اوباش اور بدقماش لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ان کے تاخت و تاراج سے رعایا کی جان و مال دونوں محفوظ نہ رہے، اور رفتہ رفتہ مرکزی حکومت کا اثر بالکل اُٹھ گیا۔ ان لوگوں نے شمالی میسوپوٹامیا

۱؎ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۹۰) ۔ افشین نے اپنی موت سے قبل معتصم سے کہا تھا کہ "میری مثال ایک بچھڑے کی سی ہے، جسے کوئی نہایت احتیاط سے پالے پوسے۔ مگر اُس کے دوست بچھڑے کا گوشت کھانا چاہتے ہیں۔ یہ شخص اُسے ذبح کر کے اپنے دوستوں کی آرزو پوری نہیں کرتا۔ آخر دوست یقین دلاتے ہیں کہ یہ بچھڑا نہیں بلکہ شیر ہے، اور بڑا ہو کر اپنی جنس میں مل جائے گا۔ دوسرے اس رسالے کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر وہ شخص اس بچھڑے کو ذبح کر ڈالتا ہے (ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۱۹۱)۔ ابن خلدون نے ایک روایت نقل کی ہے (ج ۳۔ ص ۲۶۹) کہ افشین قتل کیا گیا تھا۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ عدالت میں اظہار دینے کے بعد مازیار کو ۲۲۵ھ میں قتل کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے برعکس افشین نے ۲۲۶ھ میں انتقال کیا۔ اثبات جرم کے بعد اُسے اتنے دن تک زندہ چھوڑنا اور پھر قتل کرنا ناممکن ہے۔ معتصم غالباً اس کے قتل کی ہمت بھی نہ کر سکتا تھا، اور اسی لیے اس نے اُسے آہستہ آہستہ مارا۔

تک قتل و غارت کا سلسلہ قائم کیا۔ آخر معتصم نے ایک فوج تیار کی اور عبداللہ بن السید بن انس الازدی کی سرکردگی میں اُسے جعفر کے خلاف بھیجا۔ عبداللہ نے ان لٹیروں کو زبردست شکست دی، اور ماتعیس سے، جہاں اُنھوں نے اپنی چھاؤنی بنائی تھی، نکال دیا۔ شکست کھا کر باغی کوہستانی علاقے میں پناہ گزین ہوئے، اور عبداللہ بھی بے سوچے سمجھے، عقب کی حفاظت کا انتظام کیے بغیر، ان کے تعاقب میں پہاڑوں میں داخل ہوا۔ قبل اس کے کہ اُسے ذرا بھی خطرہ کا احساس ہو اُس نے دیکھا کہ وہ ایک گھاٹی میں دشمنوں سے گھر گیا ہے۔ اُس نے چاہا کہ دشمنوں کو تلوار سے کاٹ کر راستہ بنالے۔ لیکن اس کوشش میں اس کے بہت سے آدمی یا تو ترکوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور یا اُن پتھروں سے کچلے گئے، جو دشمن پہاڑوں پر سے لڑھکا رہے تھے۔ اس ناکامی کے بعد معتصم نے ایک نئی فوج موصل بھیجنے کے لیے تیار کی، اور آئندہ سال یعنی ۲۲۶ھ (۸۴۱ء) میں ایتاخ نے، جو عبداللہ کی جگہ سپہ سالار مقرر ہوا تھا، کو دسیر کی جنگ میں شورشیوں کے سرغنہ جعفر کو قتل کیا اور بغاوت فرو کی۔[۵۱]

میسوپوٹامیا میں امن و امان قائم ہوا ہی تھا کہ فلسطین ایک خطرناک بغاوت کا میدان بن گیا۔ یہاں اب تک بنی اُمیہ کے ہمدرد باقی تھے، اور اس شورش کا مقصد یہ تھا کہ خاندان خلافت کو تباہ کر دیا جائے۔ فوری سبب یہ ہوا کہ ایک سپاہی نے فلسطین کے رہنے والے ایک شخص ابوحرب الیمنی کے گھر میں داخل ہو کر ایک عورت کو قتل کر دیا۔ جب ابوحرب گھر آیا، اور اس واقعہ کی اطلاع اُسے ہوئی تو اُس نے اس سپاہی کو قتل کر دیا۔ اور جبال اردن میں پناہ لی۔ یہاں اُس نے، نقاب پوش ہو کر، خلیفہ سے خودمختاری کا وعظ کہنا شروع کیا۔ ابوحرب نے دعوے کیا کہ وہ بنی امیہ کے خاندان سے ہے۔ بہت جلد لوگوں کی ایک بڑی جماعت اُس کے گرد جمع ہو گئی۔ رجاء بن ایوب الحضاری کو معتصم نے فوج دے کر فلسطین بھیجا؛ لیکن رجاء کو اُس وقت حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر آئندہ سال معتصم کی وفات، اور واثق کے خلیفہ ہونے کے بعد رجاء نے ابوحرب کو، جو نقاب پوش ہونے کی وجہ سے مبرقع کہلاتا ہے، جنگ پر مجبور کیا۔ مبرقع کے بیس ہزار آدمی کام آئے؛ وہ خود گرفتار ہوا، اور سامرہ بھیجا گیا۔[۵۲]

---

[۵۱] ابن اثیر، ج ۶، ص ۱۸۷؛ ابن خلدون، ج ۳، ص ۲۶۷۔ (ان مصنفوں کا بیان ہے کہ یہ شورش ۲۲۵ھ میں فرو ہوئی تھی۔ مترجم)

[۵۲] ابن اثیر، ج ۶، ص ۱۹۳؛ ابن خلدون، ج ۳، ص ۲۰۰۔ ایک لاکھ آدمی مبرقع کے ساتھ تھے۔ یہ سب اُسے سفیانی سمجھتے تھے۔ یمنیوں کا سردار ابن بیہس بھی مبرقع کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔

مندرجہ ذیل واقعہ سے معتصم کے زمانے کی عدالتی کارروائی کے متعلق ہمارے خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معتصم نے افشین کو مجرم ثابت کرنے کے لئے محض سیاسی اغراض کے تحت ظاہراً عدالتی انتظامات کیے تھے؛ اور دوسری طرف اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو سکے تب بھی معتصم سخت ترین سزا دینے میں تامل نہ کرتا تھا۔

افشین کو مشہور سپہ سالار ابودُلف سے، اُس کی بہادری، فصاحت و بلاغت، اور عربی زبان میں بے انتہا عبور رکھنے کی وجہ سے حسد تھا۔ اسی بنا پر اُس نے ابودُلف کے خلاف ایک سازش کی، اور اُس کے قائل دغدار ہونے کے ثبوت میں گواہ بھی فراہم کر لیے۔ افشین نے انھیں الزامات کی بنا پر ابودُلف کو گرفتار کرا دیا۔ اُس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ آخر انھیں اجیر گواہوں کی شہادت پر اُسے سزائے موت سُنا دی گئی۔ اس کی اطلاع قاضی القضاۃ احمد بن ابی داؤد کو ہوئی۔ وہ عدالت کے چند آدمی ساتھ لے کر افشین کے پاس گئے۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جلاد عدالت کے فیصلے کی تعمیل کے لیے تیار تھا، اور ابودلف کی گردن مارا ہی چاہتا تھا۔ احمد نے افشین سے کہا کہ امیرالمومنین نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میں تجھے یہ حکم پہنچا دوں کہ ابودُلف کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے، اور اُسے میرے حوالے کر دیا جائے۔ یہ کہہ کر احمد عدالت کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ گواہ رہنا کہ امیرالمومنین کا حکم میں نے افشین کو پہونچا دیا ہے، اور ابودُلف کو زندہ اور سلامت پایا ہے۔ افشین نے مجبوراً ابودُلف کو رہا کر دیا۔ اب احمد خلیفہ کے پاس گئے، ابودُلف اور افشین میں جو کچھ گذرا تھا اُس کی اطلاع دی، اور کہا کہ ابودُلف کی جان بچانے کے لیے گو کوئی احکام صادر نہیں ہوئے تھے، لیکن ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ کا قاصد ظاہر کریں، تاکہ افشین کو سوائے تعمیل حکم کے کوئی چارہ نہ رہے۔ معتصم نے احمد کی گفتگو روک دی اور ابودُلف کی خطا معاف کر دی۔ مگر افشین کو محض زبانی سرزنش کی گئی، حالانکہ خلیفہ اور قاضی القضاۃ کے ہوتے ہوئے قاضی القضاۃ کے آخری اور قطعی حکم کے بغیر وہ دارالخلافہ کے ایک جلیل القدر عہدہ دار کی جان لینے کے لیے تیار ہو گیا تھا[۱]۔

معتصم محمد بن الجہم برمکی سے ناراض ہوا، اور اُس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اُس کے قتل کی تیاری ہو چکی تھی۔ احمد بن ابی داؤد جانتے تھے کہ وہ بے گناہ ہے۔ وہ اُسے بچانا چاہتے تھے، مگر خلیفہ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انھیں سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہ سُوجھی کہ خلیفہ کے ذاتی مفاد کا حوالہ

---

[۱] ابن خلکان (مطبوعہ یورپ) ج ۱ - ص ۴۳ +

دے کر اُسے اس کام سے باز رکھیں۔ اُنھوں نے خلیفہ سے پوچھا کہ اُس نے اس قتل کا ارادہ کس کے حکم سے کیا ہے۔ خلیفہ نے کہا: مجھے روک ہی کون سکتا ہے؟ احمد نے جواب دیا کہ خدا اور اُس کا رسول اور خلفا کا انصاف تجھے اس سے باز رکھتے ہیں کہ تو وارثوں سے ان کا مال چھینے۔ خصوصاً جب تیرے پاس اُس جرم کی، جس کی پاداش میں تو اُسے موت کی سزا دے رہا ہے، کوئی واضح شہادت موجود نہیں۔ جب تک وہ زندہ ہے تو اُس سے غبن شدہ رقم واپس لے سکتا ہے۔ یہ سُن کر معتصم نے محمد بن الجہم کی جان بخش دی، اور اُسے دوبارہ قید کر دیا۔ اس معاملے کا تصفیہ آخر اس طرح ہوا کہ محمد نے بہت بڑی رقم دے کر دوبارہ رہائی پائی۔

یہاں ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ قاضی کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ خلیفہ سے صاف کہہ دیں کہ اس شخص کی زندگی پر تمھیں کوئی اختیار نہیں۔ یتیموں کا مال ضبط کر لینا معمولی بات تھی، مگر زندہ لوگوں کا مال ضبط کرنے میں بھی تامل نہ کیا جاتا تھا۔ وزیر فضل بن مروان سے خلیفہ ناراض ہوا، اور اُسے معزول کیا تو اُس سے دس لاکھ دینار اور اتنی ہی قیمت کے سونے چاندی کے برتن اور جواہرات وصول کیے گئے[1]۔ فضل کے بعد احمد بن عمار، اور بعد محمد بن عبدالملک ابن الزیات وزیر ہوئے[2]۔ اُس زمانے کے شعرا نے ابن الزیات کی مدح میں خوب خوب قصیدے کہے ہیں[3]۔ مگر اُس کی اور احمد بن ابی داؤد کی کبھی نہیں بنی۔

معتصم کے عہد خلافت میں احمد بن ابی داؤد اور محمد بن عبدالملک ابن الزیات نے یونانی علوم کی نشر و اشاعت میں خاص حصہ لیا۔ خود معتصم اتنا ہی جاہل اور ان پڑھ تھا جتنا کہ اُس کا بھائی مامون علم و فضل کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ یہاں ان یونانی طبیبوں اور فلسفیوں کا ذکر کرنا ضروری نہیں جو ابتدائی خلفا کے دور میں عربوں کے استاد رہے تھے، اور جنھوں نے یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔ یہ حالت معتصم کے زمانے تک رہی۔ نہ اس کی گنجائش کہ یہودی طبیب زین الطبری اور اُس کے بیٹے ابوالحسن علی بن سہل کا حال تفصیل سے لکھا جائے۔ زین نے نہ صرف طب کا بلکہ

---

[1] ابن خلکان (مطبوعہ یورپ) ج ۲۔ ص ۲۷۰۔

[2] یہ ابن خلکان کا بیان ہے۔ ابن اثیر (ج ۶۔ ص ۱۶۱) اور ابن خلدون (ج ۳۔ ص ۲۵۱) کے مطابق فضل کے بعد محمد بن عبدالملک ہی وزیر مقرر ہوا تھا۔ فضل بن مروان کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ سرکاری رقمیں غبن کرتا تھا، خلیفہ کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تھا، اور ہر لحاظ سے بدترین سیرت کا اظہار اُس سے ہوتا تھا۔ یہ واقعات ابن اثیر اور ابن خلدون دونوں نے بیان کیے ہیں۔ مصنف ان دونوں مورخوں کو ہمیشہ سند میں پیش کرتا ہے۔ مگر معتصم کو ظالم و جابر ثابت کرتے وقت واقعات کا ذکر کرنا بھول جاتا ہے۔ مترجم)

[3] دیکھو ابو تمام کے چند اشعار۔ ابن خلکان ج ۲۔ ص ۳۰۸۔

فلسفہ اور ریاضی کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔ اس کا بیٹا طبرستان کے سپہ بد مازیار بن قارن کا معتمد تھا۔ اُس کی تباہی کے بعد وہ غالباً اس سے الگ ہوا، اور معتصم کے دربار میں آکر اُس نے اسلام قبول کیا۔ مشہور طبیب الرازی اسی کا شاگرد تھا۔ الکندی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ مشہور فلسفی تھا، اور بجا طور پر فیلسوف العرب کہلاتا ہے۔ اس کی تصانیف ایک زمانے میں یورپ میں بھی بہت مقبول تھیں۔ وہ قبیلۂ کندہ سے تھا، اور اُس کا پورا نام ابو یوسف یعقوب بن اسحاق بن صباح ہے۔ اُس نے بصرہ میں تعلیم پائی تھی۔ فلسفہ، طب اور ریاضی پر جتنی یونانی، ہندی اور ایرانی کتابیں اُس زمانے میں متداول تھیں اُن سب کا اُس نے مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے یونانی مصنفین کی کتابیں جو اُس زمانے میں متداول تھیں پڑھیں، اور اپنی محنت سے طب اور ہیئت میں ایسا ملکہ پیدا کیا کہ اُسی کی شرحوں اور ترجموں کے سبب یونانی فلسفہ اور ریاضی کی ترویج ہوئی۔ بہت جلد مامون نے اُسے بغداد بلا لیا اور مترجم مقرر کیا۔ خلیفہ معتصم کے دربار میں بھی اُسے بہت وقعت حاصل رہی۔

معتصم نے ۱۸۔ ربیع الاول سنہ ۲۲۷ھ (مطابق ۵۔ جنوری سنہ ۸۴۲ء) کو وفات پائی۔ وہ بنی عباس کا آٹھواں خلیفہ تھا، حضرت عباسؓ کی آٹھویں پشت سے تھا، اُس نے آٹھ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں چھوڑیں، اُسکی عمر موت کے وقت اڑتالیس برس کی تھی۔ اُس نے اسّی لاکھ دینار اور اتنے ہی درہم خزانہ میں چھوڑے۔ وہ ماہ شعبان میں پیدا ہوا تھا، جو سال کا آٹھواں مہینہ ہے۔ اُس نے آٹھ مرتبہ فوج کشی کی یا کم از کم جنگ کا حکم دیا۔ یہ فوجی مہمیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) بابک اور خرمیہ کے خلاف　　(۲) زُط کے خلاف
(۳) خراسان میں بنو علی کے خلاف　　(۴) بازنطینیوں کے خلاف
(۵) اسپہبد طبرستان کے خلاف　　(۶) آذربائیجان کے باغیوں کے خلاف
(۷) کردوں کے خلاف　　(۸) مبرقع کے خلاف

معتصم سے خلفائے عباسیہ کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے اصلی ناموں سے یاد نہیں کیے جاتے تھے۔ خود معتصم کا نام ابو اسحاق محمدؐ، اور لقب معتصم باللہ تھا۔ اسی لقب سے وہ مشہور ہے۔ اسی طرح باقی خلفا کے بھی لقب ہوتے تھے اور انھیں لقبوں سے ان کا ذکر کیا جاتا تھا۔

(جناب الحاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے، پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(۴)

شعر گوئی کا آغاز حسان الہند حضرت محسن کاکوروی کے کلام کی تدوین اخلاف سعید پر واجب تھی۔ خلف رشید نے اس خدمت کا بیڑہ اُٹھایا۔ مثنویاں متعدد بار چھپ چکی تھیں۔ بعض قصائد شائع ہو چکے تھے اُن کو یکجا کیا۔ متفرق رسالوں اور بیاضوں سے قطعات اور قصائد تلاش کر کے نکالے۔ صبح تجلی۔ چراغ کعبہ اور ابیات نعت کی شرح لکھی۔ تلمیح طلب الفاظ پر مفید حواشی چڑھائے۔ خصوصیات کلام کے اظہار کے لیے ایک طویل دیباچہ لکھا۔ حضرت محسن کی زندگی کے حالات جس قدر مستند ذرائع سے معلوم تھے قلمبند کیے۔ جولائی ۱۹۰۵ء سے اس خدمت کا آغاز کیا۔ اکتوبر میں کاکوری تشریف لائے تو کلیات کی تدوین ہو چکی تھی اور سوانح عمری کا معتدبہ حصہ تیار تھا۔ رفیق قدیم منشی مقبول علی اُس وقت وطن میں موجود تھے۔ سوانح نوشتہ سنائے اور تحقیق و کاوش کی داد پائی۔ اثنائے گفتگو میں لوح مزار کا تذکرہ ہوا۔ فرمایا کہ ڈپٹی حکیم الدین[۱] صاحب نے "ادخلہ مالک الملک فی الفردوس" سے تاریخ نکالی ہے اور منشی زین العابدین[۲] فرجاد نے آیت قرآن شریف سے بے مثل مادۂ تاریخ حاصل کیا ہے یعنی "انہ فی الآخرۃ لمن الصالحین" ان کے علاوہ کئی قدر شناسوں نے تاریخیں روانہ کی ہیں۔ چند قطعے اُردوئے معلیٰ علیگڈھ میں چھپے ہیں لیکن ہنوز طے نہیں کیا گیا کہ لوح مزار پر کیا لکھا جائے۔ منشی مقبول علی نے عرض کی کہ والد ماجد کی تاریخ وفات آپ کو خود کہنا چاہیے۔ مولوی نور الحسن نے اُس وقت تک ایک شعر بھی موزوں نہ کیا تھا اپنی معذوری بیان کی۔ مکرر التماس پر کوشش کا اقرار کیا۔ اُسی وقت سے دماغ فکر شعر میں مبتلا ہوا۔ مین پوری پہونچ کر "راہی باغ جناں" مادۂ تاریخ ذہن میں آیا۔ مثنوی کی بحر میں چند اشعار موزوں کیے جن میں

---

[۱] مولوی حکیم الدین۔ رڈول ضلع میرٹھ کے رہنے والے۔ عرصہ تک مین پوری میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ مولوی محمد محسن سے برادرانہ تعلقات تھے۔ پنشن لے کر نائب وزیر بھوپال ہو گئے تھے۔ چار برس وہاں گذارے بعد ازاں خانہ نشین ہوئے اور اپنے وطن میں ۲۰ نومبر ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔

[۲] منشی زین العابدین ریاست اودے پور میں ملازم تھے۔ مولوی محمد محسن کے غائبانہ نیاز مند تھے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ میرٹھ کے محلہ اندر کوٹ میں رہتے تھے اور وہاں سے مولوی نور الحسن کو خطوط لکھے تھے۔ اُس کے بعد کچھ احوال معلوم نہ ہوا۔

ممدوح کے مختصر حالات تھے۔ اُن کی بیماری کا بیان اور دعائے مغفرت پر خاتمہ تھا۔ دوا علاج کی سب بے اثری کی بابت یہ شعر واقعہ کی سچی تصویر تھا:-

ہر دوا در کار خود بے کار بود　　ضعف از حبّ جواہری فزود

اُستاد مرحوم کی یہی پہلی نظم تھی:-

بود محسن خسرو ملک سخن　　تاج الوارالحسن۔ نورالحسن
چارہ ساز مفلسان و بیکساں　　ہمدم و ہمدرد ہر پیر و جواں
بود طور نعت را گو یا کلیم　　یا خلیل کعبۂ مدح کریم
مولد او ہست کاکوری بہ نام　　مین پوری شد ازو دارالسلام
علم ظاہر خوانده بود از جدّ و اب　　فیض باطن را کرامت شہ سبب
ماند او زیب نظارت روز چند　　تا نیابد دل ز بے شغلی گزند
خوش بیانی را زبس آمد دلیل　　بر زبانہا شد رواں نعم الوکیل
ہر دو دستش خلق را حاجت روا　　ہر دو چشمش محو محبوب خدا
داشت از امراض پیری گو تعب　　بود دائم محو نعت و ذکر رب
آخر ماہ محرم سال حال　　داد اسہال کبد او را ملال
خود اشارت کرد از طرز عمل　　ہیچ نتواں کرد از جاء الاجل
ہر دوا در کار خود بے کار بود　　ضعف از حبّ جواہری فزود
ہیجدہم روز دوشنبہ از صفر　　کرد از منزل گہ آہنگ سفر
کلمۂ توحید را خواندن گرفت　　لا و الّا بر زباں راندن گرفت
خاست انگشت شہادت ہر زماں　　مخبر تصدیق قلبی بے گماں
واصل حق شد بتائید الٰہ　　باد یا رب جنتش آرامگاہ

گفت نیّر از پئے سال وفات
"راہی باغ جناں" عالی صفات

نظم ہنوز تمام نہ ہوئی تھی کہ مین پوری کے بعض عقیدت کیشوں نے تجویز پیش کی کہ حضرت محسن کی یادگار میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے اور مولوی نورالحسن اُس بزم کے میر مجلس ہوں۔

شیخ عبدالوحید فدا۔ گلاوٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے مین پوری کی عدالت کلکٹری میں

عرصہ سے ملازم تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ۔ کلام پر لطف و با مزہ ہوتا تھا۔ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولوی محمد محسن کی "نظم دل افروز" کی تضمین کی تھی۔ مولوی نور الحسن سے محبت تھی۔ اکثر حاضر ہو کر اپنا تازہ کلام سُناتے تھے۔ اُنھوں نے مشاعرے کے لیے اصرار کیا۔

سید ابو طالب۔ شاہ گنج ضلع آگرہ کے رئیس زادے۔ علیگڈھ کالج کے گریجویٹ۔ مین پوری میں وکالت کرتے تھے۔ خوش رو، تیز فہم اور روشن خیال تھے۔ شہر کے ایک کامیاب وکیل قاضی احمد حسین کانپوری کے انتقال کے بعد اُنھیں کی کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ جمی ہوئی وکالت ملی۔ پیشہ میں جلد فروغ ہو گیا۔ مولوی نور الحسن سے خلوص تھا۔ روزانہ خدمت میں حاضر ہوتے اور گھنٹوں خوش طبعی کیا کرتے تھے۔ وہ بھی مشاعرہ کے مؤید تھے۔

شیخ محمد اسمٰعیل رنگیلے۔ مین پوری کے رہنے والے۔ بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج تھے۔ محرری اور عرائض نویسی سے اوقات بسر کرتے تھے۔ شاعری گھٹی میں پڑی تھی۔ ظریفانہ مضحک اشعار فی البدیہہ کہتے تھے۔ بزم احباب سے "تفریح الشعرا" خطاب ملا تھا۔ بعض اشعار زبانزد خاص و عام ہو گئے تھے مثلاً

آدھے مُنھ پر تک کروں اور آدھے پر آٹا ملوں اے رنگیلے اک نئی شام و سحر پیدا کروں

اُن کا ایک مصرعہ ضرب المثل ہو گیا تھا اور آج تک عدالت فوجداری کی حقیقت حال کا آئینہ ہے:-

جنٹی سے ہے سزا تو رہائی سشن میں ہے

وہ مولوی محمد محسن کے نیازمند تھے اور اُنھوں نے بھی "نظم دل افروز" کی تضمین کی تھی۔ مولوی نور الحسن کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور مشاعروں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

مولوی نور الحسن کو مشاعروں سے دلچسپی باقی نہ تھی مگر احباب کے اصرار سے انعقاد محفل کی رضامندی دی۔ ۱۰ر جون ۱۹۰۶ء مطابق ۸ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ مشاعرے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ شعرائے مارہرہ، ایٹہ و فرخ آباد کو دعوت کے رقعے روانہ کیے گئے۔ شیخ عبدالوحید فدا نے ایک روز کہا کہ میر مشاعرہ کو غزل پڑھنا چاہیے آپ شعر نہیں کہتے ہیں اگر اجازت ہو تو میں ایک غزل تیار کر دوں اور اُس کو آپ اپنے نام سے محفل میں سُنا دیں۔ اُستاد کو یہ صلاح پسند نہ آئی۔ فرمایا کہ میں خود غزل کہنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کامیابی ہوئی تو وہی پڑھوں گا ورنہ کچھ ضرورت نہیں۔ شیخ صاحب خاموش ہوئے مگر مشاعرے کے دن مقررہ وقت سے پہلے دولت خانہ پر آئے اور غزل سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ نومشق شاعر کے کلام میں عیوب اسقام ہوں گے اُن کا خلوت میں درست کرنا محفل میں بدنامی سے بہتر ہے۔

شیخ رنگیلے بھی حاضر تھے اُنھوں نے بھی اصرار کیا۔ غزل بہ نظر اصلاح سُنی تھی لیکن کسی جگہ حرف رکھنے کی جگہ نہ پائی۔ تحسین و آفریں کی صدا بلند کی۔

اُستاد کی پہلی غزل تھی اس لیے بجنسہ درج کی جاتی ہے :۔

دل کے پردے میں نظر آئے وہ جلوہ کس کا ۔۔۔ آپ ہی آپ جو کھنچ جائے وہ نقشہ کس کا
غمگساری ہے نہ دلداری نہ الفت نہ تعلق ۔۔۔ دل کُڑھے نذر یہ پتھر کا کلیجہ کس کا
غیر بھی سُن کے ہوں برہم وہ شکایت کس کی ۔۔۔ لب پہ آ آکے جو رہ جائے وہ شکوہ کس کا
لب تک آنے نہیں پاتا ہے کہ مٹ جاتا ہے ۔۔۔ کس کے وعدے کی طرح حرف تمنا کس کا
دل سا ہمدرد چھٹا اپنے ہوئے بیگانے ۔۔۔ ظلم غیروں سے بیاں کیجیے کس کا کس کا
اُس کے کوچہ کو تو مقتل ہی بنا دیکھا ۔۔۔ رکھ لیا نام مریضوں نے مسیحا کس کا
سہو سے سجدہ کیا بھی تو پڑھا اُس میں درود ۔۔۔ لے نکیرین سمجھ لو میں ہوں بندہ کس کا
دل کے کھونے کی شکایت تھی دل آجانے پر ۔۔۔ لے اثر تم نے یہ انداز اُڑایا کس کا

اُس وقت تخلص اثر تجویز کیا تھا۔ بعد کو نیر قرار دیا اور کئی سال کے بعد بیاض خاص میں اس غزل کے آخری مصرعہ کو یوں ترمیم فرمایا۔

نیر انداز نرالا یہ اُڑایا کس کا

چند ہفتوں کے بعد مارہرہ ضلع ایٹہ میں ایک بڑا مشاعرہ ہونے والا تھا۔ احباب نے مولوی نور الحسن سے شرکت کے لیے اصرار کیا۔ پہلی غزل کی بہت تعریف ہو چکی تھی۔ ہمت بڑھی اور اس مشاعرے کے لیے بھی غزل کہی۔ سید ابو طالب وکیل رفیق سفر ہوئے۔ اثنائے راہ میں بخار آیا۔ ۳۰ جون مشاعرے کی تاریخ تھی۔ بیماری کی حالت میں غزل سنائی۔ مشاعرہ "واہ واہ" کے نعروں سے گونج اٹھا اور "الولد سرٌ لابیہ" واقف کاروں کے زبان پر آیا۔ چند شعر سُنیے :۔

ہم نے مانا غیر کا کھٹکا ہے آ سکتے نہیں ۔۔۔ کیا بلانا بھی قسم ہے کیوں بلا سکتے نہیں
آہ اپنی نارسا ہے۔ نالۂ دل بے اثر ۔۔۔ ایسے اوچھوں کو پیمبر ہم بنا سکتے نہیں
قتل کرنے پر ہیں آمادہ مگر مشکل یہ ہے ۔۔۔ کچھ نزاکت کچھ حیا ہے ہاتھ اُٹھا سکتے نہیں
حضرت نیر کا شکوہ سُن کے قاصد سے کہا ۔۔۔ کیسے دیوانے ہوئے ہیں ناز اُٹھا سکتے نہیں

مارہرہ سے واپسی کے وقت طبیعت کو سکون تھا۔ موسم کے اثر سے ایک شعر موزوں ہوا۔ سُننے کے قابل ہے :۔

کالی گھٹا پہ کیسی دھنک لال لال ہے — شاید کرشن جی نے اُڑا یا گلال ہے

ورستمبر ۱۹۱۰ء کو مین پوری میں دوبارہ مشاعرہ ہوا۔ طرح تھی۔ ع

دیارِ حُسن میں اُترا ہوا ہے کارواں کوئی

اُستاد نے بھی غزل لکھی۔ ابتدائی دو غزلوں سے مقابلہ کیجئے۔ روانی بڑھ گئی ہے اور کلام میں پختگی کی جھلک نظر آنے لگی ہے:۔

مری آہ رسا کا کیا کرے گا امتحاں کوئی — دھوئیں اُڑ جائیں گے رنگت تو بدلے آسماں کوئی

وہاں اغیار پہلو میں یہاں صدمے جدائی کے — شریک رنج و راحت ہے یہاں کوئی وہاں کوئی

وہ ہنس کر وعدہ کرتے ہیں دل مایوس کہتا ہے — نہ ہو منظور اس حیلے سے اُن کو امتحاں کوئی

ابھی آنکھوں میں آئے تھے ابھی وہ دل میں جا پہونچے — ذرا خلوت میں دیکھے آکے اُن کی شوخیاں کوئی

شکستہ دل اور اسیرِ خواہش دلبر ہو خورش نیرؔ — نہیں ٹوٹے پیالے کا ہمارے قدرداں کوئی

مشاعرے کے بعد کاکوری تشریف لے گئے اور ۲۷ رجب ۱۳۲۸ھ مطابق ۷ ارستمبر ۱۹۱۰ء کو اپنے بڑے صاحبزادے مولوی احمد حسن اور بھتیجے مولوی محمد حسن کی شادیاں اُولوالعزمی سے کیں۔ اپنی بڑی صاحبزادی کا منشی وزیر احمد سے عقد کیا اور تقریبات سے فارغ ہو کر مین پوری واپس گئے۔ راہ میں ایک ساقی نامہ لکھنا شروع کیا وہ نامکمل رہا۔ نظر ثانی کی نوبت نہ آئی اور اصلاح کسی سے لیتے نہ تھے۔ وہ مسودہ بہت دنوں قلمدان میں بند رہا۔ بعد کو اُس کاغذ پر دست خاص سے یہ نوٹ درج کیا:۔

"اب کے مین پوری آتے ہوئے میرے خیالات خدا جانے کہاں پہونچے۔ شکرم پر یہ اشعار پنسل سے لکھے۔ پھر تمام کرنے کی فرصت نہ ہوئی۔ اگرچہ اس قابل نہیں ہیں کہ لکھے جائیں لیکن دل بہلانے کے واسطے یہ مشغلہ اچھا تھا۔ نظر ثانی نہیں ہوئی اور نہ اس عمر میں اصلاح لینے اور چھپوانے کا ارادہ ہے اس لیے ترتیب بھی درست نہیں کی گئی۔"

اُستاد کے عجز و انکسار نے اس نظم کو اشاعت سے محروم رکھا لیکن اُن کا ہر شعر فقیر امیر کے لیے تبرک ہے وہ اس کو کیونکر چشم خلائق سے مستور چھوڑ سکتا ہے:۔

اے ساقی ماہرو کدھر ہے — اپنے مستوں کی کچھ خبر ہے

میرے دل کے لبھانے والے — لانبی تانیں اُڑانے والے

ساون کا مہینہ آگیا ہے — آنکھوں میں خمار چھا گیا ہے

کالی کالی گھٹائیں آئیں　　ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آئیں
جھوٹے ہیں کہ ہار ہیں گلے کے　　تعویذ سے اُن میں سخنے لٹکے
مہندی رچے ہاتھ ڈوریوں پر　　روکے دوپٹہ کہنیوں پر
مِسّی کی دھڑی وہ کالی کالی　　اُس پر پانوں کی دیکھو لالی
آنکھیں تیری مری نظر میں　　سودا زلفوں کا میرے سر میں
ہنستے بھی ہیں اور بناتے بھی ہیں　　شرماتے ہیں مناتے بھی ہیں
غیروں سے ہے لطف اور عنایت　　ہم بولیں تو منت کی شکایت
کعبہ میں نہ دیر میں خبر ہے　　کیا آہ ہماری بے اثر ہے

افسوس ہے کہ اُستاد نے اس نظم کو تمام نہ کیا اور دوبارہ اس طرز میں کبھی کچھ نہ لکھا ورنہ نیچرل شاعری کے دل گرفتہ کلام نیر کو چشم عقیدت کا سرمہ بناتے۔

غرض۔ مولوی محمد محسن کے "کلیات نعت" کی تدوین سے فارغ ہوتے ہی مشق سخن شروع ہوگئی تھی۔ کسی غیر سے اصلاح لینا گوارا نہ تھا۔ صنائع و بدائع کا والد ماجد سے درس لیا تھا لیکن علم عروض سے آشنائی نہ تھی۔ اب اس علم کے اصول و قواعد پر عبور ضروری معلوم ہوا۔ عروض کی کتب متداولہ کا مطالعہ کیا۔ بحریں یاد کیں۔ اُن زحافات کی فہرست لکھی جو صرف اُردو میں مستعمل ہیں اور یادداشت کے لیے اُن کو موزوں کیا۔ زحافات مرکب کو چار شعروں میں نظم کیا۔ تقطیع کی مشق کی۔ اور چند ہی روز میں مقامی شعرا کو درس دینے کے قابل ہوگئے۔

اس دوران میں وکالت کا کاروبار بہت ہلکا تھا۔ موروثی زمینداری کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی۔ سال میں دو ایک بار ضلعداروں اور کارپردازوں کا حساب دیکھ لیتے تھے یا ایک گشت دیہات کا لگا آتے تھے۔ دوپہر کو کچہری جاتے اور شام کو کلب میں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ اہل خانہ کو مین پوری کی آب و ہوا پسند نہ تھی وہ زیادہ تر اپنے والد کے ساتھ رہتی تھیں۔ مولوی محمد حسن انٹرنس پاس کر کے لکھنؤ جا چکے تھے۔ مولوی حامد حسن اور مصطفےٰ حسن عربی پڑھتے تھے۔ اُن کے لیے مولوی مقرر تھے۔ ہر ہفتہ وار اُن کا امتحان لیا جاتا تھا۔ اوقات فرصت میں حکام سے ملاقاتیں کرتے اور تاش وغیرہ مشاغل تفریح میں شریک ہوتے تھے۔ شہر کے ایک مہاجن مصر کدار ناتھ ان کے ہم عمر دوست تھے۔ وہ دوسرے تیسرے دن آتے اور گنجیفہ بازی کی رغبت دلاتے تھے۔ سید ابوطالب کی خاطر سے کبھی کبھی بار مونیم بھی یاد کیا جاتا تھا۔ ڈپٹی حکیم الدین کے صاحبزادے منشی عبدالحق مین پوری میں نائب

تحصیلدار تھے۔ زندہ دل۔ یار باش۔ وفا شعار۔ شب و روز مولوی نورالحسن کی خدمت میں حاضر رہتے اور پالٹکس پر رسالے زنی کیا کرتے تھے۔ خان بہادر منشی اطہر علی وکیل کا اسم مبارک اوراق گذشتہ کی زینت ہو چکا ہے وہ اس سال بہ نیت حج عازم حجاز ہوئے۔ اُن کے صاحبزادے منشی اظہر علی بی اے کئی سال سے امتحان وکالت میں شریک ہوتے اور ناکام رہتے تھے۔ ظریفوں نے فقرہ بازی شروع کر دی تھی کہ ان کے دماغ میں قانون کی گنجائش نہیں ہے۔ مولوی نورالحسن نے اُن کو مین پوری بلایا کئی مہینے مہمان رکھا اور خود قانون کا درس دیا۔ اُستاد کیمیا ساز کا فیض رائگاں نہ جا سکتا تھا۔ اُسی سال وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور آج مجلس وضعان قوانین ہند کے ممبر ہیں!!

حضرت محسن مرحوم ہر سال ماہ ربیع الاول میں ایک مجلس میلاد شریف بڑی عالی ہمتی اور سیر چشمی سے کیا کرتے تھے۔ وسط صفر ۱۳۲۲ھ میں اُن کا انتقال ہوا تو اُس سال ربیع الاول میں یہ مجلس متبرک منعقد نہ ہو سکی۔ دوسرے سال مولوی نورالحسن نے بہ نیت ایصال ثواب رسم قدیم کی پابندی کی۔ صفر ۱۳۲۵ھ قریب آیا تو رائے ہوئی کہ اس سال یہ مجلس بجائے ربیع الاول کے والد ماجد کے ماہ وصال میں منعقد کی جائے اور اُس کے ساتھ مشاعرہ بھی ہو۔ مولوی انوار الحسن سے مشورہ لیا۔ وہ بھی ہم خیال ہوئے اور ۳۰ مارچ ۱۹۰۷ء انعقاد بزم کی تاریخ مقرر ہوئی۔ عوام نے اُس کو برسی کا فاتحہ سمجھا۔ عقیدتمندوں نے حضرت محسن کا عرس تصور کیا لیکن حقیقتاً وہ قدیم مجلس تھی جس کی تاریخ تبدیل کر دی گئی تھی۔ دعوت کا اہتمام ہوا۔ شیوخ اٹاوہ۔ سخن سنجان مارہرہ۔ کہنہ مشقان فرخ آباد وغیرہ مدعو کیے گئے۔ راقم الحروف اُس وقت فیروز آباد ضلع آگرہ کا دورہ کر رہا تھا اُس کو بھی یاد فرمایا۔ تاریخ معینہ پر صبح کے وقت بڑی فراخ حوصلگی سے محفل کا انصرام ہوا۔ سہ پہر کو الگین یونین کلب کے وسیع صحن میں مشاعرہ تھا۔ شعرائے مین پوری و فرخ آباد نے خوب خوب غزلیں پڑھیں۔ شیخ عبدالوحید فدا حضرت ظاہر فرخ آبادی۔ اور منشی نعیم الدین کاکوروی کے صاحبزادے حکیم حکیم الدین برق کی غزلیات کی بہت تعریف ہوئی۔ حکیم صاحب کی غزل اس قدر مقبول ہوئی کہ ختم محفل کے بعد شائقین کے اصرار سے دوبارہ پڑھوائی گئی۔ اُس کے چند شعر سُنیے:۔

وصال اُن کا ہو اور مجھ کو میسر۔ ہو نہیں سکتا	وہ۔ اور مجھ سے ملیں۔ ایسا مقدر ہو نہیں سکتا
نہ ہو جس دل میں تو بالکل غلط ہے اُس کو دل کہنا	نہ سودا تیرا جس سر میں ہو وہ سر ہو نہیں سکتا
مری آنکھوں میں آجا دُ مرے دل میں سما جاؤ	مقام خلوت اس سے اور بہتر ہو نہیں سکتا
الٰہی خیر ہو یہ بت تو دل ہی چھینے لیتے ہیں	بتوں کا گھر بنے اللہ کا گھر ہو نہیں سکتا

پڑا ہے برق سے پالا سنبھل لے آسماں اب تو — نہ اُڑ جائیں دھوئیں تیرے ستمگر ہو نہیں سکتا

شیخ محمد اسمٰعیل رنگیلےؔ کی غزل ظرافت میں خوب تھی۔ چند شعر یاد ہیں :۔

بنے گو لاکھ نیٹو پر وہ مسٹر ہو نہیں سکتا — مقابل بوٹ کے ہرگز سلیپر ہو نہیں سکتا
نہ دیتے ہو نہ دو اچھا نہ دو للکارتے کیوں ہو — مرے ٹیپو کو کیا ٹکڑا میسر ہو نہیں سکتا
مو کل دم دیے پھرتے ہیں نرسنگھ داس کے اوپر — پلیڈر اور پھر ایسا پلیدر ہو نہیں سکتا

مولوی نور الحسن میر مشاعرہ تھے۔ اُن کی غزل بھی سید الکلام تھی :۔

شفا ہو مجھ کو ان آنکھوں سے باور ہو نہیں سکتا — کہ جادوگر میں اعجاز پیمبر ہو نہیں سکتا
وہ کہتے ہیں کہ بے جا تہمتیں تم نے لگائی ہیں — رہے آٹھوں پہر دل میں وہ دلبر ہو نہیں سکتا
صبا تجھ کو مبارک تو وہاں گر آتی جاتی ہے — مگر اتنا رسا اپنا مقدر ہو نہیں سکتا
سراپا ناز جو بت ہو نیاز اُس میں کہاں ممکن — خدا چاہو تو کہہ لو۔ بندہ پرور ہو نہیں سکتا
مرے دل میں اثر کیا خاک ہو پند و نصیحت کا — یہ بت خانہ کبھی اللہ کا گھر ہو نہیں سکتا
تسلی خاک ہو نیرؔ کو تصویر خیالی سے — شبیہ گل میں انداز گل تر ہو نہیں سکتا

نظرت نے سنجیدہ و متین بنایا تھا۔ معاملہ بندی پسند نہ تھی۔ زبان کے چٹخارے سے شعر میں لطف پیدا کرنا عجز تصور فرماتے تھے۔ مضمون آفرینی کا شوق تھا۔ ہوسناکی کی داستانیں۔ بازار کی کہانیاں نظم کرنا عار سمجھتے تھے اور عاشقانہ شاعری میں انھیں چوچلوں کی قدر رہتی لہذا صوفیانہ مضامین تلاش کرنے اور نعت کہنے کا عزم کیا۔ مندرجہ ذیل غزل شروع کی تھی مگر ناتمام رہی :۔

عیاں گر پردۂ دل میں تری تصویر ہو جاتی — "تعالیٰ شانہ" کی اک نئی تفسیر ہو جاتی
وہ قتل بیگنہ پر ہوں نہ شرمندہ قیامت میں — مجھے یہ دھن ہے مجھ سے بھی کوئی تقصیر ہو جاتی
ہماری آہ کو لازم رسائی تھی زمانہ میں — کہیں ناقوس بن جاتی کہیں تکبیر ہو جاتی

نعت کی غزل سنیے :۔

دل میں تصور شہ کون و مکاں نہ تھا — شعلہ تھا طور کا کہیں جس میں دھواں نہ تھا
دیر و حرم میں ایک ہی جلوہ نظر پڑا — میری نظر میں صرف مکیں تھا مکاں نہ تھا
سایہ میں تیرے امت عاصی نے دم لیا — یہ وہ زمین تھی کہ جہاں آسماں نہ تھا
سایہ قد رسول کا اُمت کو مل گیا — اللہ رے دلدہی کہ یہاں تھا وہاں نہ تھا
گذرے ہیں شاعر اور بھی نیرؔ خدا گواہ — محسن سا نعت میں کوئی شیریں بیاں نہ تھا

جون ۱۹۱۱ء میں کلکٹر ضلع نے بادشاہ کی سالگرہ کا جلسہ کیا۔ مولوی نورالحسن سے نظم کی فرمائش ہوئی اُنھوں نے بلطائف الحیل ٹالنا چاہا۔ مگر احباب کے اصرار سے مجبور ہوے۔ کلکٹر صاحب کے بنگلہ پہ ایوننگ پارٹی تھی۔ ضلع کے رؤسا اور عمائدین جمع تھے۔ تکلفات سے فراغت کے بعد حسب ذیل نظم سنائی:-

کیسی ادا سے آمد فصل بہار ہے — شرمیلی چال اور غضب کا نکھار ہے
گرمی کی رُت میں رات سہانی خنک ہوا — گجرا کلائی میں ہے تو گردن میں ہار ہے
ہاتھوں میں زاہدوں کے ہی مضراب خوشنما — ہر رند دوش پر لیے پھرتا ستار ہے
یہ لطف پارٹی کا یہ ترتیب و انتظام — جو چیز اس جگہ ہے وہ ترتیب دار ہے
کس کا یہ جشن سالگرہ کیسی دھوم ہے — تقریب کیا ہے جس کی خوشی بے شمار ہے
شاہنشہ ہند کا شہ اڈورڈ ہفتمیں — قربان جس پہ چاند ہے سورج نثار ہے
جب تک رہے زمانہ میں یارب خوشی کی دُھوم — جب تک نشاط دل کے لیے خوشگوار ہے
سایہ میں حق کے وہ رہے ہم اُس کے سایہ میں — جب تک یہ دھوپ چھاؤں یہ لیل و نہار ہے
افکار دشمنوں کو میسر اُسے ہو عیش — جب تک زمانہ بھر میں خزان و بہار ہے
نورالحسن دعا تری مقبول ہوگئی — آمین کی بلند صدا بار بار ہے

راقم جولائی ۱۹۱۱ء میں فرائض ملازمت کے وسیلہ سے مین پوری پہونچا۔ شام کا وقت تھا۔ مصر کدار ناتھ اور مولوی عبیدالحق خدمت میں حاضر تھے۔ امساک باراں کی شکایت تھی۔ مصر کدار ناتھ نے کہا کہ ہفتہ عشرہ میں پانی نہ برسا تو قحط یقینی ہے۔ راقم اضلاع مغربی کے دورے سے آیا تھا اُس طرف بارش کسی قدر ہو چکی تھی عرض کرنے لگا کہ اب قحط کا خطرہ نہیں باقی ہے۔ اُستاد مرحوم نے فرمایا کہ خدا رحم کرے گرانی تو ابھی سے شروع ہے۔ اس کے بعد شعر و سخن کا تذکرہ ہوا۔ ارشاد فرمایا کہ نعت کے لیے غزل مناسب نہیں ہے۔ ارادہ ہے کہ غزوۂ بدر یا فتح مکہ کی حکایت نظم کروں۔ اور سراپائے رسول اکرم ؐ کے طرز پر مسدس لکھوں۔ میں نے عرض کی واقعہ نگاری کے لیے مثنوی موزوں ہے اور فتح مکہ تاریخ اسلام کا مہتم بالشان واقعہ ہے۔ فرمایا کہ میں اول غزوۂ بدر نظم کرنے کی کوشش کروں گا۔ فتح مکہ تو مدتوں بعد ہے۔

جب حاشیہ نشین رخصت ہوئے تو راقم سے فرمایا کہ مقدمات کا دائرہ یہاں بہت تنگ ہوگیا ہے اگر قحط پڑا تو میرے پاس کچھ بھی کام نہ رہے گا۔ ارادہ ہے کہ مین پوری کی سکونت ترک کرکے حیدرآباد میں قسمت آزمائی کروں۔ وہاں ہندوستانی وکلا کی بہت قدر ہے۔ میں نے عرض کی کہ آپ

تشریف لے جانے سے یہاں کے علاقہ کا انتظام دشوار ہو جائے گا۔ فرمایا زمینداری کا کام ضلعدار دیکھتے ہیں وہ بحال رہیں گے۔ کوٹھی کرایہ پر دیدی جائے گی۔ مولوی انوار الحسن سال میں دو ایک بار اس طرف آیا کریں گے۔ میں نے عرض کی کہ بڑی افسوسناک خبر آپ نے اس وقت سُنائی ہے۔ فرمایا "کیا کروں۔ میرا دل یہاں سے اُچاٹ ہو گیا ہے۔" اس کے بعد گفتگو کا رُخ بدل دیا اور اپنے لڑکوں کی تعلیم کا تذکرہ کرنے لگے۔

راقم الحروف کو اس موقع پر کئی ہفتہ تک خدمت اقدس میں حاضری کا شرف حاصل رہا۔ مولوی احمد حسن بھی اُس زمانہ میں مین پوری میں تھے۔ احاطہ کے نو تعمیر کمرے میں رہتے تھے اور میں بھی اُنھیں کے ساتھ اقامت گزیں تھا۔

خود بدولت اپنے والد مرحوم کی نشست گاہ میں رونق افروز رہتے تھے۔ صبح کو مقدمات کی مسلیں دیکھتے۔ خطوط لکھتے یا شاعری کرتے تھے۔ سہ پہر کو کلب جاتے اور ٹینس کھیلتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے۔ سرِ شام احباب کا مجمع ہوتا۔ اور شب کے نو دس بجے تک صحبت رہتی تھی۔ ایک روز سہ پہر کو کوٹھی کے پورب طرف صحن میں تشریف فرما تھے۔ راقم آثم خدمت میں حاضر ہوا۔ سامنے پُر فضا پائیں باغ تھا اور سرو کے شاندار درخت لگے تھے۔ جیب سے کاغذ کا پرچہ نکال کر خلاف عادت یہ اشعار سُنائے:۔

سرو چمن بہ شکل عَلَم سرفراز ہے　　مہندی کی ہر روش صف اہل نماز ہے
بلبل نیاز مند گل بے نیاز ہے　　سنبل شبیہ حضرت گیسو دراز ہے
لالہ ہے سر بکف کہ جو موقع ذرا ملے
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں جا ملے

میں نے عرض کی کہ جنگ کی تمہید کے لیے یہ بند نہایت خوب ہے۔ فرمایا "اسی طرز پر لکھنے کا ارادہ ہے اور میں پہلے مسدس ہی لکھوں گا۔"

چند روز کے بعد راقم مین پوری سے رخصت ہوا۔ اکتوبر سے مولوی احمد حسن و محمد حسن علیگڑھ چلے گئے۔ مولوی حامد حسن و مصطفیٰ حسن کے لیے بیش قرار تنخواہ پر مولوی نوکر تھے۔ اہل خانہ اپنے والد کے ساتھ تھیں اور صاحب اولاد ہو چکی تھیں۔ مولوی طاہر محسن ۱۷ فروری ۱۹۱۶ء کو پیدا ہو چکے تھے۔ اخراجات میں افزونی تھی۔ وکالت میں ترقی نہ ہوئی۔ قحط شروع ہو گیا۔ دیہات کی آمدنی ذریعہ معاش تھی اُس میں بھی نقصان نظر آنے لگا۔ اتفاقات قضا و قدر سے اسی زمانہ میں ضلع کے صاحب جج سے

بھی خفیف رنجش پیدا ہوگئی۔ دل مین پوری سے پہلے ہی اُچاٹ تھا اب ترک سکونت کا مستقل قصد کر لیا۔ حیدرآباد جانے کی نیت تھی۔ مشورے کے لیے مولوی انوار الحسن کے پاس اُناؤ گئے۔ اُنھوں نے دکن کے سفر سے مخالفت کی اور صلاح دی کہ وہ بجاے مین پوری کے ہردوئی میں وکالت کریں کیونکہ وہاں مقدمات کی کثرت اور قابل و جفاکش وکیل کی تلاش ہے۔

یہ تجویز پسند خاطر ہوئی۔ مین پوری سے موروثی کتب خانہ اور تین پشت کا اسباب خانہ داری ہردوئی منتقل کیا گیا۔ مولوی حامد حسن و مصطفےٰ حسن کو ہمراہ لے کر یکم دسمبر ۱۹۰۶ء سے ہردوئی میں مقیم ہوئے۔

ہردوئی میں وکالت اور خورشید بدر

یہ شہر وطن مالوف سے قریب تھا۔ آب و ہوا پسند ہوئی۔ اسٹیشن کے قریب منڈی میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ مین پوری کی وسیع و پُرفضا کوٹھی کے بعد یہاں دل کیا لگتا۔ چند ہی روز میں تکلیف معلوم ہونے لگی۔ اُس کو چھوڑ کر بازار کے قریب گئے۔ دوسرا مکان بھی ناکافی ثابت ہوا۔ آخرکار مولوی لطیف الدین کا کوروی مختار نواب صاحب شاہ آباد کی ایک حویلی میں قیام اختیار کیا اور جب تک ہردوئی میں رہے اسی محلہ میں سکونت رکھی۔

وکلاء شہر سے ملاقات کی۔ حکام کی خدمت میں حاضری دی۔ کچہریوں کے چکر لگائے۔ کارآزمودہ اور تجربہ کار تھے چند روز میں مقدمات ملنے لگے اور تین مہینہ کے اندر قانون دانی۔ معاملہ فہمی اور حاضر جوابی کی شہرت ہوگئی۔ مجلس میلاد شریف منعقد کر کے شہر کے مسلمانوں میں ہردلعزیزی حاصل کی۔ انجمن اسلامیہ اور مسجد جامع کے انتظامات میں شرکت فرما کر ضلع میں نام پیدا کیا۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں نمائش کا میلہ تھا احباب کی فرمائش سے ایک نظم لکھی اور ۲ مارچ کو نمائش کے دربار میں پڑھی۔ پہلا بند تھا :-

آئی بہار ساتھ اُمنگیں لیے ہوئے شاخوں پہ پھول جھوم رہے ہیں پیے ہوئے
نور الحسن۔ تم اور لبوں کو سیے ہوئے توبہ کو توڑ دو۔ ہوئی مدت کیے ہوئے
بلبل کے نغمے سُنیے پرندوں کے چہچہے
کلیاں چٹک چٹک کے لگاتی ہیں قہقہے

روشن خیالوں کے ایک گروہ نے نمائش کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اُن پر چوٹ تھی :-

مخمل پہ لات مار کے عاشق ہیں ٹاٹ کے جو غل مچا رہے ہیں یہاں بائیکاٹ کے

کلکٹر ضلع کی تعریف میں ایک بند تھا جس کی ٹیپ تھی

جھڑتے ہیں پھول لطف سے وہ بات بات میں گلدستہ بن گیا ہے وہ سارے صفات میں

نظم کی بہت تعریف ہوئی۔ سارے ضلع میں تازہ وارد شاعر کی معجز بیانی مشہور رہوئی۔ کلکٹر ضلع مہربان ہوئے۔ حکام عزت کرنے لگے اور وکالت چمک اُٹھی۔

۱۹ راگست ۱۹۰۸ء کو سندیلہ میں مشاعرہ تھا۔ دور دور سے شعرا تشریف لائے تھے۔ طرح تھی ع

میلہ لگا ہے پیرِ مغاں کی دُکان پر

مین پوری کے بعض حضرات بھی تشریف لائے تھے۔ رنگیلے سے ناظرین کا تعارف ہو چکا ہے اس لیے اُن کے دو شعر سُننا چاہیے :۔

دشمن جہاں اڑا تھا وہیں ہم بھی اَڑ گئے　　دو ٹوک گویا باندھ دیے ایک تھان پر
اُن کی زمین غیر کی خود کاشت تو نہیں　　پھر کیوں نہ جوتیں بوئیں اُسے ہم لگان پر

حکیم حکیم الدین برق نے بھی غزل لکھی تھی۔ مطلع تھا۔

قبضہ کیے ہوئے ہیں وہ دونوں جہان پر　　خود ہیں زمین پر تو دماغ آسمان پر

مولوی نور الحسن کی مضمون آفرینی دیکھیے :۔

ہم وہ بلا ہیں آئیں اگر اپنی آن پر　　تارے زمین پر ہوں دھوئیں آسمان پر
وہ آئے ایک دم کے لیے۔ خیر آئے تو　　شکوے کے ساتھ شکر ہے لازم زبان پر
مین حشر میں مثال ادیس تشرن اُٹھوں　　دل میں احد ہو۔ نام محمد زبان پر
کچھ تھی مریض ہجر کو جینے کے دم کی آس　　وہ بھی تو جا کے بیٹھ رہے آسمان پر
نیر وہ ہم نہیں کہ جو چوری چھپے پییں　　چپکے سے جا کے بیٹھ رہیں پھر مکان پر

وکالت کا کاروبار بڑھتا گیا مشق سخن کی فرصت مفقود ہوئی لیکن غزوۂ بدر کے واقعات نظم کرنے کا عزم قائم تھا۔ رجبی شریف کی مجلس میں ہر سال کاکوری قدم رنجہ فرماتے اور حسب دستور نعت خوانی کرتے تھے۔ اس سال اپنے جدید مسدس کے چند بند سنائے۔ اعزہ دنگ ہوئے۔ اہل بزم ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ بعض کوتاہ اندیشوں کو شک ہوا کہ "یہ اشعار حضرت محسن کے ہیں۔ مولوی نور الحسن نے کبھی شعر نہیں کہا" عقیدت مندوں نے خیال کیا کہ یہ زورِ کلام "کلیاتِ نعت مولوی محمد محسن" کی تدوین کا ثمرہ ہے۔ ایک بند بطور نمونہ کے لکھا جاتا ہے۔ شہنشاہ رسل کا سراپا ہے۔ چشم مبارک کی تصویر دیکھیے :۔

پتلی سیاہ۔ ڈورے سفیدی میں لال لال　　آنکھیں بنی ہیں اُمت مرحوم کی مثال
ہم سے سیہ کاروں کا پتلی میں ہے جمال　　بینا دلوں کا رنگ سپیدی میں ہے کمال

پھولی شفق ہے آنکھ میں خون شہید کی
اللہ کیا رسائی ہے مشتاق دید کی

فروری ۱۹۰۹ء میں نمائش کا میلہ ہوا۔ اب کے اس کے ساتھ ایک مشاعرہ بھی تھا۔ طرح تھی۔ ع

بلبل کے آنسوؤں میں ہے خوشبو گلاب کی

مشاعرہ کے لیے غزل۔ دربار کے لیے نظم لکھی۔ غزل کا رنگ دیکھیے:۔

زاہد کی توبہ ٹوٹ کے رندوں میں جا ملی — یہ بات عمر بھر میں ہوئی ہے ثواب کی
یہ خوب دلدہی ہے کہ خط کے جواب میں — تصویر بھیج دی دل خانہ خراب کی
نیرؔ کو تم خدا سے سمجھتے ہو دور کیوں — ذرّہ میں بھی کرن ہے اسی آفتاب کی

ہر سال نمائش کا میلہ ہوتا تھا اور دربار کے لیے نظم لکھنے پر مولوی نور الحسن مجبور کیے جاتے تھے۔ یہ نظمیں وقت، مقام اور موسم کے لحاظ سے پر لطف ہوتی تھیں۔ دربار میں واہ واہ سبحان اللہ کا غل مچتا تھا لیکن شاعرانہ حیثیت سے قابل قدر نہ تھیں۔ ۴ مارچ ۱۹۱۰ء کے دربار میں ایک مسدس پڑھا جس کا پہلا بند تھا:۔

پھولا ہے آج کیسی ادا سے گل فرنگ — خوشبو نے اختیار کیے ہیں ہزار رنگ
کچھ نوبہار کے نظر آتے ہیں رنگ ڈھنگ — کلیاں چٹک چٹک کے بجاتی ہیں جلترنگ
ہر شاخ پتیوں سے ہے کیسی بھری بھری
دھانی لباس میں ہے زمرد پری کھڑی

دربار میں مسدس بہت پسند کیا گیا۔ ٹیپ واقعی خوب تھی لیکن ایک شاگرد نے دبی زبان سے چند روز کے بعد کہا کہ "گل فرنگ میں خوشبو نہیں ہوتی"۔ ارشاد فرمایا کہ "رنگ ہوتا ہے اور وہی خوشبو کا بدل ہے"۔

نمائش کے سلسلہ میں مشاعرہ بھی تھا۔ طرح تھی۔ ع

کچھ اب کے سال رنگ نئے ہیں بہار کے

غزل کے چند شعر سنیے:۔

خلعت جو دھوپ چھاؤں کا پایا تھا خواب میں — راتیں ملیں فراق کی دن انتظار کے
ہیں آرزو کے حرف بھی ایسے الگ الگ — جس طرح پھول بکھرے ہوں فصل بہار کے
نیرؔ کی پارسائی کا سب حال کھل گیا — حضرت بھی پیچھے پیچھے تھے اک بادہ خوار کے

واقعات غزوۂ بدر کے نظم کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اوقات فرصت میں دو چار شعر موزوں کرتے تھے۔ رزمیہ نظم کے لیے جنگ کی تفصیل۔ آلات حرب کی توصیف و توضیح۔ مبارزین و مقاتلین کی فہرست ضروری تھی۔ لیکن اس حصہ کو مہمل کیا اور فرمایا کہ "میر انیس اس صنف سخن کو تمام کر چکے مزید کوشش فضول ہے" علاوہ اس کے صحیح روایات سے یہ تفصیلات معلوم نہ ہوتی تھیں اور تخیل سے کام لینا منظور نہ تھا۔ ایک بند میں کل حکایت ختم کر دی۔

مقبول کبریا کی دعا با اثر ہوئی فوج قریش لمحہ میں زیر و زبر ہوئی
اسلام کو خدا کی مدد سے ظفر ہوئی روزے میں کیسے عید کی گویا سحر ہوئی
احسان کیا بیان ہو مالک کی قدر کا
گھر بن گیا بہشت میں اصحاب بدر کا

اس مسدس کا خورشید بدر نام رکھا اور افتتاح کے لیے یہ رباعی تصنیف کی

یارب مجھے عشق رخ پیغمبر دے نیر ذرہ ہے مہر انور کر دے
کر نقش نگین دل پہ اللہ اللہ ہر نقش میں پھر نام محمدؐ بھر دے

لشکر اسلام بدر میں عشا کے وقت پہونچا تھا اور رمضان کی پندرہ تاریخ تھی اس لیے تمہید میں شب ماہ اور ارکان نماز کی طرف اشارہ تھا مثلاً

آئی ہے آج رات عجب آن بان سے مہ ہے جلو میں مہر درخشاں کی شان سے
سبزہ کی ہر روش پہ ادا کہکشاں کی ہے اللہ اکبر آج یہ نیت کہاں کی ہے

گریز میں حلیۂ مبارک کی تفصیل تھی اور یہی مسدس کا بہترین حصہ تھا۔ زبان مبارک کی تعریف میں فرماتے ہیں:۔

سحر حلال ہے کہیں آیت شفا کی ہے گویا زبان کا ہے کو مرضی خدا کی ہے

تناسب اعضا کی توصیف:۔

موزونی و تناسب اعضا کا روپ ہے گرمی کی چاندنی ہے تو جاڑے کی دھوپ ہے
ڈوبا خدا کے رنگ میں قد مصطفےٰ کا ہے تصویر ہے رسول کی نقشہ خدا کا ہے
آئینۂ جمال الٰہی ہے رو برو لا یمکن الثناء کما کان حقہ

مقدس ہمراہیان جنگ کی تعریف میں یہ شعر لاجواب تھا:۔

تھوڑی بہت سبھی کو تھی صحبت رسول کی ہر ایک پنکھڑی تھا اسی ایک پھول کی

لشکر بدر میں خیمہ زن ہوا تو پانی کی قلت تھی اور تکان راہ سے بدن چور چور تھا۔ رحمتِ حق سے مجاہدین پر نیند کا غلبہ ہوا اور سفر کی خستگی دفع ہو گئی۔ نیند کی تعریف کرتے ہیں :-

دل خستہ ہو کے نیند کے انداز دیکھیے کیفیت شراب خدا ساز دیکھیے

خاتمہ پر حمد کا شعر تھا :-

ذرہ کی تو چمک ہے تو قطرہ کی آب ہے جس دل میں تو نہیں ہے وہ خانہ خراب ہے

اور دعا تھی :-

وحدت دوئی کے رنگ میں یوں روبرو رہے آنکھوں میں ہو رسول ترا دل میں تو رہے

فی الحقیقت یہ مسدس مولوی نور الحسن کا شاہکار تھا اور اُن کا کوئی عاشقانہ، صوفیانہ یا نعتیہ کلام اس نظم سے فائق نہ ہو سکا۔

الغرض نعت گوئی کی مشق سے شاعری پختہ ہو گئی۔ خورشید بدر کی قبولیت عام نے شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ انجمن اسلامیہ بردوئی کے روحِ رواں تھے۔ عید گاہ کی امامت سپرد تھی۔ مسلمانان شہر کے مسلّم لیڈر ہو گئے۔ ایک سن رسیدہ امین بٹوارہ ملک زاہد علی نام شب دردز کے جلیس و انیس تھے۔ معجونیں بنتی اور کشتے تیار ہوتے تھے۔ مولوی مصطفےٰ حسن و حامد حسن کو تعلیم کے لیے لکھنؤ روانہ کر دیا تھا اور وہ ندوۃ العلما میں عربی پڑھتے تھے۔ اپنے عزیز انیس احمد عباسی کو (جو اب روزنامہ حقیقت کے اڈیٹر و لکھنؤ میں ڈپٹی کمشنر ہیں) انگریزی پڑھنے کے لیے اپنی نگرانی میں رکھا۔ وہ انٹرنس کلاس میں تعلیم پاتے اور اوقات فرصت میں مولوی نور الحسن سے استفادہ کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں چند ماہ کے لیے اپنے بھانجے شفیق احمد کو بھی ہمراہ رکھا تھا مگر وہ تادیب و تنبیہ کے متحمل نہ ہو سکے اور اپنے بھائی ڈاکٹر حکیم احمد کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ وکالت کے کاروبار سے لڑکوں کی

سلہ منشی زین العابدین فرہاد کا تذکرہ ان اوراق میں پہلے آ چکا ہے۔ مولوی نور الحسن کے غائبانہ دوست تھے۔ خورشید بدر اُن کی نظر سے گزرا تو ایک قصیدہ اس کی تعریف میں لکھ کر روانہ کیا۔ اس تقریظ کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں :-

جانِ ایماں آید و ایمانِ جاں آید ہمی یا کہ از نور الحسن خوش ارمغاں آید ہمی

ایں مسدس پنج نوبت زد بشش رنگ جہاں شاہد ہر ہفت خلد جاوداں آید ہمی

نور تیز است از انوار نعت مصطفےٰ حرف حرفش را دمادم بر زباں آید ہمی

خامہ او نقش بند پکرستان خیال طبع روشن شارق اشراقیاں آید ہمی

تاب نیر باد در رشک افزائے مہر نیمروز خواہش نشر جاوداں از دل بر زباں آید ہمی

خبرگیری کی مہلت نہ ملتی تھی۔ آمدنی اس قدر وافر تھی کہ اخراجات کے بعد پس انداز ہوتی تھی۔ موروثی جائداد کا منافع کار ہائے خیر میں صرف کرتے تھے۔ اوراد و وظائف کا شغل جاری تھا مدح خیرالمرسلین نے آستانۂ سرکار دو عالم پر حاضری کا اشتیاق پیدا کیا۔ عشق اول در دل معشوق پیدا می شود۔ اُدھر بھی کشش شروع ہوئی اور سفر حجاز کے سامان مہیا ہونے لگے۔

سفر حجاز | مولوی انوارالحسن اناؤ میں وکالت کرتے تھے۔ جاذبۂ شوق نے فریضۂ حج یاد دلایا۔ پیشہ سے دل سرد ہوا۔ اہل و عیال ہمراہ لے کر عرب کا عزم بالجزم کر دیا۔ مولوی نورالحسن ہم خیال ہوئے۔ ہردوئی کے ایک نووارد وکیل مولوی محمود الحق کو اپنے مقدمات حوالہ کیے۔ اسباب خانہ داری سپرد کیا۔ منشی انیس محمد عباسی مدرسہ میں پڑھتے تھے اُن کو مکان مسکونہ میں چھوڑا۔ اہلیہ محترمہ اپنی ہمشیرہ کی علالت کے سبب ہمراہ نہ جا سکتی تھیں وہ اپنے والد ماجد کے سایۂ عاطفت میں رہیں اور خود بدولت اہل و عیال کی زنجیر محبت توڑ کر بھائی کے رفیق سفر ہوئے۔

حاجی ذکی الدین اور منشی رشید الدین مع اپنے قبائل کے ساتھ ہوئے۔ اعزہ کی بعض دیگر مستورات بھی قافلہ کے ہمراہ ہوئیں اور ۲۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء مطابق ۲۰ر شوال ۱۳۲۸ھ کو یہ کاروان بآہنگ حجاز کاکوری سے رخصت ہوا۔

مولوی محمد شفیع بجنوری جو کئی بار زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو چکے تھے (اور اس سال ۱۳۵۵ھ میں ستر ہویں حج کے لیے عرب گئے ہیں) مراحل و منازل سفر کا تجربہ رکھتے تھے امداد و رہبری کے لیے ہمراہ لیے گئے۔ انھوں نے چند روز پہلے سے بمبئی پہونچ کر سامان سفر فراہم کر لیا تھا۔ کاکوری کا قافلہ بمبئی میں تین چار دن قیام کر کے "نجری" جہاز پر سوار ہوا اور ہندوستان کے ساحل کو خیرباد کہی۔

قرنطینہ کامران میں تضییع اوقات کے بعد سترھویں دن جدہ پہونچے اور "باب المکہ" میں قدم رکھا۔ دو تین دن وہاں بھی قیام رہا۔ شغدف خرید کیے۔ اونٹ کرایہ پر لیے اور دو دن کا سفر طے کر کے ۲۰ر ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو مکہ معظمہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ عمرہ ادا ہوا۔ پندرہ بیس دن کے بعد حج کا وقت آیا۔ منا اور عرفات میں حاضری دی۔ فریضہ سے سبکدوش ہو کر مکہ میں مقیم ہوئے اور تقریباً چالیس دن نماز پنجگانہ مسجد الحرام میں نصیب ہوئی۔

حاجی اعجاز علی کاکوروی (برادر زادہ منشی امتیاز علی مرحوم وزیر بھوپال) اُس سال دوسری مرتبہ حج کے لیے آئے ہوئے تھے اور مولوی نورالحسن سے پہلے مکہ میں داخل ہو چکے تھے۔ اہل و عیال ساتھ تھے۔ منشی مشرف علی مرحوم (برادر منشی اطہر علی مسبوق الذکر) کی بیوہ بھی اُن کے ہمراہ تھیں اور وہ منشی منظور علی

"منجم" کے لڑکے مشہود علی کو جو اُن کی نگرانی میں پرورش پاتا تھا ساتھ لائی تھیں۔ یہ لوگ دوسرے مکان میں فروکش تھے مگر سب اہل وطن ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔

جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے طبیب حاذق حکیم عبدالعزیز۔ میرٹھ کے مشہور دنداں ساز گل محمد۔ اور لکھنؤ کے ڈاکٹر اشرف خاں بھی مکہ معظمہ میں حاضر تھے۔ عبادت و استراحت سے جو وقت بچتا وہ اہل کمال کی صحبت میں صرف ہوتا تھا اور نہایت لطف سے یہ وقت گذر رہا تھا۔

اُس وقت مکہ سے مدینہ کا سفر آلام و مصائب کا مخزن تھا۔ بے آب و گیاہ ریگستان حائل تھے۔ ہر قدم پر بدوؤں کی لوٹ مار کا خطرہ تھا۔ سلطانی راستہ سے اونٹوں کا قافلہ چودہ دن میں مدینہ پہونچتا تھا۔ ایک نزدیک تر راہ اور بھی کہ جدہ سے جہاز پر ینبوع جائیں اور وہاں سے اونٹوں پر چھ دن میں مدینے پہونچیں۔ رفقائے سفر میں اختلاف رائے ہوا۔ بعض سلطانی راستہ کو ترجیح دیتے تھے اور بعض ینبوع کی طرف کوچ بہتر سمجھتے تھے۔ مسجد الحرام میں استخارہ کیا گیا اور سلطانی راستہ سے سفر بہتر معلوم ہوا۔ چند روز کے بعد خیالات نے پلٹا کھایا اور ۱۰ محرم ۱۳۲۹ھ کو حکم استخارہ کے خلاف ینبوع جانے کے لیے جدہ کی طرف راہی ہو گئے۔ حاجی اعجاز علی مکہ میں مقیم رہے مگر حکیم عبدالعزیز ہمراہ گئے۔ ینبوع میں قدم رکھتے ہی صعوبات کا سلسلہ شروع ہوا۔

مولوی انوار الحسن کا ہفت سالہ لڑکا محمود حسن جہاز سے تندرست اُترا تھا لیکن فرودگاہ تک پہونچتے ہی ہیضہ میں مبتلا ہوا اور آواز بند ہو گئی۔ حکیم عبدالعزیز نے علاج کیا مگر قضائے الٰہی رد نہ ہو سکتی تھی۔ ہنستا کھیلتا لڑکا چوبیس گھنٹے میں تمام ہو گیا۔ اور ینبوع کے ریگستان میں دفن کیا گیا۔

حاجی ذکی الدین اسہال میں مبتلا ہوئے اور نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی۔ حاجی رشید الدین بیمار ہوئے۔ ان کی ہمشیرہ علیل ہوئیں اور قریب قریب کل ہمراہیان سفر کو کم و بیش امراض کی شکایت ہوئی۔ ہر مریض کی زبان پر تھا کہ آستانۂ نبی کریمؐ تک پہونچوں تو مرض دور ہو جائے۔ مگر گانوں میں اونٹ موجود نہ تھے جو یہاں سے کوچ کیا جاتا۔ آٹھ دن کے شدید انتظار کے بعد اونٹ ملے اور ریگستان کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ راستہ کے بدو بگڑے ہوئے تھے اور کسی قافلہ کو بغیر زحمت و آزار کے گذرنے نہ دیتے تھے۔ ہر روز حملہ کا خوف رہتا تھا اور ہر منزل دغدغہ سے کٹتی تھی۔ ایک دن سامنے میں ٹوٹے ہوئے شغدف۔ پھٹے ہوئے کپڑے۔ نظر پڑے اور معلوم ہوا کہ کل اسی مقام پر لوٹ ہو چکی ہے اور آج بھی حملہ یقینی ہے۔ قافلہ والے توبہ استغفار کرنے لگے اور موت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اتنے میں غل ہوا کہ پہاڑی کی طرف سے بدو آ رہے ہیں کسی کو جینے کی آس نہ رہی۔ ہر شخص

اپنی بدنصیبی پر گریاں تھا کہ مدینۂ رسول کے قریب پہونچ کر حاضری آستانہ کی حسرت دل میں رہی جاتی ہے۔ مدینہ ہنوز دو منزل ہے اور موت کا پیغام آ پہونچا۔ دل شکستہ محزونوں نے خلوص سے دعائیں مانگیں اور درگاہ بے نیاز سے اجابت استقبال کو آئی۔ سلطان روم کا فوجی دستہ مدینہ میں حاضر تھا۔ کل کے لُٹے ہوئے کارواں کی خبر مدینہ پہونچ چکی تھی نئے قافلہ کی حفاظت کے لیے یہ رسالہ بھیجا گیا اور عین وقت پر حاجیوں کی دست گیری کو پہونچا۔ ہر ایک ترک بچہ اہل قافلہ کی نظر میں فرشتۂ رحمت تھا۔ اُن کی فوجی وردی رحمت یزدانی کا سایہ اور اُن کے زرق برق ہتھیار تجلیات حق کا پرتو معلوم ہوتے تھے۔

سلطانی لشکر کو دیکھتے ہی بدو فرار ہوئے اور مظلوم حاجیوں کے تن بے جان میں جان آئی۔ دوسرے دن قافلہ مع الخیر مدینہ میں داخل ہوا۔ سبز گنبد کی جھلک نظر آتے ہی سب پریشانیاں فراموش ہوگئیں۔ بیمار تندرست ہوئے اور ضعیفوں کی ناتوانی دُور ہوگئی۔

خوشا نصیب کہ آستانۂ سرکار دوجہاں کی دولت حاضری میسر ہوئی۔ مدتوں کی تمنا پوری ہوئی۔ زندگی بھر کی آرزو بر آئی۔ شبکۂ مبارک کے حضور میں فرط مسرت اور جوش عقیدت سے ربودگی اور بے خودی کا عالم ہوا اور ذوق شوق سے "السلام علیك یا رسول اللّٰہ" کا نعرۂ عاشقانہ زبان پر آیا۔ قربان اُس مبارک ساعت کے جس پر زندگی کی ہر آنے والی ساعت قربان ہے!!

مقام وجد ہے اے دل کہ بزم یار میں آئے　　پڑے دربار میں پہونچے بڑی سرکار میں آئے

مولانا روم نے مثنوی میں لکھا ہے کہ جب حضرت یوسفؑ عزیز مصر ہوئے تو اُن کا ایک کنعانی نیازمند ملاقات کے لیے آیا۔ حضرت نے پوچھا کہ میرے لیے وطن سے کیا تحفہ لائے ہو۔ دوست نے عرض کی کہ آپ کے قابل کوئی ارمغان مجھ کو دستیاب نہ ہوا۔ قطرہ کو دریا کے سامنے کیا لاتا۔ البتہ ایک آئینہ لایا ہوں تاکہ اس میں حضور اپنا جمال مبارک دیکھیں اور مجھ کو یاد کریں۔

آئینہ آوردمت اے روشنی　　تا چو بینی روئے خود یادم کنی

مولوی نور الحسن ہندوستان سے اُس شہنشاہ کا سراپا لکھ کر لے گئے تھے جس کی صباحت و ملاحت کے سامنے حسن یوسف شرمندہ تھا وہی محبوب رب العالمین کے دربار میں نذر گذرانا اور مواجہۂ اقدس میں مسدس خورشید بر رجوش و خروش سے پڑھا۔ سرکار سے انوار و برکات کے جو خلعت عطا ہوئے اُن کی کیفیت سوائے شاعر کے کون جان سکتا تھا اور اُنھوں نے کسی سے بیان نہیں کی۔

میان عاشق و معشوق رمزیست　　کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

مدینہ منورہ میں چالیس دن حاضری کا شرف حاصل رہا۔ منشی اعجاز علی بھی مکہ سے آگئے۔ منشی اشرف علی

مرحوم کی بیوہ مدینہ میں قدم رکھتے ہی داخل خلد بریں ہوئیں۔ منشی منظور علی کا لڑکا جو اُن کی زیر پرداخت تھا ہندوستان پہونچانے کے لیے مولوی نور الحسن کے سپرد کیا گیا کیونکہ حاجی اعجاز علی زیارت بیت المقدس کے لیے روانہ ہونے والے تھے اور بچہ کو ہمراہ لے جانا دشوار تھا۔ حاجی ذکی الدین اور حاجی رشید الدین مع قبائل کے ہندوستان روانہ ہوگئے۔ اُن کی روانگی کے بعد مولوی انوار الحسن کی بڑی صاحبزادی (زوجہ حکیم احمد) کے اسی مقدس شہر میں دو توام لڑکیاں پیدا ہوئیں اور جنت البقیع میں سپرد خاک کی گئیں۔ اس اثنا میں ربیع الاول کا مبارک مہینہ آیا۔ مسجد نبوی میں میلاد شریف کی مجلسیں منعقد کی گئیں اور فیوض و برکات سے سرشار ہو کر جوار نبی کریم سے رخصت ہوئے۔

جس دن ہوا تھا کوچ دیار حبیب سے　　میں کس قدر تھا بے سروساماں نہ پوچھیے

ینبوع پہونچ کر پھر دشواریوں کا سامنا ہوا۔ چھ سات دن کے بعد "برما" جہاز آیا جو ساحل کے قریب چلتا تھا۔ نہایت مختصر اور سخت تکلیف دہ تھا۔ بمجبوری اُسی پر سفر کیا۔ عدن پہونچے تو ہندوستان کے لیے کوئی جہاز موجود نہ تھا اور نہ کسی کی آمد کی خبر تھی۔ ہر دن انتظار میں گذرتا تھا۔ صبح کو آس بندھتی تھی اور شام کو مایوسی ہوتی تھی۔ اس بے سروسامانی اور انتظار اشد میں ایک مہینہ گذرنے کے بعد خدا خدا کرکے جہاز کی صورت نظر آئی۔ "فیروزی" نام تھا۔ اُس پر سوار ہو کر گیارھویں دن بمبئی میں لنگر انداز ہوئے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ الفانسو کا ناشتہ کیا۔ سبز پان کھائے۔ اہل وطن کو معاودت کی اطلاع کے لیے تار دیے۔ تین روز کے بعد کاکوری پہونچے۔ دوگانہ شکر ادا کیا۔ مولوی انوار الحسن وکالت ترک کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ وہ خانہ نشین ہوے اور بقیہ زندگی یاد حق کے لیے وقف کی مگر مولوی نور الحسن چند روز آرام کرنے کے بعد سلسلۂ وکالت دوبارہ شروع کرنے کے لیے ہردوئی چلے گئے۔ اُن کا قول تھا کہ

فقیری بھی کیجیے تو دنیا کے ساتھ　　نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ

اُردو کا سب سے پہلا شاعر کون تھا

(جناب مولوی سید مظہر علیم صاحب فریدآبادی بی اے (علیگ))

اس امر کا پتہ چلانا کہ اُردو کا سب سے پہلا شاعر کون ہوا ہے درحصل بہت دشوار امر ہے درانحالیکہ ہمیں خود ہی تحقیق نہیں کہ ہماری اُردو زبان کی ابتدا کب اور کہاں سے اور کیونکر ہوئی۔ تاہم اس بارے میں جو قیاس آرائیاں محققین اور مصنفین نے کی ہیں ان کا سرسری تذکرہ اس موقع پر بے محل نہ ہوگا کسی زبان کی پیدائش اور ترقی قدرتی اسباب کے تابع ہوتی ہے۔ انسان ویسی ہی زبان بولتا اور برتتا ہے جس پر قدرتی اسباب اسے مجبور کرتے ہیں۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

جس طرح دو بولی بولنے والے جانور ایک جگہ اکٹھے کر دیے جائیں تو یقیناً ایک دوسرے کی بولی اڑالیں گے اسی طرح مختلف اللسان انسان جن کو نطق کی نعمت قدرت کی جانب سے بطور طرۂ امتیاز عطا ہوئی ہے جب ایک جا مجتمع ہوں گے تو یہ ممکن نہیں کہ ایک دوسرے کی بولی نہ سیکھیں۔ دنیا کی تاریخ کے اوراق اُلٹیے یہی حال قوموں کی زبانوں کا دیکھنے میں آئے گا۔ انگلستان میں جب رومن سلطنت قائم ہوئی تو وہاں کی اصلی اور خالص زبان میں جو سیکسن، کے نام سے موسوم تھی۔ بیشمار الفاظ لاطینی زبان کے داخل ہوگئے جو اس وقت تک انگریزی زبان میں مروج چلے آتے ہیں اور اس کا ایک جزو لاینفک ہوگئے ہیں۔ ایسا ہی ایک تغیر لسانی اُس وقت وقوع میں آیا تھا جب اہل عرب کے قدم عجم کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ جو رنگ عربیت کا اُس وقت فارسی پر چڑھ گیا وہ ایسا پختہ تھا کہ مرورِ زمانہ سے اُترا نہیں نہ پھیکا پڑا۔ اب ہندوستان کی طرف آئیے آریہ ہندو جب ہندوستان میں آئے تو یہاں کے اصلی باشندگان کی پاس خاطر سے جو تہذیب و شائستگی میں ان سے بدرجہا کم تھے انھیں اپنی سنسکرت زبان بالائے طاق رکھنی پڑی اور ایک ایسی زبان کو رواج دینا پڑا جس میں ان لوگوں کو ان وحشی باشندگان کے ساتھ بول چال بات چیت میں سہولت ہو اور جس کو یہ لوگ بھی آسانی سے استعمال کر سکیں یہ زبان 'پراکرت'، اور 'برج بھاشا' بنی۔ اس کے بعد پہلی صدی ہجری میں مسلمان محمد قاسم کی سرکردگی اور اس کی قیادت میں اول ہی اول سندھ میں وارد ہوئے اور اُنھوں نے اپنے قدم یہاں ایسے جمائے کہ پھر یہاں سے نہ ہٹے۔ بلکہ سندھ سے بڑھ کر پنجاب تک پہونچے اور پنجاب کا ایک حصہ اور ملتان وغیرہ کا علاقہ بھی ان کے زیر نگیں آگیا۔

ظاہر ہے کہ جب یہ لوگ اپنی نئی معاشرت اور نیا نیا تمدن اور اپنی عربی زبان لے کر یہاں آئے ہوں گے تو اُن کی زبان کا اثر سندھ و پنجاب کی زبان پر ضرور پڑا ہوگا اور فاتحین و مفتوحین میں زبان کے معاملہ میں کچھ نہ کچھ سمجھوتہ ضرور ہوا ہوگا۔

اب ذرا اور قدم آگے بڑھائیے پنجاب پر جب محمود غزنوی کے حملوں کا آغاز ہوا اور غزنوی خاندان کی حکومت کا مرکز لاہور قرار پایا تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت جب کہ اسلامی حکومت یہاں قائم کی گئی ہوگی تو نہ صرف یہ کہ خود بادشاہ یہاں مقیم ہوئے ہوں گے بلکہ ان کے ہمراہ لاکھوں مخلوق اور بھی ہوگی جن میں ان کے ملک کی سپاہ کے آدمی امرا و عمائدین اہل پیشہ اور ارباب فن سب ہی قسم کے لوگ ہوں گے اور ان کا اور اُن کے قیام کا جو اثر یہاں کی زبان پر پڑا ہوگا اُس کا قیاس کرنا کچھ دشوار امر نہیں۔ محمود غزنوی کا واقعہ تاریخ میں درج ہے کہ جب اُس نے کالنجر فتح کر لیا تو راجہ کالنجر نے ایک قصیدہ ہندی میں اس کی مدح میں لکھ کر اس کے حضور میں پیش کیا جس کو بادشاہ نے اہل دربار کے ہندی پروہ ہوا کر سُنا۔ اُسے سمجھا اور اُس سے بہت محظوظ ہوا اور راجہ کو اس کے صلہ میں پندرہ قلعے بخشے جن میں کالنجر بھی شامل تھا۔ اسی خاندان کے دوران عہد میں ایک صاحب تصانیف قابل یادگار بزرگ مسعود سعد سلمان ہوئے ہیں جن کا دیوان ہندی میں موجود ہونے کی شہادت حضرت امیر خسرو کی تصنیفات میں ملتی ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان فاتحین کے ساتھ ہی ساتھ صوفیائے کرام کے قدم بھی اس خطۂ زمین میں آئے جنھوں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے ہندوستان کی سرزمین کو رشک ارم بنا دیا اور اگرچہ یہ فتوحات جو یہ شاہان عالی تبار بزور شمشیر کرتے تھے بہت عظیم الشان تھیں تاہم وہ تسخیرات جو یہ نفوس قدسیہ اپنے زہد و تقوے اور پاکبازی راست شعاری و ہدایت و تلقین کے ذریعہ کرتے تھے وہ شاہان نبرد آزما کی فتوحات سے بھی بڑھ کر گہرا اثر رکھنے والی اور قلوب کو مطیع و منقاد کرنے والی ہوتی تھیں۔

مسلمان اپنے ساتھ عربی و فارسی زبان لائے تھے۔ لیکن ان قدرتی اسباب کے تحت میں جنکا ذکر اوپر گذر چکا ہندوستان میں ایک اور زبان شیریں کا بھی خمیر تیار ہونے لگا۔ جس نے ایک ہزار یا نو سو برس تک قدرت کے بھوترے میں خفیہ طور پر پرورش پائی اور پھر جب کنج مخفی سے نکل کر تخت پر جلوہ آرا ہوئی تو ملک کے گھروں اور دلوں میں اپنا سکہ بٹھا دیا اور چار دانگ عالم میں اسکی شہرت ہو گئی ملک نے اس کو تاج قبولیت بخشا اور شرف ہمنوائی عطا فرمایا۔ افسوس یہ ہے کہ اُردو کے ابتدائی مدارج و ترقی کی تاریخ تذکرہ والوں کے نزدیک مفقود ہے جب سے یہ زبان پردۂ اخفا سے ظہور میں آئی یعنی اس میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ شروع ہوا وہ سن نو سو یا ایک ہزار ہجری ہے اس زمانہ

میں جو اُس نے تدریجی ترقی ملک میں حاصل کی اور اپنی جڑیں جا بجا پھیلائیں۔ اس کی داستان ایک داستان پریشان ہے بقول شاعر ؎

کچھ قمریوں کو یاد ہے کچھ بلبلوں کو حفظ　　دنیا میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

تذکرہ نویسوں کو جہاں کہیں بھی کوئی کھوج یا نشان اس زبان کے وجود کا مل گیا ہے اُنھوں نے اُس کو بیش بہا جواہر سمجھ کر اپنے دلوں میں جگہ دی ہے اور اُس کو آنکھوں کا تارا سمجھ کر رکھا ہے۔

یوں لائے واں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈ کر　　دیکھا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

اس زمانہ کے متعلق کوئی مسلسل اور معتبر و موقر تذکرہ موجود نہیں ہے اسی اُردو کے ابتدائی زمانہ کے متعلق پنجاب سے ہمیں فاضل اجل حافظ محمود خاں صاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے ذریعہ سے ایک نظم ملی ہے جو زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین سر تاج اولیا حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا بابا صاحب موصوف کا سن وصال ۶۶۴ھ ہجری ہے وہو ہذا :۔

وقت سحر وقت مناجات ہے　　خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا　　خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با دم خود ہمدم ہشیار باش　　صحبت اغیار بوری بات ہے (بُری)
با تن تنہا چہ روی زیں زمیں　　نیک عمل کن کہ وہی ساتھ ہے
پند شکر گنج بدل و جاں شنو　　ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

ماخوذ از ’پنجاب میں اُردو‘ مصنفہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی۔

اب ذرا اور حصہ ہائے ملک کی طرف بھی نظر ڈالو کہ وہاں کیا گذر رہی تھی۔ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ گجرات میں تشریف لاتے ہیں سومناتھ کی سیر فرماتے ہیں اور اپنی زبان مبارک کا شرف ہندی کو بخشتے ہیں چنانچہ دو تین اشعار اُن سے منسوب ہیں جن کا مقطع عرض کرتا ہوں ؎

سعدی غزل انگیختہ در ریختہ دُر ریختہ　　شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہ اشعار ایک اور سعدی کے ہیں جو گجراتی الاصل تھا مگر اس کا پتہ نشان بتانے سے تذکرہ والے قاصر ہیں۔ صرف اُن کا یہ قیاس ہی قیاس ہے۔ خاندان غلامان و خلجی و تغلق کے زمانہ میں حضرت امیر خسرو کی خوشنوائی نے دلوں کو مسخر اور فریفتہ کر لیا تھا وہ جیسے فارسی میں بلبل ہزار داستاں تھے ویسے ہی ہندی میں بھی طوطی شکر مقال تھے۔ ان کا کلام خالص ہندی کا اور کچھ ہندی

فارسی مخلوط موجود ہے۔ ساون کا گیت جو اب تک ملک کی مستورات میں بہ ذوق شوق گایا جاتا ہے انھیں بزرگوار کی شگفتگی طبع کا ایک شگوفہ ہے۔ سینکڑوں پہیلیاں۔ اور کہہ مکرنیاں ان کی یادگار چلی آتی ہیں۔ جو اس وقت تک بچہ بچہ کی زبان پر ہیں ان کے گنگا جمنی کلام میں سے غزل کا ایک شعر نمونۃً درج کیا جاتا ہے۔

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری تیاں

دہلی سے گذر کر اب ذرا دکن کے حال کی طرف بھی اپنی عنان توجہ منعطف کرو محمد شاہ تغلق کے عہد میں جب شاہی منتقل ہو کر دولت آباد دکھن پہونچی تو دہلی سے بہت سے اہل کمال اور ارباب فن سلطان کے ہمراہ وہاں گئے کہ پھر اُن کو دہلی کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ لوگ اپنے ہمراہ ارمغان دہلی یعنے یہاں کی زبان کا تحفہ لے کر گئے جس کا بیج اُنھوں نے دکھن کی شاداب و زرخیز زمین میں لگایا خاندان تغلق کے عہد ہی میں دکھن میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی اور سلطنت قطب شاہی اور عادل شاہی اسی خاندان کی شاخیں ہوئیں اُنھوں نے اس طفل بے زبان کو دُرِ یتیم سمجھ کر اپنے آغوش تربیت میں لیا اور دن رات کے لیے اسے اپنے دل بہلانے کا مشغلہ ٹھہرایا چنانچہ خاندان قطب شاہی میں سے ہر ایک سلطان سلطان محمد قلی قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ صاحب دیوان ہندی تھے اور ان کے مکمل کلیات اور دیوان اب بھی کتب خانہ آصفیہ میں بہ مقام ریاست حیدرآباد دکن محفوظ ہیں۔ ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں کہ شاہان اسلام کے قدم بہ قدم اور دوش بدوش صوفیائے کرام بھی اس ملک کی ترقی و تہذیب تمدن میں برابر حصہ لیتے رہے ہیں اور اپنے باطنی فیوض و برکات سے اس ملک کو منور اور بہرہ ور فرماتے رہے ہیں زبان کی ترقی بھی ایسی شے نہ تھی جس سے وہ غافل رہتے چنانچہ اکثر موقعوں پر ان حضرات کرام نے ہندی کو اپنی زبان شیریں بیاں سے شرف بخشا ہے۔ دکن میں مقبول بارگاہ الٰہی حضرت سید صدر الدین سید محمد حسینی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ذات بہت بابرکات اور بافیض ہوئی ہے ان کی ذات مرجع خلائق و مرجع انام تھی اُنھوں نے بھی ہندی کو یہ شرف عطا کیا ہے اور ذیل کی دو بیت ان کے نام پاک سے منسوب ہیں۔

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اسے جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

یوں کھوئی خودی اپنی خدا ساتھ محمد جب گھل گئی خودی تو خدا بن نہ کوئی دسے

حضرت موصوف کا سن وصال ۸۲۵ھ ہجری ہے۔

سلاطین مغلیہ نے بھی اردو کے ہندی نژاد بچہ کو جس کی زبان نئی کھلی تھی اور بہت پیاری پیاری

اور تتلاہٹ بھری تھی اپنی نظر التفات سے محروم نہ رکھا۔ ظہیر الدین بابر شاہ نے جب سرزمین ہند میں قدم رکھا تو اُس نے بھی یہاں کی زبان میں دلکشی پائی اور اگرچہ اُس کی زبان خالص ترکی یا فارسی تھی لیکن اس نے ہندی میں بھی طبع آزمائی کی۔ یہ ایک شعر جو اس کے تو زک میں موجود ہے اس کی یادگار رہے۔

مج کو نہ ہوا کج ہوس مانک و موتی فقرا بلیغہ بس بولغوسید و رپانی و روتی
(مجھ) (کچھ) (یاقوت) (فقیر) (روٹی)

جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد میں جب ہندو مسلم قوموں کا اختلاط بدرجہ غایت بڑھا تو اگرچہ زبان درباری اس وقت فارسی تھی مگر بہت سے ہندی الفاظ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ جھروکہ۔ درشن وغیرہ الفاظ اکبر و جہانگیر کے یہاں بے تکلف برتے جاتے تھے۔ اکبر نے لاڈلا و شیخ جی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ اس زمانہ میں لڑکیوں کی رخصت کے موقع پر جو منڈھا گایا جاتا ہے وہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اکبر کے عہد کی تصنیف اور یادگار ہے جیسا کہ مشہور ہے شہاب الدین شاہجہاں کے عہد میں اس زبان نے 'اُردو زبان' کا لقب اختیار کیا۔ مقبولیت عامہ کا خلعت پہنا۔ اور ملک کے دل و زبان پر اپنا تسلط جمایا اور سکہ بٹھایا۔ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کو خود زیادہ شعر و شاعری سے لگاؤ نہ تھا۔ لیکن اس کے درباری شعرا جو در اصل فارسی گو تھے ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

از زلف سیاہ تو بہ دل دوم پڑی ہے در گلشن آئینہ گتا جوم پری ہے
(مرزا معز موسوی خاں فطرت عہد عالمگیری)

بامن کی بیتی آج مری آنکھ موں پری غصہ کیا دگالی دیا و دگر لری
(قزلباش خاں امید عہد عالمگیر بادشاہ)

عہد عالمگیری ہی میں ایک ابر نیساں دکھن کی طرف سے اٹھا اور دلی پر آ کر برسا اُس نے موتی برسائے اور یہاں کی کان میں لعل و جواہر پیدا کیے۔ یعنی شمس الدین ولی اللہ ولی اورنگ آبادی دکھن سے دہلی میں وارد ہوئے۔ اور شاہ گلشن جیسے درویش عارف باللہ اور خدا رسیدہ کی صحبت اور فیض نے انھیں کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ شاعر کو ولی کی سی مقبولیت عطا کی اور انھیں سرتاج شعرائے اُردو بنایا۔ چنانچہ اُردو کے باوا آدم ہونے کا سہرا اول اول انھیں کے سر باندھا گیا۔ اُنھوں نے زمین سخن میں خوب خوب گل کھلائے اور کلام کے چمن کو آراستہ و پیراستہ کر کے خوب خوب داد سخن اہل زمین سے لی۔ ولی نے جو فضیلت اُردو میں حاصل کی اُس کو اُس وقت کوئی نہ پہونچا تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اُس سے بہت قبل

دکھن میں خاندان قطب شاہی و عادل شاہی کے سلاطین نے اپنی توجہات سے اس زبان کو نوازا۔ مکمل دیوان و کلیات اس میں مرتب کیے اس طرح اس کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم کیں اور اس زبان کو زندۂ جاوید کیا ان میں سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی علم دوستی سخن سنجی و سخن فہمی اور قدردانی اہل سخن کا اعتراف ہر اردو کی تاریخ دیکھنے والے کو کرنا ہوگا۔ اور چونکہ زمانہ کے لحاظ سے اس کے زمانہ کو ولی کے زمانہ پر بہت کچھ سبقت ہے، اس لیے اولیت کے مرتبہ کا ولی کے مقابلہ میں وہ زیادہ مستحق قرار پاتا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا بادشاہ تھا اس کا سن وفات ۱۰۲۵ھ ہجری ہے اس کا ایک شعر نمونۃً یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کفر ریت کیا ہور اسلام ریت ہر یک ریت میں عشق کا راز ہے

اس سے بھی بڑھ کر حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم تذکروں میں یہ پڑھتے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ سے بھی پہلے اس زبان میں ایک موقر شاعر 'وجہی' یا 'وجدی' ہو گذرا ہے جس کا زمانہ غالبًا سلطان محمد قلی قطب شاہ کے باپ سلطان محمد ابراہیم قطب شاہ کا تھا (اندازاً ۱۰۱۵ھ) مولانا نصیر الدین ہاشمی مصنف "دکن میں اردو" مطبوعہ حیدرآباد اس کا نام وجدی قرار دیتے ہیں۔ اور مثنوی تحفۂ عاشقاں کو اس کی تصنیف بتلاتے ہیں لیکن "تذکرہ جواہر سخن" میں جو ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی زیر نگرانی ۱۹۳۳ء میں طبع ہوا ہے۔ اردو کے اول شاعر کا نام 'وجہی' بتلایا گیا ہے اور دو مثنویاں 'قطب مشتری' اور 'سب رس' ان کے نام سے منسوب کی گئی ہیں۔

بہرحال اس میدان میں ابھی مزید تحقیق و تفتیش کے لیے بہت کچھ گنجائش باقی ہے اور یہ مسئلہ ابھی بہت کچھ نئی تحقیق اور اجتہاد کا محتاج ہے۔

مشاطہ را بگو کہ براساب حسن یار چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

پیامِ اُمّید

(جناب منشی عبدالعزیز فطرت)

طوفان ہے کیوں مرے جہانِ دل میں مضطر ہے ہر ایک ذرہ اس محفل میں

آیا ہے کہیں سے کیا پیامِ امید بیتاب ہے لیلیٰ سکونِ محمل میں

مسلمانوں کی ثانوی تعلیم کے بعض مسائل

(جناب خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۹۳۵ء میں یہ بدعت حسنہ رائج کی گئی تھی کہ جلسوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن میں سے ہر ایک کے سپرد ایک خاص تعلیمی موضوع تھا۔ اس تنظیم جدید کی شان نزول یہ تھی کہ کانفرنس کے بعض اراکین نے یہ محسوس کیا کہ سال بہ سال محض نمائشی اجلاس کرنا اور ان میں چند ریزولیوشن پاس کر لینا کافی نہیں بلکہ ایک ایسا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے کہ کانفرنس کی وساطت سے ماہرین تعلیم کو قومی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر اور تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملے۔ ویسے تو کانفرنس کے دستور اساسی میں چند شعبہ جات عرصے سے قائم ہیں اور ایک زمانہ ہوا صیغۂ اصلاح تمدن اور تعلیم نسواں کے اجلاس عام اجلاس کانفرنس کے ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے اس پر عمل نہیں ہوا اور شاید کانفرنس کو تمام تر شعبہ جاتی طریقہ پر چلانے کا خیال تو پہلے کبھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب جبکہ مختلف علوم و فنون کا میدان وسیع ہو گیا ہے اور اس میں مقابلۃً بہت زیادہ تخصیص پیدا ہو گئی ہے اس کام کو بھی زیادہ منظم اور عملی طریقہ پر کرنے کی ضرورت ہے۔ فن تعلیم بالخصوص اس قدر زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اس کے مختلف مسائل پر علٰحدہ علٰحدہ توجہ اور معقول رسالے قائم کرنے کے لیے بہت وقت، نظر کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ یہ تقسیم جو رائج کی گئی ہے کانفرنس کو ایک زیادہ مفید اور کاروباری ادارہ بنانے میں کامیاب ہوگی۔ انھیں شعبہ جات میں سے ایک ثانوی تعلیم کا شعبہ بھی ہے جس کے صدر گذشتہ اجلاس میں جناب علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب تھے۔

میں نے بحیثیت سکریٹری شعبہ کے مسلمانوں کی ثانوی تعلیم پر ایک مختصر سا تبصرہ مندرجہ ذیل مضمون میں کیا تھا جو اس امید میں الناظر کی نذر کرتا ہوں کہ ہمارے اساتذہ اور دیگر تعلیمی کارکنوں کی توجہ ثانوی تعلیم کے ان پہلوؤں کی طرف مبذول ہو جن پر اس مضمون میں بحث کی گئی ہے۔ ایک مختصر سے مضمون کے اندر یہ ممکن نہیں کہ ثانوی تعلیم پر کوئی مکمل تنقید کی جائے یا اس کا کوئی مفصل اور مبسوط نظام پیش کیا جا سکے۔ علاوہ بریں یہ کام کانفرنس کے اس شعبہ اور تمام ماہرین تعلیم کا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بحث و مباحثہ اور غور و فکر کے بعد ایسے ایک نظام کے نقوش متعین کریں۔ کسی ایک شخص کے لیے اس اجتماعی ذہنی کاوش کے نتائج کی پیش بینی کرنا ایک بے جا جسارت ہے۔ البتہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کی توجہ بعض ایسے اہم اور ضروری مسائل کی طرف مبذول کروں جن کو

سمجھ داری اور بالغ نظری کے ساتھ حل کرنے پر ثانوی تعلیم کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ آج کل کے تعلیمی مسائل محض اصطلاحی معنوں میں تعلیمی نہیں یعنی ان کا تعلق محض نوشت وخواند اور چند علوم حاصل کر لینے سے نہیں بلکہ وہ قومی زندگی کے ہر پہلو اور ہر تحریک کے ساتھ جسم وجان کی طرح مربوط ہیں اور ان کا صحیح حل اور تصفیہ ہرگز ان بڑے بڑے سیاسی اور اقتصادی معاملات سے کم اہمیت نہیں رکھتا جو ملک کے مقتدر رہنماؤں کی توجہ کا مرکز ہیں اور باوجود ان کی توجہ کے حل نہیں ہو پاتے۔

پہلا مسئلہ جس کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ثانوی تعلیم کی حدود کیا ہوں۔ یعنی ابتدائی تعلیم کے بعد جس کو حالات موجودہ کا بے پناہ دباؤ ہمارے پسماندہ ملک میں بھی بہت جلد لازمی اور جبری بنا دے گا، کن طلبہ کو ثانوی مدارس میں داخل کیا جائے۔ چونکہ کم از کم مستقبل قریب میں تمام یا بیشتر طلبہ ان مدارس میں جگہ نہیں پا سکتے اس لیے معیار انتخاب کا تعین کرنا ضروری ہے۔ اس بارے میں ہمارے یہاں اور دوسرے ممالک میں بھی عام طور پر یہ نظریہ کارفرما رہا ہے کہ ابتدائی تعلیم جس حد تک مہیا کی جا سکے عوام کے لیے ہے اور ثانوی تعلیم خواص اور شرفا اور اس مقابلۃً خوش حال متوسط طبقے کے لیے ہے جن کے افراد اس کا خرچ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ دراصل ایک عکس ہے ہماری معاشرت کی خلاف انصاف تنظیم کا، جو ہمیں تعلیم کے آئینہ میں دکھائی دیتا ہے اور یہ قومی مفاد اور ترقی کی راہ میں ایک سنگ گراں ثابت ہوا ہے۔ مگر دور حاضرہ کی جدید سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تحریکات سے متاثر بلکہ مجبور ہو کر مغرب کے اکثر ممالک میں ثانوی تعلیم کا ایک نیا تصور تشکل ہوا ہے جو بہت زیادہ صائب اور قرین عقل ہے۔ یعنی ثانوی تعلیم کسی خاص جماعت یا طبقے کے ساتھ مختص نہیں بلکہ وہ اس تعلیمی انتظام کا نام ہے جو کوئی قوم اپنے نوجوانوں کی ذہنی اور عملی تربیت کے لیے کرتی ہے جب وہ عنفوان شباب اور بلوغ کی پُر آشوب منزل سے گذرتے ہوتے ہیں۔ یعنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں ما بہ الامتیاز اقتصادی یا معاشرتی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے۔ انگریزی ذہنیت نے بھی جو بالطبع روایت پرست اور قدامت پسند واقع ہوئی ہے اس انقلاب آفریں خیال کو تسلیم کر لیا ہے اور فشر ایکٹ ۱۹۱۸ء اور ہیڈو رپورٹ ۱۹۲۶ء نے گویا اس پر سرکاری مہر تصدیق ثبت کر دی ہے لہٰذا اب تو ہمارے علمائے فکر اور ارباب تعلیمی کو بھی اس سنت پر عمل کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نظریہ کے عملی نتائج بہت دور رس ہیں۔ اس سے ایک طرف تو یہ لازم آتا ہے کہ ہم ثانوی تعلیم کی حدود، غایت، نصاب، مدارج تعلیمی اور دیگر لوازم کا

تعین کرنے میں عہد بلوغ کی نفسی کیفیات اور مطالبات کو اپنا راہبر بنائیں اور ایک ایسا مکمل اور ہمہ گیر نظام تعلیم مرتب کریں جو عمر کی اس خاص منزل کی مختلف ذہنی، عملی اور جمالی ضروریات کی تشفی کرے۔ دوسری طرف اس کا تقاضہ یہ ہے کہ انتخاب طلبہ میں معیار ان کی فطری صلاحیت ہو یعنی کون سے طلبہ کس حد تک مختلف قسم کی ثانوی تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یوں تو ایک عمدہ اسکول کی اجتماعی زندگی اور ضبط و تربیت کی روایات سے ہر طالب علم کو کم و بیش فائدہ پہونچنا لازم ہے لیکن جہاں مواقع اور وسائل محدود ہوں وہاں اجتماعی اور انفرادی بہبود دونوں کا مطالبہ یہی ہے کہ بہترین ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو نشو و نما کا موقع دیا جائے خواہ وہ کسی سماجی طبقے میں پائی جائیں تاکہ ان کے امکانات خدمت اور سماجی کارکردگی میں اضافہ ہو اور وہ حیات اجتماعی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں۔ اس مطالبہ کا ایک سخن گسترانہ پہلو جس سے ہمارے تعلیمی حکام اور ماہرین دونوں پہلو تہی کرتے ہیں یہ بھی ہے کہ معیار صلاحیت ہر جماعت کے افراد پر خواہ وہ امیر ہوں یا غریب یا متوسط الحال، یکساں طریقے سے عائد کیا جائے۔ یعنی اگر ایک نادار بچہ ایسی صریح ذہنی صلاحیتیں رکھتا ہے کہ وہ ثانوی تعلیم سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے تو حکومت اور محکمہ تعلیم کا فرض ہے کہ اس کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائے برخلاف اس کے اگر ایک خوشحال بچہ فطرتاً کند ذہن اور اوسط سے کم قابلیت کا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بہتر طلبہ کو محروم کر کے اس پر ایک غیر مناسب اور غیر موزوں تعلیم کے دروازے کھول دیے جائیں۔ یہ مطالبہ کسی رقیق القلب جذبہ مساوات کا انتہا نہیں بلکہ قومی مفاد اور مجموعی ترقی کے لیے شرط ناگزیر ہے۔ تعلیم کے میدان میں جوہر قابل کو محروم کرنا اور جوہر ناقابل کو زبردستی بڑھانا ایک جرم صریح اور گناہ عظیم ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانا بجائے خود ایک نازک اور مشکل کام ہے جس کی طرف ابھی تک ہمارے ملک میں کوئی توجہ نہیں کی گئی مثلاً یو۔ پی گورنمنٹ کے تعلیمی ریزولیوشن کے مطالعے سے ہرگز یہ شبہ نہیں ہوتا کہ اس کے فاضل مصنفین کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا ہے مگر جب تک ہم مروجہ امتحانوں کے نظام کو منزل من اللہ سمجھ کر ان پر قانع رہیں گے کوئی اصلاح موثر نہیں ہو سکتی بالخصوص اس وجہ سے کہ ثانوی تعلیم میں تنوع پیدا کرنے اور اسے نفسیات طلبہ کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لیے جس مواد کی ضرورت ہے وہ اس تعلیمی تحقیق و تفتیش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ مغربی ممالک میں گذشتہ بیس، پچیس سال میں اس سلسلہ میں بہت کچھ کام ہوا ہے۔ میں مثال کے طور پر صرف ایک تحقیق کا ذکر کروں گا جو لندن کونٹی کونسل کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر سرل برٹ (Burt)

نے کچھ عرصہ ہوا کی تھی (شاید بعض حضرات کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ دنیا میں ایسی میونسپل کمیٹیاں بھی ہیں جو ماہرین نفسیات کو اپنے کاروبار کے لیے لازم سمجھتی اور بیش قرار مشاہرہ پر ملازم رکھتی ہیں!) ان کی طویل اور نہایت معنی خیز تحقیق سے منجملہ اور نتائج کے یہ مستنبط ہوا کہ اعلےٰ پیشوں اور ذمہ داری کے کاموں کے لیے جس قدر فطری ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت کم طلبہ میں ہوتی ہے اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے صلاحیت کی فی صد تقسیم اندازاً اس طرح کی جا سکتی ہے :-

(۱) اعلےٰ علمی اور اخلاقی پیشوں اور [illegible] کے لیے ہزار طلبہ میں ایک موزوں ہوتا ہے۔

(۲) ابتدائی مدارس کی معلمی، کلرکی کے نچلے عہدوں اور تجارت کے لیے دو فی صدی طلبہ موزوں ہوتے ہیں۔

(۳) معمولی دفتری کاروبار اور محرری اور اعلےٰ قسم کے ہنرمندی کے کاموں کے لیے دس فی صدی طلبہ موزوں ہوتے ہیں۔

(۴) اوسط قابلیت کے طلبہ جو معمولی تجارت، دستکاری اور صناعی کے لیے موزوں ہوتے ہیں آٹھ فی صدی ہیں۔

(۵) باقی اسی فی صدی طلبہ اوسط سے کم قابلیت کے ہوتے ہیں جو محض معمولی قسم کا ایسا کام اور مزدوری کر سکتے ہیں جس کے لیے کسی خاص ہنر کے جاننے کی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر مائرز (Dr Myres) کے پیشوں کی رہنمائی کے ادارے (Institute of Vocational Guidance) نے بھی اس مسئلہ پر نہایت مفید اور قابل قدر کام کیا ہے۔ اس تمام تحقیقات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ طلبہ کی صلاحیتیں بہت مختلف اور متنوع ہوتی ہیں اور ان میں مختلف قسم کے علمی کام اور دستکاری اور صنعت و حرفت کے میلانات غالب ہوتے ہیں مگر ہماری ثانوی تعلیم نے اس حقیقت کی طرف سے بالکل توجہ ہی نہیں کی۔ وہ نہ طلبہ کے ان نمایاں اور مختلف نفسی رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ ہے، نہ اس میں اور صنعت و حرفت اور نظام معاش میں کوئی ربط قائم ہے۔ تقریباً تمام طلبہ کو اس طرح تعلیم دی جاتی ہے گویا سب کو آئندہ چل کر علمی یا دفتری زندگی بسر کرنی ہے اور ان کے دل میں آہستہ آہستہ غیر محسوس لیکن مستحکم طور پر دستکاری، مزدوری اور دوسرے تخلیقی کاموں کی طرف سے حقارت اور بے اعتنائی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے حالانکہ قوم کی مادی خوشحالی اور ان کی حقیقی تخلیقی صلاحیتوں کا نشوونما انھیں کاموں کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہذا آپ کے سامنے ثانوی تعلیم کی تنظیم جدید کے ضمن میں سب سے بڑا مسئلہ یہ در پیش ہے کہ اسے کس طرح طلبہ کی نفسی ضروریات اور قوم کی معاشی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ

بنایا جائے اور دونوں پہلوؤں کا متحدہ تقاضا یہ ہے (جس کو ایک حد تک یوپی گورنمنٹ کے تعلیمی ریزولیوشن، سپرو کمیٹی کی رپورٹ اور حکومت ہند کے تعلیم کے مشورتی بورڈ (Advisory Board of Education) کی سفارشات میں تسلیم کیا گیا ہے) کہ ثانوی تعلیم کی حدود کو زیادہ وسیع کیا جائے اور اس میں نہ صرف نظری اور علمی رجحان رکھنے والے طلبہ کے لیے سائنس وادبیات وغیرہ کی تعلیم کا وافر بندوبست کیا جائے بلکہ ان طلبہ کے لیے بھی ایک مخصوص نصاب مضامین ومشاغل مرتب کیا جائے جن کی ذہنی ساخت ایسی نہیں کہ وہ مروجہ تعلیم سے جس پر نظری علوم غالب ہیں پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔ اس میں مقابلۃً درسی مضامین کم اور عملی مشاغل زیادہ ہوں گے اور ان کی درسی تعلیم کا تعلق آئندہ کے پیشوں کے ساتھ رفتہ رفتہ زیادہ واضح ہوتا چلا جائے گا۔ محض نظری تعلیم کی صلاحیت کی کمی کی وجہ سے ان کو ثانوی تعلیم سے محروم کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ تمام قابل قدر قوتیں جو زمانہ شباب میں پھولتی پھلتی ہیں اظہار کا موقع نہ پائیں گی۔ رہا لبرل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مطالبات کا پرانا جھگڑا، اس کو حال کی نفسیاتی تحقیق نے بڑی حد تک حل کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ جو اعلیٰ قدریں ہم تعلیم کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ محض ادب عالیہ اور کلاسیکی علوم کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ جدید سائنس اور صنعت وحرفت کے مشاغل کی تعلیم سے بھی حاصل ہو سکتی ہیں بشرطیکہ طریقہ تعلیم کی مناسب اصلاح کی جائے۔ البتہ اگر غلط طریقۂ تعلیم کو اختیار کیا جائے گا تو وہ علوم بھی بالکل بیکار ہیں جن کو روایتاً تہذیب کا مخزن اور سرچشمہ مانا گیا ہے۔

یہ ثانوی تعلیم کے وہ عام مسائل ہیں جو تمام ہندوستان کے لیے مشترک ہیں۔ آخر میں چند باتیں مسلمانوں کے ثانوی مدارس کی تنظیم کے بارے میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مضمون تلخ ہے اور قلم گستاخ اس لیے ارباب تعلیم کی توجہ اور درگذر دونوں کا طالب ہوں۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے (جن نفوس مطمئنہ کو یہ سوال عجیب معلوم ہو وہ مجھے معاف کریں) کہ آخر ہندوستانی نظام تعلیم میں مسلمانوں کی مخصوص درسگاہوں کی شان نزول اور وجہ قیام کیا ہے؟ خیر شان نزول کو تو چھوڑیے کہ وہ ایک تاریخی بحث ہے مگر ان کی موجودہ حالت پر تو غور کیجیے۔ اگر ان کا کام یہی تھا کہ مسلمان والدین اور طلبہ کو سرسری سی مذہبی تعلیم کی تحریص دلا کر انگریزی تعلیم کی طرف راغب کریں تو وہ فرض تو پورا ہو چکا کیونکہ اب تو ارباب قضا وقدر کو تعلیمی توسیع کے روکنے کی فکر اور راہ چلتے کو مروجہ تعلیم کی تنقید وتنقیص سے غرض ہے۔ اگر ان سے محض اپنی عصبیت کو بیدار رکھنا اور ایک علیحدہ جماعت ہونے کے احساس کو مستحکم کرنا مقصود ہے تو یہ بجائے خود کوئی بہت قابل قدر جذبہ نہیں۔ اگر ان کی وجہ سے مشترک احساس

قومیت کے پیدا ہونے میں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں تو فرقہ وارانہ مدارس، خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، لائق سرپرستی نہیں، قابل انسداد ہیں۔ پھر ان کی علت غائی کیا ہے؟ میری رائے میں مسلمانوں کے ثانوی مدارس دو خاص فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ اول، مخصوص قومی اور ملی روایات اور قدروں کی نشر و اشاعت جو اسلامی تہذیب کا سرمایۂ افتخار ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ اس کام کو مشترک اور سرکاری مدارس انجام نہیں دے سکتے۔ دوسرے تعلیمی تجربات اور اصلاحات کے میدان میں پیش قدمی اور قیادت کے فرض کی انجام دہی، جو پرائیوٹ مدارس کا مخصوص کام ہے کیونکہ وہ سرکاری مدارس کی نسبت قواعد و ضوابط کی سختیوں اور پابندیوں سے مقابلۃً آزاد ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں دنیا کے متمدن ممالک میں تعلیم نے اپنی پرانی کینچلی بدلی اور نیا روپ اختیار کیا ہے اُس کا آغاز تقریباً ہمیشہ نجی اور امدادی مدارس میں ہوا ہے کیسے؟ اس طرح پر کہ کسی اہل دل اور اہل نظر معلم نے اپنی حرکت آفریں شخصیت کے اثر سے بوسیدہ ہڈیوں میں نئی روح پھونک دی۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کے ان مدارس نے اپنے طلبہ کے سامنے زندگی کا کوئی بلند نصب العین یا کوئی واضح اسلامی آئیڈیل پیش کیا؟ اس اسلامی آئیڈیل کی تشریح کا یہاں موقع نہیں اور شاید منطق کی توضیح کے ساتھ اور نثر کی زبان میں اس کے اظہار میں زباں بندی کا اندیشہ بھی ہو۔ اس لیے ادائے مطلب کے لیے فی الحال شعر کے اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ اسلام نے تو یہ تعلیم دی تھی کہ:-

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
وہی سجدہ ہے لائق اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

لیکن آپ کی اس تعلیم نے سکھایا کہ ہر آستانہ قوت و زر جو نظر پڑے وہ لائق جبیں سائی ہے اور خودی کو سیم و زر کے عوض فروخت کرنا عین مصلحت اور دانشمندی ہے!

اسلام نے یہ راز سکھایا تھا کہ

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اور انسان کو یہ تنبیہ کی تھی:-

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ — ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم!

مگر کیا ان مدارس نے کبھی "نصاب زر و سیم" کے علاوہ اور حکومت کے دسترخوان سے گرے ہوئے ٹکڑوں کو سعادت دارین سمجھ کر چن لینے کے سوا کسی اور مطمح نظر کو اپنا شعار عمل قرار دیا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور مجھے یقین ہے کہ جواب نفی میں ہے تو ظاہر ہے کہ ہمارے پہلے معیار یعنے اسلامی اصول اور قدروں کی اشاعت پر تو یہ مدارس کسی طرح پورے نہیں اترتے۔ تو کیا ان مدارس نے قیادت تعلیمی کا فرض پورا کیا؟ کیا انھوں نے نصاب اور طریقۂ تعلیم کی کوئی جدید تشکیل کی؟ کیا انھوں نے جدید تعلیمی تحریکوں میں فعالی طور پر کوئی نمایاں حصہ لیا؟ کیا ان کی حالت اپنی تعلیم و تربیت کے اعتبار سے حکومت کے مدارس سے صریحاً بہتر ہے۔ آپ حضرات خود باخبر ہیں۔ لہذا موجودہ حالت کی تفصیل ضروری نہیں۔ ہمارے مدارس نے اب تک نہ نصاب کے مسئلہ پر غور کیا ہے نہ تعلیمی طریقوں میں کوئی اصلاح کی ہے۔ نہ ان کے استادوں میں ولولۂ عمل ہے، نہ منتظمین میں سلیقہ کار اور تقسیم عمل کی صلاحیت۔ ایک اندھے بیل کا کولھو ہے کہ چلا جا رہا ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن کی تشریح کا یہاں موقع نہیں اور اس کی ذمہ داری مختلف جماعتوں اور حالات پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اسباب کا تجزیہ اور ذمہ داری کی تقسیم ایک فلسفی کو مطمئن کر سکتے ہیں، کسی عملی آدمی کو، جسے کام کی دھن ہے، کسی قوم کو جس کی موت اور حیات کا مسئلہ درپیش ہے مطمئن نہیں کر سکتے۔

آپ کو اس سخت نازک اور اہم صورت حال کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ان زندہ مسائل کا مقابلہ مردانہ وار جرأت اور صداقت کے ساتھ نہ کریں گے تو آپ کی تمام سیاسی تعمیروں کی حقیقت نقش آب سے بڑھ کر ثابت نہ ہوگی؛

مجذوب کی بڑ

(جناب خواجہ عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

کام فطرت سے نہ ہم کو ساز سے ... آشنا ہیں طور کی آواز سے
ہم تو ہونے دیں نہ واقف راز سے ... بس چلے بھی دیدۂ غماز سے
نغمہ پیدا ہے کہ نوحہ ساز سے ... ہوک سی اٹھتی ہے اس آواز سے
آشنا بیٹھا ہو یا نا آشنا ... ہم کو مطلب اپنے سوز و ساز سے
آشنا اچھا ہے یا نا آشنا ... اس کو پوچھو آشنائے راز سے
آ رہا ہے وہ مست شباب ... کس ادا کس ناز کس انداز سے
اک نظر میں آشیاں گم کردہ کو ... بھانپ لیں ہم ہیئت پرواز سے

"دوشیزہ کا راز" — ایک دلپذیر نظم

(جناب منشی محمد اظہار احسن صاحب اظہری بی اے ایل ایل بی وکیل)

"زمانہ" کا پرانا فائل دیکھ رہا تھا۔ جون ۱۹۲۹ء کے پرچہ میں مسٹر آنند نرائن ملا ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ لکھنؤ کی نہایت کیف آور اور جذبات سے لبریز نظم "دوشیزہ کا راز" نظر سے گذری جس کو پڑھ کر طبیعت اس قدر محظوظ ہوئی کہ میں یہ چند سطور لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ مسٹر ملا کا شمار کہنہ مشقوں میں نہیں ہے لیکن نزاکت احساس رفعت تخیل اور موزونی طبع ان کی آئندہ شاعرانہ عظمت کا پتہ بتاتی ہیں اور وہ دن کچھ دور نہیں معلوم ہوتا جب وہ دنیا کا بھا سے سرور اور نوبت رسائے نظر کی جگہ ادب اردو میں پر کریں گے۔

اردو میں نظمیں لکھنے کا رواج زیادہ پرانا نہیں بلکہ حال ہی میں اس کی ابتدا ہوئی ہے پھر بھی عمدہ نظموں کا کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے اور بعض اچھے اچھے شاعروں نے نظمیں لکھنی شروع کر دی ہیں۔ دوشیزہ کا راز ہر حیثیت سے ایک کامیاب نظم ہے اور اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ بندشوں کی چستی الفاظ کا تناسب، طرز ادا کی سادگی، زبان کی بے ساختگی اور ان سب سے بڑھ کر اثر اور دلآویزی نے غضب کا لطف پیدا کر دیا ہے، ناممکن ہے کہ آپ "دوشیزہ کا راز" پڑھیں اور داد دیے بغیر رہ سکیں۔ مصوری جذبات کی اس سے بہتر مثالیں کم از کم میری نظر سے کم گذری ہیں۔

ایک البیلی حسین دوشیزہ کے دل میں شادی کے بعد جو احساسات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں ان کو مسٹر آنند نرائن نے خود اسی کی زبانی بیان کیا ہے اور شادی سے قبل کی کیفیت اور اس کے بعد کے انقلاب کا پرلطف موازنہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں اور خوب فرماتے ہیں۔

آج کا دن زیست میں میری ہے سب سے بہتریں — اس کو میں سب سے الگ دل میں کروں گی جاگزیں
قدر کیوں اس کی ہے اتنی میں بتاؤں گی نہیں — یہ مگر سچ ہے دلاتی ہوں تمہیں اس کا یقیں

دہر میں جب تک یہ صبح خوشگوار آئی نہ تھی
گلشن جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

آغاز الفت کا پہلا دن! اف کس قدر دلچسپ و رنگین آفریں ہوگا۔ رفیق زندگی کی ملاقات اولیں کے وہ مسرت زا لمحے جن کا تصور بھی سرور آمیز ہوتا ہے کس قدر عزیز ہونے چاہییں۔ حجاب نسوانی اس احترام و دلنشینی کا سبب بتانے میں مانع ہے کہنا نہیں چاہتی مگر کہتی ہے اور سب کچھ کہہ دیتی ہے۔

گلشن جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

کہنے کو باقی ہی کیا رہا

مثل مکتوب نہ کہنے میں ہے کیا کیا کہنا

قاعدہ ہے کہ جب انسان کا دل مسرور ہوتا ہے تو اُس کو ہر چیز پر مسرت چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے دنیا اُس کی نگاہ میں یکسر ابسزار بن جاتی ہے ہر وقت پیش نظر رہنے والی چیزیں معمول سے زیادہ بارونق و پر کیف نظر آتی ہیں۔ دوسرے بند میں اسی کیفیت کو نظم کیا ہے۔

تازگی باد صبا میں کل تلک ایسی نہ تھی　　آسماں پر یہ چمک میں نے کبھی دیکھی نہ تھی
دل میں یہ ارماں نہ تھے ارماں میں یہ گرمی نہ تھی　　ہاں مگر کل تک میں دل کی آرزو سمجھی نہ تھی

اب کھلا مجھ پر مرادوں پر شباب آتا ہے کیوں
آج میں بھی کہ غنچہ پھول ہو جاتا ہے کیوں

شباب اور مرادوں پر آیا ہوا شباب دل کو پیکر آرزو بنا دیتا ہے مگر اس کا احساس تشنۂ مضراب ہے، کوئی چھیڑنے والا بھی تو ہو آخری شعر کتنا پُرلطف ہے۔

اب کھلا مجھ پر مرادوں پر شباب آتا ہے کیوں　　آج میں سمجھی کہ غنچہ پھول ہو جاتا ہے کیوں

یہ تازگی اور دلفریبی ممکن ہے کہ موسم کی خوشگواری کا اثر ہو لیکن نہیں اس کے نشاط قلب کا باعث کچھ اور ہے جس کو وہ بتانا نہیں چاہتی مگر ایک دل خوش کن خیال کو اپنے سینہ تک محدود رکھنا فطرت نسوانی کے خلاف ہے، اس لیے وہ ایک رازداں تلاش کرتی ہے مگر ایسا جس میں تاب گویائی نہیں۔

آج کا دن یہ تو ممکن ہے کہ ہو ناز بہار　　ختم ہے یہ میں نے مانا اس پہ موسم کا نکھار
ہے نشاط قلب کا پر اور ہی کچھ ذمہ دار　　راز اپنا میں نہیں کرنے کی ہر گز آشکار

بات یہ جز گل کسی کو میں نے بتلائی نہیں
رازداں ایسا ہے جس میں تاب گویائی نہیں

'ناز بہار' کی ترکیب کتنی حسین ہے۔ دوسرے مصرعہ کی روانی قابل داد ہے۔

مدعائے زندگی کیا ہے؟ محبت! وہ زندگی ہی کیا جو عشق کی رنگینیوں سے خالی ہو۔

دل لگانے میں غم ہزار سہی　　پھر بھی اک دل لگی سی رہتی ہے

عورت کی زندگی کا دلچسپ پہلو شادی کے بعد شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے "پیا" کی تمنا کا مرکز بن جاتی ہے کیا خوب کہا ہے

میں سمجھتی تھی نہ کل تک مدعائے زندگی　　کان تک میرے نہ پہونچی تھی نوائے زندگی

مجھ سے پنہاں تھی شبیہ جانفزائے زندگی عشق نے کھولے نہ تھے بند قبائے زندگی

دل مرادنیا کی باتوں میں ذرا لگتا نہ تھا

آئینہ میں حسن تک اپنا بھلا لگتا نہ تھا

سادگی ہائے حسن کی کتنی سچی تصویر ہے۔ یہ اُس زمانہ کی باتیں ہیں جب بہ الفاظ حسرت موہانی "اظہار تمنا" سے "حسن بے پروا" "یہ خودبین وخود آرا" نہ ہوا تھا[1]۔ تقاضائے فطرت کو نہ سمجھنے والی بھولی حسینہ جب اپنی پنہاں قوتوں کو بروئے کار دیکھتی ہے تو کہہ اُٹھتی ہے کہ

بے خبر فطرت سے اپنی خاطر معصوم تھی یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی

آرزو اپنی مجھے اتنی فقط معلوم تھی کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی

اب حقیقت زیست کی مجھ پہ ہویدا ہو گئی

کل تلک انگور تھی میں آج صہبا ہو گئی

دوسرے شعر میں جس کیفیت کو قلمبند کیا گیا ہے الفاظ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ملا نے واقعی کمال کیا ہے۔ مصوری جذبات اسی کا نام ہے۔

کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی

اور اس سے زیادہ ایک دوشیزہ سمجھ ہی کیا سکتی ہے؟ کسی مست شباب نازنیں کو جو دیکھنے والوں کو مخمور و بےخود بنا دے "صہبا" کہنا حسن تخئیل کا کمال ہے انگور کا صہبا بن جانا غضب کی تشبیہ ہے اور کتنی مکمل!

انیس حیات سے پہلے پہل سامنا ہوتا ہے۔ اُف کس بلا کا منظر ہے! ایک طرف حسن شرم آگیں ہے دوسری جانب عشق سراپا شوق

اک جوش ہے کہ محو تماشائے جوش ہے

نگاہیں چار ہوتی ہیں اور آنکھوں آنکھوں میں وہ پیام ادا ہو جاتا ہے جس کی لطافت رہین الفاظ نہیں ہو سکتی فطرت رنگ لاتی ہے۔ کیوپڈ وہ خوبصورت مگر اندھا لڑکا کیوپڈ جو اپنے بے پناہ تیروں کی بارش سے ہر اُمنگ بھرے دل کو چھلنی کر دیا کرتا ہے اپنا ترکش خالی کرتا ہے حسن حیا پرور کے دل میں ایک شیریں سوزش ایک میٹھی کسک محسوس ہونے لگتی ہے۔

اک لذت پُر درد سے ہے آغاز محبت

نگاہیں جھک جاتی ہیں، چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور لطف شکست سے ناآشنا دل سراپا درد بن جاتا ہے

---

[1] حسرت کا شعر ہے۔ حسن بے پروا کو خودبین وخود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

خود زندگی وقف خیال یار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک انقلاب ہے زبردست مگر کتنا خوش آیند! اس تمام کیفیت کو مسٹر ملا نے کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں

کل بھی دل سینہ میں تھا پر یہ دل پرخوں نہ تھا　　کل تلک بطن صدف میں یہ دُرِ مکنوں نہ تھا
کل بھی مجھ کو تھا مذاق زیست لیکن یوں نہ تھا　　کوئی جادو تھا پیام دیدۂ مجنوں نہ تھا

دل میں ہوک اُٹھی لبوں پر مسکراہٹ آگئی
رُخ پہ رنگ آیا نگاہوں میں لگاوٹ آگئی

تیسرے مصرعہ کی برجستگی تعریف سے بالا ہے۔ البتہ چوتھے مصرعہ میں "مجنوں" کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا آخری دو مصرعے خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ آغاز الفت کی کیفیت نسوانی شرم و حیا کے مرقع میں کتنی دلکش معلوم ہوتی ہے

ساتواں بند "مذاق زیست" کے انقلاب کی تفسیر ہے۔

اب اُمنگیں اور ہیں جوش طبیعت اور ہے　　زندگی کی خواب ارماں کی حقیقت اور ہے
گلشن ہستی کی اب نظروں میں حالت اور ہے　　گل کی نکہت اور ہے سبزے کی رنگت اور ہے

کیا بتاؤں کون سا جلوہ مری آنکھوں میں ہے
اک نئی دنیا کا نظارہ مری آنکھوں میں ہے

دوشیزہ یہ داستان محبت اپنی سہیلیوں کو سناتی ہے۔ اُن کا مشورہ بھی سن لیجئے۔

مجھ سے کہتی ہیں مری ہمجولیاں اکثر یہی　　مرد ہیں سارے کے سارے بے وفا خود مطلبی
آج ہے جس کی خوشامد کل ہے اس سے بے رُخی　　اُن کے بہکانے میں آتی ہیں مگر ایسی نہ تھی

یا تو اُن کے حسن میں میری سی رعنائی نہیں
یا کسی کی طبع اُن پہ یوں کبھی آئی نہیں

صنف نازک کے یہ خیالات اپنی نسبت شاید اچھے نہ معلوم ہوں۔ لیکن کیا آپ نے عورت کی زندگی کی شعریت کو تباہ نہیں کر ڈالا کیا واقعی تیسرا مصرعہ حقیقتوں کا حامل نہیں۔ آپ کی بے وفائیاں اور ستم ظریفیاں مستقل مرثیہ طلب ہیں لیکن بھولی حسینہ اس کا اعتبار نہیں کرتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ نوجوان جو آج پیکر الفت بنا ہوا ہے کل کیونکر گنہگار محبت بن سکے گا۔ ہمجولیوں کے تلخ تجربات کی وجہ وہ کہیں اور ڈھونڈھنا چاہتی ہے اور کہتی ہے

یا تو اُن کے حسن میں میری سی رعنائی نہیں　　یا کسی کی طبع اُن پہ یوں کبھی آئی نہیں

"خود مطلبی" کی غرابت اور "طبع" کی گرانی سے قطع نظر کر کے حقیقی جذبات کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔

خواہش محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر — پردہ داری کس لیے جذبات کی ہے اس قدر
اپنے دل کی آرزوئیں کیوں چھپاتا ہے بشر — یا الٰہی کون سا الفت میں ہے ایسا اثر

تاب خاموشی نہیں اور فکر چپ رہنے کی ہے
شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

پہلا مصرعہ کتنا بلند ہے

خواہش محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر

ظالم نے کیا بات کہی ہے۔ جذبات کی رو میں دوشیزہ اپنے احساسات پنہاں بیان کر جاتی ہے پھر خیال آتا ہے کہ میں نے کیا کیا تو یہ کہہ کر دل کو تسکین دیتی ہے

خواہش محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر — پردہ داری کس لیے جذبات کی ہے اس قدر

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب محبت کوئی جرم نہیں بلکہ عین فطرت ہے تو

اپنے دل کی آرزوئیں کیوں چھپاتا ہے بشر

آخری شعر فطرت نسوانی کا حسین مرقع ہے

شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

کس قدر دلچسپ ہے۔

آخر کار فطرت نسوانی جوش جذبات پر غالب آتی ہے دوشیزہ سنبھلتی ہے اور کہتی ہے۔

لو نہ جانے کیا کہے جاتی ہوں اپنے جوش میں — میں نہیں ہوں غالباً اس وقت اپنے ہوش میں
اب نہ آئے گی صدا میری کسی کے گوش میں — راز کو اپنے چھپاؤں گی لب خاموش میں

ہاں مگر جب تک یہ صبح خوشگوار آئی نہ تھی
گلشن جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

اس "ہاں" میں نہ معلوم کتنے معانی پنہاں ہیں۔

شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

آپ نے دیکھا مسٹر آنند نرائن نے کتنی کامیاب نظم کہی ہے موضوع اتنا نازک تھا کہ شاعر کو اپنا دامن متانت عریانی و آلودگی کے کانٹوں سے بچا کر لے جانا سخت دشوار تھا۔ ملا اس میں بوجہ احسن کامیاب ہوئے۔ اور یہ اُن کے حسن مذاق کی دلیل ہے۔ خدا کرے وہ اسی طرح ادب اُردو کی خدمت کرتے رہیں۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

تقویت حافظہ

(جناب خاور جبلپوری)

حضرت خاور جبلپوری نے تقویت حافظہ کے نام سے ایک مفید کتاب لکھی ہے جو عنقریب شائع ہوگی اُسکا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر

اچھے حافظہ سے مراد ہے کسی موضوع کا۔

(ا) بہت جلد یاد ہوکر دماغ میں محفوظ ہو جانا۔

(ب) کسی قسم کی رجوعات کے بغیر طویل عرصے تک ذہن میں قائم رہنا۔ اور

(ج) بوقت ضرورت بغیر فروگذاشت بہ عجلت تمام اصلی حالت میں یاد آجانا۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ جو چیز جسقدر آسانی سے حاصل ہوتی ہے وہ اُتنی ہی جلدی ضائع بھی ہو سکتی ہے اور جو کسی قدر محنت اور دقت کے ساتھ دستیاب ہوتی ہے وہ اُسی حد تک مستقل اور دیرپا بھی ثابت ہوتی ہے چنانچہ حافظہ بھی اس "دیر آید درست آید" والے کلیے سے خالی نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کو یاد کرنے کیلیے جس قدر وقت نظر اور غور و فکر سے کام لیا جائے گا وہ اتنے ہی عرصے تک ذہن سے فراموش نہیں ہو سکے گی۔

عام طور پر لوگ وقتی ضرورت کے لحاظ سے بعض ضروری باتوں کو یاد تو کر لیتے ہیں مگر کام نکل جانے کے بعد اُنھیں اپنے حافظہ میں محفوظ نہیں رکھ سکتے اور اُن کی حالت اُس طالب علم جیسی ہوتی ہے جو گھنٹی بجنے سے چند منٹ پیشتر اپنے سبق کو از بر کر کے ایک دو روز بعد بالکل فراموش کر دیتا ہو لیکن ایسے اشخاص کم نکلیں گے جو کافی غور و خوض کے بعد ہمیشہ یاد رہنے کی غرض سے کسی بات کو اپنے ذہن میں منتقل کرتے ہوں۔

اگرچہ حافظہ خود بھی ضروری اور کارآمد چیزوں کو حفظ کر کے یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح حافظہ میں سپرد ہونے والی باتوں کے محفوظ رہ کر بوقت ضرورت یاد آجانے کا امکان بھی ہے مگر اس معاملہ میں مندرجہ بالا اصولوں پر عمل پیرا ہونا ناگزیر ہے

اس سلسلہ میں ایک اور بات خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ کیا بیکار باتوں اور غیر ضروری چیزوں کو بھی ہمارا حافظہ طبعی طور پر متوجہ ہوکر انھیں باقاعدہ محفوظ رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ تجربہ اس سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے کیونکہ بہت سے لوگوں کے خیالات ہزارہا چیزوں پر راغب ہوتے ہیں مگر ضرورت کے

وقت اُن میں سے ایک کو بھی یاد نہیں رکھ سکتے۔

اس قسم کے حافظہ کی مثال اُس عورت کی ہے جو اپنے اسباب کو قرینہ اور حفاظت سے نہ رکھتی ہو۔ کسی ایک کمرے میں بے ترتیبی سے اناج کے بوروں کی طرح تلے اوپر ڈال دیتی ہے اور جب کبھی اُس سے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو سارے سامان کو اُلٹ پلٹ کر تلاش کرتی ہے کہ شاید اس میں اس کی مطلوبہ چیز بھی نکل آئے۔

اسی طرح جو طلبا خود کو امتحانات کیلئے تیار کرتے ہیں اُن کے خیالات حدود امتحان سے تجاوز نہیں اور جو کچھ بھی وہ یاد کرتے ہیں وہ صرف امتحان کی غرض پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ برائے آئندہ یاد رکھنے کے صحیح اصولوں کے مطابق ترتیب وار۔

پھر اگر اتفاق سے رٹی ہوئی کتاب کے مطابق امتحان میں کوئی سوال آگیا تو خیر ورنہ اگر اسی کو کسی دوسری صورت میں تبدیل کر کے پوچھا گیا تو اُن کی سمجھ میں خاک نہیں آتا اور وہ صحیح جواب سے قاصر رہ جاتے ہیں اور اگر کسی طرح کامیاب بھی ہو گئے تو امتحان سے فارغ ہو کر اسکول سے نکلتے ہی سب یاد کیا ہوا بھول جاتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے تو صرف امتحان میں کامیاب ہونے کی غرض سے جو کچھ بھی پڑھا یا رٹا تھا وہ کچھ روز کے بعد یقینی طور پر فراموش ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بہ نسبت غیر دلچسپ اشیاء کے بالب توجہ اشیاء اور ایسی باتیں یاد ہو کر دیر تک محفوظ رہتی ہیں جنکے حصول کا اشتیاق ہو اسلیے کہ اول الذکر ہماری توجہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی اہلیت نہیں رکھتیں اور اسی سبب سے چھوٹے بچوں کو کتابی صورت میں الف۔ بے۔ پسند نہیں آتی اور وہ اسے یاد کرنے سے ہچکچاتے ہیں مگر شیرینی کے حروف کو تھوڑی ہی کوشش سے یاد کر لیتے ہیں یا یہ کہیے کہ شیرینی پسند خاطر ہونے کی وجہ سے خود بخود اپنے حروف اُن کے ذہن نشین کر دیا کرتی ہے پس اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں جس چیز کا جس قدر شوق ہوگا اُسی لحاظ سے ہم اُسے جلد یاد کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ایک مشہور جرمن موسیقار، مُزارٹ (Mozart) چودہ سال کے سن ہی میں موسیقی کے اہم مسائل کو صرف ایک مرتبہ سن لینے کے بعد یاد کر کے جیسا کا تیسا لکھ دیا کرتا تھا اس کی خاص وجہ یہی تھی وہ موسیقی کے برابر کسی دوسری چیز کو پسند نہیں کرتا تھا اور اس کے سننے کے وقت خیالات کو یکسو اور ہوش و حواس کو مجتمع کر لیا کرتا تھا کیونکہ کسی حفظ کیے ہوئے موضوع کو مدت مدید تک ذہن میں باقی رکھنا اس موضوع سے دلچسپی اور اشتیاق پیدا کیے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا اسلیے کہ صرف وقتی طور پر کام نکالنے

اگر کسی چیز کو یاد کر لیا گیا تو مطلب برآری کے بعد پھر اُس سے کوئی تعلق نہ رکھنے کی صورت میں اسکا فراموش ہو جانا یقینی ہے مثلاً ایک شخص کو کسی خاص وجہ سے عدالت دیوانی کے قواعد سمجھنے کی ضرورت ہوئی، اُس نے اُن کی ورق گردانی کی اُنھیں سمجھا اور دماغ میں محفوظ کر لیا لیکن عدالت سے اس معاملہ کا فیصلہ ہو جانے کے بعد پھر اُنکے برقرار رکھنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہی اسلیے کچھ روز بعد آپ ان ہی قوانین کا اس سے اعادہ کرانا چاہیں کہ جو تھوڑے دن پیشتر ازبریاد تھے اور جن کی مدد سے اس نے ایک وکیل کی حیثیت سے اپنے مقدمہ میں پیروی کی تھی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اب وہ ان میں سے بہت کچھ بھول چکا ہے اور اگر جزوی طور پر کچھ یاد بھی رہا ہے تو وہ قانونی کتابوں کی ورق گردانی کا محتاج ہے۔

اب اسکے ساتھ ہی ایک مصنف یا وکیل کو لیجئے انھیں روزانہ قانونی معاملات کے تصفیہ اور اُن کی پیروی کی ضرورت ہوتی ہے اسلیے یہ لوگ تمام متعلقہ قوانین کو ہمیشہ یاد رکھ کر ان سے کام نکالنے پر مجبور اور ایسے قوانین کے متواتر استعمال کی وجہ سے بغیر بیس و پیش یاد کر لینے پر حاوی ہیں کیونکہ کسی چیز کو متواتر استعمال کیے بغیر چوں کا توں یاد رکھنا دشوار ہے اور جس چیز کو جتنا زیادہ مورد استعمال رکھا جائے گا وہ اسی تناسب سے زیادہ دیر تک یاد بھی رہ سکے گی جس طرح اگر کوئی اشعار کے قطعات کو حفظ کرنا چاہے تو جتنا زیادہ انھیں دُھرائیگا اتنی ہی زیادہ دیر تک وہ اُس کے ذہن میں باقی رہیں گے چنانچہ جو بچے جتنا زیادہ آموختہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اسی مناسبت سے اپنے سبق کو یاد بھی رکھ سکتے ہیں۔

دوسرے، دلچسپ اور مرغوب طبع ہونے کے علاوہ کسی چیز کا متناسب ہونا بھی اُسکے جلد یاد ہو جانے کی دلیل ہے مثلاً کسی مسلسل قصیدے کو حفظ کر لینے کے بعد صرف ایک شعر پڑھنے سے اسکا دوسرا شعر خود بخود زبان پر آجاتا ہے لیکن اگر کسی درمیانی مصرعہ کو بطور تمثیل یاد کیا جائے تو اس کے لیے کسی قدر غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے اسلیے کہ قصیدہ اس خاص مقصد کو مد نظر رکھ کر یاد نہیں کیا گیا تھا جس کے لیے اس مصرعہ کی تمثیل کی ضرورت ہوئی بلکہ وہ تو صرف حفظ کرنے کے وقت پیش نظر رہنے والے خیال تک محدود تھا۔

اس لیے جب کسی چیز کو یاد کیا جائے تو صرف اُسکے ایک ہی رُخ پر نظر نہیں ہونی چاہیے اور اسے ایک ہی مقصد کے لیے مخصوص نہ سمجھنا چاہیے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسکے ہر ایک پہلو پر مختلف زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈال کر اُس سے وابستہ ہونے والے تمام مقاصد کے ساتھ اپنے ذہن میں محفوظ کر لینا چاہیئے تاکہ جب کبھی ان میں سے کسی ایک مقصد کے حصول کی ضرورت پیش آسکے تو وہ بلا تامل یاد آجایا کرے۔

قطعہ

بطرح مشاعرہ خیرآباد بسلسلۂ جلسۂ جشن سیمیں حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ بتاریخ ۱۴ فروری ۱۹۳۷ء

(جناب سید عقیل احمد جعفری صاحب خیرآبادی)

ہاں مجھ کو مبارک ہو، یہ حسن کا کاشانہ — میں عقل سے بیگانہ، تو عشق سے بیگانہ
اے لعبت انگلشیہ، اے برق کلیسا کی — ویراں تو کیا تو نے مشرق کا صنم خانہ
محفل میں نہیں ہے اب، وہ شمع ہے افسردہ — کل حسن کو کرتی تھی جو عشق کا پروانہ
بے نور بنایا تو بجلی نے چراغوں کو — اُس نور صداقت سے لیکن رہی بیگانہ
کھنچ آتے تھے دل جس سے، بے دل جو بناتا تھا — جو چشم حقیقت کا تھا غمزۂ ترکانہ
تنویر نے مغرب کی، آنکھوں کو کیا خیرہ — آباد نہ کر پائی دل کا مرا ویرانہ
خورشید نے دھوئے تو گیسوئے شب ظلمت کے — سلجھا نہ سکا لیکن اس زلف کو یہ شانہ
جلووں میں نہ تھا اس کے، اُس نور کی آمیزش — کیڑے کو بناتا تھا محفل میں جو پروانہ

تقریب میں جبلی کی، عثمان علی خاں کی
اب ایک غزل سنیئے، باطرز جداگانہ

ہر شخص تصدق ہے، اپنا ہو کہ بیگانہ — یہ پھول "دکن" کا ہے، بو اس کی ہے مستانہ
کیا شان بزرگی ہے، کیا شان کریمانہ — زلف شب ظلمت کا خورشید بنا شانہ
سو جاتا ہے، دنیا سے ہو جاتا ہے بیگانہ — جب موت سناتی ہے، ہشیار کو افسانہ
پیکر ہے عمل کا وہ، تو قول ہے اے بلبل — کچھ منہ سے نہیں کہتا، جل جاتا ہے پروانہ
ہو سکتا ہے ایسا بھی، موقوف ہے نیت پر — بتخانے میں کعبہ ہو، کعبے میں ہو بت خانہ
ساغر مرا خالی ہے، ساغر کو مرے بھر دے — اس چشم مروت سے، اے ساقی میخانہ
اے ضعف مدد کر اب، اے پاؤں مرے تھک جا — آگے نہ قدم اُٹھے، یہ ہے درِ جانانہ
اک ایسی لگے ٹھوکر، کھل جائیں مری آنکھیں — تو ہی مری رہبر بن، اے لغزش مستانہ
زاہد تو ہے حجرے میں، اسلام ہے خطرے میں — اب تیری ضرورت ہے، اے جرأت رندانہ
انساں سے توقع ہے انساں کو محبت کی — دیوانہ سمجھتا ہے ہر شخص کو دیوانہ
دیکھے جو پڑے پردے منصور نے حق پر، تو — ایمان کی کہہ بھاگا، دیوانہ تو دیوانہ

خود اپنی ثنا خوانی، یہ کون حماقت ہے
اب نام عقیل اپنا ہم رکھیں گے "دیوانہ"

امام الشعراء ولی دکھنیؒ

(جناب حاجی محمود الحسن صاحب محمود اسرائیلی)

۰ر فروری ۱۹۵۷ء کو اسمٰعیل کالج اندھیری (بمبئی) میں حضرت ولی دکھنی مرحوم کی دو صد سالہ برسی منائی گئی تھی۔ یہ نظم اسی تقریب میں پڑھی گئی تھی۔

نغمۂ اردو ابھی تھا ساز کے پردوں میں گم
اور مغان شعر کے ٹوٹے ہوئے تھے جام و خم

محفل علم ادب میں ایک ویرانی سی تھی
گیسوئے معنی سے پیدا کچھ پریشانی سی تھی

سینے میں جذبات تھے طرز بیاں کوئی نہ تھی
اک زبان کلک تھی، دل کی زباں کوئی نہ تھی

بیج بھاشا کا نہ تھا اک شبدہ بھی سلجھا ہوا
صورت تحریر جو مضموں تھا وہ الجھا ہوا

مان لیجے اس کے شاہر دوہرے معصوم تھے
زیور شائستگی سے سب مگر محروم تھے

شوکت الفاظ کی ہونٹوں پہ رنگینی نہ تھی
بولی میں اظہر پنا تھا کوئی شیرینی نہ تھی

دیدۂ تخئیل سے پنہاں تھا ندرت کا جمال
عشق کو مطلق نہ تھا آداب محفل کا خیال

صنف نازک بولتی تھی عاشقوں کے بھیس میں
عاشقی کی یہ انوکھی ریت تھی اس دیس میں

گرچہ یہ عریانیٔ جذبات وجہ ننگ تھی
لیکن احساسات انسانی کی دنیا تنگ تھی

فارسی کا غنچہ بھی زیب چمن یوں ہی سا تھا
اس میں خوشبو تھی مگر رنگ وطن یوں ہی سا تھا

نظم کی کیاری میں اردو کی کلی پھوٹی نہ تھی
دوسری بھاشائیں تھیں ایسی کوئی بوٹی نہ تھی

موسم گل کا کوئی منظر کہاں آنکھوں میں تھا
اس گلستاں میں خزاں ہی کا سماں آنکھوں میں تھا

نخل اردو کو اگانے کے لیے مالی نہ تھا
اور یہ پروان کیا چڑھتا کوئی والی نہ تھا

اس کی زیبائی سے گلزار سخن محروم تھا
یعنی ذوق شعر سے اب تک چمن محروم تھا

اے خوشا قسمت کہ دکھن سے ولیؔ پیدا ہوا
اس نے بویا اس کو اور خود اس پہ وہ شیدا ہوا

اس کو سیراب اپنے خون دل سے وہ کرتا رہا
اس کی رگ رگ میں عجب رنگینیاں بھرتا رہا

اے ولی اے شعر اردوئے معلےٰ کے امام
سیکڑوں کیا، تیری روح پاک پر لاکھوں سلام

تو ہے میر کارواں، گرد رہ منزل ہیں ہم
تو ہے بحر بیکراں، موج لب ساحل ہیں ہم

تو شہنشاہ سخن اور بندۂ ناچیز ہم
کشور شعر و سخن کا تیرے ہاتھوں میں علم

شاعران ہند کی جانب سے یاں آیا ہوں میں
گل عقیدت کے تری سرکار میں لایا ہوں میں

تواریخ انتقال اندوہناک

۱۹ ۳۶

برائے

مزار افصح الکلام اصغر گونڈوی

۱۹ ۳۶

آہ شیریں بیان اصغر آہ

۱۹ ۳۶

(۱)

گئے دار فنا سے جانب باغ جناں اصغر
ادیب ملک اصغر، نازشیوا بیاں اصغر
نہیں حاصل تھا حامد مرتبہ معجز کلامی کا
لکھو تاریخ رحلت "شاعر جادو بیاں اصغر"

۱۹ ۳۶

(۲)

صاحبدل خدا دوست اصغر حسین گونڈہ
دائم بظل لطف داور بخلد بادا
چوں راہی جناں شد، بنوشت کلک حامد
سالش ز روئے الہام "اصغر بخلد بادا"

۱۹۳۶

(۳)

حضرت اصغر حسین گونڈوی
شعر میں رکھتے تھے کیا دل کی نگاہ
ان کی تصنیفات نثر و نظم ہیں
آسمان علم و فن کے مہر و ماہ
حامد ان کی قبر پر سال وفات
لکھ "منور قبر اصغر یا الٰہ"

۱۹ ۳۶

(۴)

جو سوز و درد و اثر تھا کلام اصغر میں
وہ فن شعر میں ہے نادر و لطیف و عجیب
جگر[1] کے دل سے وہ پوچھو، مری زباں سے سنو
نیاز[2] اور یگانہ[3] کو کب ہوا ہے نصیب
یہ سال رحلت اصغر لکھا ہے حامد نے
کہ "آہ شاعر و نقاد و نکتہ سنج و ادیب"

۱۳ ۵۵

---

[1] جگر مراد آبادی۔ [2] نیاز فتحپوری نے کلام اصغر پر اعتراضات شائع کیے ہیں۔
[3] میرزا یگانہ چنگیزی کہتے ہیں کہ اصغر کو علی گڑھ والوں نے یکایک شاعر بنا دیا ہے۔

کلام آشفتہ

(جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

مے سے مطلب ہے وہ ہو خم میں کہ پیمانے میں
کوئی کعبہ میں پلا دے کہ صنم خانے میں

عشق ہی عشق ہے سب حسن کے افسانے میں
شمع جلتی ہے تو لَو دیتی ہے پروانے میں

بادۂ شوق کہاں دیدۂ مایوس کہاں
یہ وہ مے ہے کہ ٹھہرتی نہیں پیمانے میں

کوئی پوچھے دل وحشی سے حقیقت اس کی
وہ جو اک چیز نظر آتی ہے ویرانے میں

غم فرقت میں قیامت کا اضافہ ہی سہی
اک ورق اور بڑھا دو مرے افسانے میں

منزل عشق میں کرتا ہے وفا کی تخلیق
وہ جو اک جذبۂ خاموش ہے پروانے میں

چیر کر پھینک دیا آگ لگا دی میں نے
دقتیں تھیں دل مایوس کے بہلانے میں

دل میں وہ درد ہے جس درد کی تدبیر نہیں
وہ تمنا ہے جو آتی نہیں سمجھانے میں

اُن کو یہ ضد کہ مرے دل کی کہانی نہ سنیں
اور یہاں جان ہے ٹکڑے یہی افسانے میں

ٹوٹ جائے گا یہ دل پھیر کے نظریں دیکھو
دیر لگتی ہے کہیں پھول کے کملانے میں

سرخیاں یاس و تمنا کی ہیں عنواں غم کے
اور کیا چاہیے اک درد کے افسانے میں

ذوق تشنہ نہ رہا سعی طلب میں آخر
بن گیا کعبہ کا کھویا ہوا بت خانے میں

وہی وحشت ہے وہی حاصل بے ربطی ذوق
وہ جو اک دھن سی ہوا کرتی ہے دیوانے میں

جلوۂ حسن جو مل جائے تو میں دل ڈھونڈوں
غم کی بکھری ہوئی دلفوں کے سیہ خانے میں

مسلک عشق میں آشفتہ نہ ایماں ہے نہ کفر
بتکدہ کعبہ میں ہے کعبہ ہے بتخانے میں

شوکت آرا بیگم

یہ ایک خاتون کے نام سے عجیب و غریب افسانہ شائع ہوا ہے جس میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے طریقوں سے دلچسپ بحث کی گئی ہے اور تعلیم نسواں کی اہمیت و ضرورت کو واضح کرتے ہوئے مختلف درجے، طبائع اور عورتوں کی تعلیم کی زندگی کے مرقعے پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ لڑکیوں کو کس نہج پر تعلیم دینا مفید ہوگا اور کن طریقوں سے بچنا چاہیے۔ حصہ اول و دوم قیمت سے، حصہ سوم قیمت سے ر۔

الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

نوائے اختر

(جناب نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی)

هم زمانے سے نکل کر بھی زمانے میں رہے ‏ درد بن کر حسن و الفت کے فسانے میں رہے

چار دن کی زندگی یوں ہم نے کاٹی ہمصفیر ‏ دام میں دو دن تو دو دن آشیانے میں رہے

مٹ مٹا کر قبر اپنی نذر صرصر ہو گئی ‏ خاک ہو جانے پہ بھی ہم خاک اُڑانے میں رہے

لاگ سی کچھ ہو گئی ہے برق کو اے ہم صفیر ‏ ہم تو جاتے ہیں وہی اب آشیانے میں رہے

ہمت مردانہ راہ عشق میں لغزش نہ ہو ‏ ہم گذر جائیں مگر جرأت نہ شانے میں رہے

گلفشانی ہم کریں بلبل تو ہو طرف بہار ‏ آشیاں گلشن میں گلشن آشیانے میں رہے

چار آنکھیں اُس سے ہونا تھیں کہ آفت آ گئی ‏ دل جگر دونوں تو پہلے ہی نشانے میں رہے

موج بوئے گل بنی جاتی ہے پھندا دام کا ‏ کہہ دو بلبل پر سمیٹے آشیانے میں رہے

حضرت شوکت تو پوری کر چکے کب کی غزل
اختر اب تک ایک ہی مصرعہ لگانے میں رہے

امواج شمیم

(جناب نوار ناظر صاحب شمیم پروفیسر کرائسٹ چرچ گرلس کالج۔ الہ آباد)

غایت تخلیق جب مجھ پہ عیاں ہو جائے گی ‏ ساز ہستی سے مری برپا فغاں ہو جائے گی

مجھ مریض غم کی خاموشی میں ہے اک داستاں ‏ میری حالت میری صورت سے عیاں ہو جائے گی

جان جاتی ہے فراق یار میں جانے بھی دو ‏ زمرۂ عشاق میں تو داستاں ہو جائے گی

اس بت غنچہ دہن کے عشق میں اے ہم نفس ‏ داستان میری دہان بے زباں ہو جائے گی

میں وہ بلبل ہوں خزاں میں لوں اگر نام بہار ‏ اک نفس کیا، سبز شاخ آشیاں ہو جائے گی

حسن کی شہرت ہو تیرے اس لیے سنتا ہوں میں ‏ میرے مٹنے سے حقیقت سب عیاں ہو جائے گی

حسن باطن کا مرقع تو بنا ہے اے شمیم
اس لیے تصویر تیری ضو فشاں ہو جائے گی

نظرے خوش گذرے

آئین جدید کے بموجب اسمبلی اور کونسل کے انتخابات کل صوبوں میں مکمل ہوگئے۔ تفصیلات اخباروں میں آچکی ہیں یہاں صرف بعض امور کا ذکر کیا جائے گا۔

کانگریس نے مدراس میں ۷۵ فی صدی، صوبہ متوسط میں ۷۰ فی صدی، اڑیسہ میں ۶۵ فی صدی، بہار و صوبہ متحدہ میں ۶۰ فی صدی اور بمبئی میں ۵۰ فی صدی سے زائد جگہیں حاصل کیں۔ اور اگر کانگریس کمیٹی نے عہدے قبول کرنے کی موافقت میں فیصلہ کیا تو گویا ان چھ صوبوں پر کانگریس کی حکومت ہوگی۔ اور فیصلہ عہدوں کے خلاف میں ہوا تو امید کرنا چاہیے کہ ان صوبوں میں آئین جدید معرض تعطل میں آجائے گا۔

مسلم لیگ کو ہندوستان کے کسی چھوٹے سے چھوٹے صوبہ میں بھی اکثریت نصیب نہیں ہوئی۔ سندھ اور سرحد کے صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت زائد ہے لیگ کا انتخابی بورڈ ہی نہیں قائم ہوسکا۔ پنجاب میں اس کے صرف دو نمائندے منتخب ہوئے جن میں سے ایک صاحب جو بورڈ کے سکریٹری بھی ہیں انتخابی کشمکش کے دوران میں مجلس اتحاد ملت میں بھی شریک ہوگئے حالانکہ اس کا مطمح نظر مکمل آزادی ہے اور مسلم لیگ نوآبادیات کے درجہ سے آگے بڑھنے کی جسارت نہیں رکھتی۔ اور دوسرے صاحب کامیاب ہونے کے بعد سر سکندر حیات خاں کی اتحادی جماعت میں جا ملے۔

بنگال میں سب سے زیادہ کامیابی ہوئی یعنے مسلمانوں کی ⅓ جگہیں لیگ کے نمائندوں کو ملیں مگر وزارت کی ترتیب کا شرف مسٹر فضل حق کو حاصل ہوا جو پرجا پارٹی کے رہنما ہیں اور جن کو مسٹر جناح نے ناراض ہوکر اپنے بورڈ سے خارج کر دیا تھا۔

جن صوبجات میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان میں سے بہار اور اڑیسہ میں تو لیگ کا بورڈ ہی نہیں قائم ہوا۔ صوبہ متوسط میں قائم ہونے کے بعد شکست ہوگیا اور دو رہنماؤں کی شخصی قیادت میں انتخابی جنگ لڑی گئی۔ بمبئی اور مدراس میں مسلمانوں کی جگہوں میں سے ۶۰ فی صدی کے قریب لیگ کے نمائندوں کو حاصل ہوئیں اور صوبہ متحدہ میں ۴۲ فی صدی۔

کانگریس اور مسلم لیگ کی انتخابی جنگ پر اگر غور کیا جائے تو ایک کی کامرانی اور دوسری کی محرومی کا سبب معلوم ہوسکتا ہے۔ کانگریس کی باگ جس جماعت کے ہاتھ میں ہے وہ جانتی ہے کہ قومی تنظیم کے واسطے ایک مستقل نصب العین درکار ہے اور اس کے حصول کے لیے مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے اور اس راہ میں کوئی قربانی ایسی نہیں جس سے وہ دریغ کرتی ہو۔ مسلم لیگ کا کھلونہ چند سیاسی بازیگروں کے ہاتھوں میں ہے

جن کو سوائے اپنے ذاتی ترفع کے نہ قوم کا درد ہے نہ ملک کا۔

خدا بخشے مولانا محمد علی مرحوم نے ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپسی کے بعد اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ "جتنے لوگ فرقہ پرستی کے مدعی ہیں وہ سب خود پرست ہیں" دوسری اقوام کے فرقہ پرستوں کی حالت خواہ اس سے مختلف ہو مگر مسلمانوں کے فرقہ پرست اللہ کے فضل سے سب خود پرستی ہی میں مبتلا ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ایک آزاد خیال محب وطن ہیں اور اسی خیال سے ۱۹۱۹ء میں خود راقم الحروف اس کا محرک ہوا تھا کہ اُن کو مسلم لیگ کا صدر بنایا جائے۔ مگر افسوس کہ اس ساری مدت کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

سولہ سترہ سال کی طویل مدت میں جناح صاحب کے کل کارناموں کو دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا پڑتی ہے کہ وہ بھی "بسیار خوش خط بسیار غلط" کے مصداق ہیں۔

انتخابات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل افسوس بلکہ مضحکہ انگیز حکمت عملی اُن اسلامی جماعتوں کی رہی جو اس امر کی مدعی ہیں کہ آزادی کامل اُن کا نصب العین ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند قدیم کے بعض معتقد مقدمین سے ہیں جو عقیدت ہے اُس کی بنا پر دلی اذیت ہوتی ہے جب ان بزرگوں سے اختلاف کرنا ہوتا ہے مگر مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ۱۹۲۱ء کی جنگ آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش رہنے کے بعد ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس سے نہ صرف علیحدہ رہنا بلکہ ایسے لوگوں سے ساز کرنا جو اُن کے سیاسی نصب العین سے کوسوں دور ہیں اور جن میں سے اکثر کا مطمح نظر ذاتی ترفع اور شخصی اقتدار کے سوا کچھ نہیں رہا اُس جماعت کے ہرگز شایان شان نہ تھا جو مذہبی حیثیت سے برسوں کونسل کے داخلہ کی مخالفت کرتی رہی اور شرعی مصالح کی بنا پر آزادی کامل کے لیے کوشاں ہے۔

بہتر تو یہ تھا کہ علمائے کرام انتخابات میں حصہ ہی نہ لیتے۔ اور اگر یہ پاپڑ بیلنا ہی تھے تو اُن کو اپنی ساری قوت کانگریسی مسلمانوں کی تائید میں صرف کرنا چاہیے تھی یا کانگریسی مسلمانوں، جمعیۃ العلما، مجلس احرار اور مجلس اتحاد ملت کا ایک مشترکہ بورڈ بنا لیا جاتا یا کم سے کم انفرادی طور پر صرف ایسے لوگوں کی حمایت کی جاتی جن کا نصب العین آزادی کامل ہوتا۔

کانگریس کی سیاسیات میں اگرچہ معتقدات کا کوئی دخل نہیں ہے مگر سیاسیات کی خود ایک جداگانہ شریعت ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر جن خطاب یافتگاں نے کانگریس کے نام پر انتخابات میں شریک ہونا چاہا اُن سے

کانگریس والوں نے صاف کہہ دیا کہ خطابات سے دست برداری کیے بغیر کانگریس اُن کو اپنا امیدوار نہیں بنا سکتی اور متعدد اصحاب نے خطابات واپس کرکے کانگریس کی نمائندگی حاصل کی اور سارے ہندوستان میں ایک بھی کانگریس کا نمائندہ ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو خطاب یافتہ ہو۔

جمعیۃ علما کے مقدسین اور ہمارے دوسرے علمبرداران حریت اپنے دعاوی آزادی میں تو پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور فرنگی محل کے ایک مولوی صاحب کے بارہ میں تو ایک مقامی اخبار میں یہ چھپ بھی گیا کہ انھوں نے ایک تقریر میں فرمایا کہ آزادی کامل کی طلب میں وہ جواہر لال سے بھی آگے ہیں لیکن دوسرے صوبوں کا اگرچہ تفصیلی علم نہیں تاہم کم سے کم ہمارے صوبہ میں متعدد خطاب یافتگان اور تعلقداران جو اپنی سندوں کے رو سے انگریزوں کی غلامی پر مجبور ہیں علمائے کرام کی تائید و حمایت کے بدولت انتخاب میں کامیاب ہوئے جس کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں جمعیۃ علما اور خود ان علما سے شدید ناراضی اور بیزاری کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں اور وہ دوسرے ملانوں کی طرح ان پر بھی زر پرستی اور ہوا خواہی دولت و اقتدار کے آوازے کستے ہیں۔

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا، جسے ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گذری کہ مولانا محمد علی مرحوم جیسے قائد کو جمعیۃ العلما کی صدارت دینے سے انکار میں اس قدر اصرار کیا گیا کہ خود جمعیۃ العلما کے دو ٹکڑے ہو گئے جن میں سے ایک نے امر دہہ میں کانگریس کی جنگ آزادی سے مسلمانوں کو باز رکھنے کی تجویز منظور کرکے شائع کی۔ مگر جمعیۃ العلما کی وہی باغی جماعت جب اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر پھر نئی جمعیۃ العلما کو خیرباد کہہ کر پرانی جمعیۃ العلما میں جا ملی تو چند ہی سال کے اندر جمعیۃ علمائے ہند قدیم کے سردار بھی اس حد تک اعتدال پسند اور مصلحت کیش بن گئے کہ مسٹر محمد علی جناح جیسے عافیت کوش رہنما کی قیادت میں انتخابات کی جنگ میں شریک ہونا اور خطاب یافتوں یا تعلقداروں کی حمایت و تائید کرنا اُن کے لیے باعث ننگ و عار نہ رہا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

مجلس احرار کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اس کی صدر مجلس نے پہلے مسٹر جناح کی قیادت قبول کی، پھر جب پنجاب میں مسلم لیگ بورڈ بننے لگا تو اُس سے الگ ہو کر اپنا بورڈ علیحدہ قائم کیا مگر صوبہ متحدہ کے احراری یہاں کی لیگ بورڈ میں شامل ہوئے اور عین انتخاب کے قریب اُنھوں نے اپنی طرف سے ایک فہرست اُن لوگوں کی شائع کر دی جن کی تائید اُن کو کرنا تھی، پھر اس میں سب ہی قسم کے لوگ تھے، کانگریسی بھی، مسلم لیگی بھی، آزاد خیال بھی اور خطاب یافتہ بھی حتے کہ بعض ایسے لوگ بھی تھے جو مسلم لیگ بورڈ کے نمائندوں کے حریف تھے۔

مجلس اتحاد ملت نے غنیمت ہے کہ مسٹر جناح کی قیادت سے گلوخلاصی حاصل کر لی مگر انفرادی طور پر اُس نے جہاں ایک طرف پنجاب مسلم لیگ بورڈ کے سکریٹری کو اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی وہاں پنجاب کی اتحادی جماعت اور بعض آزاد امیدواروں کی حمایت میں بھی دریغ نہیں کیا۔

غرضکہ ان حامیان آزادی کامل کی مشترکہ قوتوں کے مجتمع نہ ہونے اور طرح طرح کی بے اعتدالیاں سرزد ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں جہاں مسلم لیگ کے ۲ نمائندے کامیاب ہوئے وہاں مجلس احرار اور اتحاد ملت کے بھی دو ہی دو امیدوار کامیاب ہو سکے۔ اور آج اگر ہندو اکثریت والے صوبوں میں ہندو کانگریسیوں کو تفوق حاصل ہے کیونکہ مسلمان کانگریسی ان حضرات کی امداد سے محروم رہنے کی بنا پر عموماً ناکامیاب ہیں تو مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں خطاب یافتوں یا پنجاب کی اصطلاح میں "ٹوڈیوں" کی حکومت قائم ہو رہی ہے اور علمبرداران حریت "ازیں سو راندہ و ازاں سو درماندہ" فاعتبروا یا اولی الابصار۔

سلطان العلوم ہز اگزالٹڈ ہائینس نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام حیدرآباد کی نقرئی جوبلی آخر فروری میں حیدرآباد اور ملک کے دوسرے حصص میں منائی گئی۔

موجودہ تاجدار کے زمانہ میں حیدرآباد بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ اور اس ساری تبدیلی میں کلیۃً اگر نہیں تو بڑی حد تک خود فرماں روا کی ذاتی توجہ کو دخل ہے۔ خصوصاً علیم کی اشاعت اور اردو زبان کی ترقی میں جو نمایاں حصہ حیدرآباد نے لیا ہے اُس کے لیے سلطان العلوم کا عہد حکمرانی یادگار رہے گا۔

ریاست کا عام نظم و نسق رفتہ رفتہ اُسی رنگ پر آگیا ہے جو برطانوی ہند کے علاقہ میں ہے۔ یہ طریقہ نظم بعض خوبیوں کے ساتھ بہت سے نقائص بھی رکھتا ہے اور جب اُستاد کے یہاں اُس کی اصلاح نہ ہوئی تو شاگردوں سے کیا توقع کی جائے۔ پھر بھی حیدرآباد کو ایک بات میں فوقیت حاصل ہے یعنے اُس کے نظم و نسق کی غایت کسی اجنبی ملک کی نفع رسانی نہیں ہے، اس بنا پر نقائص کے باوجود اس کا نظم و نسق مجموعی حیثیت سے اہل ملک کے لیے چنداں مضر نہیں۔ اور اگر زمانہ مستقبل میں وہاں بھی صحیح معنوں میں آئینی حکومت قائم ہو گئی اور نظم و نسق پر اہل ملک کو ویسا ہی اقتدار حاصل ہو گیا جیسا انگلستان میں انگریزوں کو ہے تو یہ ہز اگزالٹڈ ہائینس کے عہد کی سب سے بڑی اصلاح ہو گی۔

خدا کرے کہ میر عثمان علی خاں اپنے ملک اور اپنی رعایا کو ترقی کی اس منزل پر پہونچانے کے لیے تا بہ دیر سریر آرائے حکومت رہیں اور اہل دکن کو اس نقرئی جوبلی کے بعد اُن کی طلائی جوبلی منانے کا موقع نصیب ہو۔

جلوہ گاہ ناز میں بیٹھے تھے بن کر لاجواب
اب خجل ہیں آئینہ میں دیکھ کر اپنا جواب

یہ بھی کوئی بات ہے یہ بھی کوئی انداز ہے
تم تو سیدھی بات کا دینے لگے الٹا جواب

میں گلہ اُن سے کروں گا وہ کریں گے التجا
لطف دے گا حشر میں میرا سوال اُن کا جواب

پائے وحشت اس قدر پھیلا نہ اے جوشِ جنوں
خوف یہ ہے دے نہ جائے وسعتِ صحرا جواب

حسن والے یوں تو ہونے کو خدائی میں بہت
چاند سی صورت کا ان کی ہو نہیں سکتا جواب

نامہ بر کے پاؤں توڑوں منت میں کیا فائدہ
ناامیدی دے گئی مجھ کو مرے خط کا جواب

وصل سے انکار لکھا ہے ستمگر نے ضرور
یاس بھی ہمراہ آتی ہے نہیں تنہا جواب

غیر کے در پر بھی جاتے ہیں جبیں سائی کو ہم
دیکھئے تقدیر دیتی ہے ہماری کیا جواب

نامہ بر کے منہ پہ مارا پھینک کر میرا ہی خط
پھر کہا منہ پھیر کر اس شوخ نے "پایا جواب"

ہائے اس انداز شوخی پر نہ کیوں صدقے ہو دل
مجھ کو لکھا ہے "نہیں لکھتے ترے خط کا جواب"

کاتب تقدیر کا لکھا اسے کیا مل گیا
جو مری قسمت میں تھا اُس نے وہی لکھا جواب

رنج و غم سے اب تو یہ نقشہ رسا کا ہو گیا
آپ ہی کچھ بات کرنا آپ ہی دینا جواب

یہ بھی کچھ بات ہے ہر وقت ہے تکرار کی بات (۱۰) وہی انکار کا پہلو وہی انکار کی بات

پوچھ لی پیار سے اس بیکس و ناچار کی بات
آج تو آپ نے رکھ لی دل بیمار کی بات

یا خدا حشر میں اس کا کوئی پرساں ہی نہ تھا
تیری رحمت نے بنا دی ہے گنہگار کی بات

وصل کے نام سے ہو جائیں گی آنکھیں نیچی
خود سکھائے گی جوانی انھیں اقرار کی بات

آج تک اُس سے نہ جانا مرے مرنے کا سبب
اک مسیحا سے نہ سمجھی گئی بیمار کی بات

حشر بھی دیکھ لیا دیکھنے والوں نے ترے
اور ہی کچھ ہے ستمگر تری رفتار کی بات

سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بری ہوتی ہے
اُن کی گالی بھی ہے میرے لیے اک پیار کی بات

غیر بھی اس سے رضامند ہیں ہم بھی خوش ہیں
سیکڑوں رکھتی ہے پہلو بت عیار کی بات

آئے کیوں بہر عیادت تو تبسم کیسا
پوچھتا ہے کوئی ہنس ہنس کر کسی بیمار کی بات

سخت جاں ہوں میں مرے قتل پہ باندھو نہ کمر
دیکھو دیکھو کہ بگڑ جائے گی تلوار کی بات

پھر وہی جور کے طعنے ہمیں دینے آئے
حشر کے روز بھی کی آپ نے تکرار کی بات

جور کا اُن کے ٹھکانا نہ کرم کی حد ہے ‌ ‌ قہر کی آنکھ کبھی ہے تو کبھی پیار کی بات

یوں تو ہیں اہل سخن سارے زمانے میں مگر

اور ہی کچھ ہے رسا آپ کے اشعار کی بات

آئے دن تکرار شب ہے آئے دن تکرار صبح (۱۷) اب تو یا اقرار شب ہو ہم سے یا اقرار صبح

اُن کا رُخ کھلتے ہی غارت ہو گئے انوار صبح ‌ ‌ کیا غضب ہے دن دہاڑے لٹ گئی سرکار صبح

مر نہ جائے حسن کے عاشق آپ کا انکار صبح ‌ ‌ محفل ماتم نہ ہو جائے کہیں دربار صبح

اُٹھتے اُٹھتے کھولیے منھ ہو گئے آثار صبح ‌ ‌ لائے ہیں انجم نچھاور کے لیے انوار صبح

اب تو قصہ ختم ہو ظاہر ہوئے آثار صبح ‌ ‌ شام تک ہوتی رہے گی کیا یونہیں تکرار صبح

وصل کی شب دیکھتے ہو بار بار آثار صبح ‌ ‌ ہو گیا ہے کیا کسی کمبخت سے اقرار صبح

منھ تمہارا دیکھ کر دیکھے کوئی آثار صبح ‌ ‌ عید ہے اُس کے لیے جس کو ہو یوں دیدار صبح

کیا قسم کھائی تھی تم نے دیکھ کر آثار صبح ‌ ‌ کیا کہا تھا یاد بھی ہے تم کو کچھ اقرار صبح

وصل کی شب اُن کو عجلت یہ کہ ہوں آثار صبح ‌ ‌ مجھ کو یہ حسرت کہ تا محشر نہ ہو دیدار صبح

ایک دن کا ہو جو یہ رونا تو کر لیں صبر بھی ‌ ‌ رات دن کیونکر سنیں انکار شب انکار صبح

یہ مؤذن ہے مؤذن آپ کا نوکر کہیں ‌ ‌ کیا غرض ہے نصف شب سے کیوں کرے اظہار صبح

چھا گئی ہے کیا شب غم پر سیہ بختی مری ‌ ‌ ہو گئی ہے صبح اور ہوتا نہیں اظہار صبح

وصل کی شب ہائے وہ کہنا کسی کا تھا غضب ‌ ‌ اب تو ظالم چھوڑ دے ہم کو کہ ہیں آثار صبح

صبح دم وہ بے نقاب اُٹھے جو خواب ناز سے ‌ ‌ روئے انور پر تصدق ہو گئے انوار صبح

اے ستمگر کل خدا جانے جیے یا مر گئے ‌ ‌ تو خدا کے واسطے ہم سے نہ کر اقرار صبح

زلف مشکیں ہٹ گئی روئے منور سے کہیں ‌ ‌ تلملاتے پھر رہے ہیں کس لیے انوار صبح

انتظار صبح اُن کو کس قدر ہے وصل میں ‌ ‌ ہے نصیبہ کا سکندر طالع بیدار صبح

اب تو پیری ہے کہیں توبہ بھی کر مرد خدا

سو بلاؤں کو رسا ہوتی ہے استغفار صبح

پھولے پھلے جہاں میں نہال سخن کی شاخ (۱۸) اس انجمن کی شاخ ہے اُس انجمن کی شاخ

کیا چیز آرزو ہے دل پر محن کی شاخ ‌ ‌ کیونکر ہری ہو ایسے نہال سخن کی شاخ

کیا کیا نہ ہم نے جور سہے ہجر یار میں
گویا کہ یہ زمین ہے چرخ کہن کی شاخ

کہتے ہیں جس کو حور تری اک جلیس ہے
جنت ہے جس کا نام تری انجمن کی شاخ

کوئے بتاں ہے اور جبین نیاز ہے
کیا کعبہ کیسی بتکدۂ برہمن کی شاخ

کیا کیا چمن میں سرو کو بالیدگی ہوئی
توڑی جو اُس نے ناز سے سرو چمن کی شاخ

صحرا ہو یا ہو کوہ برابر ہے عشق میں
اک قیس کی ہے شاخ تو اک کوہکن کی شاخ

چھوٹے بڑے کا فرق ہے حیرت میں ایک ہیں
دل ہے ہمارا آئینہ انجمن کی شاخ

ہر وقت یہ دعا ہے رسا کی کہ تا ابد
پھولے پھلے جہاں میں نہال سخن کی شاخ

---

(۱۹)

کیا خاک ہم کسی سے کہیں ماجرائے دل
اک بوند رہ گئی ہے لہو کی بجائے دل

جب مجھ سے پوچھتا ہے کوئی ماجرائے دل
سینہ پہ رکھ کے ہاتھ یہ کہتا ہوں ہائے دل

آیا نہ رحم سن کے تجھے ماجرائے دل
پہلو میں تیرے دل ہے کہ پتھر بجائے دل

رہتے ہیں دونوں ایک ہی پہلو میں رات دن
دل آشنائے درد ہے درد آشنائے دل

ہم سے ہی جب گیا تو بلا سے کہیں رہے
جنت میں جائے دل کہ جہنم میں جائے دل

ارمان ہیں ہزار شب وصل مختصر
ایسے میں خاک اپنی لگی کو بجھائے دل

تاریک ہے اگر شب فرقت تو خوف کیا
روشن ہیں داغ ہائے جگر داغ ہائے دل

پھر ماننا نہ ماننا یہ اختیار ہے
اک روز تم سنو تو سہی مدعائے دل

پہلو میں میرے رہنے سے پھر اُسکو کیا غرض
آیا ہے اُن پہ دل تو وہیں کیوں نہ جائے دل

آئینہ دیکھ کر تمھیں انصاف سے کہو
اس پیاری پیاری شکل پہ کیونکر نہ آئے دل

ہر چند دل نے رنج اُٹھائے ہزارہا
پھر بھی تری جفا سے خجل ہے وفائے دل

سہنے کو رنج لائے کلیجہ کہاں سے غیر
کچھ دل لگی نہیں ہے کہ تم سے لگائے دل

کب تک رسا کوئی تری حالت سنا کرے
دن رات مشغلہ ہے ترا ہائے ہائے دل

---

(۲۰)

حیران ہو کے رہ گئے وصف عدو سے ہم
تصویر بن گئے ہیں تری گفتگو سے ہم

تو قتل گر کرے تو مریں آبرو سے ہم — ہوں تجھ سے سرخرو جو نہائیں لہو سے ہم
اے چارہ ساز چاک گریباں تو یہ نہیں — کس طرح زخم دل کو چھپائیں رفو سے ہم
ہم کو غرض کہ فرصت بیداد دیں تجھے — آئینہ کیوں اٹھائیں ترے روبرو سے ہم
انکار وصل سن کے عجب حال ہو گیا — ہم سے اب آرزو ہے خجل آرزو سے ہم
ساقی ہمارے صبر کی ہے شرم تیرے ہاتھ — بیٹھے ہیں دور ساغر و جام و سبو سے ہم
جب ڈھونڈھنے پہ آئے تو کعبہ ہے کتنی دور — کیوں تھک کے بیٹھ جائیں تری جستجو سے ہم
ان کو جفا سے کام ہے ہم کو وفا سے کام — لاچار اپنی خو سے ہیں وہ اپنی خو سے ہم

مایوس ہو کے وصل سے اس بت کے اے رسا
کرتے ہیں التجائے سفارش عدو سے ہم

کوئی جب مہرباں ہوتا ہے مجھ پر دل سے کہتا ہوں (۲۱) کہ مجھ کمبخت کی تقدیر ایسی ہے میں ایسا ہوں
نظر پڑتی ہے مجھ پر جب کبھی گھر سے نکلتا ہوں — تمہاری ہی یہ ساری خوبیاں ہیں ورنہ میں کیا ہوں
وہی دنیا کی حسرت قبر میں بھی ساتھ لایا ہوں — عنایت سے تمہاری میں نہ تنہا تھا نہ تنہا ہوں
جفاکاروں میں تم ہو میں وفاداروں میں یکتا ہوں — خبر بھی ہے کہ تم کیا ہو خبر بھی ہے کہ میں کیا ہوں
تری محشر خرامی سے ہزاروں فتنہ اٹھتے ہیں — ہر اک فتنہ یہ کہتا ہے کہ میں آفت کا پتلا ہوں
کوئی امید بر آئے تو کیونکر دل نہیں رکھتا — تمنا کس طرح نکلے کہ ناکام تمنا ہوں
کسی کے وصل کا نقشہ پھرا کرتا ہے آنکھوں میں — تسلی کو یہ تصویر خیالی ساتھ رکھتا ہوں
عجب کچھ عالم وحشت میں حالت ہو گئی اپنی — کہ روتا ہوں تو روتا ہوں جو ہنستا ہوں تو ہنستا ہوں
نکالا جا رہا ہوں بار بار اللہ کی قدرت — تری محفل میں گویا غیر کے دل کی تمنا ہوں
وہ میرے حال کے پرساں تو ہیں یہ فخر کیا کم ہے — وہ میں بیمار ہوں لیکن ہزار اچھوں سے اچھا ہوں
ستمگر دیکھ باز آ یہ ستم اچھا نہیں مجھ پر — خدا کا تو بھی بندہ ہے خدا کا میں بھی بندا ہوں
عبث دل کی طلب پر وصل کی شب روٹھے بیٹھے ہو — یہ کوئی بات بھی ہے دل تمہارا میں تمہارا ہوں
سمائیں گے الٰہی کس طرح اس کنج تربت میں — کہ دنیا سے بہت ارمان اپنے ساتھ لایا ہوں
جو تم پہلو سے اٹھو گے تو میں دنیا سے اٹھوں گا — ادھر تم جانے والے ہو ادھر میں جانے والا ہوں
اخیر کا دم میں دوں گا وہ برا سمجھیں بھلا سمجھیں — رسا ہوں نارسا ہوں میں غرض جو کچھ ہوں انکا ہوں

کر کے انکار مسکراتے ہیں (۲۲) زخم پر زخم وہ لگاتے ہیں

ہم ترے در پہ جی سے جاتے ہیں دیکھ شان وفا دکھاتے ہیں
آئینہ سے نظر لڑاتے ہیں سامنے کی وہ چوٹ کھاتے ہیں
اپنے ہاتھوں سے وہ پلاتے ہیں اب کوئی ہوش میں ہم آتے ہیں
جب وہ سیر چمن کو جاتے ہیں پھول پھولے نہیں سماتے ہیں
دم رخصت غضب وہ ڈھاتے ہیں مجھ کو رو کر گلے لگاتے ہیں
کیوں منائیں نہ خیر آپ کی ہم جان کی خیر سب مناتے ہیں
ضبط آتا ہے رو کئے ہر بار کس کے شکوے زباں پر آتے ہیں
جب سے کھویا ہے ہم نے دل اپنا چیز رکھتے ہیں بھول جاتے ہیں
پاسباں ہوتی ہے حیا اُن کی جب وہ نیچی نظر اُٹھاتے ہیں
عاشقوں کا یہی وطیرہ ہے داغ کھاتے ہیں نام پاتے ہیں
کبھی آئینہ سے ہے سرگوشی کبھی پتھر اُسے بناتے ہیں
کون کرتا ہے شکوۂ بیداد اُن کا قصہ اُنھیں سناتے ہیں
کون زندہ رہے گا آپ کے بعد جائیے آپ ہم بھی جاتے ہیں
وصل کی شب اسی میں جاتی ہے رات بھر ہم اُنھیں مناتے ہیں
یہ بھی ہے بندہ پروری اُن کی اپنا بندہ ہمیں بناتے ہیں
امتحاں گاہ میں جتا سب دل سب سے آگے قدم بڑھاتے ہیں
پھر انھیں رحم آ ہی جاتا ہے پھر خوشامد پہ مان جاتے ہیں
اب تو آ بیٹھو بزم ماتم میں لوگ میت مری اُٹھاتے ہیں
ہیں غضب ان کی چال کے فتنے حشر کی دھجیاں اُڑاتے ہیں
دل میں آکر نہیں قرار اُنھیں وہ ہوا پر سوار آتے ہیں
زخم دیتے ہیں دل میں رہ رہ کر کس تکلف سے وہ ستاتے ہیں
فتنے کہتے ہیں پڑھ کے بسم اللہ جب وہ اونچا قدم اُٹھاتے ہیں
غش سے فرصت غضب ہے میرے لیے ہوش آتے ہی ہوش جاتے ہیں
وہ مٹاتے نہیں جہاں سے مجھے نام اہل وفا مٹاتے ہیں

کیا کہوں اُن سے آرزوے دل | بات کرتا ہوں مُنہ بناتے ہیں
غیر کو کوئی کچھ نہیں کہتا | مجھ پہ سب اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں
لگ گیا دل پہ کس کا تیر نظر | لختِ دل آنسوؤں میں آتے ہیں
کتنے بیدرد ہوتے ہیں یہ حسیں | دردمندوں کا دل دُکھاتے ہیں
دل میں رہتے نہیں گھڑی بھر وہ | حسرتِ غیر بن کے آتے ہیں
کیا بُری شے ہے دردِ فرقت بھی | چارہ گر کے حواس جاتے ہیں
وہ کہاں اور کوئے غیر کہاں | لوگ تہمت اُنھیں لگاتے ہیں
پتلیاں پھر گئیں دمِ آخر | آپ کس سے نظر چُراتے ہیں

اے رسا دوست ہو کہ دشمن ہو
ہم تو سب کا بھلا مناتے ہیں

نالے لب پر مرے جب آتے ہیں (۲۴) آسماں کے دھوئیں اُڑاتے ہیں

سُن کے نالے وہ سہم جاتے ہیں | پھر یہ ناکام کام آتے ہیں
غیر کو پاس کیا بٹھاتے ہیں | مجھ کو دنیا سے وہ اُٹھاتے ہیں
کوئی ہم سا نیاز مند نہیں | غیر کے آگے سر جھکاتے ہیں
ہے وہی خوش نصیب دنیا میں | جس کا کہنا وہ مان جاتے ہیں
ہائے اس بھولی شکل پر تم کو | لوگ عیار کیوں بتاتے ہیں
حضرتِ دل وہ مہربان ہوئے | لو نئی آپ کو سُناتے ہیں
غیر فتنے اُٹھا کے اُٹھے گا | کس کو پہلو میں وہ بٹھاتے ہیں
دل میں لگتے ہی ٹھہر جاتا ہے | اس طرح تیر وہ لگاتے ہیں
بُرے ہوتے ہیں شوق کے جذبے | کھنچنے والوں کو کھینچ لاتے ہیں
تیرے بیمار کی یہ حالت ہے | کہ مسیحا بھی دم چُراتے ہیں
کیا وہ سمجھے ہیں اس کو دل میرا | آئینہ سے نظر چُراتے ہیں
سچ تو یہ ہے ہمیں وفا کر کے | اُن کو طرزِ جفا سکھاتے ہیں
شورِ محشر ہی اُٹھائیں گے | یہی نالے جو لب پر آتے ہیں
آتے ہیں قبر وہ مٹانے کو | کبھی دو پھول بھی چڑھاتے ہیں

ایک تو کر دیا ہمیں برباد / اس پہ احسان وہ جتاتے ہیں

یا خدا حشر میں ہم اک بت کی / تجھ سے فریاد کرنے آتے ہیں

وہ بگڑتے ہیں غیر سے بگڑیں / جان پر میری کیوں بناتے ہیں

کیا سُنا تم نے قصۂ فرہاد / ہم سے کچھ سنیے ہم سُناتے ہیں

یہ کلیجہ یہ دل ہمارا ہے / ستم ناروا اُٹھاتے ہیں

غیر سے ہو وفا یہ ناممکن / کس کی باتوں میں آپ آتے ہیں

آپ کی جان کو خدا رکھے / جائیں جی سے جو جی سے جاتے ہیں

کیسا اقرار اور کیسی وفا / جھوٹ سچ اُن کا آزماتے ہیں

غیر کا کرکے وہ جگر ٹھنڈا / کیوں کلیجہ مرا جلاتے ہیں

کہتے ہیں اور پر ہے دل تیرا / نئی تہمت مجھے لگاتے ہیں

یوں تو لٹتی نہیں ہے مے واعظ / نذر کچھ کیجئے پلاتے ہیں

ذکر غیر اور سامنے اُن کے / اپنی شامت ہمیں بلاتے ہیں

بے خودی ہم کو ہجر میں اچھی / غم سے کچھ تو نجات پاتے ہیں

خون کرتے ہیں بے گناہوں کا / مہندی تلووں میں کیا لگاتے ہیں

کوئی ہوتا نہیں ہے غربت میں / خضر بھی راستہ بتاتے ہیں

کیسی گھاتیں ہیں ان بتوں کو یاد / چار باتوں میں دل لبھاتے ہیں

یہ بھی اک ضد ہے اُن کو میرے ساتھ / دل دکھانا ہے دل دکھاتے ہیں

اے رسا کرکے وہ ہمیں برباد
دیکھیں اب کس کا گھر بساتے ہیں

(۲۴)

دل لگی پر کبھی جو آتے ہیں / اور دل کی لگی بڑھاتے ہیں

آج نوروز تو نہیں واعظ / بادہ کش عید کیوں مناتے ہیں

سُن کے میرا فسانہ فرمایا / آپ باتیں بہت بناتے ہیں

یہ بھی کوئی ہے طور رنجش کا / بات کرنے میں روٹھ جاتے ہیں

اس قدر یاس ہم کو ہے شب غم / کہ دعا سے بھی ہاتھ اُٹھاتے ہیں

دیکھتے ہیں ہم اُن کا وعدۂ حشر / صبر کرکے بھی آزماتے ہیں

سامنے ہر کسی کے رو رو کر
آپ دنیا کو ہم ہنساتے ہیں

نامہ بر کی عجیب حالت ہے
اُن کے آگے حواس جاتے ہیں

حشر ہوتی ہے بزمِ ناز اُن کی
بیٹھ کر فتنے وہ اُٹھاتے ہیں

دل میں ارمان چٹکیاں لے کر
یاد تیری ہمیں دلاتے ہیں

کس قیامت کے ہیں مرے نالے
سونے والوں کی نیند اُڑاتے ہیں

سو رہا ہوں دکھائیے جلوہ
مرنے والوں سے مُنھ چھپاتے ہیں

دل ملائیں تو کچھ مزہ آئے
ہم سے وہ ہاتھ کیا ملاتے ہیں

لے کے دل جان کی بھی خواہش ہے
آزما کر وہ آزماتے ہیں

شیخ صاحب ہیں رازدارِ مغاں
میکدے شب کو چھپ کے جاتے ہیں

آسماں کیوں ہمیں ستاتا ہے
جن کو شایاں ہے وہ ستاتے ہیں

میں دعائیں جب اُن کو دیتا ہوں
گالیاں دے کے مسکراتے ہیں

نئی دیکھی ہے یہ فراموشی
نام میرا وہ بھول جاتے ہیں

آ چلی آنسوؤں میں کچھ سُرخی
کچھ نہ کچھ اب یہ رنگ لاتے ہیں

اور تو کچھ اُنھیں نہیں آتا
ظلم کرتے ہیں قہر ڈھاتے ہیں

کشتۂ ناز ہیں کسی کے ہم
کب مسیحا کے دم میں آتے ہیں

عیش سے اتنی کب اُنھیں فرصت
کم نہیں یہ جو دل دُکھاتے ہیں

اب تو یا رب اثر زباں میں دے
دردِ دل اُن کو ہم سُناتے ہیں

اور کیا ہے مرے جلانے کو
بزم میں غیر کو بُلاتے ہیں

جب ہمارا اُنھیں یقین نہیں
ہو کے مجبور دل دکھاتے ہیں

تیرے کوچے میں ہم بھی او ظالم
اپنی ہستی مٹائے جاتے ہیں

ناز بردار اُن کے ہم بھی ہیں
ہم سے کیوں ہاتھ وہ اُٹھاتے ہیں

نامہ بر جلد آ خدا کے لیے
ہمنشیں جان کھائے جاتے ہیں

امتحاں ہے مری وفاؤں کا
کھینچ کر تیغ آزماتے ہیں

اپنی صورت کا ذکر کچھ بھی نہیں
میری حیرت پہ مُسکراتے ہیں

سُن کے آمد کسی کی خوش ہیں رسا
اب یہ جامہ میں کب سماتے ہیں

بنام خداوند جہاں آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی))

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

جلد ۴۳	مارچ و اپریل ۱۹۳۷ء	نمبر ۳ و ۴

فہرست مضامین

قیمت:- فی پرچہ ۵ روپیہ ۲ ر

نہیں ہے بلکہ ایسا انسان بنانا ہے جس کے اخلاق وخیالات پاکیزہ اور عادات منضبط ہوں۔ جس کو حق العباد اور حق اللہ کا پورا لحاظ ہو۔ جس میں ایثار کسر نفسی حب الوطنی کے جذبات بدرجہ اتم پائے جائیں۔ جس کا مذاق سلیم اور جو مرد میدان عمل ہو۔ جو انسان ان خصائل سے متصف ہوگا اُس میں ضوابط وقواعد کا احترام یعنے "ڈسپلن" خود بخود پیدا ہو جائے گا۔

گذشتہ زمانہ میں کتابی تعلیم اور ماحول کے اثرات متفق ہو کر ان نتائج کو فراہم کر دیتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کے جزو کو تعلیم۔ اور ماحول کے اثر کو تربیت کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے پرانا تمدن قریب قریب ضائع ہو گیا۔ دو چار نام لیوا جو اب تک باقی ہیں تھوڑے دنوں میں نظر سے اوجھل ہو جائیں گے۔

آج کل یہ امید کرنا کہ ہمارا پرانا تمدن اور موجودہ ماحول تعلیم کے اُس جزو کو جو تربیت کہلاتا ہے مرتب کر سکے گا ایک امید موہوم ہے۔ ماحول کی صورت بالکل بدل گئی ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ماحول کا انقلاب تمدن قومی پر بہت شدید اثر ڈالتا ہے اور اگر اُن حضرات نے جن پر قوم کو راہ راست پر چلانے اور اصلاح کرنے کا فرض عائد کیا گیا ہے توجہ نہ کی تو ساری قوم کا ڈھانچہ بدل جائے گا۔ گذشتہ ایک صدی کی مغربی تعلیم اور ماحول نے ہمارے نوجوانوں کے طرز خیال اور طریق ماندوبود میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ ان میں سے بیشتر کو پرانی تہذیب میں بجز عیوب کے کچھ اور نظر نہیں آتا۔

ماحول کے اعتبار سے یہ زمانہ بہت نازک تھا اور ہے۔ ماحول ابھی رہگذر انقلاب پر ہے اور قوم سازوں کا یہ فرض تھا اور ہے کہ اس کی رہنمائی ایسے طریقہ پر کریں کہ قومی تشکیل کی صورت اختیار کرلے۔ اب تک ہماری قوم کی رہنمائی کوتاہ بیں اور تنگ خیال حضرات کے ہاتھ میں رہی جن کا نصب العین محض اپنی قوم یا فرقہ کو ترقی کی منزل تک پہونچاتا رہا۔ ان حضرات نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جسے مصلحان مصر نے اپنی قوم کے لیے تجویز کر کے ملک میں نافذ کیا اور جس کی وجہ سے مصر میں فرقہ پروری کا مسئلہ پیدا نہ ہو سکا بلکہ مسلم وعیسائی جو وہاں آباد ہیں وہ اپنے ملک کی خدمت کرنے میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جانا چاہتے ہیں اُن کا مرکزی خیال اور نصب العین صرف مادر وطن کی خدمت کرنا ہے۔ جس پر ہزاروں جانیں وہ اب تک قربان کر چکے ہیں اور الحمد للہ کہ اُن کا نصب العین ایک حد تک احاطہ امکان میں آگیا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ہاں کے رہنماؤں اور لیڈروں نے وطن کے مفاد کو پس پشت ڈال دیا فرقہ پروری کے جذبات کو غیر معمولی طریقہ پر اکسانا شروع کیا جس کا نتیجہ ہم لوگ بھگت

رہے ہیں اور اگر قانون قدرت نے امداد نہ کی تو آئندہ نسلیں بھی برداشت کریں گی۔

موجودہ نسل سے یہ امید کم کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات و طرز عمل میں ترمیم کرے۔ ہماری دعا کارکنان قضا و قدر کی بارگاہ میں یہ ہے کہ موجودہ لیڈر۔ خود بیگانگی۔ نفاق۔ تعصب خود غرضی وغیرہ کے زہریلے جراثیم مادر وطن کی فضا میں بو رہے ہیں وہ بار آور نہ ہوں اور اُن کی قابل نفرین کوششیں دیرپا اثر ہمارے وطن کی فضا میں نہ چھوڑیں تاکہ آئندہ نسل کے سچے قوم سازوں کو تشکیل قومی میں دقت نہ اُٹھانا پڑے۔

ناظرین سے عذر خواہ ہوں کہ میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ یہ جرم میرے جذبات کا ہے جنھوں نے مضمون زیر بحث سے مجھے الگ کر دیا۔

میں موجودہ ماحول کے متعلق عرض کر رہا تھا ابھی تک ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی ماحول نے کوئی خاص مستقل صورت اختیار نہیں کی ہے اس وجہ سے نونہالان قوم کی صحیح تربیت کے متعلق ماحول سے امید رکھنا فضول ہے۔ لہٰذا وہ خصائل بھی جو ماحول کی آغوش میں پرورش پاتے تھے تعلیم ہی کے ذریعہ سے حاصل ہونا چاہییں۔ اس وجہ سے اب تعلیم کا دائرہ عمل بہت وسیع ہو گیا ہے چنانچہ ہندوستان میں حقیقی ضرورت ایسے تشکیل قومی تعلیمی اداروں کی اتنی زیادہ ہے کہ کسی اور دوسری قوم میں نہ ہو گی۔ ان اداروں میں اس قسم کا ماحول فراہم ہونا چاہیے کہ جن میں بچہ مکمل انسان بن سکے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ محض لکھنے پڑھنے کی قابلیت بچہ کو مکمل انسان نہیں بنا سکتی۔ راقم حروف بلا مبالغہ سینکڑوں ایسی مثالیں پیش کر سکتا ہے کہ بی اے ایم اے وغیرہ کی ڈگریاں انسان بنانے میں بالکل بے اثر ثابت ہوئیں اور زندگی کی کشمکش میں معذور رہا۔ سب ڈگری فرد معطل اور قوم اور خاندان پر بار بن گئے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ حالت میں جہاں جذبات قومی اور سچی حب الوطنی بالکل مفقود ہے اور اُن کی جگہ جذبات فرقہ پروری، فرقہ بندی، خود غرضی اور تعصب نے غصب کر لی ہے۔ ہندوستانی قوم کی ارتقا کا مسئلہ محض علمی بحث سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اس مسئلہ پر فرصت نے اگر مساعدت کی تو آئندہ موقع پر غور کیا جائے گا۔

اس مضمون میں مسلمانوں کی موجودہ حالت اور طریقہ تعلیم و تربیت پر غور و بحث مقصود ہے۔ مسلمانوں کی حالت موجودہ کے متعلق زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہر مسلم و غیر مسلم اس کو بخوبی جانتا ہے کہ موجودہ حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ جن اسباب نے اسلامی تمدن کو برباد کر کے مسلمانوں کو سلطنت سے محروم کر دیا وہ اب تک کارفرما ہیں۔ جو رہی سہی وقعت اسلاف کے کارناموں کی وجہ سے

مسلمانوں کے نام کے ساتھ وابستہ ہے وہ بھی روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔ اگر مسلمانوں کی اقتصادی معاشرتی اور مالی حالت کا جو ساٹھ سال قبل تھی آج کی حالت سے مقابلہ کیا جائے تو آسمان و زمین کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ حکومت و سلطنت کے بگڑنے کے بعد بھی اتنی خوشحالی تھی کہ اگر صرف قائم ہی رکھی جاتی تو افلاس کا جو رونا آج کل ہے اُس کا کوئی موقع نہ ہوتا۔ بلامبالغہ ثروت و خوشحالی میں متذکرہ بالا میعاد کے اندر اسّی فی صدی کی کمی ہو گئی ہے۔ بڑے بڑے امرا اور اراکین سلطنت کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے اور اُن کے پسماندگان آج کل فاقہ کشی کی مصیبت میں گرفتار رہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ انتزاع سلطنت کے بعد مفتوح قوم کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ لیکن اول تو اتنی خراب نہیں ہوتی جتنی کہ ہماری ہوئی۔ ثانیاً ہندوستان کے اُن صوبوں میں جہاں بفضلہ ملکی انتظام و سلطنت قائم ہے اور جہاں نوابان و راجگان حکمراں ہیں وہاں بھی مسلمانوں میں افلاس کی ترقی کی شرح بالکل اتنی ہی ہے جتنی برطانوی ہند میں اس بدیہی واقعہ کو پیش رکھنے کے بعد ہر اُس شخص پر جو قوم کی ہمدردی کا دم بھرتا اور اصلاح کی کوشش و فکر کر رہا ہے یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے تمدن میں اُس نقص کو معلوم کرے جس کی بنا پر اُن میں سے نہ صرف وہ خصائل جاتے رہے جو جاہ و ثروت کی فراہمی کے لیے ضروری تھے بلکہ وہ اُن عادات سے بھی محروم ہو گئے جو دولت و ثروت و خوشحالی کو محفوظ رکھنے اور اُن کے قیام و استقلال کے لیے لابدی ہیں۔

اس نقص و عیب کے معلوم کر لینے کے بعد ہر دردمند مصلح قوم کا فرض ہوگا کہ اُن کے استیصال و اصلاح کی کوشش کرے اور وہ زہریلے جراثیم جو اب تک قوم کو قعر ذلت کی سمت گھسیٹے لیے جاتے ہیں اُن کا انسداد کرے۔ بغیر مرض کی تشخیص کیے ہوئے صحیح علاج ہونا غیر ممکن ہے۔ یہ امید کرنا کہ ہیضہ یا پلیگ کا مریض محض ٹانک اور قوت بخش دوا سے صحتیاب ہو جائے گا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو کوئی تجربہ بھی قبول نہیں کر سکتا۔

ارباب نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ جن مسلمانوں نے اسلامی حکومت و اقتدار کو مٹی دی اُن میں انفرادیت کے جذبات کی فراوانی اور قومی خیالات و جذبات کا فقدان تھا۔ وہ ہر فعل کو اپنی ذاتی اور اپنے اعزہ و احباب کے مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھتے اور ریاست یا قوم کے مفاد کو پس پشت ڈال دیتے تھے۔ اودھ کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے جب کوئی امیر وزیر اعظم ہو گیا تو سب سے پہلے بڑے بڑے عہدے اعزہ کے سپرد کیے گئے۔ اُن کے بعد احباب کی نوبت آئی اور آخر میں وہ اشخاص جن سے امداد کی امید ہوتی تھی نوازے گئے۔ اس کا مطلق خیال نہ ہوتا تھا کہ جو حضرات مقرر کیے گئے

ہیں وہ کام کے بھی اہل ہیں یا نہیں۔ اس طریقِ عمل کا لازمی نتیجہ پارٹی بندی تھا جس نے لکھنؤ اور دہلی کی سلطنتوں کو برباد کر دیا۔ لہذا سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں سے جذبۂ انفرادیت و خود غرضی کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے اور اُن کی جگہ پر ایثار، حمیت قوم اور حب الوطنی کے جذبات برانگیختہ کیے جائیں۔ جن تدابیر سے یہ مقصود فراہم ہو سکتا ہے اُن کو معلوم کرنا اور عملی جامہ پہنانا قوم سازوں کا فرض ہے۔ اس موقع پر تمثیلاً ہم یہ عرض کر دینا بے محل نہیں سمجھتے کہ ہٹلر، مسولینی اور کمال پاشا اتاترک جن کے قوم ساز ہونے میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا انھوں نے انواع و اقسام کے طریقے بچوں میں قومیت۔ حب الوطنی۔ راست خیالی پیدا کرنے کے اختیار کیے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا ضروری جزو انواع و اقسام کے تہواروں سے بچوں میں اُن جذبات کا برانگیختہ کرنا قرار دیا ہے جن سے قومی عزت۔ قومی وقار۔ ایثار۔ قومی خودداری اور حب الوطنی کے خیالات کو فروغ ہو۔ اس نتیجہ کو مرتب کرنے کی غرض سے اُن کے ماحول میں نمایاں تغیر کر دیا ہے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے قوم ساز بھی ان حضرات کی مثال کو پیش نظر رکھ کر عمل فرمائیں۔

دوسری اہم وجہ مسلمانوں کے انحطاط کی جنسی جذبات کی بے ترتیبی اور بے ضابطگی ہے جس کی وجہ سے مسلم نوجوانوں کے خیالات بیشتر اوقات انھی جذبات میں منہمک رہتے ہیں اور وقت عزیز نیک نامی۔ قوتِ عمل۔ خوش حالی۔ انسانیت غرضکہ سب کچھ ان جذبات پر قربان کر دیے جاتے ہیں۔ مرورِ ایام و قانونِ فطرت جب ان جذبات میں کمزوری اور ان کے غلو میں کمی پیدا کرتا ہے اس وقت ہمارا شباب زدہ نوجوان بالکل پست ہمت مفلوج العمل اور خراب عادات و خصائل میں گرفتار نظر آتا ہے۔ جو قوم کی امداد کرنا تو درکنار اپنی زندگی کو بھی اچھی طرح نہیں گذار سکتا۔ دائمی عمر میں جنسی جذبات کی گرفتاری اُن کو دنیا کے کسی کام کا نہیں رکھتی۔

جنسی جذبات ہر قوم کے نوجوانوں میں ہوتے ہیں پھر مسلمانوں کے لیے کیا تخصیص ہے اور ان میں انھوں نے ایسی برباد کن صورت کیوں اختیار کر لی ہے اس کا جواب اس ماحول کی خرابی ہے جس میں ہمارے نوجوان نمود بالیدگی کے منازل طے کرتے ہیں۔

یہ جواب کسی قدر مجمل ہے لیکن اس کی تفصیل کے متعلق یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سوسائٹی کو بحث کی اغراض کی خاطر مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے مالدار و نادار۔ امیر و فقیر۔ متمول و مفلس۔ بندہ و آقا سب کا ایک ہی رتبہ رکھا ہے اور قرن اولیٰ میں اسلامی ماحول ہر مسلمان کے لیے یکساں تھا۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اور ہمارے موجودہ

حالات و تمدن کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ عرض کرنا غلط نہیں کہ مسلمانوں میں بھی مرور ایام نے طبقات پیدا کر دیے ہیں۔ اور ہر طبقہ کا ماحول مختلف و جداگانہ ہے۔ چنانچہ اُس کے پاک و صاف کرنے کی تدابیر بھی مختلف ہوں گی۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سوسائٹی کو حسب ذیل طبقات میں تقسیم کیا جائے۔

۱۔ طبقہ والیان ملک ۲۔ طبقہ امرا و روسا

۳۔ طبقہ متوسط یا متوسط الحال ۴۔ طبقہ عوام

(۱) جس ماحول میں والیان ملک اور اُن کے قریبی عزیزوں کے بچے پرورش پاتے ہیں وہ اپنی نوعیت میں خاص اور دیگر طبقات کے ماحول سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جس وقت سے بچے کے حواس اُس کے قابو میں آتے ہیں حضور و سرکار کی صداؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں سنتا۔ اُس کی ہر خواہش عام اس سے کہ کسی قسم کی ہو پوری کی جاتی ہے۔ والدین کے فطرتی جذبات محبت تو درکنار جو لوگ بچے کے گرد و پیش ہوتے ہیں وہ اپنے ذاتی مفاد موجودہ و آئندہ کو مد نظر رکھ کر عمل کرتے ہیں اس کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ اُن کا اہم فرض ایسے بچہ کی پرورش و تربیت ہے جس کے کندھوں پر ایک ملک کے انتظام کا بار ہوگا۔ ہمارے ملک میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً نہ والدین کو اس کا احساس ہے اور نہ بچہ کے حوارئین کو۔ بچہ کی خدمت پر جو ملازمین مقرر کیے جاتے ہیں اُن میں بیشتر تعداد جہلا کی ہوتی ہے۔ جن کے متعلق کوئی تحقیقات چال چلن کی نہیں کی جاتی حالانکہ یہ بہت آسانی سے ممکن ہے کہ تعلیم یافتہ اور خوش چلن ملازمین رکھے جائیں۔ تاکہ بُرے خیالات سے بچے بچیں اور اچھے ماحول میں پرورش پائے اس بے احتیاطی کے نتائج کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ آنکھ کھول کر اپنے گرد دیکھیے۔ تملق۔ چاپلوسی۔ بے محل تعریف اور ہر وقت کی خوشامد سے ایک ایسا غیر فطرتی اور مصنوعی ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو بچہ کی فطرتی نمو د بالیدگی میں سدراہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عموماً مسلمان رئیس کا بچہ گدی پر بیٹھتے ہی اتنا بدل جاتا ہے کہ اُس کا بہی خواہ ناخوش رہتا ہے۔ یہ بدنصیبی نو زائیدہ نہیں ہے۔ بلکہ زمانہ انحطاط کے ہر دور میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ جنہوں نے اس بدنصیب ملک پر ایک صدی سے زائد کا عرصہ ہوا کہ سلطنت کی تھی شاہزادگی کی حالت میں شائستگی۔ متانت۔ سمجھداری اور نیک چلنی کے لیے مشہور تھے۔ چنانچہ کئی معتدد انگریزوں نے جو اُن سے ملے تھے اُن کے متعلق تحریر کیا ہے کہ ایسا باتمیز۔ مہذب۔ سمجھدار اور خوش اخلاق شاہزادہ اُن کی نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن جب عنان سلطنت ہاتھ میں آئی تو خدا جانے

کیوں کا یا پلٹ ہو گیا۔ ساری امیدیں جو اُن کی ذات سے وابستہ تھیں یکایک خاک میں مل گئیں۔ بادشاہی کے دوران میں جو انگریز اُن سے ملے اُن کی متفقہ رائے ہے کہ اودھ کے حکمرانوں میں سے جنھوں نے سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا ان حضرت کا نمبر اول ہے۔ اُن کی خرابی کی اصلی بنا جنسی جذبات کی بے ضابطگی تھی۔ دربار اندر کا اکھاڑہ تھا۔ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ گذرتا تھا کہ گندے خیالات۔ گندے حرکات میں انہماک نہ ہو۔ دنیا کی شرم۔ رائے عامہ کا لحاظ مذہب کی پابندیاں بالائے طاق رکھ دی گئی تھیں۔ ملک کے انتظام یا بہبودِ رعیت و قوم کے فلاح کے تذکرے کی گنجائش اُن کی محفل میں نہ تھی۔ یہ نتیجہ اُس گندے ماحول کا تھا جس میں اُنھوں نے پرورش پائی تھی اور جس نے اُن کو مجبور کیا کہ اُسی قسم کے حوارئین اپنے اردگرد رکھیں۔ خراب صحبت کا اثر روز بروز زیادہ ہو گیا اور بالآخر وہ صورت پیدا ہوئی جس کا لازمی نتیجہ بربادی تھا۔ کمینے۔ خود غرض۔ آبرو باختہ مصاحبین اور حوارئین نے نہ صرف سلطنت برباد کی بلکہ دائمی بدنامی کا طرہ امتیاز بادشاہ کے سر پر رکھدیا اور بالآخر زہر پلا کر جان لے لی۔

لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ آئندہ مالک تخت و تاج کے ملازمین۔ معلمین اور مصاحبین ایسے ہوں جو بچے کے اردگرد پاکیزہ ماحول اور فضا قائم رکھیں۔ کچھ عرصہ تک اس فضا اور ماحول کے قائم رہنے سے بچہ کی طبیعت میں خود بخود بہودگی اور رکیک الحرکاتی سے تنفر پیدا ہو جائے گا۔ اور امتیاز نیک و بد جبلّی خاصیت بن جائے گا۔

علاوہ بریں یہ امر بھی مدنظر رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان اب تک ملوکیت پرست ہے۔ جمہوریت کی وارنش بالکل سطحی ہے۔ تھوڑی سی رگڑ سے یہ وارنش غائب ہو جاتی ہے۔ نواب راجہ حقیقتاً ظل اللہ خیال کیے جاتے ہیں۔ اگر وہ ذرا سی توجہ فرمائیں اور بدچلن حضرات کی سرزنش کر دیں تو اُن کی مملکت کا ماحول گندگی سے ایسی قلیل مدت میں پاک و صاف ہو جائے جس کی واعظ و مسلمان قوم مدت العمر کی محنت کے بعد بھی امید نہیں کر سکتے۔ لیکن اُن ممالک کی بدنصیبی کا کیا تذکرہ جہاں مالک و رئیس خود جنسی جذبات کی خوش فعلیوں میں مصروف ہو اور اپنے حوارئین میں اُن کو جائز رکھے۔ وہاں کی فضا اور ماحول بد سے بدتر ہو جائے گی۔

اس موقع پر تمثیلاً ایک واقعہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ مرحوم اعلیٰحضرت نظام حیدرآباد نہایت درجہ خوش پوشاک تھے اور اپنے حوارئین کو بھی زرق برق پوشاک پہنے دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اچھے اور قیمتی کپڑے پہننے کا شوق حیدرآباد میں اتنا زیادہ رائج ہو گیا کہ مشکل سے کوئی رئیس اُس زمانہ میں ایسا تھا کہ جس پر درزیوں اور بزازوں کا قرضہ نہ ہو۔ یہ مذموم حالت روز بروز ترقی

کرتی جاتی تھی اور شدید پیچیدگیوں کا باعث بن گئی۔ موجودہ اعلیٰحضرت نے بکمال فراست اسکو محسوس فرمایا اور انسداد شروع کردیا۔ خود نہایت سادے کپڑے پہننا شروع کردیے اور دوچار موقعوں پر بھڑکیلے کپڑوں کے خلاف رائے ظاہر کردی۔ بس اتنا کافی تھا۔ فیشن بدل گیا اور سادے سستے اور صاف کپڑوں کا دور شروع ہوگیا۔ دو ہی سال کے اندر بڑے بڑے درزیوں نے دکانیں بند کردیں اور حیدرآباد چھوڑ دیا۔ مقروض ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ مفقود ہوگئی۔ رئیس کی ذراسی توجہ سے مشکل سے مشکل اصلاح بہت آسانی سے عوام و رعایا کے عادات میں کی جاسکتی ہے۔ صرف رئیس کو نقائص کا احساس اور شوق اصلاح ہونا چاہیے۔

(۲) طبقہ امرا اور روسا۔ جس ماحول میں ان حضرات کے بچے پرورش پاتے ہیں وہ بعض تفصیلی اجزا میں طبقہ اول کے مشابہ ہے اور بہت کچھ جو طبقہ اول کے متعلق عرض کیا جاچکا ہے اُن پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

اس طبقہ کے نسبوں پر جاہ دیرینہ اور ثروت پارینہ کا اب تک اثر باقی ہے اور مختلف صورتوں میں رونما ہوتا ہے باوجودیکہ نہ اُس خودسری اور نازک مزاجی کی گنجائش ہے نہ موقع۔ راقم حروف کے چند احباب ایک پرانے خاندان کے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اُن کو ایک عام جلسہ میں شرکت کے لیے مدعو کریں۔ نواب صاحب نے استدعا سنکر فرمایا کہ آپ ہم لوگوں کو مدعو کرنے تو تشریف لائے ہیں لیکن یہ فرمائیے کہ آپ نے ہمارے لیے نشست کا کیا انتظام کیا ہے۔ وفد میں ایک صاحب منچلے تھے جواب میں عرض کیا کہ اب تک تو یہ انتظام تھا کہ ڈائس پر یعنی اُس مرتفع مقام پر جہاں صدر مجلس بیٹھتا ہے، آپ لوگوں کے لیے جگہ مقرر تھی۔ لیکن اگر یہ ناپسند ہو تو اُس سے بھی بلند مقام تیار کرواکر سیڑھیاں لگادی جائیں گی۔ نواب صاحب کو جائے نشست کے متعلق اطمینان نہ ہوا اور جلسہ میں شرکت نہ کی۔ جن اسباب نے اسلامی تمدن کو ماؤف اور اسلامی سلطنت کو برباد کردیا وہ اب تک اس طبقہ میں کم و بیش کارفرما نظر آتے ہیں۔ رئیس یا بزرگ خاندان اپنے کو بیشتر اوقات قوانین اخلاق و شرم سے بالاتر سمجھتے ہیں اور تعیش و تن آسانی کو نصب العین زندگی قرار دے کر نہایت انہماک، یکسوئی اور فراخدلی سے بلا لحاظ بدنامی دُنیوی و بازپرس اُخروی مذموم و مشتبہ اشغال میں مصروف رہتے ہیں۔ مدت العمر کی اخلاقی بدنظمی سے رئیس صاحب کے دل میں ایک قسم کی رواداری و دلچسپی بدچلنی کے ساتھ پیدا ہوجاتی ہے۔ لہذا اگر اُن کے بچوں یا حوارین میں سے کوئی شخص کوئی حرکت ناشائستہ جنسی جذبات سے متاثر ہوکر کربیٹھتا ہے تو وہ باعث تفریح

ہوتا ہے اور "اقتضائے بشریت" پر محمول کرکے اس کی دلدہی اور امداد کرتے ہیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ ماحول کی گندگی ہے۔

ایسی مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں کہ پدر بزرگوار نے اپنے نوخیز بچے کی دلچسپی و تفریح کے لیے نہایت خوش رو طوائف نوکر رکھ دی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنے بدچلنی کے سبق اوائل عمر میں سیکھنے کے بعد نواب زادے صاحب درجہ بدرجہ ترقی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جب گدی نشینی کا وقت آیا تو فن عیاشی میں کامل ہو چکے تھے۔ خود مختاری ملنے پر ایسی مہارت دکھلائی کہ باید و شاید۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خاندانی جائداد تباہ و برباد کر دی۔ ہمارے تمدن و ماحول کو بد سے بدتر بنانے اور جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے میں رؤسا اور امرا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ باوجودیکہ ان کی جنسی بے ضابطگی صرف اُن کے طبقے اور خاندان کی فضا نہیں برباد کرتی بلکہ ساری قوم پر اثر ڈالتی ہے۔ بدترین اثر اُن کے بچوں کی عادات و اطوار پر پڑتا ہے اور بالآخر خاندان کی بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن اب تک امرا میں اس کا پورا احساس نہیں پیدا ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے ہر ملک کے خوشحال طبقہ میں جنسی جذبات کی خوش فعلیاں کم و بیش نظر آتی ہیں لیکن ہمارے یہاں کی طرح اُن پر جواز کی مہر نہیں لگائی جاتی۔ اور ایسی بے حجابی سے دوسری اقوام کے نوجوان رئیس اس میں گرفتار نہیں پائے جاتے۔ اس کی وجہ وہی گندہ ماحول ہے جس میں ان کی نشوونما ہوتی ہے۔ اگر شروع عمر سے اُن کے ماحول کی تشریح کی جائے تو صاف طور پر ظاہر ہو جائے گا کہ بزرگوں اور بزرگ خاندان کی جنسی بے ضابطگی نے اُن کے لیے ایسی فضا مہیا کر دی تھی کہ جنسی خوش فعلیوں کو نصب العین زندگی سمجھنے لگے۔ اس خیال میں جو کچھ خامی تھی اُس کو جاہل اور بدچلن ملازموں نے رفع کر دیا۔ راقم حروف ایسی مثالیں بتلا سکتا ہے کہ ۹-۱۰ سال کے رئیس زادے کو سوزاک کی مہلک بیماری ہو گئی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ملازم جو بچہ کی خدمت پر مامور تھا بے حد بدچلن اور اس مرض میں گرفتار تھا جس سے بچہ پر اثر پڑا۔ ایسے واقعات بھی پیش نظر ہیں کہ ملازمین نے بچہ کو شراب پینا اور دیگر افعال شنیعہ سکھلائے۔ ان واقعات کے لحاظ سے اس کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ جو ملازمین۔ اتالیق یا مصاحب بچہ کی نگرانی۔ پرورش و تعلیم کے لیے مقرر کیے جائیں اُن کے چال چلن کے متعلق پوری تحقیقات کر لی جائے۔

درحقیقت مسلمانوں میں انحطاط شروع ہونے کا باعث بچوں کی تعلیم و پرورش سے

بے التفاتی و بے رخی ہے۔ اس بے رخی نے ایسا گروہ معلموں کا پیدا کر دیا جو عملی دنیا سے الگ محض کتابی نظریوں اور اصولوں کو رٹاتا رہا۔ بزرگ بھی محض لکھنے پڑھنے کی قابلیت کو اصل منشاء تعلیم سمجھتے رہے۔ اور چال چلن اور قوت عمل کی اصلاح کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے آخری زمانہ میں امرا اور ارکان سلطنت جن پر مدار استحکام و قیام سلطنت ہوتا ہے اُن میں مالک تخت و تاج سے زیادہ عیوب و نقائص تھے۔ تقریباً ایک صدی کی طویل مدت میں جو حکومت مغلیہ کے برباد ہونے میں لگی۔ طبقہ اراکین و امرا میں کوئی ایسا شخص نہ پیدا ہوا جو اوراق سلطنت کے انتشار کو روک سکے۔

لہذا اب جو امرا اور رؤسا باقی رہ گئے ہیں اُن پر فرض ہے کہ اپنے زاویہ نگاہ کو بدلیں۔ اور اپنے طرز زندگی کو ننگ و نام خاندان۔ بہبودی اسلام اور محبت وطن کی خاطر بالکل بدل دیں اپنے چال چلن کی اصلاح کریں۔ اگر یہ ناممکن ہو تو بچوں کو کسی سکونتی ادارے میں تعلیم کی غرض سے داخل کر دیں تاکہ وہ گھر کے گندہ ماحول سے بچیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کافی ہے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ والدین اپنے بچوں کی تعلیم و ترقی سے ہر وقت واقف رہیں۔ اُس میں دلچسپی لیں اور وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ہدایات بھی معلمین کو دیتے رہیں۔ اگر اس پر عمل کیا گیا تو انشاءاللہ بہت جلد حالت روباصلاح ہو جائے گی۔

(۳) متوسط الحال طبقہ۔ حکمائے سیاسیات و اقتصادیات نے جسد قومی میں اس طبقہ کو اُتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی کہ صُلب یا ریڑھ کی ہڈی کو اطبا جسم انسانی میں دیتے ہیں۔ اس طبقہ پر حقیقتاً قوم کی بقا اور سلطنت کا انحصار ہوتا ہے۔ جب تک اس طبقہ میں راست خیالی۔ دیانت اور قوت عمل باقی رہتی ہے قوم و تمدن کا شیرازہ بکھرنے نہیں پاتا اور سلطنت و وقار قومی قائم رہتا ہے۔ لیکن جب اس طبقہ میں بے ایمانی۔ خود غرضی۔ دغا بازی پھیل جاتی ہے اور قوت عمل معطل ہو جاتی ہے اُس وقت انحطاط قومی شروع ہو جاتا ہے۔ اس طبقہ کی خرابی اسلامی تمدن اور اسلامی سلطنت کی بربادی کی ذمہ دار ہے۔ معلمان قوم کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کی جانب پوری توجہ فرمائیں۔

قبل اس کے کہ اصلاح کی جانب قدم بڑھایا جائے یہ ضروری ہے کہ اُن عیوب و نقائص کو معلوم کر لیا جائے جو اس طبقہ میں جاری و ساری ہیں۔

ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ اس طبقہ کے افراد میں بھی انفرادیت کا غلبہ۔ سرکشی اور

بدنظمی کا دور دورہ ۔ جنسی جذبات کی بے ترتیبی ۔ قوت عمل کا فقدان ۔ حق العباد اور حق اللہ کے احترام سے بیگانگی ہے ۔

انفرادیت کا ایک پہلو خود غرضی ہے ۔ ہر شخص اپنے مفاد اور ذاتی اغراض کو ہر معاملہ میں پیش نظر رکھتا اور ملکی ۔ قومی اور مذہبی نقطہ نظر کو پس پشت ڈال دیتا ہے ۔ ہر قدم پر اہل نظر کو اس کا ثبوت ملتا ہے ۔ تمثیلاً ہم اوقاف کے انتظام کا حوالہ دیتے ہیں اس وجہ سے کہ یہ اسی طبقہ کے سپرد ہیں ۔ مشکل سے کوئی موقوفہ جائداد ایسی ملے گی جس کا انتظام دیانت کے ساتھ ہوتا ہو اور متنظمین میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو ۔ صرف شہر لکھنؤ میں چھوٹے اور بڑے اوقاف کی تعداد قریب قریب ایک سو کے ہے ۔ راقم حروف کو فرائض منصبی کی انجام دہی میں ان کے حسابات دیکھنے کا موقع ملا ۔ حالات ناگفتہ بہ نظر آئے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر متنظمین کو اپنی ذمہ داری کا احساس باقی نہیں رہا ہے ۔ بڑے بڑے اوقاف کی جانب نظر کیجئے تو ایک عبرتناک منظر دکھلائی دیتا ہے ۔ بہرائچ میں سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور موقوفہ جائداد کی بدنظمی گذشتہ زمانہ میں اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ سید سالار مرحوم کا کلام مجید اور تبرکات بنیوں اور مہاجنوں کے یہاں رہن تھے ۔ خدا سرکار دولتمدار کا بھلا کرے کہ واقعات معلوم ہونے پر ایک مسلمانوں کی کمیٹی قائم کر دی جس نے بہ نگرانی افسران سرکاری کچھ روز تک اچھا کام کیا اور مزار شریف ۔ جائداد موقوفہ اور ہسپتال وغیرہ جو مزار شریف سے متعلق تھے بہت کچھ درست ہو گئے ۔ لیکن خود غرضی نے اب پھر رنگ دکھلانا شروع کر دیا ہے ۔ ممبروں میں پارٹی بندی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے لڑائی جھگڑا ۔ جوتی بیزار جاری تھی ۔ ممکن ہے اس سال ڈیڑھ سال میں کچھ اصلاح ہو گئی ہو ۔

اسی طرح اجمیر شریف میں خواجہ غریب نواز کی درگاہ شریف میں جو اختلافات و بدانتظامیاں ہیں وہ محتاج بیان نہیں ۔ وقس علٰے ہذا ۔

انفرادیت کے دوسرے پہلو نے مسلمانوں میں عجیب و غریب صورت اختیار کی ہے یعنے ہر شخص اپنے کو سقراط دوراں اور بقراط زماں سمجھتا ہے ۔ اپنی رائے کے سامنے دوسرے کی رائے کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا ۔ بلکہ برداشت نہیں کر سکتا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہمی مشورہ و مصالحت کے ساتھ چار آدمی مشکل سے کام کر سکتے ہیں ۔ ہر اسلامی ادارے میں لڑائی اور اختلاف ہونا ضروری ہے ۔ اس کی بنا محض ہٹ دھرمی پر ہے ۔ احترام ضوابط (Discipline

ہمارے احساس واعمال سے مفقود ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے عمل مشترک قریب قریب غیر ممکن ہے۔ ہر فرد ہر وقت اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا ہے اور کسی دوسرے کی رہنمائی منظور نہیں کرتا خواہ وہ کتنا ہی نیک طینت۔ ہوشیار۔ متدین اور جلیل القدر بزرگ کیوں نہ ہو۔ چند بصرین کی رسائے ہے کہ یہ سرکشی (Indiscipline) مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا باعث ہوئی اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظریہ ایک حد تک درست ہے۔ آئندہ نظام تعلیم و تربیت میں اس کی نہایت شدید ضرورت ہے کہ احترام ضوابط (یعنے Discipline ڈسپلن) کا احساس بچوں میں پیدا کیا جائے۔ اس صفت کے عادت میں داخل ہو جانے سے ان کے ذاتی اعمال بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ اور چال چلن پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔

جنسی جذبات کی بدنظمی اس طبقہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کا انسداد بہت زیادہ ضروری ہے۔ موجودہ صورت حال میں جب تک کہ والدین اور بچوں کے سرپرست معلموں کا ہاتھ نہ بٹائیں گے اصلاح بہت دشوار ہے۔ سب سے پہلے بزرگ خاندان کا فرض ہے کہ گھر کی فضا کو درست کریں کیونکہ سکونتی اداروں کی کمی اور بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کا شوق اس کا ذمہ دار ہے کہ بہت کم تعداد بچوں کی بورڈنگ ہاوس یا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ کثیر التعداد طلبہ چند گھنٹے اسکول میں صرف کرنے کے بعد بقیہ وقت گھر میں والدین اور بزرگوں کے ساتھ گذارتے ہیں۔ اگر گھر کا ماحول گندہ ہے تو اُس کا دیرپا اثر اُن پر پڑ جاتا ہے جس سے مدت العمر نجات نہیں ہوتی۔

مغربی ممالک میں مستطیع خاندانوں کے بچے عموماً سکونتی اداروں میں پرورش پاتے ہیں۔ جہاں کی فضا اور ماحول گندگی سے عملاً پاک و صاف کی جاتی ہے۔ والدین کی خراب عادات کا اثر بچوں پر نہیں پڑنے پاتا۔

مسلمانوں میں سب سے زیادہ کمی آج کل قوت عمل کی ہے۔ سوچتے بہت کچھ ہیں لیکن کر کچھ نہیں سکتے۔ خیالات اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا بھول گئے۔ درحقیقت خیالات و عمل میں اتصال باقی نہیں رہا۔ راقم حروف کو کئی ایسے ذی علم اور ذی حیثیت حضرات سے بحث و گفتگو کا موقع ملا جو اہم مسائل اور علے الخصوص انتظامی معاملات میں ایسے واقف کار نظر آئے کہ باید و شاید۔ کوئی شخص ان کی نظر یوں۔ وسعت خیالات باریک بینی اور ذہانت کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان ہی حضرات کے ذاتی معاملات کی بدانتظامی وابتری ہر شخص کو حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اس نفاق و دو رنگی کا سبب دریافت کرنا مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بے عملی ایک

حد تک زمانہ انحطاط کے مورثوں سے ترکہ میں ملی ہے۔ اس کی بڑی ذمہ داری مروجہ لٹریچر پر بھی ہے
اُس زمانے کو بہت دن نہیں گذرے کہ جب بچہ پڑھنے کے قابل ہوجاتا تھا تو بیشتر اوقات
طلسم ہوشربا۔ بوستان خیال وغیرہ پر وقت صرف کرتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اپنے ارادوں
اور امیدوں کی فراہمی میں فوق العادات واقعات کا متمنی رہتا تھا۔ اور قوت عمل کمزور اور ماؤف
ہوجاتی تھی۔ اُس کا بہت کچھ اثر اب تک باقی ہے۔ بے عملی ہماری فطرت ثانیہ ہوگئی ہے اور
باوجود اتنی مدت کی مغربی تعلیم کے ہم اب تک اصلاح نہیں کرسکے۔ مسلمان قوم کا فرض ہے کہ اس جانب
خاص توجہ فرمائیں اور بچوں میں مناسب تدابیر سے عادت عمل پیدا کریں کیونکہ بغیر اس کے قومی ترقی محال
ہے۔ اس سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کرسکتا کہ ہم لوگوں میں حق العباد اور حق اللہ دونوں سے بیگانگی
ہے۔ انفرادیت اور خودغرضی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ حق العباد کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ ہر
شخص اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور اُسی کی قربانگاہ پر دوسروں کے حقوق کو بلا تکلف قربان
کرتا ہے۔ قومی خدمات اُسی وقت تک قابل توجہ ہوتی ہیں جب تک کہ کوئی ذاتی غرض اُن سے
وابستہ ہوتی ہے۔

خودغرضی نفاق کی جڑ ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں میں مل جُل کر کام کرنا غیر ممکن ہوگیا ہے۔
ہر ایسے کام میں جس میں باہمی مشورہ کی ضرورت ہو اختلاف و نفاق ہونا ضروری ہے۔ یعنے مذہبی
سیاسی۔ قومی۔ ملکی۔ معاشرتی کوئی مسئلہ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

ذرا سے غور پر ارباب نظر کو ذاتی غرض کا ہیولیٰ اختلاف و نفاق کے پس پشت دکھلائی دے گا۔
لہذا قوم سازوں کا فرض ہے کہ خودغرضی کے خیال کو بچوں کی ذہنیت سے جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیں
اور اُسی جگہ پر ایثار۔ خدمت الناس اور راست خیالی کے بیج بودیں تاکہ یہ مرض آئندہ نسلوں میں
نہ پھیلنے پائے۔

خدمت الناس کو افضل الاشغال بتلایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس دل میں خدمت
خلق کا جذبہ اور شوق ہوتا ہے اُسے حق اللہ کی ادائگی میں کوئی دقت نہیں واقع ہوتی۔

موجودہ تعلیم نے ہم لوگوں کو ایک حد تک حق اللہ کے خیال سے علیحدہ کردیا ہے۔ اور یہ بغاوت
ہماری اخلاقی بدنظمی کی بنا ہے۔

تعلیمی اداروں کے منتظمین اور معلمین کا فرض ہے کہ اس نقص کو رفع کریں۔ جذبۂ اطاعت خدا
بچوں میں پیدا کردینے سے موجودہ بے اتفاقی کا انسداد ہوجائے گا۔ جن عملی تدابیر سے یہ تعمیر

فراہم ہو سکتا ہے اُن کو سوچنا اور عملی جامہ پہنانا اُن حضرات کا فرض ہے جو تعلیمی کاموں میں مصروف ہیں۔
اس طبقہ کے متعلق صرف ایک اور اہم امر کا تذکرہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بچوں کو صحبت بد سے حتے الامکان بچایا جائے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور زمانہ قدیم سے ہر مصلح نے اس پر زور دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ نے نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس کی وجہ سے تحفظ نہیں کیا جاتا اور سیکڑوں خاندانوں کے ہونہار بچے برباد ہو چکے ہیں۔ جن خاندانوں میں مغربی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہو گیا ہے اور جن کا کوئی فرد شہر میں یا کسی ایسی جگہ جہاں تعلیمی آسانیاں فراہم ہیں مقیم ہے اُس کے یہاں دیگر اعزا اور احباب کے لڑکے تعلیم کی غرض سے رکھ دیے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہ عموماً مضافات میں مغربی تعلیم کا کافی انتظام نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کا رواج سا ہو گیا ہے۔
مسلمان بزرگ خاندان یا روٹی پیدا کرنے والا عموماً اپنے بچوں کی تعلیم سے لاپروا ہوتا ہے اور ایک ماسٹر یا معلم کو رکھ دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا۔ گھر کے واسطے بورڈنگ ہاؤس کے سے قواعد مرتب کرنا اُس کے لیے غیر ممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف گھرانوں کے مختلف ماحول میں پرورش یافتہ بچے بلا کسی قسم کی نگرانی اور رہنمائی کے ایک ساتھ مدارج بالیدگی و نمو طے کرتے ہیں۔ جو خراب عادات میزبان کے بچوں میں ہوتی ہیں وہ مہمان بچوں میں اور جو مہمان بچوں میں ہوتی ہیں وہ میزبان کے بچوں میں سرایت کر جاتی ہیں اور وہ ساری عمر اُس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ راقم حروف متعدد خاندانوں کو بتلا سکتا ہے جو اس بے احتیاطی کا شکار ہو گئے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظریہ ہندوستانی تہذیب و طرز عمل کے خلاف ہے اور بہت لوگ اس کی مخالفت کریں گے۔ لیکن دنیا عالم اسباب ہے۔ اسباب فراہم کرنے کے بعد نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے۔
اس مسئلے پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ غریب بھائیوں کے لڑکے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ اس کا ازالہ یوں ہو سکتا ہے کہ اُن بچوں کی جن کی تعلیم مقصود ہے مدد کی جائے اور بورڈنگ ہاؤس میں رکھ دیے جائیں۔ اس طرز عمل میں اخراجات کا سوال پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ایسی ضرورت ہے کہ جس پر خرچ سے گریز کرنا دانشمندی میں داخل نہیں۔

(۴) طبقہ عوام میں ابھی تک تعلیم بہت کم ہے۔ شوق تعلیم ضرور پیدا ہو چلا ہے لیکن ایسے تعلیمی ادارے جن میں اس طبقہ کے بچوں کو مفید اور کارآمد تعلیم دی جا سکے بہت کم ہیں عموماً غرباکے بچے کسی مکتب یا مسجد میں تعلیم کی غرض سے بٹھائے جاتے ہیں جہاں کلام مجید اور ابتدائی اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ موجودہ ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قسم کی تعلیم کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر محلہ میں ایسے اسکول ہوں کہ جن میں علاوہ مندرجہ بالا نصاب کے دست کاری، صنعت و حرفت بھی سکھلائی جا سکے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اس کی ترتیب و انتظام کے لئے جب تک کہ ساری قوم آمادہ نہ ہوگی اُس وقت تک حسب دلخواہ نتیجہ فراہم ہونا محال ہے۔ امید کہ مصلحان قوم اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

مجذوب کی بڑ

(جناب کاج خواجہ عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس لکھنؤ)

بس اب ایک ہی آشنا چاہتا ہوں　　ہٹو دوستو راستہ چاہتا ہوں
بتوں کو بُرا اے خدا چاہتا ہوں　　سر خُم دل مبتلا چاہتا ہوں
میں اے ضبط آہ رسا چاہتا ہوں　　بہت ناتواں ہوں عصا چاہتا ہوں
جو پوچھا ادا سے تو سب بھول بیٹھا　　کھڑا سوچتا ہوں کہ کیا چاہتا ہوں
مرا ساز ہستی ہے لبریز نغمہ　　کوئی مطرب خوشنوا چاہتا ہوں
رہ عشق میں پھر قدم لڑکھڑائے　　مدد تم سے پیر ہُدیٰ چاہتا ہوں
سنبھالو۔ سنبھالو۔ سنبھالو　ق　گرا چاہتا ہوں گرا چاہتا ہوں
بھلاتا ہوں پھر بھی وہ یاد آرہے ہیں　　وہی چاہتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں
ارے رکھ ہنسی کو ہنسی ہی کی حد میں　　ہلاک تبسّم ہوا چاہتا ہوں
سراپا ہے سوز یہ ساز ہستی　　میں وہ راگ اب چھیڑنا چاہتا ہوں

بہت دن تو مجذوب کی ہرزہ گوئی
بس اب لب پہ نام خدا چاہتا ہوں

(جناب الحاج منشی امیر احمد صاحب علوی بی۔اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(۵)

ہردوئی کا دوسرا دور | جون ۱۹۱۰ء میں حاجی نور الحسن دوبارہ ہردوئی پہونچے۔ احباب نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ رؤسا نے مبارکباد دی۔ کارکنان انجمن اسلامیہ نے خیر مقدم کہا۔ قانون دانی کی شہرت۔ جفاکشی کی دھوم تھی۔ قیامگاہ تک پہونچتے ہی موکلوں کے پیام آنے لگے اور چند روز میں مقدمات کا دہی انبار ہوگیا جو سفر عرب سے پیشتر تھا۔

صحت جسمانی ظاہرا درست تھی لیکن طبیعت مضمحل رہتی تھی۔ سرزمین بطحا کی روحانی برکات نے زق زق دنیوی سے دل متنفر کر دیا تھا۔ روزانہ کچہری جاتے۔ مقدمات کی پیروی کرتے تھے لیکن دیار رسول کی یاد فراموش نہ ہوتی تھی اور جی اُداس رہتا تھا۔ اطفال خورد سال کی پرورش و پرداخت کرنا تھی اس لیے کسب معاش کا خیال چھوڑ نہ سکتے تھے۔ مولوی احمد حسن اسی سال بی اے پاس ہوئے تھے اُن کو قانون کی تعلیم کے لیے الہ آباد بھیجنا تھا۔ مولوی حامد حسن ندوۃ العلماء کے مدرسہ میں عربی پڑھتے تھے اُن کو درسیات کی تکمیل کے لیے دیوبند روانہ کرنا تھا۔ مولوی طاہر محسن کی تعلیم کا وقت آ گیا تھا۔ غرض مختلف اسباب ایسے جمع تھے کہ وکالت سے دست بردار نہ ہوسکتے تھے۔ "دل بیار و دست بہ کار" کے قدیم مقولہ پر کاربند ہونے کی خواہش تھی مگر دل کی گرمی سے ہاتھ بیکار ہوا جاتا تھا۔ "دلائل الخیرات" اور "حصن حصین" کے سوا دوسری کتابوں میں جی نہ لگتا تھا۔ مقدمات کی مسلیں بار خاطر تھیں اور اوقات عدالت کی پابندی ناگوار۔

قاضی محمد مصطفٰے غازیپوری، شہر میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کے بھائی قاضی احمد الیاس وکالت کرتے تھے۔ دونوں مولانا کے مخلص دوست تھے۔

ڈاکٹر نبی احمد شہر میں مطب کرتے۔ صبح کو شکار کھیلتے اور شام کو خدمت اقدس میں حاضری دیتے تھے۔ ملک زاہد حسین اپنے بٹوارہ قدیم نیازمند تھے۔ مولوی محمود الحق حقی کی وکالت فروغ پر تھی۔ انجمن اسلامیہ کی ترقی کی تجویزیں پیش کرتے۔ مقامی معاملات میں صلاح طلب ہوتے تھے۔ مولانا ہر ایک رفیق سے اُس کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے اور افکار دنیوی سے اپنی بیزاری ظاہر ہونے نہ دیتے تھے لیکن دل کی گرمی دست و پا کی قوت آہستہ آہستہ سلب کر رہی تھی۔

منشی مقبول احمد وصل کا وطن بلگرام تھا لیکن عرصہ سے ہردوئی میں رہتے تھے۔ کچھ دنوں تک مرقع عالم پریس سے اور ایک مدت تک مقبول المطابع سے تعلق رہا۔ مولوی نورالحسن کے مصاحب خاص تھے۔ شعروسخن سے ذوق تھا۔ مولانا کو شعر گوئی کی رغبت دلاتے رہتے۔

دوستوں کے اصرار سے جشن تاجپوشی کے موقع پر دسمبر ۱۹۱۱ء میں ایک نظم لکھی جس میں حکومت برطانیہ کی رعایا پروری اور معدلت گستری کی تعریف تھی اور مدرسہ رفاہ عام کے جلسۂ تہنیت میں حکام کو سنائی۔ بعدازاں ۱۳ فروری ۱۹۱۲ء کو سالانہ نمائش کے دربار میں ایک مسدس پڑھا جس کا پہلا بند تھا۔

کیا قیامت ہے اُڑتے ہوئے جاڑے کا غبار میہاں ہے گھڑی ساعت کی فقط فصل بہار
ابتو نورالحسن اچھا نہیں مے سے انکار لاؤ بھی داڑھی سے خدا کے لیے کیوں تم کو ہے عار
کب سے ارمان مچلتے ہیں نکلنے کے لئے
پی بھی لو آج مزا منھ کا بدلنے کے لئے

لیکن طبیعت کی افسردگی سے نظم تمام نہ ہو سکی۔ البتہ ایک غزل تیار ہوئی جس کا مطلع اُن کے حسب حال تھا:—

یکسوئی ہو تو کچھ اثر آہ رسا کرے قابو میں دل نہ ہو تو بھلا کوئی کیا کرے

مقطع سُنیے:—

نیرؔ یہ عمر اور یہ رندانہ صحبتیں اللہ آپ کو بھی کہیں پارسا کرے

مندرجہ ذیل اشعار بھی اسی زمانہ کی تصنیف ہیں اور دل کی پژمردگی ظاہر کرتے ہیں:—

(۱) نفس انسانی کا دنیا میں فنا ہو جانا میری آنکھوں میں ہے بندے کا خدا ہو جانا
جوش ہیں عشاق جو ہوتے ہیں نئے روز ستم درد نے سیکھ لیا بڑھ کے دوا ہو جانا
عشق کی بھول بھلیاں میں نہ بھٹکے نیرؔ اے چک درد کی تو راہ نما ہو جانا

(۲) جوانی تو ہے چاندنی چار دن کی ہمیشہ رہا ہے زمانہ کسی کا
اکیلی جوانی پہ کیا منحصر ہے نہیں ساتھ دیتا زمانہ کسی کا

پرائیوٹ خطوط میں بھی حسرت واندوہ کے مضامین ہوتے تھے۔ رفیق قدیم منشی مقبول علی کو ایک خط میں لکھا تھا:—

"دنیا افکار اور پریشانیوں کا مجموعہ ہے۔ اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق کم و بیش اس میں مبتلا ہے۔

قومے بہ تماشائے خط و خال خوش اند قومے بہ تمنائے زر و مال خوش اند

بیدل ہمہ را بہ حال بدمی بینم خوشحال کسانیکہ بہرحال خوش اند
جس قدر دینیات کی طرف مائل ہوتے جاؤگے پریشانیاں کم ہوتی جائیں گی۔ خدا کی یاد دل کو تسکین دیتی ہے۔"

مکتوب مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۱ء میں لکھتے ہیں :-

"وہ زمانہ طالب علمی کا بڑی مصیبت کا وقت سمجھ کر کاٹا تھا۔ فی الحقیقت وہ بڑی بے فکری کا زمانہ تھا۔ دل میں حوصلے تھے اور ہر وقت آئندہ ترقیوں کی امیدیں۔ اب معلوم ہوا کہ خواب تھا، اسی طرح اُس وقت کے آنے کا یقین ہے جب یہ دنیا خواب ہو جائے گی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"

خلاصۂ نظائر اور شاعری

اگر یہ وحشت و پراگندہ خاطری۔ افسردگی و پژمردگی زیادہ دنوں تک قلب میں جاگزیں رہتی تو مولانا کا رہا سہا دنیا سے معطل ہو جاتے اور ادب اردو اُس گراں بہا نعمت سے محروم رہ جاتا جو ان کے وسیلہ سے مقدر تھی۔ وہ صاحبِ تسبیح و مُصلّا ہو کر عزلت نشین ہوتے اور ملک اُن کی محققانہ قابلیت سے استفادہ نہ کر سکتا۔ لیکن اجرام و اجسام کے موکلوں کو ان کی موشگافیوں سے کام لینا تھا اور دنیا کی شعبدہ پردازیوں میں ان کو چندے گرفتار رکھنا لازم تھا۔ لہذا اُن کے خیالات کو فکرِ معاد سے پھیرنے اور دنیا میں پھنسانے کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ ایک دن وکلائے شہر کی مجلس میں تذکرہ ہوا کہ اودھ کے نظائر قانونی کی کوئی جامع و مانع فہرست موجود نہیں ہے۔ پچھلی تالیفات از کار رفتہ ہیں اور ضرورت ہے کہ ایک جدید فہرست ایسی مرتب کی جائے جس میں ۱۸۶۵ء سے اس وقت تک کے کل مفید نظائر کا خلاصہ موجود ہو۔ چونکہ مولوی نورالحسن کو نظائر سے زیادہ دلچسپی ہے اس لیے مناسب ہے کہ وہی اس خدمت کو انجام دیں۔ مولانا نے پہلے انکار کیا مگر احباب کے تقاضے سے مجبور ہو کر اس خدمت کا بیڑا اُٹھایا۔ نظائر کی بیشتر کتابیں دولت خانہ پر موجود تھیں۔ کچھ اور خریدیں کچھ دوستوں سے عاریتاً لیں اور خلاصہ نویسی کا آغاز کیا۔ صبح شام تالیف جدید میں مشغول رہتے اور عدالت کے روزانہ کام پر بھی زیادہ توجہ کرتے تھے۔ وقت کی قدر بڑھی۔ زندگی کی ضرورت معلوم ہوئی۔ امورِ دنیوی سے تنفر گھٹا۔ دل بہلا۔ شعر و سخن کا ذوق تازہ ہو گیا۔ ایک اخلاقی نظم لکھی جو زمیندار اور ہمدرد وغیرہ مختلف اخباروں میں شائع ہوئی اور ملک میں بڑی قدر و پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ فی الحقیقت صفائی بندش۔ سادگی بیان اور پاکیزگی خیالات کے اعتبار سے اُن کے سب قطعات پر فائق ہے :-

عالمِ خلوت میں مجھ کو اتفاقاً ایک شب | رب سے موقع مل گیا اک شکوۂ دلگیر کا
دستِ بستہ عرض کی میں نے کہ اے بندہ نواز | تیری رحمت نے بڑھایا حوصلہ تقریر کا
غور سے کرتا ہوں میں جو اگلے لوگوں پر نظر | ساتھ اُن کے اور ہی کچھ ڈھنگ تھا تقدیر کا
اُن میں بھی ایسے تھے جو تھے تیرے منکر صفات | ہم میں بھی ایسے ہیں جن کو تکیہ ہے تدبیر کا
اُن کی آہیں عرش کے نیچے کبھی رکتی نہ تھیں | اپنی آہیں پست ہیں۔ پلہ نہیں اک تیر کا
تیری رحمت عام ہے اور تو سراپا رحم ہے | تجھ سے کچھ کھٹکا نہیں تبدیل کا تغئیر کا
توبہ توبہ تو خفا ہو جائے یہ ممکن نہیں | پھر یہ کیوں انداز بدلا عالمِ تقدیر کا
ہنس کے فرمایا کہ اے ناواقفِ اسرارِ غیب | نکتہ چینی اب تو شیوہ ہے جوان و پیر کا
دل میں کچھ ہے اور زباں سے کچھ کہا کرتے ہیں وہ | پھر گلہ رہتا ہے ہر دم برگشتی تقدیر کا
لب پہ ہے سبحان ربی دل میں انا دیکھو | اس عبادت پر ہے تکیہ ہر جوان و پیر کا
دل کے آئینہ سے پارہ اڑ گیا اخلاق کا | روح رخصت ہو گئی خاکہ رہ گیا تصویر کا
اپنے اپنے نفس کو ہر اک بنائے ہے خدا | اور خدائی نام ہے مجموعۂ تقصیر کا
سچ بتا دیکھے ہیں تو نے کتنے ایسے نیک خو | جن کو ہو اقرار دل سے اپنی ہی تقصیر کا
جو پرستش میری کرتے ہوں خلوصِ دل کے ساتھ | جن کو غرہ ہو نہ دنیا کی کسی جاگیر کا
ہو زباں اُن کی مطابق دل کے دل ہو آئینہ | آئینہ وہ جس میں جلوہ ہو مری تنویر کا
ہم نہیں بدلے ہے بدلا ہے ہمارا انتظام | فرق ہے تیری سمجھ کا پھیر ہے تعبیر کا
خود پرستی چھوڑ دے کر حق پرستی اختیار | راز کھل جائے گا تجھ پر عالمِ تقدیر کا

فروری ۱۹۱۱ء میں سالانہ نمائش تھی اور یہ خلاصۂ نظائر کی تالیف میں سرگرم تھے۔ دوستوں نے اصرار کیا کہ حسبِ دستورِ قدیم دربار کے لئے نظم ضرور لکھی جائے۔ ارشاد کی تعمیل کی۔ پہلا بند تھا:-

ساقی پلائے جام ہے خوشگوار کا | وہ پیش خیمہ آگیا فصلِ بہار کا
قابو میں دل کہاں ہے کسی بادہ خوار کا | جو اعتبار کیجئے قول و قرار کا

زاہد کی ہم تو ایک نہ مانیں ہزار میں
توبہ کسی نے کی بھی ہے فصلِ بہار میں

ٹیپ کا دوسرا مصرع زباں زدِ خاص و عام ہو گیا۔ بعض نکتہ سنجوں نے اس مصرع کو طرح قرار دے کر طبع آزمائی کی۔ مولانا نے بھی غزل لکھی جس کا مطلع تھا:-

مجھ کو یہ اضطراب رہا ہجر یار میں
آج اس دیار میں ہوں تو کل اُس دیار میں

"بہار" کی قافیہ پیمائی ملاحظہ طلب ہے :-

کیا جانے کیا زبان سے نکلا خمار میں
توبہ سے توبہ کیجئے فصل بہار میں

داتا ترے کرم کا تو اک فیض عام ہے
محروم کیا ہیں رہیں فصل بہار میں

زاہد بھی منھ لگاتے نہیں نیک بخت کو
توبہ بھٹکتی پھرتی ہے فصل بہار میں

ڈنکے کی چوٹ ہم تو کہیں گے ہزار میں
توبہ کسی کی رہتی ہے فصل بہار میں

مقطع تھا :-

نیرؔ شب فراق کا شکوہ کسی سے کیا
تقدیر بھی ہوئی ہے کہیں اختیار میں

۱۹ر فروری ۱۹۱۱ء کو نمائش کے پنڈال میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ طرح تھی۔ ع

ہم گلستاں میں رہے قطرۂ شبنم ہو کر

مولانا نے بھی چند شعر کہے :-

کچھ عجب طرح سے کٹتے ہیں مرے لیل و نہار
دن بھی رہتا ہے مرے گھر میں شب غم ہو کر

ناتوانوں کی یہ صورت ترے کوچہ میں رہی
درد کی طرح اُٹھے گر پڑے شبنم ہو کر

اور تکلیف بڑھی جس قدر ادراک بڑھا
کچھ بھی راحت نہ ملی جوش جنوں کم ہو کر

اسی زمین میں ایک شعر تھا :-

بے حقیقت ہے یہ دنیا کا بگاڑ اور بناؤ
ہم نے سب دیکھ لیا درہم و برہم ہو کر

پہلا مصرعہ کسی دوسرے شاعر کا تھا اور مصرعۂ ثانی مولانا نے ضم کیا تھا۔ اس میں "درہم و برہم" بہ معنی "پست و بلند" استعمال ہوا تھا۔ کہا گیا کہ اہل فارس "درہم و برہم" بہ معنی "خفا" "ناراض" بولتے ہیں "پریشان" یا "تہ و بالا" کی جگہ مستعمل نہیں ہے۔ مولانا نے مصحفی کا شعر پیش کیا۔

ہم کو نصیب روز بنا نا ہو زلف کا
اپنا تو حال درہم و برہم بہت ہے یاں

لغت نویسی کا خیال | اسی وقت سے خیال پیدا ہوا کہ محاورات و مصطلحات اردو کی ایک فرہنگ مرتب ہونا چاہیے۔ امیر مینائی علیہ الرحمہ کی بے وقت وفات سے امیر اللغات ناتمام رہا۔ دفتر ہنوز قائم ہے ریاست رامپور سے امداد ہو رہی ہے۔ منشی احمد علی شوق ملازم ہیں لیکن کام کچھ نہیں ہوتا اور لغت کی تکمیل کی کوئی امید نہیں۔ میر علی اوسط رشک لکھنوی کا لغت تقویم پارینہ ہے۔ بیگم بھوپال کے خزینۃ اللغات میں محاورات نہیں۔ یہی حال نفائس اللغات کا ہے۔ فیلن صاحب کی ڈکشنری ہاں محض

ناکافی ہے۔

قدیم مراسم کی بنا پر منشی احمد علی شوق سے خط و کتابت کی۔ انھوں نے اُردو لغت کی تدوین ناممکن بتائی اور بہت شکن جواب دئے۔ مولانا کو خلاصۂ نظائر کی ترتیب سے فرصت نہ تھی لیکن امیر اللغات کو مکمل کرنے کا خیال دل میں بار بار آنے لگا اور محاورات جمع کرنے کا عزم آہستہ آہستہ قلب میں راسخ ہونے لگا۔

منشی انور علی فاروقی ایم اے ایل ایل بی۔ ہردوئی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مولانا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ فہرست نظائر کی تکمیل میں معاون ہوئے اور پروف دیکھنے کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں ڈائجسٹ چھپ کر آگیا۔ وکلا اور حکام نے بڑی قدر کی۔ ایک ہزار کاپیاں طبع کرائی تھیں وہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں اور دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اودھ کے صاحب جوڈیشل کمشنر نے اس تالیف کی عدالت ہائے ماتحت سے سفارش کی اور مولانا سے ایسی کتاب کی فرمائش کی جس میں اودھ کے جملہ نظائر کے طے شدہ مباحث مع دلائل کے واضح طور پر لکھے جائیں۔ مگر مولانا کو تدوین لغت کا خیال پیدا ہو چکا تھا لہٰذا اس جدید فرمائش کی تعمیل سے قاصر رہے۔

شاعری کا عروج | مجموعہ نظائر کی تالیف کو شعر گوئی سے ظاہراً تعلق نہیں لیکن شب و روز کی دلچسپی نے پریشان خاطری دور کر دی اور شاعری میں لطف آنے لگا۔ لغات و محاورات جمع کرنے کا خیال بھی ترقی کر رہا تھا اور اسے مضامین کے نئے نئے اسلوب تلاش کرتے تھے اس لئے ۱۹۱۲ء کا کلام ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۰ء کی غزلیات سے بہتر ہے :-

(۱) ہر گھڑی تازہ ستم دل پہ سہا کرتے ہیں　　تیرے جانباز تو مر مر کے جیا کرتے ہیں
یاد کر کر کے وہ اس طرح جفا کرتے ہیں　　جیسے بھولے ہوئے وعدے کو وفا کرتے ہیں
رنگ تصویر میں ہے کچھ تو مصور کی جھلک　　جا کے بت خانہ میں ہم یاد خدا کرتے ہیں
(۲) وعدہ بھی جو کرتے ہیں مکر جاتے ہیں فوراً　　بن بن کے بگڑ جاتی ہے تقدیر کسی کی
ہم کو تو مرقع میں تمھیں تم نظر آئے　　آنکھوں میں سمائی نہیں تصویر کسی کی
(۳) غیر کے سامنے کیوں ہم کو اُٹھا دیتے ہیں　　میں بُری چیز نہیں جس کو چھپا دیتے ہیں
اپنے مایوس کو وعدوں کا سہارا دے کر　　بیم و اُمید کا کھٹکا سا لگا دیتے ہیں
وعدے تسکین کا باعث ہیں یقیں ہو کہ نہ ہو　　انھیں چھینٹوں سے لگی دل کی بجھا دیتے ہیں

ترک مے معنت کروں شیخ کی خاطر کیونکر — حور و جنت تو خدا کی ہیں وہ کیا دیتے ہیں
واعظو حضرت نیر کو نہ اتنا چھیڑو — ایک ہی آہ میں وہ عرش ہلا دیتے ہیں

مولانا کے پیر مرشد حضرت شاہ تقی علی قلندر کا ایک رسالہ "اسرار فطرت" پر اُن کے سجادہ نشین نے شائع کیا۔ مولانا نے قطعہ تاریخ لکھا جس کے چند شعر یہ تھے:۔

مرشد من حضرت شاہ تقی — شبنم شاداب گلزار علی
فخر دارد علم برادراک او — نازش نیر بذات پاک او
پردۂ اسرار فطرت ساز کرد — باب فیضان حقیقت باز کرد
سالہا بعد وصالش این کتاب — لیلی محمل نشین بُد در حجاب
چاپ شد این نسخۂ فرخ مقال — جلوہ گر شد شاہد یوسف جمال
اسم تاریخی بگیرم بے بدل — از تجلیات نیایش ازل

رفیق قدیم منشی مقبول علی نے ایک عریضہ میں لکھا کہ پہلے شعر میں اگر بجائے "گلزار علی" کے "بستان علی" ہوتا تو بہتر تھا۔ مولانا نے جواب میں ایک پوسٹ کارڈ لکھا جو بجنسہ نقل کرنے کے قابل ہے:۔

" دعا۔ خط آیا۔ تمہاری سخن فہمی سے دل نہایت خوش ہوا۔ اشتیاق ملاقات کے واسطے یہ اک اور تازیانہ ہوا۔ "گلزار" اور "بستان" کے فرق پر خیال کرو۔ ایک کو پھولوں سے دوسرے کو پھلوں سے تعلق ہے۔ شبنم کو پھولوں سے مناسبت۔ تو خود تم ہی پسند کرو گے کہ "گلزار" کو "بستان" پر ترجیح ہے۔ ملاقات کا ذکر کرکے تم نے انگار کے زخموں پر نمک پاشی کی۔ افسوس وہ شب و روز کا ساتھ۔ وہ میل جول دن رات کا ہنسی مذاق اور کہاں یہ سالہا سال کی جدائی۔ برسوں صورت دیکھنے کو ترسنا۔ پچھلی صحبتوں کی یاد ذکر جوانی در پیری اللہ اللہ۔

رخصت ہوا شباب کے ہمراہ درد دل — اندھیر ہے چمک بھی گئی آفتاب کی

کیا کہئے اور کس سے کہئے۔ یہ سب اپنے اعمال کی شامت ہے۔ ورنہ کیا بھائی بھائی جدا نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں لیکن اس طرح کہ دو چار مہینے حد کو چھ مہینے سال بھر ہوا ہے پھر چند روز مل بیٹھے پھر جدا ہوئے پھر ملے۔ غرض یہ کہ وصال و فراق کی دھوپ چھاؤں میں شاد و ناشاد زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں تو وہ فراق کی مصیبت ہے جس کے کٹنے کی امید نہیں۔ خدا نہ کرے کیا یہ بھی شاعروں کی شب ہجر ہے جس کی سحر نہیں۔ جامع المتفرقین کی بارگاہ میں بعجز و الحاح تم بھی دعا کرو کیا عجب ہے کہ بار یاب قبول ہو۔ ہر تعطیل میں یہ سہارا ہوتا ہے کہ تم سے ملاقات ہوگی اسی امید پر کئی سال

گذر چکے ہیں۔ لغات نیر کے متعلق تحقیقات کر رہا ہوں۔ کتابیں کچھ آگئی ہیں کچھ جمع ہونے کو باقی ہیں حرف الباء سے آغاز کیا ہے۔ اس حرف کے متعلق نصف سے زیادہ الفاظ و محاورات کی ترتیب ہو چکی ہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔ نور الحسن۔ ۵ ر اگست ۱۹۱۵ء"

دو ہفتہ کے بعد لغت کی بابت تحریر فرمایا :۔

"یہ کام جس کی میں نے ابتدا کی ہے اہم ہے۔ اللہ تعالےٰ امداد فرمائے اور تکمیل کو پہونچائے۔ میں نے اس کو حرف الباء سے اس وجہ سے شروع کیا ہے کہ امیر اللغات حرف الف کے لیے کافی ہے۔ بعد تکمیل انشاء اللہ حرف الف لکھا جائے گا۔ "بات" کے مفردات و مرکبات کے معانی قریب ۵۰ اکے لکھ چکا ہوں۔"

ایک پنجسالہ صاحبزادی کا اسی زمانہ میں انتقال ہوا تھا۔ مندرجہ بالا خط کے خاتمہ پر تحریر ہے :۔

"عابدہ میری چھوٹی لڑکی نے شب مابین ۲۰ و ۲۱ ر اگست کو بعارضۂ بخار و ہیضہ انتقال کیا اس کی سبب پانچ سال تک دل بہلتا رہا۔ میں اس سے خلاف معمول زیادہ مانوس ہو گیا تھا۔ مرضی خدا سے کیا چارہ ہے۔"

۵ ر دسمبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"برخوردار احمد حسن سلمہ الہ آباد لا کلاس میں قانون پڑھتے ہیں۔ دسمبر کی تعطیل میں کاکوری آئیں گے برخوردار حامد حسن[1] یہاں ہیں انگریزی پڑھتے ہیں۔ اسکول میں داخل کرنا فضول معلوم ہوا۔ ماسٹر مقرر کر لیا ہے۔ طاہر سلمہ مع اپنی والدہ کے لکھنؤ میں ہیں اور بخیریت ہیں۔

میں حسب دستور بفضل خدا باوجود مکارہ و افکار کے علمی مشاغل میں مصروف ہوں۔ عمر پچاس تک پہونچی۔ داعی اجل لبیک کی صدائیں دیتا ہے۔ دعا کرو کہ خدائے تعالیٰ اپنی اطاعت اور رضا مندی کا خلعت عطا فرمائے۔ عبادت کی توفیق اور قبولیت کی سند رحمت فرمائے۔ وما متاع الدنیا الا قلیل"

"علمی مشاغل" سے لغت کی ترتیب اور دواوین کی ورق گردانی کی طرف اشارہ ہے۔ کسب معاش کی افکار سے جو وقت بچتا وہ اسی خدمت پر صرف کرتے تھے۔ شاعری بھی قریب قریب ترک تھی۔ ۱۹۱۶ء میں صرف ایک غزل پانچ شعر کی لکھی :۔

دل میں اک بوند لہو کی تو حقیقت کیا ہے ۔۔۔ دوڑ دھوپ ایسی غضب ہے کہ قیامت کیا ہے
پڑ گئے پردے کرشموں کے اداؤں میں پھنسا ۔۔۔ محو حیرت نے نہ دیکھا تری صورت کیا ہے

[1] مولوی حامد حسن عربی کی تعلیم ناتمام چھوڑ کر دیوبند سے چلے آئے تھے۔

غیر بے پردہ سر بام بُلائے جائیں ذکر میرا ہو تو کہتے ہیں ضرورت کیا ہے
چار باتیں بھی نہ کیں ہم سے کبھی گھل مل کے انھیں باتوں کی شکایت ہے شکایت کیا ہے
کچھ تو محشر میں بھی ہے بندہ نوازی منظور ورنہ نیر کے بلانے کی ضرورت کیا ہے

البتہ ۱۹۱۵ء میں کئی غزلیں کہنے کا اتفاق ہوا۔ ۲۵ر فروری ۱۹۱۵ء کو نمائش کے مشاعرے میں حسب ذیل غزل پڑھی:۔

دل بیتاب کی اُس بُت کو خبر ہے کہ نہیں میری آہوں میں خدا جانے اثر ہے کہ نہیں
جس کی رگ رگ میں کھٹک ہو وہ بتائے کیونکر درد دل ہے کہ نہیں درد جگر ہے کہ نہیں
نہ سہی۔ دیر و حرم میں میری حاجت نہ سہی دونوں عالم میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں
خوف کیا دفتر عصیاں کا کرم سے تیرے رونے دھونے کے لئے دیدۂ تر ہے کہ نہیں

مقطع درد و تاثیر سے لبریز تھا۔

گنبد سبز میں آرام سے سونے والے اپنے نیر کی تجھے کچھ بھی خبر ہے کہ نہیں

۸ر جون ۱۹۱۶ء کو مین پوری میں مشاعرہ تھا۔ طرح تھی ع۔ وہی گل ہے گلستاں میں وہی ہے شمع محفل میں۔ مولانا کی شاعری کا آغاز مین پوری سے ہوا تھا اور سخن فہمی کی قابلیت بھی وہیں حاصل کی تھی۔ لہٰذا اُس جوار کے نکتہ سنجوں کو پختہ مشقی کا کلام سُنانا پسند خاطر ہوا۔ منشی مقبول حسین وصل بلگرامی کو ہمراہ لے کر مین پوری تشریف لے گئے۔ والد ماجد کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ دیرینہ نیازمندوں سے ملاقات کی اور مشاعرہ میں وہ زور شور کی غزل پڑھی کہ واہ واہ سبحان اللہ کے نعروں سے صحن مجلس گونج اُٹھا:۔

نہ درد اُٹھا کلیجے میں نہ ٹیس اُٹھی کبھی دل میں بھلا کس مُنہ سے واعظ جا رہا ہے کوئے قاتل میں
نہ ہم باہر کبھی نکلے نہ پہونچے تیری محفل میں مگر گھر بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتے ہیں تجھے دل میں
مرے داغوں پہ خوشیاں ہوں مبارک میرے دشمن کو مجھے یہ ناز ہے رہتا ہوں میں پریوں کی محفل میں
تمھارے دم قدم سے دونوں گھر آباد رہتے ہیں جگر میں درد ٹھہرا ہے چپک اُجڑے ہوئے دل میں
وفا پر حرف آ جائے زباں سے کچھ اگر نکلے مگر ہاں درد کچھ اُٹھ اُٹھ کے کہتا ہے مرے دل میں
ملا ہے جام جم اس دل کی صورت میں خدا رکھے یہی محفل ہے تنہائی میں تنہائی ہے محفل میں
تمھاری حسرتوں میں کس بلا کی دلربائی ہے پری زادوں کا اک جمگھٹ بسا رہتا ہے مرے دل میں
چلو۔ یوں ہی سہی۔ ہم ہی بُرے ہیں سارے عالم سے مگر تم پر زمانہ کی نظر پڑتی ہے محفل میں

وہ دیکھو حضرت نیر چلے آتے ہیں محفل میں / کرامت جذب دل کی ہے کہو۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے

خان بہادر سید محمد ہادی ہردوئی میں حاکم ضلع تھے۔ سخن فہم۔ سخن سنج۔ ولایت کے تعلیم یافتہ عربی و فارسی میں استعداد۔ اُردو کے شاعر اور نثار۔ مولوی نورالحسن کی تکریم و توقیر کرتے۔ شاعری کی داد دیتے اور لغت نویسی کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ ان کا تبادلہ ہوا ضلع کے اشراف و اعیان کو جدائی کا قلق تھا۔ الوداعی پارٹیاں ہوئیں۔ استاد نے بھی ایک نظم لکھی۔ برطانیہ اور جرمنی کی جنگ عظیم جاری تھی۔ روس تباہ ہو چکا تھا۔ عراق کی حالت زار تھی۔ رنگروٹ بھرتی کیے جاتے تھے۔ قرضہ جنگ کے دفتر کھلے تھے۔ وفاداروں کو خطابات تقسیم ہوتے اور اسلحہ کے لیسنس دیے جاتے تھے۔ ان سب واقعات کی طرف لطیف پیرایہ میں اشارہ تھا اور فراقیہ نظم نیم مزاحیہ بن گئی تھی۔ پہلا بند تھا۔

اے فلک تو نے نکالا یہ کہاں کا کھٹراگ / اس طرح کوئی بھی گھر میں لگاتا ہے آگ
عیش و عشرت سے ہمیشہ تجھے رہتی ہے لاگ / روسیوں کا تری حرفت نے اجاڑا ہے سہاگ
کون سینہ ہے جو ماتم میں نہیں چاک ہوا
کیا بُری آگ لگی لاکھ کا گھر خاک ہوا

چند اشعار اور سُنیے:۔

(۱) ساورن داغ جگر کے تجھے چندے میں ملے / لوٹ بربادی تقدیر کے قرضے میں ملے
(۲) تیرے حصہ میں وہ بھرتی ہوئے رنگروٹ بڑے / بن کے زیپلن جو ستاروں کی طرح ٹوٹ پڑے
(۳) نہ سہی خوف خدا کچھ تجھے وسواس بھی ہے / اک دونالی کا تو لیسنس مرے پاس بھی ہے

۰ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو مولانا کے دولتکدہ پر مشاعرہ تھا۔ سندیلہ۔ بلگرام۔ شاہجہانپور۔ لکھنؤ سے مہمان آئے تھے۔ حضرت فانی بدایونی جو آج ہندوستان کے بہترین شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں شریک بزم تھے۔ اُس وقت تک اُن کا دیوان شائع نہیں ہوا تھا اور شہرت عام حاصل نہ تھی لیکن مزاج عاشقانہ۔ دماغ شاعرانہ۔ آواز درد انگیز رکھتے تھے اور سر تا بقدم مجسم شعر تھے۔ کلام میں سوز و گداز تھا اور حسرت خیز ترنم سے سُننے والوں کے دل موہ لیتے تھے۔

مصرع طرح تھا۔ ع الفت ہوئی ہے رونق محفل جگہ جگہ۔ فانی نے بڑی موثر غزل لکھی جو کئی سال تک ہردوئی کے سخن فہموں کو یاد رہی۔ راقم الحروف اس مشاعرے کے دو سال بعد بسلسلہ ملازمت ہردوئی پہونچا تو ارباب ذوق کو یہ غزل حفظ تھی اگرچہ تحت اللفظ سے وہ لطف حاصل نہ ہو سکتا تھا جو شاعر کے ترنم سے حاصل ہوا تھا۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:۔

نوجوان مدعائے دل اور دل جگہ جگہ ہے ایک شمع رونق محفل جگہ جگہ
رو رو کے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوں میں ہنستی ہے مجھ پہ دوری منزل جگہ جگہ
اک سرگذشت درد ہے ہر ذرہ خاک کا پہونچی ہے داستان غم دل جگہ جگہ
غم اصل کائنات ہے دل جوہر حیات دل غم سے غم ہے دل سے مقابل جگہ جگہ
مٹ کر بھی داغ شاہد خون شہید ہے دھویا ہوا ہے دامن قاتل جگہ جگہ
اب یادگار فانی بسمل ہے اس قدر گلگوں ہے خاک کوچۂ قاتل جگہ جگہ

مولانا کی غزل سنیے :-

شکوہ یہ عام ہے سر محفل جگہ جگہ کمبخت آہ کرتی ہے منزل جگہ جگہ
اے دل سنبھل کے کوچۂ جاناں میں رکھ قدم بیٹھے ہوئے ہیں راہ میں قاتل جگہ جگہ
مجنوں کی آہ آہ کا کچھ تو اثر ہوا اُٹھ اُٹھ گیا ہے پردۂ محمل جگہ جگہ
دنیا و دیں سے گذرے تو پہونچے ہیں تیرے پاس کرنا پڑی ہے راہ میں منزل جگہ جگہ
نیر سے کیوں کرے کوئی قیمت کی بات چیت ملتے ہیں مفت لوٹے ہوئے دل جگہ جگہ

اُستاد ترنم سے غزل پڑھنا پسند نہ کرتے تھے اس وجہ سے مشاعرہ کا سہرا فانی کے سر رہا ورنہ جس طرح فانی کا شعر نمبر۵ لاجواب تھا ویسے ہی مولانا کے بعض اشعار بھی قابل قدر تھے۔

نوٹ: نور اللغات الفاظ و امثال۔ محاورات و مصطلحات جمع کرنے کا سلسلہ دو سال سے شروع ہو چکا تھا دیباچۂ نور اللغات میں ہے کہ "۱۹۱۴ء میں میرے بہت سے ذی علم احباب نے طرح طرح سے ہمت بڑھا کر مجبور کیا کہ میں باوجود پیشہ وکالت اور دیگر مشاغل کے اس ذمہ داری کا بار اپنے سر لوں اور اپنے اوقات کا زیادہ حصہ اس کام کے لیے وقف کر دوں۔ میں نے معذرت کی لپیٹ میں اپنی حالت کا اظہار بہت کچھ کیا لیکن کچھ سماعت نہ ہوئی اور مجبور ہو کر تعمیل ارشاد کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے کتب خانہ کی موجودہ کتب کے علاوہ اس ضرورت کے لیے معتد بہ کارآمد کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا اور ایک خاص دفتر اس کا قائم کیا۔ محرر ملازم رکھے ان کا صرفہ اپنے ذمہ لیا اور الفاظ و محاورات کو بہ ترتیب حروف تہجی لکھنا شروع کر دیا۔"

اُردو کا پہلا قابل لحاظ لغت شیکسپیر اور فیلن صاحبان نے ۱۸۷۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس کو دلیل راہ بنا کر امیر اللغات کے طرز پر محاورات و امثال شامل کرنے کا عزم کیا۔ اساتذہ کے دواوین پڑھتے۔ مثنویوں کی ورق گردانی کرتے۔ نثر اردو کی مقبول کتابیں دیکھتے۔ ہر جدید محاورہ یا لفظ کو

نشانات بناتے۔ تذکیر و تانیث کی اسناد پر خط کھینچتے۔ مراثی کے دفتروں سے اصطلاحات منتخب کرتے۔ محرر علامت زدہ الفاظ و محاورات کو بہ ترتیب حروف تہجی لکھتے۔ اور سند کے اشعار نقل کرتے تھے۔ امیر اللغات کے دو حصے شائع ہو چکے تھے۔ الف ممدودہ و مقصورہ کا ذخیرہ ان میں موجود تھا۔ اس لیے حرف الباء سے آغاز کیا۔ بوقت فرصت الفاظ کے معانی لکھتے اور پہلوے استعمال دکھانے کے لیے مسلم الثبوت استادوں کے اشعار یا مستند نثاروں کے فقرات درج کرتے تھے۔

امیر اللغات کا حصہ اول شائع ہونے سے چھ سات برس پہلے ایک "نمونہ" شائع کیا گیا تھا جس میں صرف "آنکھ" کا لفظ اور اس کے مرکبات تھے۔ یہ اپنے لغت کا آغاز حرف ب سے کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے نمونہ کے لیے لفظ "بات" انتخاب کیا۔ اگست ۱۹۱۵ء تک اس لفظ کے سیکڑوں مرکبات جمع کر چکے تھے اور تقریباً ۱۵ محاورات کے معانی لکھ چکے تھے۔ تلاش و تحقیق کا یہ عالم تھا کہ مفرد لفظ "بات" کے ۸۰ معانی لکھے تھے اور ہر معنی کے لیے سند پیش کی تھی۔ بعض معانی بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتے تھے لیکن جب سند دیکھی جاتی تو ثابت ہوتا تھا کہ واقعی اس جگہ بات کے یہی معنی ہیں۔ مثلاً

بات بہ معنی دلیل۔ ثبوت۔ (داغ)

بات کیا چاہیے جب مفت کی حجت ٹھہری — اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

بات بہ معنی تعریف۔ مدح۔ (غالب)

زاہد نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

بات بہ معنی خطا۔ قصور۔ (سودا)

سودا کسی کو وہ تو ستائے نہ بے سبب — کیا جانیے کہ تجھ سے ہی کیا بات ہو گئی

بات بہ معنی الزام۔ (امانت)

لائے گی ایک دن محبت میں — آبرو پر یہ اشکباری بات

بات بہ معنی عقلمندی (مومن) بات جب ہے کہ بات ٹالو تم

بات بہ معنی سبب۔ (امانت)

آدھی رات اور ہم ترے در پہ — دل لگانے کی ہے یہ ساری بات

بات بہ معنی رسم و راہ۔ (مومن)

میں جو آیا تو التفات نہیں — وہ نظر وہ سخن وہ بات نہیں

بات بہ معنی موقع محل۔ (منیر)

ہوتی ہے صبح دیکھیے تھوڑی سی رات ہے کروٹ ادھر کی لیجئے یہ کون بات ہے

غرض یہ نمونہ امیر اللغات کی تقطیع پر لکھا گیا۔ اتفاق سے کاتب بھی وہی دستیاب ہوگیا جس نے امیر اللغات کی کتابت کی تھی۔ مقبول المطابع ہردوئی میں چھپا اور مشہور شعرا۔ ادبا اور زبان دانوں کی خدمت میں اظہار رائے کے لئے روانہ کیا گیا۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدا آئی لیکن عام خیال تھا کہ اس طرح پر سارا لغت تالیف نہیں کیا جا سکتا۔ امیر مینائی باوجود ریاستہائے رامپور و بھوپال کی امداد کے تمام نہ کر سکے تو مولوی نورالحسن اس خدمت کو کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔ ان کی اعانت کے لئے نہ تو شاگردوں کا انبوہ ہے اور نہ کسی رئیس کی سرپرستی۔ کوئی عظیم الشان کتب خانہ بھی ان کے اردگرد نہیں ہے اور نہ ان کو امیر مینائی کا سا فن شعر میں تجربہ ہے۔ اشاعت کی دشواریاں بھی سنگ راہ ہیں۔ ان کے پاس نہ کوئی دفتر ہے اور نہ مطبع۔ اگر بفرض محال یہ لغت مولانا کی زندگی میں مکمل بھی ہو جائے تو وہ اس کی طباعت اور اشاعت کا بار گراں برداشت نہیں کر سکتے لہذا یہ کوشش فضول اور سعی لاحاصل ہے۔

مولوی نورالحسن کی ہمت بھی عام رائے سے متاثر ہو کر پست ہوئی۔ ریاست حیدرآباد سے امداد کے لئے سلسلہ جنبانی کی مگر وہاں سے کچھ جواب نہ آیا۔ خود دکن جانے کا ارادہ کیا مگر وکالت کی مصروفیاں دامنگیر ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۱۸ء سے تالیف لغت کا عزم فسخ کر دیا گیا۔ مکتوب مورخہ ۲ مارچ ۱۹۱۹ء میں لکھتے ہیں کہ "دسمبر سے لغت کا کام بالکل بند ہے۔ صحت اس قابل نہیں ہے کہ دن رات کی محنت برداشت کر سکوں اور محنت بھی وہ جس کا صلہ ملنے کا دین و دنیا میں کہیں آسرا نہیں۔"

ہردوئی سے بیزاری | دو تین سال کا مشغلۂ دلچسپی یکایک چھوڑنا بھی سہل نہ تھا۔ طبیعت اُداس رہنے لگی مزاج مکدر ہوا اور پیشۂ وکالت سے دل اُچٹ گیا۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں ایک ہم عصر ہندو وکیل سے نزاع ہوئی۔ معاملہ خفیف تھا لیکن یہ دل برداشتہ اور پراگندہ خاطر تھے وکالت سے کنارہ کش ہونے کا تہیہ کر لیا۔

منشی منظور علی ڈپٹی کلکٹر کا نام ان اوراق میں پہلے آ چکا ہے وہ اب ملازمت سے دستکش ہو چکے تھے۔ بیشتر لکھنؤ میں رہتے اور کبھی ہردوئی میں بھی اقامت فرماتے تھے۔ انھوں نے مولانا کی آزردگی اور کبیدگی دیکھ کر حیدرآباد میں قسمت آزمائی کی صلاح دی۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی رئیس بھیکن پور ضلع علیگڈھ ریاست حیدرآباد میں امور مذہبی کے صدر تھے۔ حضور نظام کی

سرکار میں قدر و منزلت تھی ارکین ریاست ادب و احترام کرتے تھے۔ منشی محفوظ علی سے قدیم تعلقات تھے۔ لکھنؤ تشریف لاتے تو ان کے برادر زادہ منشی احتشام علی (خلف منشی امتیاز علی سابق وزیر بھوپال) کی کوٹھی میں مہمان ہوتے تھے۔ اُن کے وسیلے سے حیدرآباد میں کامیابی کے سبز باغ دکھائے۔ مولوی نورالحسن کے عزیز اور لڑکپن کے دوست سید ظہورالدین احمد[1] وہیں ڈسٹرکٹ ججی کے عہدے پر سرفراز تھے اُن سے بھی اعانت کی توقع متصور ہوئی اور یہ خیالات اس قدر راسخ ہوئے کہ اعزہ و اقربا سے مشورہ کیے بغیر حیدرآباد جانے کا مستقل ارادہ کر دیا۔ ادبی کتابوں کا ذخیرہ بکسوں میں بند کرا کے سید ظہورالدین کے پاس دکن روانہ کیا۔ قانونی کتابیں مولوی محمود الحق وکیل اور بعض دوسرے احباب کو دیں۔ اسباب خانہ داری کچھ حیدرآباد روانہ کیا اور کچھ لکھنؤ۔ بقرعید کے دن (ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ) عیدگاہ میں الوداعی تقریر کی۔ انجمن اسلامیہ کا کاروبار مولوی محمود الحق کے سپرد کیا۔ مولوی طاہر محسن اور

---

[1] سید ظہورالدین احمد بن سید نورالدین احمد از اولاد ملک العلما مفتی عبدالسلام ساکن دیوہ ضلع بارہ بنکی۔ شاہ رحیم باسط نبیرۂ شاہ محمد کاظم قلندر آپ کے نانا تھے۔ کاکوری میں بتاریخ ۴ر شعبان ۱۲۸۲ھ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کاکوری میں پائی اُس کے بعد مین پوری میں کچھ عرصہ تک مولوی نورالحسن کے ہم سبق رہے۔ مولوی ہدایت علی بریلوی سے یہ بھی عربی پڑھتے تھے۔ ابتداءً مین پوری میں اور بعدازاں الہ آباد میں انگریزی پڑھی۔ سلسلۂ تعلیم ختم نہ ہوا تھا کہ حیدرآباد جا کے ملازم ہو گئے۔ تقریباً چالیس سال وہاں قیام رہا۔ مدت تک ہائیکورٹ کے رجسٹرار رہے اس کے بعد ڈسٹرکٹ جج مقرر ہوئے اور تین سال تک صوبہ اورنگ آباد کے اڈیشنل سشن جج رہے۔ ۲۴ر ربیع الاول ۱۳۳۲ھ کو نیکنامی اور عزت سے پنشن لے کر وطن آئے۔ آپ کی کارگزاری، دیانت داری اور راستبازی کے اہل دکن مداح رہے ہیں۔ شعر و سخن سے ذوق اور ظہور تخلص ہے۔ مفتی اکرام اللہ افسوں کاکوروی کے تلمذ تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

صورت و سیرت میں اتنا فرق بھی دیکھا نہیں — پھول چہرہ آپ کا پتھر کلیجہ آپ کا
کیا مزے سے تھے جب حسینوں میں گذرتی تھی ظہور — یاد ہیں وہ دن وہ راتیں وہ زمانہ آپ کا

آئینہ رکھ کے سامنے اپنے — آپ اپنا وہ بت حجاب ہوا
چاہِ زنداں کہاں کہاں یوسف — حسن بھی جان کا عذاب ہوا
وہ ملے بھی تو کب ملے جس وقت — مجھ سے رخصت مرا شباب ہوا

منحصر ایک تصور پہ رہا کام اپنا — ہم دو قاصد نہ کبوتر نہ صبا رکھتے ہیں
کچھ بھی ہو وصل کا وعدہ ہو کہ دیدار کا ہو — وہ ہر اک بات قیامت پہ اٹھا رکھتے ہیں
جب کہا اُن سے کہ مرتا ہے ظہور — بولے اپنے فعل کا بھگتا رہے

منشی محب الرحمن (صاحبزادہ منشی عبدالوحید نیرنگ) اُس زمانہ میں ہمراہ تھے اُن کو ساتھ لے کر ہردوئی سے کوچ کر دیا۔ یقین تھا کہ مولوی انوارالحسن حیدرآباد کے سفر سے مخالفت کریں گے اس لیے کاکوری تشریف نہیں لائے بلکہ براہ راست لکھنؤ پہونچے اور منشی احتشام علی کی کوٹھی میں مسافرانہ مقیم ہوگئے۔ ایک عزیز نے تبدیل مقام کا سبب دریافت کیا تو جواب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"دعاہا۔ نوراللغات کی تکمیل کی خواہش حیدرآباد کے سفر کا باعث ہے۔ کیا عجب ہے کہ دوسرے عشرۂ محرم میں یہاں سے روانہ ہوسکوں۔ اس سفر کے نتیجہ کے بعد یہ طے کیا جائے گا کہ آئندہ قیام کہاں ہوگا اور کیا مشغلہ رہے گا۔ تمہاری رائے دریافت کرنے کا مشتاق ہوں۔ ایک عزیز بھائی کی خلوص محبت میں ڈوبی ہوئی رائے ہر وقت قابل قدر ہے۔ میرے ان افعال کی محرک کیا چیز ہوئی اس کا جواب حسب ذیل ہے

صبح پیری کی چلی ٹھنڈی ہوا نیند آنے کا زمانہ آگیا

نورالحسن۔ ۳ر اکتوبر ۱۹۱۳ء"

مولوی انوارالحسن نے بھائی کو اس دور و دراز سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ راقم الحروف کسی وجہ سے وطن آیا تھا اُس نے بھی عاجزی سے عرض کی کہ سن شریف اس سفر کے قابل نہیں ہے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں حیدرآباد کی آب و ہوا خراب ہوگئی لہذا سفر چند روز کے لیے ملتوی کیا گیا۔ منشی مقبول علی نے بھی اس تجویز سے اختلاف کیا تھا ان کو جواب میں لکھا۔

"دعاہا۔ تمہارا خط آیا۔ اس سفر کا قصد بارہا بھی ہوا تھا لیکن ہردوئی کی وکالت کے تعلقات نے نہ چھوڑا۔ اب حیدرآباد کی آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے چند روز قصد ملتوی کرنا پڑا۔ میں یہاں مسافرانہ زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس وجہ سے یکسوئی خاطر مفقود ہے۔ دیکھئے آب روانہ کی کشش کب حیدرآباد لے جاتی ہے۔ وہاں کے متعلق ہنوز کوئی رائے قائم نہیں کی ہے۔ توکلاً علی اللہ قصد کیا ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ہردوئی اور کاکوری میں مختلف قسم کی افواہیں میری نسبت اڑ رہی ہیں جن کی واقفیت سے قطعاً ناواقف ہوں۔ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی رباعی ورد زبان ہے۔

روئے سیہ و موئے سپید آوردم چشم گریاں قدے چو بید آوردم
تو خود گفتی کہ ناامیدی کفرست فرمان تو بردم و امید آوردم

نورالحسن۔ لکھنؤ۔ نظیرآباد۔ کوٹھی منشی احتشام علی صاحب۔ جمعہ۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۳ء"

المختصر لکھنؤ میں قیام تھا اور اپنے خسر منشی محفوظ علی کے مہمان تھے۔ منشی مقبول علی نے لکھا کہ آپ بجائے لکھنؤ کے کاکوری میں رہیں تو زیادہ دلچسپی ہوگی جواب میں تحریر فرمایا:-

"یہ تم نے خوب لکھا کہ کاکوری میں دلبستگی کا سامان بمقابلہ لکھنؤ کے بہت ہے۔ اب سے بیس پچیس سال پیشتر تو میں بھی یہی کہتا تھا۔ اب خدا جانے کاکوری میں کیا وحشت برستی ہے کہ کسی کا دل نہیں لگتا۔ اور میں تو اس زمانہ میں کاکوری و لکھنؤ دونوں مقامات پر گھبراتا ہوں لیکن اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ کاکوری میں قیام کا قصد نہیں ہے۔ دیکھئے مشیت ایزدی کیا ہے اور آب و دانہ کہاں کا ہے۔ حیدرآباد کا قصد بوجہ وہاں کی خرابی آب و ہوا کے ملتوی ہے۔ وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد"۱

موسم سرما کا ابتدائی حصہ حیدرآباد کی روانگی آب و ہوا دفع ہونے کے انتظار میں گذرا۔ منشی محفوظ علی کے مشورے سے بعض اراکین ریاست کو نور اللغات کی اعانت کے لئے خطوط لکھے تھے اُن کے جواب کا راستہ دیکھا مگر دکن سے صدائے برنخاست۔

قاصدا تو ہی بتا تو نے تو دیکھے ہونگے　　کیسے ہوتے ہیں وہ خط جن کا جواب آتا ہے

مولوی انوار الحسن نے اصرار کیا کہ بھائی کاکوری میں تشریف رکھیں۔ مولانا کو بھی زیادہ مدت تک منشی محفوظ علی پر بار رہنا بار خاطر تھا۔ حیدرآباد کے سفر کی ساعت نہ آتی تھی۔ وکالت چھوٹ چکی تھی۔ لہذا طے کیا کہ فی الحال کاکوری میں قیام ہو اور نور اللغات کی باقاعدہ ترتیب شروع کی جائے جب حیدرآباد سے کوئی امید افزا پیام آگیا تو وہاں کا سفر کیا جائے گا ورنہ اشاعت لغت کی خدا کوئی اور سبیل نکالے گا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۱۰ء سے وطن مالوف میں سکونت اختیار کی۔

کاکوری کا عارضی قیام | مولوی انوار الحسن وکالت سے کنارہ کش ہو کر کاکوری میں خلوت نشین ہوئے تھے اور زندگی کا بقیہ حصہ یاد خدا میں صرف کرنے کی نیت تھی مگر حکام ضلع نے ۱۹۱۰ء میں آنریری مجسٹریٹی سپرد کر دی اور اعزہ کی فہمائش سے اُن کو باوجود ہرج اوقات کے یہ خدمت منظور کرنا پڑی۔ منشی فخر الحسن رئیس کاکوری شریک خدمت بنائے گئے اور باقاعدہ اجلاس ہونے لگے۔ یہ کچہری چار پانچ برس سے قائم تھی اور موروثی کوٹھی کے مغربی دالان میں صبح کے وقت مقدمات کی پیشی ہوتی تھی۔ مولوی نور الحسن نے کاکوری میں قیام منظور کیا تو اسی کوٹھی کے مشرقی دالان میں اُن کا دفتر سجایا گیا۔ دن کے وقت وہاں کام کرتے اور شب کو برآمدہ میں استراحت فرماتے تھے۔

---

۱ مکتوب مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۹ء۔

لغت کی ترتیب شروع ہوئی۔ ۲۰ر مئی [illegible] کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"میں لغت میں مصروف ہوں۔ دم مارنے کی فرصت نہیں پاتا ہوں۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی لیکن یہ صحیح ہے کہ لغت کی دُھن میں طبیعت ہر وقت اسی خیال میں رہتی ہے دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ کاکوری میں دلچسپی خدا جانے کون خوش نصیب ہیں جن کو نصیب ہوتی ہے۔ میں مجبوری سے یہاں ہوں اور اس درجہ تالیف لغت میں انہماک ہے کہ مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ میں کاکوری میں ہوں یا ہردوئی میں۔ سچ یہ ہے کہ نہ وہ دن رہے نہ وہ بن رہے۔ کاکوری کا مذاق اور۔ میرا مذاق اور۔ پھر دلچسپی اور تفریح کیونکر ہو۔ زمانہ بدل گیا۔ مذاق بدل گیا۔ اب تو کاکوری کا باوا آدم نرالا ہو گیا ہے۔"

مولوی نظیر الحسن مرحوم کے صاحبزادے نبی الحسن مولانا کی ولایت اور تربیت میں تھے۔ طاہر حسن بھی ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے اور ان دونوں کی تعلیم میں کسی قدر وقت صرف ہوتا تھا۔ ان کے استفادہ کے لئے سلیس عبارت میں "صرف" کے وہ قواعد نظم کئے جن کے بغیر عربی عبارت نہیں پڑھی جا سکتی۔ ہر قاعدہ کے ساتھ مثالیں بھی نظم کیں اور اس کی تشریحات نثر میں لکھیں۔

جون کی گرمی اور ماہ صیام	ایک ہفتہ میں یہ ہوا ہے کام
طلبہ شوق سے جو یاد کریں	فاتحہ سے مجھے بھی شاد کریں

"تعلیلات منظوم" اس رسالہ کا نام رکھا۔ تالیف نہایت مفید ہے اور اس قابل ہے کہ ابتدائی [illegible] پڑھنے والے طلبہ کو حفظ کرائی جائے۔

رمضان کا مہینہ اور سخت گرمی کا موسم۔ ۲۵ر جون [illegible] کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"ایک ہفتہ سے وہ گرمی پڑ رہی ہے کہ الامان الحفیظ۔ خدا معلوم سورج کب سے جلے پھپھولے پھوڑ تا ہے۔ ہوا کے حبس سے دم بند ہے۔ پسینے کے تڑا کے جھڑی لگائے ہوئے ہیں۔ بادل نے وہ سون کھینچی ہے کہ پناہ بخدا"

اگرچہ لغت کی فکر سے فرصت نہ تھی اور شب و روز کے لئے مشغلۂ دلچسپی موجود تھا لیکن کاکوری کا قیام پسند نہ آیا۔ یکم ستمبر [illegible] کے ایک خط میں لکھا تھا :۔

"قیام وطن کے ساتھ ہر گاہ چند وطن شد مکشد آزار کا تجربہ ہو رہا ہے۔"

۵ر دسمبر کو تحریر فرمایا کہ :۔

"دلم چو قبلہ نما فارغ از تپیدن نیست — بعالمیکہ منم رسم آرمیدن نیست"

مندرجۂ ذیل غزل اسی دور کی بے چینی کی یادگار ہے:-

کیا جانیے کیا کہہ گئے وہ ترچھی نظر میں　　　اک ٹیس سی اٹھتی ہے مرے زخم جگر میں

وہ وعدے کی شب بزم میں غیروں کی جمے ہیں　　　ہم سانس کی صورت کبھی باہر کبھی گھر میں

دو گھر ہوئے آباد تری ایک نگہ سے　　　اک تیر مرے دل میں ہے اک تیر جگر میں

تم بند کیے آنکھیں پڑے رہتے ہو نیرؔ　　　پنہاں تو نہیں پردہ نشیں کوئی نظر میں

مولوی احسن اللہ خاں ثاقبؔ۔ آگرہ کے رہنے والے۔ مولوی نصر اللہ خاں صدر الصدور کے صاحبزادے۔ مولوی محمد محسن کے قدیم شاگرد۔ امیر مینائی سے فن شعر میں تلمذ۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے نیازمند۔ رسالۂ قند پارسی کے اڈیٹر "خطوط منشی امیر احمد" کے جامع۔ فارسی نثر و نظم کے دبیر کامل۔ گوالیار کالج میں پروفیسر تھے۔ مولوی نور الحسن سے دیرینہ مراسم تھے۔ کاکوری تشریف لائے۔ اپنا کلام سنایا۔ مولانا کی نازک خیالیوں کی داد دی اور تالیف لغت کا حوصلہ بڑھایا۔

حضرت ریاض خیر آبادی۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد۔ امیر مینائی کے حاشیہ نشین "خمریات" کے بادشاہ فن شعر میں مرتبۂ استادی رکھتے تھے۔ مولوی نور الحسن سے قدیم شناسائی تھی۔ لغت کی بابت باہم خط و کتابت ہوئی تھی۔ نمونۂ نور اللغات نظر انور سے گذرا تھا اس زمانہ میں کاکوری آئے۔ محاورات و مصطلحات کے متعلق قیمتی مشورے دیے۔ ان کے بھائی سید محمد عسکری وسیم خیر آبادی نے بھی قدم رنجہ فرمایا اور کئی مہینہ تک دفتر نور اللغات کے منتظم رہے۔

حرف الف کے مفردات و مرکبات جمع ہو چکے تھے اور ان کے معانی مع اسناد کے لکھے جا چکے تھے لیکن جب طباعت کی دشواریوں پر نظر جاتی تھی تو ہمت پست ہوتی تھی۔ فرماتے تھے کہ "لغت کی اشاعت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کا خاص پریس ہو۔ دفتر کا کام باضابطہ جاری رہے نقادان سخن مدد دیتے رہیں۔ ایک ایک حصہ ترتیب پاکر ان کی نظروں سے گذرتا جائے اور زیور طبع سے آراستہ ہو کر ملک کے ہاتھوں میں پہونچتا جائے"۔

۲۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو اپنے صاحبزادے مولوی حامد حسن کی فرنگی محل میں شادی کی اور ۱۸ اپریل کو اپنی چھوٹی صاحبزادی کا (جس کو ان کی ماں شیر خوارہ چھوڑ گئی تھیں) نبی حسن خلف مولوی نظیر الحسن کے ساتھ عقد کیا۔ ان رسوم سے فراغت کے بعد لغت کی اشاعت کے لئے پریس خرید کرنے اور مطبع قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ خیال تھا کہ چھاپہ خانہ کاکوری میں کھولا جا سکتا ہے لیکن خیر اندیشوں نے اس تجویز میں دشواریاں بتائیں اور بالآخر طے ہوا کہ مطبع کے لئے لکھنؤ ہی مناسب ہے۔

۱۸ر جون ۱۹۲۶ء کو اراکین انجمن اسلامیہ کے اصرار سے ہردوئی تشریف لے گئے۔ رمضان کا آخری جمعہ تھا۔ جامع مسجد کے امام نے خطبہ میں الوداع پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور بعض جہلا سمجھتے تھے کہ بغیر الوداع اور الفراق کی تکرار کے ماہ مبارک رخصت ہی نہیں ہو سکتا۔ لہذا ایک وفد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کو امامت کے لئے ہمراہ لے گیا۔ راقم الحروف اُس وقت ہردوئی میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔ غریب خانہ پر فروکش ہوئے۔ جمعہ کی نماز پڑھائی۔ ماہ رمضان کو عزت و تکریم سے وداع کیا۔ شام کو رویت ہلال ہوئی۔ دوگانہ عید کی امامت کے لئے ایک شب اور قیام کرنا پڑا۔ اُن کے قدوم کی برکت سے راقم نے رات کے وقت مین پوری کے قطب الاقطاب حافظ محمد عارف کو (جن کا تذکرہ کتاب کے ابتدائی حصہ میں آچکا ہے) خواب میں دیکھا۔ اُن کے قدموں پر سر رکھ کر عالم غفلت میں خوب رویا اور کہتا جاتا تھا کہ

کافر ہو جو سجدہ کرے بت خانہ سمجھ کر　　سر رکھ دیا ہم نے در جانانہ سمجھ کر

علی الصباح بیدار ہوا تو گریۂ شب کا اثر باقی تھا۔ اُسی وقت مولانا سے خواب کا ماجرا بیان کیا فرمایا کہ "یہ خواب بہت مبارک ہے اور اس کا ثمرہ انشاء اللہ جلد ظاہر ہوگا۔" استاد کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی لیکن اُس کی تفصیل کی اس مختصر میں گنجائش نہیں۔

۲۰ر جولائی ۱۹۲۶ء کو مولانا کی چچی یعنی بیوۂ مولوی محمد احسن مرحوم کا انتقال ہوا۔ مولانا کی دو صاحبزادیاں اُن کی نگرانی میں رہتی تھیں۔ مولوی احمد حسن اور حامد حسن کی خاطر داری اور دل نوازی بھی وہی خوب فرماتی تھیں۔ اس سانحہ سے بہت قلق ہوا اور افکار و تردداًت میں اضافہ ہو گیا۔ ہفتہ عشرہ سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اشتداد مرض کی خبر سُن کر کاکوری آگئے تھے۔ تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد پھر وہیں چلے گئے۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۲۶ء کو لکھتے ہیں :—

"چچی مرحومہ کے انتقال سے ایک فکر اور اضافہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو غریق رحمت کرے اور ہم لوگوں کو اطمینان قلب اور یکسوئی خاطر عطا فرمائے۔ نور اللغات کا کام جاری ہے۔ مطبع کی اجازت مل گئی ہے۔ اس کے اجرا کے انتظامات میں مصروف ہوں۔ اگست میں اس کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔"

۲۴ر اگست ۱۹۲۶ء کو بقر عید (ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ) کی نماز پڑھانے کے لئے آخری مرتبہ ہردوئی آئے احباب سے بیان کیا کہ عنقریب "نور المطابع" کا کام شروع ہو جائے گا اور ایک ماہوار رسالہ "گلچیں" یکم اکتوبر سے جاری ہوگا جس کے ساتھ دو ایک جزو نور اللغات کے بھی سلسلہ وار شائع ہوتے رہیں گے۔

شب کو مولوی حمید احمد وکیل کے یہاں دعوت تھی۔ وہاں سے واپس ہوتے ہوئے راہ میں راقم سے کہا کہ "میں ایک مطبع بڑے پیمانہ پر قائم کرنا چاہتا ہوں جس میں نور اللغات کی طباعت کے علاوہ شہر کا متفرق اُجرتی کام بھی انجام پا سکے اور خاندان کے ناکارہ لڑکوں کے لئے کسب معاش کا حیلہ ہو۔"

قیصر باغ میں سکونت | دوسرے روز لکھنؤ تشریف لے گئے۔ منشی احتشام علی کی کوٹھی میں مقیم ہوئے اور مستقل سکونت کے لئے ایک ایسے مکان کی جستجو شروع کی جس میں مطبع اور کارپرداز ان مطبع کے لئے کافی جگہ ہو اور خود بھی مع اہل و عیال کے آسائش سے رہ سکیں۔ بڑی تلاش اور کوشش سے قیصر باغ میں چودھری نصرت علی تعلقدار سندیلہ کے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر ملا۔ مشین خرید کی گئی۔ مطبع جاری ہوا۔ بجائے "نور المطابع" کے "نیر پریس" نام رکھا گیا۔ رسالہ کا نام بجائے "دلچسپ" کے "ادیب اُردو" قرار پایا اور طے ہوا کہ یکم جنوری ۱۹۲۸ء کو رسالہ کا پہلا پرچہ شائع کیا جائے۔

مولوی حامد حسن نے سلسلۂ تعلیم ناتمام چھوڑ کر تجارت کا شوق ظاہر کیا تھا اور ایک دوکان اسٹیشنری کی نظیر آباد میں قائم کر کے نقصان اُٹھا چکے تھے وہ نیر پریس کے منیجر مقرر ہوئے۔

بنی حسن اور طاہر حسن تعلیم و تربیت کے لئے ہمراہ تھے اب راقم کے بڑے لڑکے مشیر احمد کو بھی جو اس وقت انٹرنس کلاس میں پڑھتا تھا اپنی نگرانی میں لیا اور ارشاد فرمایا کہ یہ بھی بنی حسن اور طاہر حسن کے ساتھ رہا کرے۔

غرض ستائیس برس کے بعد قیصر باغ کے پرفضا مقام پر دوبارہ سکونت نصیب ہوئی۔ بالائی منزل میں زنانخانہ تھا۔ نیچے مطبع اور نور اللغات کا دفتر۔ مولوی نظیر الحسن زندہ نہ تھے لیکن اُن کا لخت جگر آنکھوں کے سامنے تھا۔ امیر احمد دور تھا لیکن اُس کا نور نظر قائم مقام تھا۔ بھائی ساتھ نہ تھے لیکن دو صاحبزادے (حامد حسن اور طاہر حسن) خدمت میں حاضر تھے۔ کورس تیار کرنے کی ضرورت باقی نہ تھی لیکن دواوین اور لغات کی ورق گردانی اس کی جگہ تھی۔ کالج میں حاضری درکار نہ تھی لیکن محاورات کی چھان بین کے لئے مشاہیر لکھنؤ سے ملاقات کی ضرورت تھی۔ خیال تھا کہ قیصر باغ کی سکونت ویسی ہی دلچسپ ہوگی جیسے ۱۹۰۱ء میں تھی لیکن "لیت الشباب یعود" کتاب زندگی کی تیس پینتیس ورق الٹ چکے تھے۔ جوانی رخصت ہوئی۔ بڑھاپا آیا۔ خیالات میں انقلاب ہوا۔ نہ وہ دل رہا نہ وہ طبیعت۔ نہ وہ درخشاں امیدیں تھیں نہ وہ بلند ہمتیں۔ روح کی فرحناکی اور خاطر کی شادمانی کافور ہو چکی تھی۔

جگ سارا سونا ہے آنکھوں کا کیا حال ہوا　　دنیا آگے بستی تھی دنیا اب بھی بستی ہے

مذہبُ لاادریت" کی زد میں

(از جناب سید اختر علی صاحب تلہری)

اگرچہ "تحریک اصلاح عیسائیت" ریفارمیشن کے بانی لوتھر نے جرمنی میں پاپائیت کا اقتدار مٹانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اس کی تحریک کو "آزادانہ غور و فکر" سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ وہ ایک نوعیت کے توہمات و تعصبات کو مٹا کر دوسری نوعیت کے توہمات و تعصبات قائم کرنا چاہتا تھا۔ لوتھر کے متبعین پروٹسٹنٹ کہے جاتے ہیں۔ کیتھولک عیسائیوں کی طرح ان کے تبلیغی کارناموں سے بھی خون کی بو آتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ جرمنی کے اس مذہبی مصلح کی جد و جہد نے "پاپائی مسیحیت" کے خلاف عیسائیت کو ضرور ابھار دیا تھا اور اس پہلو سے جرمنی میں بھی "فکری قوتوں" کی کچھ نہ کچھ جلا شروع ہو گئی تھی مگر "عقلیت" کے نقطۂ نظر سے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی البتہ اٹھارھویں صدی سے جرمنی نے بھی "آزادانہ غور و فکر" کے راستہ پر چلنا شروع کر دیا اور مخالف مسیحیت خیالات کی نشر و اشاعت شروع ہو گئی مگر عقلیت کے اس پودے میں ابھی تک نئے برگ و بار پیدا نہیں ہوئے تھے فرانسیسی و انگلیسی افکار ہی کے خرمن سے خوشہ چینی کی جا رہی تھی۔ ہیوم اور برکلے ہی کے نظریات کا ہر طرف زور تھا۔ "انکار مادہ" اور "شک و ارتیاب" ہی کی آوازیں علم و دانش کے حلقوموں سے نکل رہی تھیں۔ عیسائیت نے فکر و نظر کی ان جولانیوں کے خلاف قید و بند کے اسلحہ اٹھا لئے تھے ان کے نازک مذہبی جذبات ان فکری بے باکیوں کے کیونکر روادار ہو سکتے تھے۔ عین اس زمانہ میں کہ جب جرمنی میں ایک طرف "آزادئ خیال" نشو و نما پا رہی تھی اور دوسری طرف "عیسائیت" اس کا گلا گھونٹنے کے لئے آستین الٹ چکی تھی۔ جرمنی کے مشہور مفکر و حکیم کینٹ نے دنیائے فکر و نظر میں قدم رکھا۔

اس وقت خطرہ کی بڑی چیز ہیوم کے "ارتیابی نظریے" تھے جو علت و معلول کے تخیل کی جڑیں کاٹ چکے تھے اور ان تمام چیزوں کو جن میں ہمیں علت و معلول کی کارفرمائی نظر آتی ہے اتفاقیات کا ایک انبار قرار دے چکے تھے۔

ہیوم نے اس مقصد کے اثبات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ ایک دوسرے کے بعد بالالتزام واقع ہونے والی چیزوں میں "فعلیٰ لزوم" نہیں پایا جاتا۔ ہوتا یہ ہے کہ چند چیزوں کے بار بار

ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے رہنے سے دماغ اُن میں علاقہ ضرورت یعنے پہلا دوسرے کی علت ہے اور اس لئے پہلے کے وجود کے بعد دوسرے کا واقع ہونا ضروری ولازمی ہے فرض کر لیتا ہے لیکن حقیقت میں ایک کا دوسرے کے بعد واقع ہونا کوئی چیز سبب ومسبب علت و معلول کی قسم کی ان میں نہیں پیدا کر دیتا۔

ہیوم نے "علاقہ تعلیل" کا انکار صرف مادی دنیا تک محدود نہیں رکھا بلکہ "روح وارادہ" کے افعال تک اُس کی زد میں سے لئے۔

کینٹ ہیوم کی اس "ارتیابیت" کا تار و پود بکھیرنے کے لئے اٹھا تھا اور اس لئے اس کے فلسفہ سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اُن زخموں کے اندمال کے لئے مرہم کا کام دے گا جو "ارتیابیت" نے مذہب کے دل میں ڈال دیے تھے لیکن ستم ظریفی دیکھئے کینٹ کے فلسفہ نے "ارتیابیت" کو ہٹا کر اس کی جگہ "لاادریت" کو دے دی اور اس طرح اُس نے مذہب کے خلاف ایک دوسرا طاقتور حریف پیدا کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ کینٹ نے اپنے "ماوراء التجربی" (Transcendental) دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ دنیا کی بہت سی چیزوں میں "علاقہ تعلیل" پایا جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اُس نے ہمارے علم کو حقیقت سے عاری بنا ڈالا اور اُسے صرف ایسی چیز قرار دیدیا جو مشابہ بعلم ہے اور اس طرح خطرناک لاادریت کا سنگ اساس رکھ دیا۔

ہیوم نے مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا تھا کہ اگر ایک چیز کے بعد دوسری چیز برابر غیر منقطع طور سے واقع ہوتی ہے تو اس سے علاقہ تعلیل کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا کیونکہ ہمارا علم مختلف احساسات کا نام ہے اور ان احساسات میں کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ ایک کا دوسرے کے بعد واقع ہونا محض اتفاقی امر ہے۔

کینٹ نے ہیوم کا یہ دعوے تو مان لیا کہ یہ احساسات فی الواقع ہمیں اشیا میں "علیت و معلولیت" کا پتا نہیں دے سکتے اور اس لئے اگر ہمارے ادراکات کلیۃً صرف انھیں احساسات کا نتیجہ ہوتے اور ہم انھیں کے پابند ہوتے جو ان خارجی اشیاء کے ذریعہ سے ہم تک پہونچتی ہیں تو فی الحقیقت یہاں حقیقی علیت موجود نہیں ہو سکتی بلکہ وہی کیفیت ہو گی جس پر علیت کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن اگر اس کے برخلاف واقعات سے مجبور ہو کر ہم کچھ چیزوں میں "علاقہ علیت" تسلیم کرتے ہیں تو اسے ماننا پڑے گا کہ ہمارے کچھ ادراکات ایک باطنی ذات (Subject) کی بھی ممنون ہیں۔ احساسات کی دنیا خالص اتفاقی

چیزوں کا مجموعہ سہی لیکن پھر بھی غیر محدود احساسات ہی تو ہمارے علم کی پوری کائنات نہیں ہیں۔ ہم جس دنیا کو جانتے ہیں وہ اپنے علاقۂ علیت کے قوانین کی خاطر ایک دماغ کی پابند ہے۔
سابق کے فلسفیوں کے برخلاف وہ انسانی دماغ کو اشیا کے لئے گودام نہیں مانتا بلکہ اس کی نظر میں خارجی اشیا (Objects) "دماغ سے رابطہ علیت کے وہ اصول جو انہیں قابل ادراک بناتے ہیں اخذ کرتی ہیں۔ کینٹ نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر حکیمانہ نظر ڈالی ہے لیکن اس کی ان فلسفیانہ ژرف نگاہیوں کا یہ نتیجہ بہر حال نکلتا ہے کہ جو دنیا ہمارے سامنے موجود ہے وہ واقعی دنیا نہیں ہے جسے ہم جاننا چاہتے ہیں۔ حقیقی دنیا کا اسے ایک ظل یا شبح سمجھئے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہم کسی امکانی طریقہ سے یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ یہ ہماری "ظلی دنیا" حقیقی دنیا سے کیا تعلق رکھتی ہے ؟۔
کینٹ نے اس عنوان سے یہ تو ثابت کر دیا ہے کہ ہماری دنیا میں بہت سی اشیا "علت و معلولیت" کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہیں اور اس طرح ہم ہیوم کی "ارتیابیت" کے جال سے بچ کر ضرور نکل جاتے ہیں لیکن فائدہ ؟ کینٹ کے بنائے ہوئے "حلقہائے دام خیال" سے تو نجات نہیں ہوتی۔ وہ بھی تو ہمیں یہ منوانا چاہتا ہے کہ ہم جن چیزوں سے بحث کر رہے ہیں وہ حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ صرف ہمارے تصورات کا کھیل ہیں۔ جن کو ہمارے باطنی حاسہ (Mind) نے وجود بخشا ہے۔ کینٹ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

> "تمام چیزیں جن میں ہم مصروف رہتے ہیں بغیر کسی استثنا کے مجھی میں موجود ہیں یعنی میری ذات سے متعلق "شؤن واردات" ہیں"۔

گویا ہیوم کے برخلاف کینٹ کی "دنیا" باطنی ہے یا دماغی"۔
مگر اس میں بھی شک نہیں کہ کینٹ نے جو دنیا بنائی ہے اس سے بھی اسی قدر حقیقت مفقود ہے جس قدر کہ ہیوم کی دنیا سے اور اس لئے ہیوم کی "ارتیابیت" مذہب کے "مابعد الطبعیاتی افکار" کو جتنا صدمہ پہونچا رہی ہے اتنا ہی کینٹ کی "لاادریت" بھی۔
اگر ہیوم نے خدا کا اور معجزات کا اپنے ارتیابی رنگ میں انکار کیا ہے تو کینٹ نے بھی اپنے ان نظریات کے ذریعہ سے مذہبی تخیل کو کوئی قوت نہیں پہونچائی ہے۔ کینٹ بھی اس امر کے اثبات میں منہمک نظر آتا ہے کہ ہم جب عقل کی مدد سے خدا کا وجود اور روح کی قدامت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو متضاد باتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ "مابعدالطبیعیاتی حیثیت" سے خدا کا انکار کر دینے کے بعد "فلسفۂ اخلاق" کی خاطر اس نے پھر خدا کا وجود مان لینا چاہا ہے اسی لئے اس کے متعلق یہ ظریفانہ فقرہ مشہور ہو گیا ہے کہ "جس خدا کو اس نے سامنے کے صدر دروازہ سے نکال دیا تھا اسے پھر عقبی دروازہ سے اندر داخل کرنا چاہا ہے"۔ لیکن اس زبردستی کے فرض و تسلیم سے مذہب کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔

کینٹ کے فلسفہ کا حقیقی منشا خواہ "لاادریت" کی براہ راست حمایت نہ ہو لیکن بعد میں جو اس کے مقلدین ہوئے ہیں انہوں نے اس کے فلسفہ کا خصوصی امتیاز اسی "لاادریت" کی حمایت قرار دیا ہے۔

لینگ (Lange) تاریخ مادیت کا مصنف جدید مقلدین کینٹ کا جرمنی میں میر کارواں تھا۔ اس کا اور اس کے فاضل ہمسفیروں کا خیال ہے کہ حکیم کینٹ کے کریٹیک کی خاص کامیابی یہ ہے کہ اس نے ہماری لازمی جہالت کی حدیں مقرر کر کے "مابعدالطبیعیاتی ہوتے" کا آخری طور سے خاتمہ کر دیا ہے۔

اضافیت علم کا نظریہ کینٹ نے "اضافیت علم" (Relativity of Knowledge) کے نظریہ سے جس انداز میں بحثیں کی ہیں حقیقت میں ان سے لینگ ہی کے اس خیال کو تقویت پہونچتی ہے کہ حکیم کینٹ کے فلسفہ کا اصلی محور "لاادریت" ہے۔

کینٹ نے "اضافیت علم" کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ اس کے سابق کے خیالات ہی پر متفرع ہوتا ہے۔

کینٹ نے مختلف مقامات پر اس نظریہ کے متعلق جن الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے ان پر غور کیجئے۔ ایک جگہ کہتا ہے :—

> "اشیاء کی حقیقت من حیث ہی ہی بغیر اس لحاظ کے کہ ہمارے حواس ان کا ادراک کرتے ہیں کیا ہے؟ ہمیں اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا ہم اپنے خاص احساس کی نوعیت و کیفیت کے علم کے سوا جو ہمارے ہی ساتھ مخصوص ہے کچھ اور نہیں جانتے"۔

دوسری جگہ کہتا ہے :—

> "ہم اپنے "تجربی احساس" کا اس بلند ترین درجہ تک پہونچنا فرض کئے لیتے ہیں جو وضوح کی آخری امکانی حد ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اشیاء خارجی من حیث انفسہا (یعنے اپنی ذات میں جیسی وہ ہیں) کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ہمیں اپنے احساسات کے شئون

وکیفیات کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارے معلومات جو احساس سے متعلق ہیں "اضافیات" سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور محض "اضافیات" کے ذریعہ سے کسی چیز کا من حیث ہو ہو علم نہیں ہو سکتا۔ حواس ظاہری ہمیں صرف اضافت (تعلق) کا پتا دیتے ہیں جو مدرک (ادراک کنندہ) اور مدرک (ادراک کردہ) کے مابین ہے لیکن اس حقیقت اصلیہ کا علم نہیں ہو سکتا جس سے اس خارجی شے من حیث ہو ہو کا کالبد بنا ہے"

علم کے متعلق ہملٹن نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ مباحثات (Discussions) میں کہتا ہے :-

"ہمارا تمام علم خواہ وہ ذہن سے متعلق ہو یا مادہ سے اضافی ہے۔ اشیا من حیث انفسہا کو خواہ وہ خارجی ہوں یا داخلی یا تو ہم بالکل نہیں جانتے یا اُن کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہمیں اُن کا کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ان غیر معمولی اشیا کے خارجی مظاہر سے تعلق رکھتا ہے"

میٹا فزکس میں یہی مفکر کہتا ہے :-

"ایک وجود کے ہم ہزاروں شئون فرض کر سکتے ہیں لیکن یہ سب شئون اُس وقت تک ہمارے لئے صفر (زیرو) کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک کہ ہم اتنے حواس نہ رکھتے ہوں جو ان سب شئون کا ادراک کر سکیں۔ لیکن اگر ان شئون وکیفیات کی تعداد کے برابر ہی ہمارے ادراک کرنے والے آلات بھی ہوں تو بھی ہمارا علم موجودہ حالات میں اضافی ہی ہوگا اور ہم ان وجودات من حیث ہی ہی کے متعلق اتنے ہی جاہل رہیں گے جتنے کہ اب ہیں"

عبارات بالا پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفکرین اپنے اس نظریہ کا نقطۂ آغاز اس امر کو قرار دیتے ہیں کہ ہمارے حواس خمسہ اشیا کے بے شمار شئون وکیفیات کا ادراک نہیں کر سکتے اور اگر ہمیں کچھ اور نئے حاسے میسر ہو جائیں تو انھیں چیزوں کے متعلق دوسرے شئون و کیفیات کا اندازہ ہو سکے گا جو اب تک ہم سے مخفی تھے لیکن اگر ہم ان مفکرین کے اس نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیں اور یہ مان لیں کہ خارجی اشیاء کے متعلق ہمارا علم مکمل نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ دنیا کی کوئی دوسری مخلوق ان اوصاف کے متعلق زیادہ علم رکھتی ہو یا پھر ہمارا ہی علم آگے چل کر ان کے متعلق مکمل ہو جائے تو بھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ احساس کی اس "امکانی محدودیت" کے یہ معنی کیونکر ہو سکتے ہیں کہ ہمیں ان اشیاء کے متعلق جو احساس ہو رہا ہے وہ واقعیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

مگر ان منکرین کی "لا ادریت" اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ آگے بڑھتی ہے اور انسانی حواس کی محدودیت اور اُس کے مخصوص عنوان ادراک کو نظر انداز کرتی ہوئی علم کی مطلق اضافیت کا سوال درمیان میں لاکر اپنی جڑیں مستحکم کرتی ہے۔

کینٹ نے صاف صاف کہا ہے کہ علم ادراک کنندہ (مدرک) اور ادراک کردہ (مُدرَک) کے درمیانی تعلق سے عبارت ہے۔ اسے مدرک (ادراک کردہ) کے باطنی عناصر سے کوئی ربط نہیں ہے۔

ہملٹن نے بھی آخری عبارت میں اسے صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ ذہن اور مادہ کے جن اوصاف کا علم ہوتا ہے اُن کی حیثیت محض اضافی ہے۔ ہمیں اُن اشیاء کا من حیث ہی کوئی علم نہیں ہوتا۔ اگر ہمارے حواس کی تعداد بڑھا بھی دی جائے تو اس اضافیت سے ہمیں نجات نہیں مل سکتی۔ اس بحث کا دوسرے لفظوں میں یہی مطلب ہوتا ہے کہ ہم لازمی طور سے کسی چیز کی اصلیت و حقیقت کو نہیں جان سکتے کیونکہ ہم ان چیزوں کا ادراک حواس مدرکہ ہی سے کر سکتے ہیں۔

اس امر کا علم حاصل کرنے کے لئے کہ یہ اشیا حقیقت میں کیا ہیں ہمیں اُن چیزوں کو جاننا چاہئے لیکن جن چیزوں کو ہم جاننا چاہتے ہیں وہ اپنے معلوم بننے کے لئے ہمارے ہاتھوں میں متغیر ہو جاتی ہیں۔ وہ معلوم و مدرک بننے کے لئے اُس مخصوص اضافیت کے سانچہ میں ڈھل جاتی ہیں جس میں وہ پہلے گرفتار نہ تھیں۔ بنا بریں ہمیں ان اشیا کی خالص اصلیت (یعنی اُس اضافیت سے قطع نظر کر کے جو اُن کی ماہیت ہے) کا علم قطعاً حاصل نہیں ہوتا۔ جس چیز کو ہم جاننا چاہتے تھے وہ تو ہمیں حاصل نہیں ہوئی اور اُس کے بجائے کوئی دوسری چیز حاصل ہو گئی۔

اصل تو یہ ہے کہ "لا ادریت" کے یہ مبلغ ان مقامات پر تحکم سے کام لے رہے ہیں۔

ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ فی الواقع اس کا امکان ہے کہ ہمارے ادراکات و احساسات کی نوعیتیں ہمارے ساتھ مخصوص ہوں اور ان اشیا کی جو اصلی کیفیتیں ہیں اُن کی نمائندگی نہ کر رہی ہوں لیکن اسی کے ساتھ کم سے کم اتنا ہی اُس کا امکان بھی کیوں نہیں فرض کیا جاتا کہ ہم جس طرح سے ان چیزوں کا احساس کر رہے ہیں اُسی طرح سے وہ حقیقت میں بھی موجود ہوں؟ ہمارے علم کے سانچہ میں ڈھلتے ہی ان اشیا کی حقیقت کیوں مسخ ہو جاتی ہے؟ آخر وہ کون سے اسباب ہیں جو لازمی طور سے ان اشیا کی حقیقت کو ہمارے دماغوں تک پہونچتے پہونچتے مسخ کر دیتے ہیں۔

فطرت سلیم اس کے تسلیم کرنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتی کہ دنیا کی ہر چیز کو اس عنوان سے مرتب کیا گیا ہے کہ ہمیں اُس کے علم حاصل کرنے میں برابر ناکامی ہوتی رہے۔ اس کے علاوہ

"لاادریت" کے اس نظریہ میں یہ خرابی بھی نظر آئی ہے کہ ایک ہی شے سے علم اور جہل کا بیک وقت تعلق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی حیثیت "اجتماع متضادین" کی ہے۔

خدا بھی کسی چیز کو نہیں جان سکتا

مسٹر پرنگل پٹسن نے اسکاٹش فلاسفی میں ان منکرین کے نظریہ اضافیت کی تشریح میں یہ بھی لکھا ہے :-

"اشیاء کا من حیث انفسہا کسی حالت میں بھی ادراک نہیں ہو سکتا۔ ہماری تو حقیقت کیا ہے خود خدا کو بھی اشیاء کا من حیث انفسہا علم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا بھی بغیر ادراک کے توسط کے کسی چیز کو نہیں جان سکتا۔ اس کے جو قوائے ادراک ہیں انہیں کے توسط سے وہ علم حاصل کر سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا علم بھی اضافی ہوگا۔ مختصر لفظوں میں اس کا مطلب یہی ہوا کہ علم کی ساخت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔"

تشریح بالا سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان حکما کا نظریہ اضافیت علم علم کے ناممکن قرار دینے پر مبنی ہے اور اس سے مذہب پر جو ضرب لگتی ہے وہ ظاہر ہے کیونکہ لاادریین کے ان مزعومات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی معرفت ہو سکنے کا بھی انکار کر دیا جائے۔

علم باری کے عدم امکان کے متعلق حکمائے اسلام کے نظریات

تشریح بالا میں علم باری کے عدم امکان کے متعلق جو اشارہ کیا گیا ہے اس سے بھی اتفاق مشکل ہے۔

علم باری کے ناممکن ہونے کا قول نیا قول نہیں ہے۔ یونانی حکما میں بھی اس کے قائل ملتے ہیں انہوں نے بھی علم کو اضافی سمجھ کر اس کا انکار کر دیا تھا لیکن حقیقت میں علم باری کو اضافی سمجھنا ہی غلط ہے۔ علم باری کو اضافت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اسے اشیاء کے ادراک کے لئے قوائے ادراک کے توسط کی ضرورت ہے۔

محققین حکمائے اسلام کے نزدیک علم باری کی حقیقت ہمارے علم سے بالکل ہی الگ ہے۔ وہ علم باری کو حضوری اور عین ذات قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک واجب تعالیٰ کا تمام ممکنات کے لئے علت تامہ ہونا ہی انکشاف کا مبنی ہے اور ان اشیاء کا واجب تعالیٰ سے صادر ہونا ہی ان کا عین تعقل ہے۔

اگر وہ دلائل صحیح ہیں جو واجب الوجود کے یقین تک منتہی ہوتے ہیں تو پھر یہ بھی لازمی ہے کہ واجب علم محض قرار پا جائے اور تمام ممکنات اس کے حضور میں پوری مکشوفیت اور نورانیت کے ساتھ موجود ہوں۔ اسی کیفیت کو حکمائے اسلام نے "علم اجمالی واجبی" قرار دیا ہے جو عین الکشف

دوسرے لفظوں میں ذات واجب تمام مخلوقات و معلولات کے لئے "صورت علمیہ" ہے اس لئے اُس کی ذات ہی بعینہ تمام اشیاء کے "علمی انکشاف" کا دوسرا نام ہے۔ ایسی حالت میں علم باری کے لئے کسی دوسرے امر کی مداخلت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اُس کی ذات کی "واجبیت" ہی انکشاف تام کے لئے کافی ہے اور کسی دوسرے آلہ تعقل یا ذریعۂ تفکر کے توسط کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

علامہ خضری البیاک شرح تجرید جدید کے حواشی میں فرماتے ہیں:—

"واجب الوجود کے لئے دو علم ہیں۔ ایک 'علم کمالی اجمالی' ہے اور یہ وہ علم ہے جو عین ذات واجب ہے یعنی اس کی ذات اپنی ذات کے لحاظ سے اس نوعیت کی واقع ہوئی ہے کہ وہ تمام موجودات کے انکشاف کا منشا ہے۔ شیخ الرئیس کا نامور شاگرد بہمنیار کہتا ہے کہ اُس کی حقیقت اس نوعیت کی حقیقت ہے جس سے تمام معلومات مفصل حیثیت سے صادر ہوتے ہیں۔ جس طرح سے "معقول بسیط" ہمارے لئے معقولات مفصلہ کی علت ہوتا ہے البتہ فرق اتنا ہے کہ معقول بسیط ہمارے پاس ہماری عقلوں میں موجود ہے اور باری تعالیٰ کے یہاں نفس وجود ہے۔ معقول بسیط کی توضیح مثال ذیل سے ہو سکتی ہے۔

جب تم کسی شخص سے مناظرہ کرو اور وہ تم پر بہت سے اعتراضات وارد کر دے تو تمہارے دل میں اس کے جواب کا ظہور ہو جاتا ہے اور اس کے بعد تم اُس کی تفصیل کرتے ہو یہاں تک کہ کاغذ کے دستے کے دستے بھر جاتے ہیں۔

پہلی کیفیت کو "معقول بسیط" سمجھو اور دوسری کیفیت کو "معقول مفصل" باری تعالیٰ کے ہاں پہلا علم جو ہے وہ مکمل طور سے موجود ہے۔ اور وہ اسی "شہود (حضور) علمی کمالی" میں اپنی ذات کو بھی جانتا ہے اور تمام دوسرے ممکنات کو بھی۔"

اس میں شک نہیں کہ علم حضوری کا صحیح تخیل ہمارے لئے آسان نہیں ہے تاہم خالص عقلی دلائل ہیں اس کے ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔ واجب الوجود کا تخیل بھی تو ہمارے بس کی چیز نہیں لیکن جب دلائل اُس کے وجود کا سراغ دیتے ہیں تو ہمیں اپنے حواس کی بیچارگیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اُسے ماننا ہی پڑتا ہے۔ علم کے کمال ہونے میں شک کی گنجائش نہیں ہے اور چونکہ واجب الوجود کو کسی صفات کمالیہ سے معرّیٰ نہیں مانا جا سکتا اس لئے ذات واجب الوجود میں علم کا موجود ماننا لازمی ہے۔ علم باری کے متعلق حکمائے اسلام نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں شیخ الرئیس کی شفاء و حکمت علامہ محقق طوسی کی شرح اشارات اور تجرید میر باقر داماد کی تقویمات و تقدیسات اور

صدر المتالہین کی اسفار میں اس مسئلہ کے اکثر جزئیات پر بسط سے نظر ڈالی گئی ہیں۔ ہمارے اس دور میں سید مرتضیٰ نونہروی فلسفی مرحوم نے بھی شرح دعائے مشلول میں نہایت جامعیت کے ساتھ مسئلۂ علم باری پر نظر کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان حکمائے اسلام کی تحقیق اُسی پرانے فلسفہ کے افکار پر مبنی ہے جسے آج کل دقیانوسی قرار دیا جاتا ہے لیکن ان کی کہنگی و قدامت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ وہ لازماً غلط ہوں۔

یہ سچ ہے کہ اس طولانی دفتر میں کام کی باتیں زیادہ نہیں ہیں۔ لاحاصل موشگافیوں میں کافی وقت ضائع کیا گیا ہے تاہم اگر ہیوم و کینٹ برکلے اور ہیگل کے پہلو بہ پہلو اپنے ان بڑے بوڑھوں کے افکار پر ایک غلط انداز ہی نگاہ ڈال لی جائے تو فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

ایک علمی ستم ظریفی | "لاادریت" کی تان کو اتنا اونچا لے جانے کے بعد ان حکما نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اپنے علم کے ان "رخنوں" کو عقیدہ سے بند کرنا چاہتے ہیں۔ کینٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اس نے "فکری دنیا" میں یہ سب زحمت اس لئے اٹھائی ہے کہ وہ "اخلاقی عقیدہ" کے لئے جگہ نکال سکے۔ اُس نے علم کا استیصال ہی اس لئے کیا ہے کہ "عقیدہ" ان مقامات پر اپنے قدم جما سکے اور "عقلی فکر و نظر" نے جو زخم لگائے ہیں ان کا "عملی استدلال" سے اندمال ہو سکے۔ اُس کے نزدیک گویا کریٹک کا پہلا حصہ دوسرے حصے کے لئے "منفی تمہید" ہے۔

ہملٹن نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے کہ۔

"میرے اس انکار کا کہ ہم "غیر محدود" کا علم حاصل نہیں کر سکتے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں اس کا اعتقاد بھی نہ کرنا چاہئے۔ درحقیقت ہماری "عالمانہ جہالت" ہی جو فلسفہ کا نقطۂ اختتام ہے مذہب کی ابتدا مستوار پاتی ہے"

کینٹ اور ہملٹن کچھ کہیں مگر اصل تو یہ ہے کہ مذہب سے استدلال کا سہارا ہٹا کر اُسے عقیدہ کی بنیاد پر قائم کرنا نہایت ہی خطرناک طریقہ ہے۔

عقیدہ کے لئے استدلال کی ضرورت | استدلال کو کمزور ثابت کرنے کے بعد عقیدہ کے لئے جگہ نکالنے کا تخیل "فکری خوش مذاقی" کا ثبوت نہیں ہے۔

پائے استدلال کو مطلقاً "چوبیں" بنا کر اُس کے "سخت بے تمکیں" ہونے کا موضوعہ کتنا لطیف خطابت منزدر ہے لیکن برہانی بصیرت سے معریٰ ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ استدلال کو یوں بے دست و پا بنا دینے کے بعد آگے چل کر ہمارا رجحان مذہبی عقیدہ کی طرف نہیں ہو سکتا بلکہ کمل "لا ادریت" کی طرف ہوگا۔ اس کا ایک علمی ثبوت تو یہی ہے کہ حکیم کینٹ نے اپنے "علمی استدلال" سے جو نتائج نکالے تھے وہ یک لخت نظر انداز ہوگئے اور اُس کے نظریے کے جو "منفی نتائج" تھے وہی رائج ہوئے۔

اس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ اگر واقعتاً مذہب اپنی حیثیت محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو اُسے استدلال ہی کے سہارے کھڑا ہونا چاہیئے۔ جو عقیدہ استدلال سے محروم ہے اُس کا سہارا کمزور سہارا ہے۔

مذہب کی بنیاد ایسے عقیدہ پر قرار دینے کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اُسے جہل پر مبنی قرار دیا جائے۔ جب عقیدہ کو استدلال سے محروم قرار دے لیا گیا تو پھر وہ جہل کا ترجمان ہونے کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ایسے عقیدہ میں نہ تو کوئی استحکام ہو سکتا ہے اور نہ اُس میں کوئی نورانی کیفیت ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا عقیدہ یا تو بے معنی اقرار ہے یا پھر شاعرانہ تخیل کا دلچسپ تماشا۔

انگلستان کا مشہور فلسفی لاک کہتا ہے :—

"جو شخص بغیر کسی دلیل کے کسی چیز کا اعتقاد کر لیتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے تخیلات کا عاشق و شیدا ہو لیکن نہ تو وہ صداقت کا جویا ہے اور نہ اپنے خالق کا مطیع بندہ کیونکہ وہ اُن توسلے تمیز سے کام نہیں لے رہا ہے جو اُسے اسی لئے دیئے گئے ہیں کہ غلطیوں سے محفوظ رہے۔ جو شخص اپنے مقدور بھر ان قوتوں سے کام نہیں لیتا ہے بہت ممکن ہے کہ اُس کے قدم صحیح جادہ پر ہوں لیکن یہ محض اتفاقی بات ہوگی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ بخت و اتفاق کی یہ خوش قسمتی اُس کی اس کارروائی کے لئے بے ضابطہ پن کا کفارہ ہو سکے گی۔

اپنے علم اور اپنے تصورات پر غور کرنے کے بعد جن صداقتوں کا بھی ہم پر انکشاف ہوتا ہے وہ ہمارے لئے اُن سے زیادہ قطعی اور یقینی ہوتی ہیں جو "روایتی الہام" کے ذریعے سے ہم تک پہنچتی ہیں کیونکہ اس امر کا علم کہ یہ الہام اولاً خدا کی طرف سے ہوا ہے اتنا یقینی نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ علم جو ہم اپنے تصورات کے ایتلاف و عدم ایتلاف سے حاصل کرتے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں اسکاٹ لینڈ کے مشہور مفکر ریڈ کا بھی قول سن لیجئے :—

"عہد سے نیک آدمی انسانی عقل و فہم کی بے مائگی ظاہر کرنے اور فطرت و استدلال کی روشنی بجھانے کے راستہ پر اس لئے ڈال دیے گئے ہیں کہ الہام و عقیدہ کا وقار بڑھ جائیں۔ جو اسلحہ مذہب کی حمایت

کے لیئے اُٹھائے گئے تھے اُن سے اُس کے ختم کرنے کا کام لیا جا رہا ہے اور جسے "مذہبی پختگی" کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا وہی کفر و انکار کا مستحکم ترین سہارا بن گیا۔

مدرین "انسانی فہم" کی بیاگی ظاہر کرنے میں مذہبی لوگوں کے بالکل ہم نوا ہو جاتے ہیں تاکہ یہی "لاادریت دار تیابیت" کے غار میں جھونک دیں۔"

لاک اور ریڈ نے ان "عقیدئین" کے نظریہ کی خرابی جس عنوان سے واضح کی ہے وہ نہایت ہی متین ہے۔"

اس بحث کا یہ منشا نہیں ہے کہ عقل سے غلطی نہیں ہوسکتی یا اُس کی محدودیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اس ناقص و محدود دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں ہے۔ ہمیں جن حالات میں رکھ دیا گیا ہے اُن کے حدود کا لحاظ رکھ کر ہی ہم اپنے لیئے راستہ تجویز کرسکتے ہیں اور وہ راستہ یقیناً عقل کا راستہ ہے۔

جہان آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

گم ہے احساس خودی ہوش کے میخانے میں
بھر کے ساقی نے یہ کیا دے دیا پیمانے میں

رونق حسن کہاں حسن کے کاشانے میں
اُف لپک شعلے کی جلتے ہوئے پروانے میں

طلب بادۂ سرجوش میں غیرت کیسی
ہوش پہلے سے ڈبو رکھے ہیں پیمانے میں

سوزش دل نہ سہی شعلۂ رخسار سہی
جمع ہیں دونوں سوا ایک ہی افسانے میں

بندۂ حسن نہیں حسن کا منکر ہے شیخ
ایک بت اور بھی دل کے صنم خانے میں

کیوں انا الحق وہ کہے واصل حق جو ہو جائے
کچھ ابھی بو ہے خودی کی ترے دیوانے میں

یاد کو مردہ تمناؤں کی دل سے کب کام
خاک اُڑانے کو بہار آئی ہے ویرانے میں

دل کا ٹوٹا ہوا شیشہ ہے دہان نیرنگ
ساری دنیا کے ہیں نقشے مرے افسانے میں

آرزو خود مئے بے کیف میں آ جائے گا کیف
اور کچھ دور گذارو ابھی میخانے میں

مقالات قزوینی

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بی اے)

مقالہ نمبر ۷

کتاب راحۃ الصدور[1]

کتاب "راحۃ الصدور و آیۃ السرور" خاندان سلجوقیہ ایران و عراق (بمقابلۂ سلجوقیہ کرمان و سلجوقیہ روم) کی تاریخ کی نہایت عظیم الشان اور معتبر تاریخ ہے۔ اس کا مصنف محمد بن علی بن سلیمان الراوندی چھٹی صدی ہجری کا ہے اور اس کا سنہ تالیف ۵۹۹ھ ہے یعنی دولت سلجوقیہ کے ختم ہونے اور اس کے آخری بادشاہ طغرل بن ارسلان کے تکش خوارزم شاہ (۵۹۰ھ) کے ہاتھ سے قتل ہونے سے نو سال بعد یعنی اس کتاب کی تالیف کی ابتدا ۵۹۹ھ میں ہوئی اور بظاہر اختتام ۶۰۳ھ میں ہوا۔

اگرچہ مصنف خود اہل راوند سے ہے جو محال کاشان کا ایک قصبہ تھا[2] اور اس کی تمام عمر عراق میں گذری اور وہ خود اور اس کا خاندان اخیر بادشاہان سلجوقیہ عراق کے متوسلین سے تھا مگر اس کتاب کو جو اس خاندان کے اختتام کے بعد تصنیف ہوئی ایک بادشاہ سلجوقیۂ روم سلطان غیاث الدین کیخسرو بن قلج ارسلان (۶۰۰ھ لغایت ۶۰۷ھ) کے نام اس نے معنون کیا اور خود قونیہ میں جاکر بادشاہ مذکور کی خدمت میں اس کو پیش کیا۔

یہ کتاب ظاہراً سب سے قدیم کتاب ہے[3] جو زبان فارسی میں سلاطین سلجوقیہ ایران کے حالات میں اب تک باقی ہے۔ اور چونکہ مولف خود بعض سلاطین سلجوقیہ کا معاصر اور متوسل تھا لہٰذا جو حالات کہ

---

[1] یہ مضمون میرزا محمد قزوینی نے "جہان" کے فرضی نام سے لکھا تھا۔ (مترجم)

[2] احتمال قوی ہے کہ یہ راوند وہیں کا ذکر "معجم البلدان" اور "انساب سمعانی" وغیرہ میں ہے اور ہمارے بعض علماء اس سے منسوب ہیں۔ ان حالات کی بنا پر کہ جو ان کتابوں میں دیے ہوئے ہیں وہی موجودہ راوند ہے جو کاشان کے مغرب اور قم کے جنوب میں دس دس فرسنگ کے فاصلہ پر ایک قریہ ہے مگر راوند کا نام حمد اللہ مستوفی کی "نزہۃ القلوب" میں نہیں ہے۔

[3] ان کتابوں میں جو زبان عربی میں سلجوقیہ ایران و عراق کے حالات میں راحۃ الصدور سے پہلے تصنیف ہوئیں صرف ایک کتاب باقی ہے یعنی تاریخ سلجوقیہ از عماد الدین کاتب اصفہانی مصنف خریدۃ القصر۔ اس کتاب کا سنہ تالیف ۵۷۹ھ ہے اور یہ اب تک شائع نہیں ہوئی ہے مگر اس کا خلاصہ جو فتح بن علی البنداری نے ۶۲۳ھ میں کیا تھا، بمقام لیڈن (ہالینڈ) کتب تاریخ سلجوقیہ ایران و کرمان و روم کے سلسلہ میں مشہور مستشرق ہوتسما کے اہتمام سے ۱۸۸۹ء میں چھپ گیا ہے۔

اس خاندان کے علی الخصوص آخری سلاطین کے اکثر وقائع کہ جو کتاب میں درج ہیں نہایت اہمیت رکھتے ہیں اور یہی کتاب متاخرین کی کتب تواریخ مثلاً جامع التواریخ۔ تاریخ گزیدہ۔ العراضہ فی تاریخ السلجوقیہ۔ زبدۃ التواریخ حافظ آبرو۔ روضۃ الصفا۔ حبیب السیر وغیرہ کا ماخذ ہے کہ ان سب نے حوالہ کے ساتھ یا بغیر حوالہ دئے اسی سے اخذ کیا ہے۔

اب تک سوائے ایک نسخہ کے جو کتب خانۂ پیرس میں محفوظ ہے کتاب راحۃ الصدور کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا میں موجود نہیں یعنی بہر صورت اب تک اس کا ہم کو سراغ نہیں لگا ہے۔ لہذا یہ کتاب مطبوع صرف اسی نسخۂ وحیدہ پر مبنی ہے۔ یہ نسخہ قلمی نہایت خوشخط بخط نسخ بڑی تقطیع پر ۱۷۹ ورقوں میں ۶۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اگر کسی شخص کو اس کتاب اور اس کے مصنف کے مزید حالات دریافت کرنا ہوں تو وہ اُس مفصل دیباچہ کا مطالعہ کرے جو فاضل ناشر نے زبان انگریزی میں کتاب کے ساتھ ملحق کیا ہے۔ اور نیز "تاریخ جہانگشائے جوینی" جلد اول کا مقدمہ جس کو میرزا محمد قزوینی نے تحریر کیا ہے۔

کتاب راحۃ الصدور سر محمد اقبال پروفیسر زبان فارسی اورنٹیل کالج لاہور کی تصحیح و اہتمام سے نہایت صحت اور قابلیت کے ساتھ مع ایک مفصل مقدمہ بزبان انگریزی اور تین فہرست ترتیب وار درخصوص اسمائے اشخاص و اسمائے مقامات و اسمائے کتب و مع حواشی و فرہنگ لغات نادرہ مطبع بریل (E. J. Brill) لیڈن (ہالینڈ) میں نہایت پاکیزگی اور خوبی کے ساتھ عمدہ کاغذ پر ۵۷۶ صفحات متن اور ۴۲ صفحات مقدمہ ۱۹۲۱ء میں بسلسلۂ کتب اوقاف گیب (Gibb Memorial Series) چھپی ہے اور حق یہ ہے کہ ناشر فاضل نے کمال تبحر اور وسعت معلومات کے ساتھ کہ جو زبان فارسی و عربی میں اُن کو حاصل ہیں نہایت دقت و احتیاط سے تصحیح کرکے کتاب کو طبع کیا۔ یہ ایک عظیم الشان احسان زبان فارسی پر اُن کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کو بھی اُن کی توفیق نیک عطا کرے۔ مگر افسوس ہے کہ یورپ میں ہر چیز کی گرانی کی وجہ سے، منجملہ جس کے قیمت کاغذ و اجرت طباعت بھی ہے، اس کتاب کی چھپائی میں بہت روپیہ صرف ہوا۔ لہذا اس کی قیمت نسبتاً یعنی قبل جنگ کی قیمتوں کے مقابلہ میں بہت گراں ہے یعنی دو پاؤنڈ ساڑھے سات شلنگ علاوہ محصول ڈاک۔

اب ہم بعد ایک سطحی مطالعہ کے جو اس کتاب کا ہم نے کیا بعض جزوی اغلاط کی طرف اشارہ کرتے ہیں (اس کے مؤلف نے کتاب کی چند جزوی غلطیاں دکھائی ہیں جنکا ذکر اُردو ترجمہ میں بیکار معلوم ہوا معترجم)

مقالہ نمبر ۸

پیرس سے ایک خط

(۲۴ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۷ جولائی ۱۹۲۴ء)

عزیز محترم۔ آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۲ جون مع دو نمبر اول و دوم "مجلہ علوم مالیہ و اقتصاد" جو آپ نے مجھ کو مرحمت فرمایا چند روز ہوئے کہ موصول ہوا۔ میں آپ کی اس عنایت والطاف کا کمال متشکر ہوں اور شکریہ کے بعد اس بات کا افسوس ظاہر کرتا ہوں کہ آپ کے قیام پیرس میں صرف ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکا۔ جو کلمات تعریف آپ نے اس خاکسار کے متعلق لکھے ہیں اور خاکسار کو پوری آزادی اظہار خیال کی اپنے مضمون کی تنقید کے متعلق عطا فرمائی ہے اس کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں مگر قبل اس کے کہ کچھ تنقیدی طور پر لکھوں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے مضمون کا اصل موضوع جس میں نہایت اہم و ضروری واقعات و اطلاعات جدیدہ متعلق مسائل مالیہ اور خاصکر خالصجات دولتی کے درج ہیں اس قسم کا ہے کہ بندے کو کسی طرح کی بھی اطلاع ان مسائل کی حاصل نہیں ہے کیونکہ یہ موضوع بندے کی اطلاعات محدود سے بالکل خارج ہے لہذا اگر اپنے خیالات کا اظہار ان معاملات میں زبردستی کروں تو یہ ایک قسم کی رعونت اور ادعا بندے کی جانب سے ہوگا۔ پس آپ کے ارشاد کے بموجب مجبوراً بعض جزئی خیالات اپنے جو اصل مضمون کی عبارت و املاء و انشاء سے تعلق رکھتے ہیں اپنی ناقص معلومات کے اندازہ کے موافق عرض کرتا ہوں۔

اولاً میں جناب کو مضمون کے حسن انشاء اور سلاست عبارت کے متعلق علی الخصوص یہ کہ آپ نے تمام عبارت و کلمات و جملے و اصطلاحات، و طرز بیان بالکل اپنی اصلی زبان یعنی فارسی میں لکھے ہیں تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں اس وجہ سے کہ آجکل ہماری قومی زبان میں اس قسم کے مضمون نگار شاذ و نادر ہی ملیں گے۔ اگر اس زمانے میں کوئی شخص فرانس میں کوئی چیز زبان فرنچ میں یا جرمنی میں زبان جرمن میں یا انگلستان میں زبان انگریزی میں لکھے تو یہ مطلق کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی مگر ایران میں اس زمانے میں اپنے خیالات مضامین علمیہ کے متعلق اپنی زبان مادری میں ظاہر کرنا ایک عجیب و غریب چیز اور ایسا ہی عنقا ہے جیسے کہ سیمرغ اور کیمیا۔

میں خود ایک عرصہ سے ایران سے نکلا ہوا ہوں اور وہاں کے لوگوں میں نہیں ہوں کہ کوئی صحیح حکم اس معاملہ میں لگا سکوں مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر آجکل کی زبان فارسی کا معیار جو

ایران کے اخباروں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے، چند دن اور قائم رہا تو بلا شک و شبہ اور بلا مبالغہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر صرف دس بیس ہی برس ہماری زبان اور ادب کا یہی حال رہا تو عنقریب ہی سعدی و حافظ کی زبان بالکل نسیاً منسیا ہو جائے گی اور اُس کی جگہ ایک نئی زبان لے گی جس میں فارسی و عربی و فرنچ و روسی و انگریزی و ترکی الفاظ بھرے ہوں گے مثل ہندوستان کی اُردو یا الجزائر کی موجودہ عربی کے۔

میں ہر چند اس معاملہ پر غور کرتا ہوں کہ یا اللہ ادبیات ایران کے اسقدر جلد تنزل اور زبان فارسی کی اس غارتگری کا آخر کیا سبب ہے، تو اس کا راز میرے مطلق سمجھ میں نہیں آتا اس وجہ سے کہ ایک طرف تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ سلطنت جدید (مشروطہ) قائم ہو جانے کے بعد ایرانیوں میں وطن پرستی کا احساس یقینی پیدا ہو گیا ہے اور لوگوں کا عام میلان اپنے ملک کی بقا اور حفظ قومیت کے جانب پوری طرح مبذول بلکہ روز بروز ترقی پر ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری طرف یہ اظہر من الشمس ہے کہ قومیت کے مہم ترین اور اعلےٰ ترین عناصر میں ایک قومی زبان کی موجودگی ہے جس کا ہمارے یہاں پتہ نہیں۔ لہٰذا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تناقض کو کس چیز پر محمول کروں کہ آجکل کے لکھنے والے ایک ہی وقت میں ایک طرف تو وطن پرستی کی فریاد کرتے ہیں اور حفاظت ایران اور بقائے قومی کا لمبا چوڑا دعوے کرتے ہیں مگر دوسری طرف جان بوجھ کے اور عمداً اپنے ہی ہاتھ سے اُسی قومیت کی جڑ پر ایک سخت تبر لگاتے ہیں اور بقائے ملت کا سب سے بڑا سبب کہ جو یقینی زبان فارسی ہے اُس کو اتنی سختی اور تیزی کے ساتھ مٹاتے جاتے ہیں۔ اور ہر روز اور ہر تحریر میں ایک ضرب تازہ سے اپنی قدیم اور قومی زبان کا ہاتھ اور سر زخمی اور مجروح کرتے جاتے ہیں۔ اُن کی وہی مثل ہے جیسا کہ ایک شخص ایک شاخ پر بیٹھا ہوا اُسی شاخ کو اپنے تبر سے کاٹتا جاتا تھا۔

کبھی اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتا ہوں کہ یہ تناقض عملی جو بالفعل میں اپنے ہم وطنوں میں دیکھتا ہوں ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ وہ ملیت اور قومیت کا حقیقی مفہوم نہ سمجھتے ہوں کیونکہ یہ تو کسی طرح عقل میں نہیں آتا کہ کوئی شخص جان بوجھ کے اور عمداً اپنے وطن کا اس قدر خائن اور گنہگار رہے۔ بالفرض اگر کوئی ایسا کمبخت ہو بھی تو اُس کا وجود مثل عنقا کے ہے یعنی کوئی ایسا شخص کہ جو ایک طرف تو وطن پرستی کا دعوے کرے اور دوسری طرف مادر وطن کے سر کاٹنے پر مائل ہو۔

مگر افسوس اور صد ہزار افسوس ہے کہ اتحاد ملی کو مٹانے کے واسطے خواہ کوئی کام جان بوجھ کے اور عمداً کیا جائے یا ناواقفیت اور غفلت سے عمل میں آئے ان دونوں کا نتیجہ خارج میں ایک ہی ہوتا ہے اور فطرت کی نظر میں اور انہدام ملیت کے اسباب میں کوئی عذر کسی طرح کا مقبول نہیں ہو سکتا۔ تاریخ اس کی شاہد ہے اور سیکڑوں مثالیں پیش کرتی ہے کہ بڑی بڑی قومیں جو عروج کے زمانے میں بہت کامیاب و مستقل تھیں وہ اپنے افراد کی غفلت اور ناواقفیت کی وجہ سے اور نیز اپنے اکابر کی غلطی اور سستی سے بحر فنا میں ڈوب گئیں اور ایسی ڈوبیں کہ اب قیامت تک ابھر نہیں سکتیں اور اب سوائے ان کے نام کے کوئی نشان تک ان کا باقی نہیں ہے۔

سب سے زیادہ عجیب چیز اس زمانے میں یہ دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں کسی گوشہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ زبان فارسی سے تمام عربی الفاظ خارج کر دیے جائیں اور عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ زبان عربی ایک خارجی عنصر ہے جو بعض اسباب تاریخی کی وجہ سے زبان فارسی پر مسلط ہو گئی اور اس کو غارت کر دیا۔ مگر یہی حضرات جو ایک غیر زبان کے اس قدر دشمن ہیں ساتھ ہی اس کے یوروپی الفاظ و اصطلاحات کے استعمال میں اپنی وہ خود داری اور ملت پرستی مطلق نہیں دکھلاتے اور بلا تکلف اپنی تحریروں میں انگریزی و فرنچ و جرمن الفاظ و اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ یہ تناقض پہلے سے بھی زیادہ عجیب تر ہے کیونکہ اولاً عربی الفاظ تقریباً ہزار برس سے زبان فارسی میں داخل ہو گئے اور کثرت استعمال اور طول مدت کی وجہ سے اپنی اصلی قومیت کو گویا کھو بیٹھے اور ایک دوسری قومیت کو اختیار کر کے زبان فارسی کے "ہمشہری" (ہم وطن) ہو گئے اور اب وہ مطلق خارجی خیال ہی نہیں کیے جا سکتے۔ اس کی مثال یہی ہے کہ جیسے مثلاً ایک ہندی خاندان کئی سو برس سے ہندوستان سے ہجرت کر کے ایران چلا گیا ہو اور وہاں اس کے بال بچے ہوئے ہوں تو اب وہ کسی طرح ہندی نہیں شمار ہو سکتا ہی صورت ان قبائل عرب کی تھی کہ جو شروع اسلام میں فوج کے ساتھ یا تجارت و زراعت کی غرض سے ایران آئے مثلاً شیبانی و غفاری و انصاری و خالدی وغیرہ بلکہ ان سب سے زیادہ واضح اور روشن مثال صحیح النسب سیدوں کی ہے کہ جو اپنے خاندانی شجروں کے اعتبار سے قطعاً اور یقیناً عرب تھے مگر اب سیکڑوں برس کے بعد ایران میں قیام کی وجہ سے سب ان کو ایرانی ہی جانتے ہیں اور حقیقت میں وہ ایرانی ہی ہیں اور اپنے ملک کی نیکی و بدی اور نفع و نقصان میں ایرانیوں کے سہیم و شریک ہیں۔

ہماری قومی مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) میں منجملہ دیگر وکلا کے ہمیشہ بعض حضرات سادات ضرور

شامل ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ صحیح النسب سادات ایرانی ہیں یا عرب؟ اگر آپ ان کو عرب اور عنصر خارجی کہیں تو ایرانی ان کو اپنا وکیل کیوں بناتے ہیں اور اگر ایرانی سمجھیں تو ان کے صحیح شجرے کے متعلق آپ کیا حکم دیں گے۔ لازمی یہی کہیں گے کہ گو یہ قومیت کے اعتبار سے غیر ایرانی ہوں مگر ملیت کے اعتبار سے یہ سب ایرانی ہیں۔

اور گویا نژاد (نسل) اور ملیت کے مفہوم میں فرق نہ کرنا باعث اشتباہ ہے اس وجہ سے کہ چونکہ نژاد ایک امر طبیعی اور غیر قابل تبدیل ہے لہذا ممکن ہے کہ خارجی ہو مگر ملیت جو ایک امر دقومی اور اصطلاحی ہے ہمیشہ قابل تغیر و تبدیل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کو کسی نژاد کا ہو محض کسی ملک کی طبیعت (حق باشندگی) حاصل کرکے اُس ملک کی قوم میں داخل ہو سکتا ہے اور اس قوم کا ایک فرد اور ایک عضو محسوب کیا جا سکتا ہے۔

ان نئی روشنی والوں سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا تم لوگ ایران کے سادات کو ایرانی سمجھتے ہو یا خارجی اور اگر بالفرض تم صاحب اختیار ہو جاؤ تو اُن سب سادات اور غیانی و غفاری و انعاری وغیرہ فرقوں کو تم ایران سے خارج کر دوگے یا کم سے کم اُن کو خارج از ملک شمار کروگے؟ اگر سادات اور دیگر قبائل عرب کو جو ایران میں بالفعل موجود ہیں خارج کر دیا اُن کو خارجی سمجھو تو تم کو اختیار ہے کہ عربی الفاظ کو بھی جو وہ اپنے ساتھ ہزار سال پیشتر لائے تھے خارجی جانو اور اُن کو زبان فارسی سے نکال باہر کرو اور اگر اُن سب سادات اور بقیہ قبائل عرب کو ایرانی اور تابع ایران خیال کرتے ہو تو عربی الفاظ کو بھی فارسی ہی شمار کرو۔ ان دونوں معاملات میں ذرہ برابر مجھ کو فرق نہیں معلوم ہوتا۔

اسی زبان فرنچ کو جس کے الفاظ و اصطلاحات اپنی عبارتوں میں لکھنے کے تم اس قدر شائق ہو اور اُس پر فخر کرتے ہو غور سے دیکھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ اُس میں سو کلمات میں ننانوے لفظ لاطینی اور یونانی ہیں اور اپنے اصلی الفاظ شاید فی صدی ایک سے بھی زیادہ نہ ہوں مگر فرنچ قوم جس کی تقلید کے تم اس قدر والہ و شیدا ہو کبھی اس بات کا خیال بھی دل میں نہیں لاتی کہ لاطینی اور یونانی الفاظ اپنی زبان سے خارج کر دے۔ پس میں پوچھتا ہوں کہ اس معاملہ میں بھی تم ان کی تقلید کیوں نہیں کرتے اور اپنی عمر عزیز اور نیز پڑھنے والوں کا وقت بیکار اس فضولیات و لغویات میں کیوں ضائع کرتے ہو۔

میرا مضبوط عقیدہ یہ ہے کہ آجکل کے فاضل مضمون نگار جو زبان فارسی مردجہ پر ایک

ضرب شدید لگا رہے ہیں یہ اس ضرب سے کہیں زیادہ مہلک اور سخت تر ہے جو عربوں یا تاتاریوں نے اپنے زمانے میں اس زبان پر لگائی تھی اس وجہ سے کہ عرب اور تاتاری تو جو کچھ چاہتے تھے تلوار کے زور سے کرا لیتے تھے اور جب یہ صورت حال ہو تو سوائے تسلیم و رضا کے چارہ کیا ہے مگر اس زمانے میں تو یہ جبر و استبداد مطلق نہیں پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جدید خیال حضرات بغیر کسی عذر معقول کے بلکہ بغیر کسی قسم کے عذر و بہانہ کے اپنے بزرگوں کی زبان بے تکلف غارت کر رہے ہیں۔ وہ زبان جس کو ہمارے آبا و اجداد نے ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک باوجود بڑے بڑے حملوں اور سلطنتوں کے مٹنے کے بطور امانت اپنے کلیجہ سے چمٹا کے رکھا اور ہم کو سپرد کر گئے مگر اب یہ حال ہے کہ اُن کی اولاد ناخلف بلا کسی اکراہ و اجبار کے بلکہ نہایت خوشی خوشی اور جان بوجھ کے اُسی اپنی پیاری زبان کو اپنے ہی ہاتھوں مٹائے ڈالتے ہیں اور اس قیمتی خزانہ کو جو ہزار سال کی محنت اور کوشش سے رودکی، فردوسی، عنصری، نظامی، خاقانی، سعدی، حافظ وغیرہ نے جمع اور فراہم کیا تھا بے دریغ برباد کر رہے ہیں اور محض اہل یورپ کی کورانہ تقلید میں خاک میں ملائے دیتے ہیں۔ اس دردِ دل کا بیان کہاں تک کروں۔ مختصر یہ ہے کہ جب کوئی ایرانی اخبار میرے پاس پہونچتا ہے اور اُس میں اس قسم کے کسی مضمون پر اتفاقاً میری نظر پڑتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب اس بلائے عظیم سے بدون کسی حیلہ و چارہ کے مجبوراً اور اتفاقاً دوچار ہوتا ہوں تو سچے دل سے موت کی تمنا کرتا ہوں اور بے اختیار اپنے دل سے کہتا ہوں کہ کیا مبارک تھے وہ لوگ جو اب سے چند سال پیشتر مرگئے اور زبان فارسی کی اس جانکنی کی تکلیف کو اپنی آنکھوں سے اُنھوں نے نہ دیکھا۔

(اس کے بعد فاضل مصنف نے چند غلطیاں نکالی ہیں جو اصل مضمون میں تھیں جو اُن کے پیش نظر تھا۔ مگر چونکہ اکثر کا تعلق خاص زبان فارسی سے ہے لہذا بعض نظرانداز کر کے صرف دوچار غلطیاں جن کا تعلق اُردو کی املا و انشا سے بھی ہے یہاں دی جاتی ہیں۔ مترجم)

نسبتاً۔ غلط نسبۃً۔ صحیح۔ قضاوت۔ مشہور غلطی ہے۔ کیونکہ قضی یقضی ناقص یائی ہے نہ کہ واوی۔ مگر یہ ایسی غلطی ہے جو عام و خاص میں مستعمل ہے لہذا اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح لفظ مُہر جو فارسی ہے اُس کی عربی جمع امہار اور مشتق اسم مفعول ممہور گو کہ قاعدہ سے غلط ہے مگر غلط العوام اور کثرت استعمال کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔

الفاظ حقیقۃً، کلیۃً، غفلۃً، فجاءۃً، مقارنۃً، صورۃً، نسبۃً وغیرہ اس طرح صحیح ہیں نہ

یہ کہ ان کے آخر میں الف مع تنوین لکھا جائے جو فاحش غلطی ہے۔
لفظ پرگرام (یعنے پروگرام) جو آپ نے لکھا اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے فارسی مرادفات موجود ہیں۔ شاید عذر میں آپ یہ کہیں کہ الفاظ پسٹ (پوسٹ) وتلگراف وتلفون واوتومبیل (یعنی موٹرکار) بھی اسی قسم کے ہیں اور زبان فارسی میں داخل ہوگئے ہیں تو اس کے متعلق میں کیا عرض کروں۔ ممکن ہے ان سب الفاظ کو حق ہمسائگی زبان فارسی میں پیدا ہوگیا ہو۔ میں چونکہ ایران سے بہت عرصے سے نکلا ہوا ہوں لہذا اس کی صحیح حالت سے ناواقف ہوں۔ والسلام۔

غمگین نظم

(جناب سرور الہ آبادی)

فرط غم سے آج ہیں افسردہ دل اہل جہاں — اُٹھ گئے بزم سخن سے اصغر معجز بیاں
اُن کے دم سے تھی نشاط افزا فضائے روزگار — ہوگئی تاراج سب حسن معانی کی بہار
اب کہاں شعر و سخن کے ساز و سامان دلفریب — اب کہاں پیش نظر وہ بزم امکان دلفریب
قوت تخئیل میں اُن کے عجب اعجاز تھا — یعنی ہر نغمے میں کیف حافظ شیراز تھا
اہل دل کو اس لئے حاصل سکون دل نہیں — پیش چشم شوق وہ آرائش محفل نہیں
بیٹھ کر بزم سخن کو رنگ پر لائے گا کون — بادۂ خوش رنگ کے وہ جام چھلکائے گا کون
اُن کا ایک اک شعر شرح نکہت بیدار لطیف — مطلع رنگیں سے ظاہر صبح انوار لطیف
دست حسرت مل کے کہتے ہیں یہ سب اہل کمال — ہے کہاں دنیا میں ایسا شاعر شیریں مقال
کون اب منظر دکھائے وہ امید و بیم کا — کون اب جلوہ دکھائے کوثر و تسنیم کا
ان کی وہ رنگیں بیانی وہ لطافت اب کہاں — فلسفہ کی چاشنی میں وہ حلاوت اب کہاں
بزم عرفان و حقیقت رہتی تھی پیش نظر — موت نے آکر کیا اسرار حق سے باخبر
اصغر مرحوم تو ہیں شیخ کے پہلو نشیں — روح پہونچی ہے نکل کر جسم سے خلد بریں

سرورِ خستہ جگر کی ہے دعا بے قال و قیل
حشر کے دن بخش دینا ان کو اے رب جلیل

نیاز کی جراَت بے جا

(جناب منشی نانک چند سریواستو صاحب عشرت ایم۔اے۔مولوی فاضل)

(بسلسلۂ الناظر ماہ دسمبر ۱۹۳۳ء)

شعر اصغر | دیکھنے والے فروغ رخ زیبا دیکھیں ۔۔۔ پردۂ حسن پہ خود حُسن کا پردا دیکھیں

اعتراض نیاز | دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے کیونکہ اول تو " پردۂ حسن " کے استعمال کی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور مصرعۂ اولیٰ میں کوئی ایسی بات ظاہر نہیں کی گئی جس سے " پردۂ حسن " کا تعلق ہوتا اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ یہاں "حُسن زیر نقاب" ہی کا ذکر ہے تو پھر حُسن کا پردہ کیا چیز قرار پائے گی۔ جب کہ فروغ رُخ زیبا مصرعہ اول میں کھلم کھلا اس کے منافی واقع ہے۔ اگر " حسن کا پردہ " کے بجائے " حسن کا جلوہ " لکھا جاتا تو خیر کچھ نہ کچھ مفہوم پیدا ہو جاتا۔ غالب کا شعر ہے

منھ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں ۔۔۔ زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منھ پر کھلا

معلوم ہوتا ہے کہ اصغر صاحب نے اسی شعر کو سامنے رکھ کر فکر فرمائی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ غالب کے شعر کا ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے اور اصغر صاحب نے " حسن کا پردہ " کہہ کر اس کو مہمل بنا دیا۔

عرض عشرت | بھائی صاحب آپ اصغر صاحب کے " پردۂ حسن " کو نہیں سمجھ سکے۔ غلطی سے اس کے معنی " حسن زیر نقاب " سمجھ کر شعر کو غالب کے شعر سے ملا دیا حالانکہ اصغر صاحب کا مضمون بالکل جدا گانہ ہے اور غالب کے شعر سے اُسے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اصغر صاحب کی طبیعت میں بڑی جدت ہے اور ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے مگر ہاں یہ صحیح ہے کہ اصغر صاحب کسی کی سمجھ کے ٹھیکہ دار نہیں ہیں۔ " پردہ " کے معنی اصغر صاحب نے (جیسا کہ ہم اس سے پہلے ایک شعر کی تشریح میں لکھ چکے ہیں) اُس پردہ کے لئے ہیں جو تھیٹر وغیرہ میں ہوتا ہے اور جس پر نقش و نگار، سین، سینری وغیرہ بنے ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح ایک پردہ کے آگے دوسرا پردہ اکثر گرا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے پردۂ حسن معشوق پر خود تابش حسن کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جس سے نگاہیں خیرہ ہیں اور پردۂ حسن پر جو رنگینیاں ہیں وہ نگاہ میں نہیں آ رہی ہیں۔ آپ اصلاح دے رہے ہیں کہ پردۂ حسن کے بجائے جلوۂ حسن کر دیا جائے۔ ایسا کرنے میں اول تو وہی فرسودہ بات ہو جائے گی جو آج تک اُردو شعرا کہتے آئے ہیں اور جس سے اصغر صاحب کی جدت پسند طبیعت متنفر ہے۔ دوسرے یہ کہ شاعر کا پورا مفہوم لفظ جلوہ سے ادا نہیں ہوگا۔ مفہوم شعر نہایت وسیع ہے یعنی پردۂ حسن پر رخسار جاناں کی رنگینی۔ سبزۂ خط۔ آنکھ کا جادو۔ ابرو کی کمان وغیرہ

بیسیوں چیزیں ہیں جن کی طرف دماغ فوراً لفظ پردہ۔ آئینے سے منعطف ہوجاتا ہے مگر لفظ جلوہ سے ان تمام باتوں کی طرف اشارہ نہیں ہوتا کہ جلوہ سے صرف تابش حسن کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے اس لئے اصلاح ناقص اور شعر غالب کی طرف اشارہ قطعی غلط۔

شعر مضطر | جنون عشق میں ہستی عالم پر نظر کیسی رُخ لیلےٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ جنون عشق میں دنیا کی ہستی کا خیال بھی نہیں رہتا۔ بالکل درست لیکن دوسرے مصرعہ سے اس کا تعلق؟ اگر ہستی عالم کا جواب دوسرے مصرعہ میں رُخ لیلےٰ اور جنون عشق کا جواب نظارہ محمل واقع ہوا ہے تو مفہوم کے لحاظ سے اس کا اہمال ظاہر ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہیئے تھا۔

وفور شوق ہو تو پردہ پھر کیسا کہ رکھتے ہیں رُخ لیلےٰ نظر میں اپنی محمل دیکھنے والے

عرض عشرت | جب آپ شعر نہیں سمجھ پاتے تو نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں۔ پہلا مصرعہ تو آپ سمجھ گئے مگر دوسرے مصرعہ میں لیلےٰ و محمل کا استعارہ آپ کی فہم میں نہ آسکا۔ اسی سے آپ کو پہلے اور دوسرے میں ربط نہیں معلوم ہوتا۔ سنئے "لیلےٰ" حقیقت عالم کے لئے استعارہ ہے اور "عالم" محمل ہے جس کے اندر حقیقت پنہاں ہے۔ اب جسے جنون عشق ہے اُس کی نظر محمل پر نہیں جائے گی۔ وہ تو ہمیشہ حقیقت یعنی رُخ لیلےٰ پر نظر رکھے گا۔ اور جو محمل ہی سے یعنی "عالم" سے ہی اُلجھ گیا وہ لیلائے حقیقت کو کیا دیکھے گا۔ یعنی جو دنیا میں پھنس جائے گا وہ خدا کو کیا پہچانے گا۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح اس میں بڑے بڑے نقائص ہیں۔ اول تو بقول حضرات لکھنؤ مصرعۂ اولیٰ کے الفاظ "رکھتے ہیں" میں سخت "ذم کا پہلو" ہے دیگر یہ کہ پہلے مصرعہ کا مفہوم جب تک کہ اُسے دوسرے مصرعہ سے ملا کے نہ پڑھیں کسی طرح بھی کچھ نہیں نکلتا۔ یہ اکابر معائب شاعری میں سے ہے۔ یہ اصلاح بھی آپ کی تمام اصلاحوں کے رنگ پر ہے۔ شوق سندیلوی کے "اصلاح سخن" میں بھی آپ کی تمام اصلاحیں اسی طرح کی ہیں۔ اگر چودھری حامد حسین صاحب کا مضمون اس پر شائع ہو گیا تو اس کی حقیقت آپ پر اور نیز پبلک پر روشن ہو جائے گی۔

شعر مضطر | تماشا ہے نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا میں اُن کا دل سمجھتا ہوں وہ میرا دل سمجھتے ہیں

اعتراض نیاز | ...... دوسرا مصرعہ...... کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کس چیز کو شاعر اُن کا دل سمجھتا ہے اور وہ کس چیز کو شاعر کا دل سمجھتے ہیں۔ اس کا اظہار کہیں نہیں کیا گیا۔ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں محبوب کے دل کو زخمی سمجھتا ہوں اور وہ میرے دل کو لیکن اس کو وہ ظاہر نہیں کر سکے۔

عرض عشرت | افسوس ہے کہ آپ "میں اس کا دل سمجھتا ہوں" اس معمولی فقرے کو بھی سمجھ نہیں پائے۔

آپ نے زخمی دل کے معنے لگائے جو نہایت غلط ہے۔ اگر کوئی کسی سے کہے کہ میں آپ کی بات نہیں سمجھتا تو کیا دوسرا فریق اُس سے اُلجھنے لگے گا کہ آپ کس چیز کو میری بات نہیں سمجھتے؟ کیونکہ بعینہ یہی سوال آپ اپنے اعتراض میں کرتے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ شاعر کس چیز کو ان کا دل سمجھتا ہے اور وہ کس چیز کو شاعر کا دل سمجھتے ہیں۔ بھائی صاحب سُنیئے "میں اُن کا دل سمجھتا ہوں" کے معنی ہیں کہ جو کچھ اُن کے دل میں ہے میں سمجھتا ہوں اور اسی طرح "وہ میرا دل سمجھتے ہیں" کے معنی ہوئے کہ جو کچھ میرے دل میں ٹھنی ہے وہ سمجھتے ہیں۔ اب پہلے مصرعہ سے تعلق دیکھئے۔ عاشق کے نیاز اور معشوق کے ناز میں باہم کشاکش ہے۔ یہ کشاکش دیکھنے کے قابل ہے کیونکہ کسی جانب سے نہ کوتاہی ہو رہی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ عاشق معشوق کے دل کا ارادہ سمجھتا ہے کہ وہ تُلا بیٹھا ہے کہ اپنے ناز میں کمی نہ کرے گا اور معشوق عاشق کا دل سمجھتا ہے کہ وہ اپنا نیاز کبھی نہ چھوڑے گا۔

شعر صغر | کائنات دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

اعتراض نیاز | اول تو قضا کے سامنے زندگی کے مسکرانے کی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ شعر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مسکراہٹ استسلام و سپردگی کی تھی یا جحود و انکار کی، دوسرے روح الامیں کے بیہوش ہونے کا کیا موقع تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت روح الامیں پیام خداوندی شاعر کے سامنے لائے اُسی وقت اتفاق سے قضا بھی آگئی اس لئے اِدھر شاعر کی زندگی مسکرا پڑی اور اُدھر روح الامیں غش کھا کر گر پڑے۔ کائنات دہر کی ترکیب بھی عجیب ہے۔ صرف کائنات کہہ دینا کافی تھا۔

عرض عشرت | یہ سچے عاشق کی موت ہے جو رہ عشق میں جان دے دینا تکمیل عاشقی سمجھتا ہے۔ اُسے موت کا ڈر قطعی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ عاشق کی زندگی نہایت بے پروائی و تحقیر سے قضا کے سامنے مسکراتی ہے۔ قضا کے سامنے زندگی کے مسکرانے کی یہی وجہ ہے۔ یہ مسکراہٹ نہ "استسلام و سپردگی" کی ہے اور نہ "جحود و انکار" کی جیسا کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور جب یہ بات ہی نہیں ہے تو اس کا شعر سے پتہ کیونکر چلے۔ خیر جب زندگی اس طرح نہایت بے پروائی و تحقیر سے قضا کے سامنے مسکرائی تو کائنات دہر کی حقیقت کیا روح الامین کی شدید القوے ہستی تک انتہائے تحیر سے بیہوش ہو گئی۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ کائنات دہر کی ترکیب عجیب ہے۔ صرف کائنات کہدینا کافی تھا۔ آپ emphasis یعنے زور دینے کے رمز کو سمجھ نہیں پاتے ہیں۔ جب کسی بات پر زور دینا ہوتا ہے تو زائد الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ غور کیجئے دو جملے ہیں (۱) میں نے یہ کام کیا (۲) میں نے یہ کام اپنے ہاتھوں سے کیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے جملہ میں "اپنے ہاتھوں سے"

کا ٹکڑا بیکار ہے۔ صحیح ہے لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ انہیں زائد الفاظ سے جملہ کتنا زوردار اور چست ہوگیا۔ اسی طرح محض کائنات کہنے سے بھی مطلب پورا ہو جاتا مگر وہ زور نہ رہتا جو کائنات و دہر کہنے سے پیدا ہو گیا ہے۔

شعر اصغر | ایک صدا یاں ہے اصغر میرا طرز کافری میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

اعتراض نیاز | اگر "میں" اور بت دونوں خدا کے سامنے ہیں تو اس میں "رشک صدا یاں" ہونے کی کونسی بات ہے اور وہ طرز کافری کیا تھا جس کی داد چاہی جاتی ہے۔

عرض حسرت | مجھے قطعی طور سے معلوم ہے کہ یہ شعر غلط چھپ گیا ہے۔ عجلت میں کچھ نسخوں میں اصلاح کر دی گئی تھی۔ اس وقت جس کا جی چاہے الہ آباد جا کر بچاسوں نسخوں میں اس شعر کو صحیح طور پر اصلاح شدہ دیکھ سکتا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کے لئے جو کاپی چھپنے کے لئے مصنف کے پاس رکھی ہے اس میں یہ شعر اس طرح ہے۔

رشک صدا یاں ہے اصغر میرا طرز کافری میں بتوں کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

مطلب اس کا صاف ہے۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔

شعر اصغر | جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ چشم بشر اب تک تیرا جلوہ نہیں دیکھ سکی اور دوسرے مصرعہ میں یہ خبر سنائی جاتی ہے کہ ہر ایک تجھے اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے اگر مصرعۂ اول کا دعوےٰ صحیح ہے تو معنے یہ ہوں گے کہ دوسرے مصرعہ میں جن دیکھنے والوں کا ذکر ہے وہ انسان نہیں ہیں کیونکہ اگر وہ انسان ہوتے تو ظاہر ہے کہ چشم انسانی ہی سے دیکھتے۔

عرض حسرت | یہ شعر حضرت اصغر کا کارنامہ ہے۔ مگر کاش آپ اسے سمجھ سکتے۔ شعر کے معنی سنئے۔ خدا کا جلوہ اب تک چشم بشر سے نہاں ہے کسی نے خدا کو آج تک نہیں دیکھا مگر ہر ایک نے اپنے خیال کے مطابق اس کا تصور قائم کر رکھا ہے۔ ہر ایک مذہب میں خدا کے بارے میں جدا جدا خیالات ہیں گو کہ اس کو کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ نظر کے معنے اس شعر میں فکر و خیال وغیرہ کے ہیں لیکن اگر آپ اس شعر کو "گوشت و پوست والی معشوقہ" ہی پر منطبق کرنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے۔ ہر عاشق اپنے اپنے خیال کے مطابق یہ سمجھتا ہے کہ معشوق میں یہ حسن ہے مگر اس کا اصلی حسن یا جلوہ کیا ہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔ یعنی کسی نے آج تک گویا اس کو دیکھا ہی نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے خبط کے مطابق معشوق میں حسن کا تعین کرتا ہے۔

شعر مضمر | مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے　　یہ راز ہے تو ذرا حسن راز رہنے دے

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں ایک خواہش و التجا کا اظہار ہے، کسی واقعہ کا نہیں، اس لئے مصرعہ دوم میں لفظ یہ کا اشارہ بالکل بے محل ہے کیونکہ مشارالیہ نہ کوئی موجود ہے نہ اس کا اظہار کیا گیا ہے اور اگر کہا جائے کہ (یہ) کا اشارہ حقیقت کی طرف ہے تو پھر حسن راز کا اس سے کیا تعلق۔ راز کا حسن یہی ہے کہ وہ راز رہے اور یہاں حقیقت کو مجاز سے متعلق کرکے اس کا افشا چاہا جاتا ہے جس کو حسن سے کوئی واسطہ نہیں۔

عرض مضمر | پہلے آپ لکھتے ہیں کہ "یہ" کے لئے کوئی مشارالیہ موجود نہیں ہے مگر بعد کو آپ کہتے ہیں کہ اگر (یہ) کا اشارہ حقیقت کی طرف ہے" بے شک (یہ) حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر آپ کو حقیقت کا تعلق "حسن راز" سے سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ لکھتے ہیں کہ "راز کا حسن یہی ہے کہ وہ راز رہے" بندہ پرور راز کا حسن یہ نہیں ہے کہ وہ محض راز رہے۔ کیونکہ راز محض رہنے سے اس سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوسکتی یہ جانے کہ "تڑپ" جو حسن کا لازمی نتیجہ ہے۔ راز پر جب ایک ایسا پردہ پڑا رہتا ہے کہ نہ وہ ہٹتا ہے اور نہ کلیۃً راز کو چھپاتا ہی ہے تب وہ حسن راز ہوجاتا ہے۔ چونکہ وہ پردے سے کلیۃً چھپتا نہیں اس لئے وہ نگاہوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے اور چونکہ بے نقاب ہوتا نہیں اس لئے تڑپاتا ہے یعنے جب تک۔

کیا تماشا ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں　　صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

کا لطف نہ پیدا ہو تب تک حسن راز نہیں ہوسکتا۔ حقیقت پر اگر کوئی پردہ نہ ہو تو بھی کوئی دلکشی نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی ایسا پردہ ہو کہ حقیقت کی جھلک کسی کو نہ ملے تو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے حقیقت کو حسن راز بنانے کے لئے شاعر مجاز کا ہلکا سا پردہ چاہتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مجاز حقیقت کو چھپاتا نہیں بلکہ دلکش بناتا ہے یعنے حسن راز کر دیتا ہے۔ مجاز ایسی چیز نہیں ہے جس سے راز افشا ہوجائے یا جس کو حسن سے کوئی لگاؤ ہی نہیں جیسا کہ آپ نے اپنے اعتراض میں ٹکر مارا ہے۔ تمام عالم مجاز ہے اور حقیقت خدا ہے۔ مگر عالم ایک دنیائے رنگ و بو ہونے کی وجہ سے کس قدر خوبصورت ہے اور یہ خوبصورتی حسن حقیقت کی محض ایک جھلک ہے اس پردۂ مجاز سے حقیقت کا راز افشا نہیں ہوگیا بلکہ اس سے راز "حسن راز" ہوگیا جو ایک عالم کو تڑپا رہا ہے۔

شعر مضمر | حیات تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں　　ابھی یہ مرحلۂ عمر دراز رہنے دے

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ میں لفظ (یہ) بالکل زائد استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ اس کو حذف کرنے کے

بھی معنی پورے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلے مصرعہ میں لفظ تازہ بالکل بیکار ہے۔ محض حیات کہہ دینا
کافی تھا۔ علاوہ اس کے مرحلہ کا دراز ہونا بھی کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ شعر یوں ہو سکتا تھا۔

حیات عشق ہے قائم اسی فسانے پر   فسانۂ غم الفت دراز رہنے دے

فسانہ کی تکرار اور زیادہ لطف پیدا کر دیتی

عرض عشرت! آپ کے اعتراض میں دو رکن خاص ہیں ایک یہ کہ شعر میں تقابل نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ شعر میں فلاں لفظ زائد ہے۔ خیر مان لیجئے کہ دوسرے مصرعہ میں (یہ) زائد ہے۔ اسے نکال دیجئے اب مصرعہ محض اتنا رہ گیا "مرحلۂ غم دراز رہنے دے" اس کو پڑھتے ہی یا سنتے ہی سوال ہوگا کہ کونسا مرحلۂ غم دراز رہے۔ شاعر نے اسی لئے (یہ) کا لفظ لگا دیا ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ مرحلۂ غم دراز رہے جو اس وقت شاعر سے متعلق ہے یا جسے شاعر اس وقت بھگت رہا ہے۔ مگر اساتذۂ اردو کا یہ پرانا خبط ہے کہ لفظ (یہ) یا (وہ) بغیر 'جو' یا 'جس' وغیرہ کے شعر میں نہیں آسکتا۔ اگر آجائے تو زائد ہے۔ ان کے خیال شریف میں جو جملہ 'جو' یا 'جس' سے شروع ہوتا ہے وہ understood یعنی محذوف نہیں رہ سکتا لیکن زمانہ موجودہ کے بہترین شعرا اس فضول بات کے پابند نہیں ہیں۔
چونکہ اُن کی شاعری زیادہ تر suggestions یعنی اشارات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے جو چیز اپنے سے متعلق ہوتی ہے اُس کے لئے لفظ (یہ) بلا جملہ موصولہ کے استعمال کرتے ہیں جس پر اُردو کے پرانے دھرانے اُستادوں کو اور اُن کے نالائق شاگردوں کو زائد ہونے کا دھوکا ہو جاتا ہے گو کہ کسی صحیح الدماغ کی سمجھ میں اس سے کوئی اہمال پیدا نہیں ہوتا۔ غور کیجئے۔ آپ کو محض یہ جملہ کہیں لکھا ہوا ملتا ہے "میں یہ پھول ہرگز ہرگز نہ دوں گا" اس جملہ میں جو (یہ) ہے کیا اُسے آپ زائد بتائیں گے اور کیا آپ اُس سے پوچھیں گے "یہ پھول کون پھول ہے؟" موٹی سی موٹی عقل کا آدمی بھی اس جملہ کو سمجھ لے گا کہ "یہ پھول" سے مطلب وہ پھول ہے جو کہنے والے کے ہاتھ یا قبضہ میں ہے۔ اسی طرح "یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے" سے بھی ہر ایک کی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ مرحلۂ غم وہ مرحلۂ غم ہے جسے کہنے والا خود بھگت رہا ہے۔ اب مرحلۂ غم کا حیات تازہ سے تعلق بھی سمجھ لیجئے۔ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ اصغر صاحب کا نظریہ حیات کے متعلق کیا ہے مگر شاید آپ بھول گئے ہوں اس لئے اصغر صاحب کا یہ شعر پھر لکھتا ہوں:۔

یہ مجھ سے سُن لے تو راز نہاں سلامتی خود ہے دشمن جاں   کہاں ہے رہرو میں زندگی جو کہ راہ ہی پُر خطر نہیں ہے

جب تک خطرہ اور مصیبت نہ ہو تب تک اصغر صاحب کے لیے حیات بیکار ہے اس لئے وہ مرحلۂ غم کو دراز رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ پہلے مصرعہ میں لفظ تازہ بیکار ہے آپ کہتے ہیں کہ "محض

حیات کہدینا کافی تھا" بندہ پرور رنگینیاں حیات تازہ پینے تو بنو میں پیدا ہوتی ہیں۔ حیات میں اگر رنگینیاں ہوں بھی تو بھی وہ مرور ایام سے رنگینیاں نہیں رہ سکتیں۔ اُن سے طبیعت اوبنے اور اکتانے لگے گی۔ بہت دنوں کے استعمال سے امرت بھی زہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن شاید آپ کا خیال نفسیات کے اس اصول کی طرف نہیں گیا جس سے کہ ایک دیہاتی بھی واقف ہوگا۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ رنگینیوں کے لئے حیات تازہ لازمی ہے۔ حیات مزمنہ رنگینیوں کی منافی ہے۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح۔ اس میں وہی فرسودہ مضمون فسانۂ الفت کے دراز رہنے کا ہے جس کو اُردو کے شعرا ہزار بار لکھ چکے ہیں۔ اصغر صاحب کی جدت پسند طبیعت اس سے بھاگتی ہے۔ انچہ فخر تست آں ننگ من است۔

شعر اصغر | عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں

اعتراض نیاز | یہ شعر بھی منجملہ اُن بہت سے "تصوف زدہ" اشعار کے ہے جن کا لطف کسی ولی اللہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے بغیر حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔ معشوق سے کہا جاتا ہے کہ میں جو تجھ کو دیکھ کے آئینۂ حیرت ہوگیا ہوں تو تیری صورت میری صورت ہوگئی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ عاشق معشوق دونوں کا ہمشکل ہوکر توام نزاد نظر آنا واقعہ امکانی ہے تو اس کا غزل یا محبت سے کیا تعلق ؟......

عرض عشرت | اس شعر کا تعلق علم معنی و بیان سے تھا لیکن الفاظ عکس و صورت سے آپ سو کا کھا گئے اور استعارہ کو سمجھ نہیں سکے۔ اصغر صاحب نے "نشاط روح" کی ایک نظم میں اس مضمون کو یعنے عاشق معشوق کا عکس ہے بہت روشن طور سے لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو :—

نہ جانیے مری بگڑی ہوئی اداؤں پر کہ عاشقی میں مری حسن کی ہے جلوہ گری
جو شوخیوں سے لیا ہے جمال بیتابی تو جوش حسن سے پائی ادائے جامہ دری
لئے ہیں زلف سے آشفتگی کے کل انداز نگاہ مست سے پہونچا ہے حسن بے خبری

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ عاشق کو معشوق کا عکس کہنے میں ایک خوبصورت استعارہ ہے جس کے معنی اثر پذیر ہونے کے ہیں نہ کہ عاشق و معشوق کے ہم شکل ہوکر توام نزاد ہونے کے۔ افسوس ہے کہ آپ اشعار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

شعر اصغر | ہوگئی جمع متاع غم حسرماں کیونکر میں سمجھتا تھا کوئی پردۂ غفلت میں نہیں

اعتراض نیاز | یہاں غفلت سے مراد محبوب کی غفلت و بے پروائی ہے۔ اس لئے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ پردۂ غفلت میں کوئی نہیں ہے علاوہ اس کے لفظ (کوئی) سے متاع غم کا یوں بھی کوئی تعلق نہیں۔

اگر (کوئی) کی جگہ (کچھ) کہا جاتا تو خیر پہلے مصرعہ سے یک گونہ ربط پیدا ہو جاتا۔

عرض عشرت | آپ اس مقام پر ٹھیک سمجھے کہ غفلت سے مراد محبوب کی غفلت (بے پروائی) ہے۔ عاشق نے معشوق کی غفلت دیکھ کے یہ سمجھا کہ یہ غفلت معشوق کی طرف سے ارادۃً نہیں ہے اگر یہ غفلت ارادۃً ہوتی تو اس کے لئے اُردو شعرا لفظ "تغافل" استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال عاشق نے سمجھا کہ اس غفلت کا محرک کوئی نہیں ہے۔ نہ رقیب اور نہ خود معشوق کی طبیعت۔ اسی لئے عاشق کو تسکین تھی کہ چونکہ یہ غفلت دل سے نہیں ہے چند روز میں ہٹ جائے گی۔ پس وہ ناامید نہیں ہوا تھا لیکن جب بہت دنوں کے بعد بھی غفلت نہیں ہٹی تو عاشق کے دل میں متاع حرماں جمع ہو گئی۔ اس لئے عاشق معشوق سے کہہ رہا ہے کہ میں پہلے سمجھتا تھا کہ آپ کی غفلت کا کوئی محرک نہیں ہے مگر اب متاع حرماں سے معلوم ہوا کہ کوئی محرک ضرور ہے ورنہ میرے دل میں ناامیدی نہ پیدا ہوتی۔ کیونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کے دل میں کوئی بات نہ ہوتی تو میرے دل کو حرماں نصیبی نہ ملتی۔ اس مفہوم سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ لفظ (کوئی) شعر کے لئے کتنا ضروری ہے اور اس کا تعلق متاع حرماں سے کتنا ہے۔ اس کے علاوہ معشوق کی حرمت کے لئے عاشق نے بجائے تو یا تم کے لفظ کوئی استعمال کیا ہے جو شعر میں بڑا حسن پیدا کر رہا ہے۔ مگر آپ نہ جانے کیوں (کوئی) کو (کچھ) بنا دینا چاہتے ہیں جس سے پہلے مصرعہ سے "یک گونہ" ربط پیدا ہو جائے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اصغر "یک گونہ" ربط نہیں چاہتے وہ تو دونوں مصرعوں میں ربط کامل کے پابند ہیں مگر ہاں وہ کسی کی سمجھ کے ٹھیکہ دار نہیں ہیں۔

شعر: عشق کی فطرت ازل سے حُسن کی منزل میں ہے ‌ ‌ ‌ ‌ قیس بھی محمل میں ہے لیلےٰ اگر محمل میں ہے

اعتراض نیاز | تصوف کا ایک اور مسخ شدہ شعر ملاحظہ ہو۔ وہاں تو غریب قیس کی ساری عمر گذر گئی اور پردۂ محمل تک پہونچنا نصیب نہ ہوا اور یہاں اصغر صاحب اس کو بالکل محمل کے اندر ہی لیلےٰ کے ساتھ ہم آغوش دیکھ رہے ہیں۔ عشق کی فطرت کا حسن کی منزل میں ہونا بھی عجیب بات ہے۔ منزل کی جگہ بھی فطرت لکھنا چاہیے تھا لیکن شاید مطلع بنانے کے لیے شعر کو مہمل کر دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

عرض عشرت | اس شعر کا تصوف سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اگر اصغر صاحب کے ہر شعر میں کسی کو تصوف دکھائی پڑے تو اس ماحولیت کا کیا علاج ہے۔ شعر میں معمولی سا استعارہ ہے افسوس ہے کہ وہ بھی آپ کی سمجھ میں نہ آیا۔ خیر شعر کے معنی سمجھئے عشق ازل سے فطرتاً اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ اس کو بہت کم لوگ پہچان سکتے ہیں دوسرے الفاظ میں استعارۃً یوں کہا جائے گا کہ گویا وہ ایک محمل میں پوشیدہ رہتا ہے۔ آدم جب ازل ہی میں امانت کا حامل ہوا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں حسن عشق سے مزین ہوا۔ فرشتوں سے بھی دیکھا نہ گیا۔

فرشتوں کو یقین تھا کہ وہ آدم سے برتر تھے کیونکہ اُن کی خلقت نور یا آتش سے ہوئی اور آدم کی خاک سے۔ لیکن ہاں حکم خداوندی سے مجبور ہوکر سجدہ کیا۔ گو کہ ابلیس نے جو فرشتوں میں سب سے افضل تھا سجدہ نہیں کیا۔ اب آپ خود غور کریں کہ عشق کی برتری جو آدم میں موجود تھی اُسے فرشتوں نے نہیں دیکھ پایا۔ دوسرے لفظوں میں استعارۃً اس کو یوں کہیں گے کہ ازل ہی سے عشق محمل کے اندر ہے۔ اسی لئے شاعر نے کہا کہ جیسے حسن محمل کے اندر کہا جاتا ہے ویسے ہی عشق بھی۔ اس لئے حسن اور عشق دونوں ایک ہی منزل میں ازل سے ہیں۔ دوسرا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ 'منزل' کی جگہ بھی 'فطرت' لکھنا چاہئے تھا۔ اس کا فیصلہ اس طرح ہے کہ آیا پردہ میں رہنا یا محمل میں رہنا حسن کی فطرت ہے یا یہ اس کی منزل ہے۔ ظاہر ہے کہ حسن کی فطرت پردے میں رہنے کے سخت منافی ہے۔ حسن تو سات پردہ توڑ کر ظاہر ہونا چاہتا ہے چھپنا نہیں چاہتا۔ یہ حسن کی منزلت ہے کہ اُسے پردہ میں رکھا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں لفظ 'منزل' ہی صحیح ہے اور 'فطرت' بالکل خلافِ فطرت۔ مفہوم کو غارت کرکے یا شعر کو مہمل بنا کے مطلع بنانا جرم گردن زدنی ہے مگر ہاں معترض کو اس کی پروا نہیں رہتی وہ اعتراض کی خاطر چاہے جس شعر کو مہمل قرار دے چاہے وہ بہتر سے بہتر مفہوم کا حامل ہو۔

شعر اصغر | عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حسن کو — پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

اعتراض نیاز | تصوف کی شاعری اول تو یوں ہی لغو اور مہمل ہوتی ہے لیکن جب کھلم کھلا اس میں مذہبیات کی اصطلاحیں استعمال کی جائیں تو اس کا اہمال سخت نفرت انگیز ہو جاتا ہے۔ عرش ایک ایسا لفظ ہے ..... جس کا تعلق مفروضہ عقائد مذہب سے ہے۔ اس لئے جو صوفی شعرا زیادہ پاکیزہ ذوق کے ہیں وہ ہمیشہ ایسے الفاظ سے احتراز کرتے ہیں اور زیادہ تر کنایہ سے کام لیتے ہیں لیکن اصغر صاحب جو لاہوت ایسا بکر وہ ثقیل لفظ استعمال کرنے سے احتراز نہیں کرتے تو ان پر عرش کا کیا بار ہو سکتا ہے۔ معنی کے لحاظ سے جس حد تک یہ شعر بیگانۂ تغزل ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ عشق کا اپنے ساتھ حسن کو لے جانا اور وہ بھی عرش کی منزل تک مجذوبوں کی دنیا کی بات ہے اور جب تک خود کوئی اسی حد تک بیگانۂ عقل و حواس نہ ہو جائے اس کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اب انداز بیان کا نقص ملاحظہ کیجئے۔ پہلے مصرعہ میں تو یہ خبر دی گئی تھی کہ عشق اپنے ساتھ حسن کو عرش تک لے گیا تھا اس لئے کہ ظاہر ہے کہ ذہن سامع کو آئندہ جستجو اسی کے متعلق پیدا ہوگی کہ وہ عرش کے بعد کہاں گیا لیکن دوسرے مصرعہ میں ذکر کیا جاتا ہے عشق کی منزل کا۔ میری رائے میں یہ شعر یوں ہوتا تو اتنے نقائص نہ پائے جاتے۔

عرش تک تو ساتھ تھے دونوں مگر اب کیا خبر — حسن کس منزل میں ہے اور عشق کس منزل میں ہے

عرض حضرت | اگر ناسمجھوں کے لئے تصوف کی شاعری لغو و مہمل ہو تو اس کے محاسن میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں فارسی صوفی شعرا کے ترجمے ہو رہے ہیں اور الفاظ کے استعمال کے بارے میں مَیں اس سے پہلے ایک شعر کی تشریح میں بالتفصیل لکھ چکا ہوں جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ثقیل سے ثقیل الفاظ مفہوم کے لحاظ سے استعمال کیے جا سکتے ہیں اور اُن کے استعمال سے حسن پیدا ہو سکتا ہے مگر افسوس ہے آپ اس نکتہ کو نہیں سمجھتے اور اکثر الفاظ کو بلا مفہوم پر نظر کیے ہوئے ثقیل بتایا کرتے ہیں۔ خیر شعر کا مفہوم سمجھنے کے پہلے اصغر صاحب کا نظریہ حسن و عشق کے متعلق سُن لیجئے۔ اُن کی نگاہ میں گو دونوں چیزیں بہتر ہیں مگر پھر بھی وہ عشق کو حسن سے افضل سمجھتے ہیں۔ اصغر صاحب کا ایک شعر عرض ہے۔

سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصغر صاحب عشق کو حسن سے کہیں برتر سمجھتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ عشق حسن کو اپنے ساتھ عرش تک لے گیا۔ عرش کے آگے حُسن کے پر جلنے لگے اس لئے وہ وہیں رہ گیا مگر عشق آگے بڑھتا ہی گیا اور اتنا بلند ہوا کہ اس کی بلندی کی تخصیص کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ عرش کے بعد لامکان کا درجہ ہے مگر شاعر نے عشق کے لئے اس منزل کا بھی تعین نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق لامکاں سے بھی آگے خدا جانے کہاں پہونچ گیا۔ اس لئے شاعر محض یہی کہہ کے خاموش ہو جاتا ہے کہ "پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے" مگر آپ شعر سمجھے نہیں اور اصلاح دینے لگے۔ اصلاح میں بڑے بڑے نقائص ہیں۔ اول تو آپ کے اصلاحی مصرعۂ اولیٰ میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ حسن و عشق میں کون بہتر ہے۔ کیونکہ آپ کا مصرعہ ہے "عرش تک تو ساتھ تھے دونوں مگر اب کیا خبر" اصغر صاحب کے مصرعہ اولیٰ میں ہے کہ عشق حسن کو اپنے ساتھ عرش تک لے گیا۔ یعنی حسن کا عرش تک بھی پہونچنا مشکل تھا مگر عشق اُس کو وہاں تک اپنے ساتھ لے گیا البتہ اس کے آگے حسن عشق کے لے جانے پر بھی نہ جا سکا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عشق حُسن سے کہیں بہتر و زبردست ہے۔ مگر آپ کے مصرعہ میں دونوں برابر ہیں کیونکہ دونوں عرش تک ساتھ گئے۔ دویم آپ کے اصلاحی مصرعہ ثانی سے پتہ نہیں چلتا کہ عشق اور حسن میں سے کون بلند ہو گیا اور کون پست رہ گیا مگر اصغر صاحب کے مصرعہ ثانی سے صاف ظاہر ہے کہ عشق نہایت بلند ہو گیا اور حسن محض عرش تک رہ گیا۔ شاعر کا مفہوم تھا کہ عشق حُسن سے کہیں بلند ہے مگر اصلاح میں آپ نے شاعر کے مفہوم کو برباد کر دیا جو ہمیشہ سے آپ کا شعار رہا ہے جس کی قلعی شوق سندیلوی کے "اصلاح سخن" سے کھلتی ہے۔

اس کے بعد اصغر صاحب کے اٹھارہ شعر دیے گئے ہیں جن کو عجیب و غریب کا خطاب دیا گیا ہے

اور جن پر مجموعی طور سے ذیل کے اعتراضات کئے گئے ہیں۔

اعتراض نیاز | یہ تمام اشعار نہ صرف تغزل سے خالی ہیں بلکہ مفہوم سے بھی یکسر بیگانہ ہیں۔ چند مفروضات پر ان کی بنیاد قائم ہے اور اس دنیا کے محسوسات و تاثرات سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ دعوے خواہ کتنا ہی لغو کیوں نہ ہو لیکن اگر شاعر اپنی تخئیل کے زور سے اُس کو ثابت کرے تو شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن اصغر صاحب نے کبھی اس کی زحمت گوارا نہیں کی اور یہ شاید ان سے ممکن بھی نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ شاعر کا کمال یہی ہے کہ چند خوبصورت الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دے۔ نہ اس کو محل استعمال سے بحث ہونا چاہئے اور نہ اس سے کہ اُن سے کوئی مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر چونکہ فلسفہ و تصوف کی شاعری میں اس کی کافی گنجائش ہے اس لئے اصغر صاحب جو اپنی فطرت کے لحاظ سے "گومگو" قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں بالطبع اس کی طرف مائل ہیں لیکن چونکہ تخئیل ان کی خود اپنی نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ فن شعر و بیان و معانی سے ناواقف ہیں۔ اس لئے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتے اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ محض لایعنی دعوے پیش کر دینا ہی کمال شاعری ہے۔ ثبوت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی کی اُس متصوفانہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے جو صرف احمد جام زندہ پیل اور شاہ نیاز احمد بریلوی کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ انھیں کبھی نہیں ہوا۔ فارسی میں اس رنگ کا سب سے زیادہ دقیق کہنے والا بیدل گذرا ہے اور ایسی ایسی باتیں اُس نے لکھی ہیں جو بظاہر بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ اس کا سارا کلیات چھان ڈالیے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہ نکلے گا جس میں اُس نے کوئی دعوے بغیر ثبوت کے کیا ہو۔

آئینہ۔ خودی۔ حجاب۔ دریا۔ حباب۔ ساز۔ پردہ وغیرہ نہایت عام الفاظ ہیں جن پر تصوف کی شاعری کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اور اصغر صاحب نے تقلیداً انھیں سے کام لیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ بیدل نے ان کے متعلق جو مضامین پیش کیے ہیں وہ خود اس کے ذاتی ہیں۔ اور اصغر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ تقلید ہے اسی لئے اس کے بیاں وسعت مفہوم اور شگفتگی ہے اور یہاں اہمال و منغلہ۔

عرض عشرت | نیاز صاحب جب آپ اصغر صاحب کا کوئی شعر نہیں سمجھ سکتے تو آپ کی تنقید کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ آپ چاہے جس شعر کو مفہوم و تغزل سے بیگانہ کہیں یا محسوسات و تاثرات سے خالی۔ مگر سمجھ دار دنیا کی نگاہ میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جن سے آپ انکار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے بہترین نکتہ رس مثلاً ڈاکٹر اقبال۔ سر تیج بہادر سپرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی زبان پر اشعار اصغر کے لئے سوائے تعریف کے اور کچھ نہیں علی گڈھ اور پٹنہ یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں کلام اصغر شامل ہے۔ اس لئے

ہم آپ کے کہنے کا بُرا نہیں مانتے۔

چونکہ اصغر صاحب کی شاعری زیادہ تر محسوسات وتاثرات پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ بیدل کی طرح دعوے کم کرتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں دعوے ہوتا ہے تو اُس کا ثبوت بھی موجود ہوتا ہے یہ بات اور ہے کہ کوئی اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے اُسے سمجھ نہ پائے۔ احمد جام زندہ پیل یا شاہ نیاز بریلوی کے کلام سے اصغر کے کلام کو کوئی واسطہ نہیں۔ سچ پوچھئے تو متقدمین میں سے کسی کے کلام سے اصغر صاحب کی جدت پسند طبیعت نہیں ملتی۔ لیکن ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو الفاظ تصوف کی شاعری میں رائج ہیں انھیں کو اصغر صاحب نے اپنایا ہے۔ مسالا تو پرانا ہے مگر اصغر صاحب نے عمارتیں اُس سے نئی نئی کھڑی کی ہیں۔ مگر جو ندود دماغ صرف کورانہ ماضی پرستی کا قائل ہے وہ ان سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ خیر اب اُن تمام اشعار کے معنی جن کو آپ یکسر مفہوم سے بیگانہ فرماتے ہیں سن لیجئے۔

(پہلا شعر) حسن بن کر خود کو عالم آشکارا کیجئے   پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردا کیجئے

(معنی) شاعر قدرت سے مخاطب ہے کہتا ہے کہ پہلے آپ خود حسن بن کر تمام عالم پر چھا گئے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ مجھے یعنے مشتاق دیدار عاشق کی ہستی کو پردہ بنا کر پوشیدہ رہتے ہیں۔ دیکھنے والے کی ہستی کو آپ شاید نہ سمجھ سکے ہوں گے لہذا اسے سمجھ لیجئے۔ اس سے مطلب چشم بینا اور عقل و خرد ہے۔ حسن حقیقت سب جگہ آشکار ہے مگر قیامت یہ ہے کہ ہماری آنکھ اور ہماری عقل اُسے خدا کا جلوہ نہیں کہتی بلکہ اُسے رنگ و بو، گل و ریحان، دریا پہاڑ وغیرہ کہہ کر ٹال دیتی ہے۔ اس طرح ہماری عقلیں اور ہماری آنکھیں حسن حقیقت کے لیے خود پردہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری ہستی خود پردہ ہے۔

(دوسرا شعر) دیکھتا ہوں میں کہ انساں کش ہے دریائے وجود   خود حباب و موج بن کر اب تماشا کیجئے

(معنی) یہ شعر تسلیم و رضا پر مبنی ہے انسان اگر دریائے وجود کا تماشا اپنی ہستی اور اپنی مرضی یعنے (Self) اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو قائم رکھتے ہوئے دیکھتا ہے تو اُسے انتہائی تکلیف ہوتی ہے اسی لئے وہ گویا ہر وقت مرتا رہتا ہے یعنی انتہائی رنج و تعب میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی لئے شاعر نے الفاظ "انساں کش" استعمال کیے ہیں۔ اس موت سے بچنے کے لئے ترکیب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو محو حوادث کر دے۔ یعنی جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے سب کو مرضی خدا جان کر بجا و درست سمجھے۔ یعنے اپنی مرضی وہی بنا لے جو کچھ ہو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو مٹا کر اپنی ہی ہستی مٹا دے اور حوادث دہر سے اپنی مرضی (Self) ملا دے۔ تب گویا وہ وہی ہو جائے گا۔ اب جب انسان خود گویا حوادث دہر ہے تو حوادث سے اُسے کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی اور وہ بڑی خوشی سے

نیرنگیٔ دہر کا تماشا کرے گا۔

(تیسرا شعر) دے مسرت مجھے اور عین مسرت مجھ کو　　　چاہیئے غم بھی بہ اندازۂ راحت مجھ کو

(معنی) شاعر کا نظریۂ حیات ہم کئی مرتبہ بیان کر چکے ہیں کہ غم و مصائب سے دو چار رہنے کو وہ عین زندگی سمجھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُس کے لئے غم ہی باعث مسرت یا عین مسرت ہے۔ پہلے مصرعہ میں شاعر مسرت یا عین مسرت یعنے غم کا جویا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں وہ چاہتا ہے کہ جتنی راحت اُسے چاہیئے اُسی انداز سے اُسے غم ملے کیونکہ غم ہی اُس کے لئے سامان راحت ہے۔

(چوتھا شعر) یہ آنا جلوہ بن کر اور پھر میری نظر ہونا　　　یہی ہے دید تو پھر دید بھی اے فتنہ گر ہونا

(معنی) اس کے متعلق شاعر کا نظریہ پہلے سمجھ لیجئے۔ اصغر صاحب کا خیال ہے کہ ایک ہی قوت ہے جو حسن اور عشق دونوں صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اصغر صاحب کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال　　　چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

جب حسن اور عشق یعنے جلوہ اور نظر دونوں ایک ہی قوت ہیں تب دید ہی ایک چیز ہے جو دوسری غیر ہے شاعر چاہتا ہے کہ کیف دید بھی وہی قوت ہو جائے اور تمام آفت رفع ہو جائے۔ کیونکہ کیف دید ہی ہے جس کی وجہ سے پریشانی پیدا ہوتی ہے۔

(پانچواں شعر) جمال یار کی زینت بڑھا دی رنگ و صورت نے　　　قیامت ہے، قیامت میرا پابند نظر ہونا

(معنی) حسن حقیقت میں کوئی رنگینی نہ تھی۔ اگر دیکھنے والے رنگ و صورت کے پردے میں اُسے نہ دیکھتے۔ مگر اس رنگینی سے ایک عجیب دلفریبی پیدا ہوئی جس میں ایک عالم مبتلا ہو کر حقیقت سے بے خبر رہ گیا اس لئے شاعر کہتا ہے کہ میرا پابند نظر ہونا۔ یعنی محض رنگ و صورت سے اُلجھ کر رہ جانا قیامت ہے۔

(چھٹا شعر) طلسم رنگ و بو کو جس نے سمجھا مٹ گیا اصغر　　　نظر کے لطف کا برباد ہونا ہے نظر ہونا

(معنی) اگر کسی ڈراما میں کوئی پردہ نہایت خوبصورت بنا ہو تو اُس سے ایک خاص حظ ملے گا۔ مگر صرف اُس کو جو نقاش پردہ کے فریب میں آ جائے یعنے جہاں اُس نے چند رنگین نقوش سے باغ دکھایا ہو وہاں باغ سمجھے جہاں اُس نے نیلے رنگ سے پانی دکھایا ہو وہاں پانی سمجھے۔ جو شخص اُسے یہ کہہ کر ٹال دے گا یہ کچھ نہیں ہے صرف رنگ کا فریب ہے اُسے کوئی لطف نہ ملے گا۔ اگر تصور سے لطف اُٹھانا ہے تو مصور جتنا فریب دینا چاہتا ہو اُتنا فریب کھانا چاہیئے۔ اسی مضمون کو اصغر صاحب نے "نشاط روح" میں بھی ایک جگہ کہا ہے ملاحظہ ہو ؎

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے　　　میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

اسی مضمون کو اصغر صاحب نے اس شعر میں بھی ادا کیا ہے ۔ اس شعر میں پہلے لفظ "نظر" کے معنی ہیں دیکھنے والی قوت یعنے بصارت کے اور دوسرے لفظ "نظر" کے معنے سمجھنے والی قوت یعنے بصیرت کے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عالم ایک طلسم رنگ و بو ہے جو اس کے فریب میں رہتا ہے وہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے ۔ مگر جو اس طلسم کی حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ محض طلسم ہے اُس کا سارا لطف زندگی برباد ہوجاتا ہے ۔ دنیا میں اُس کے لئے کوئی رنگینی باقی نہیں رہتی اس لئے شاعر کہتا ہے کہ نظر پیدا ہونا یعنے بصیرت حاصل ہونا نظر کے لطف کا یعنے بصارت کے لطف کا برباد ہونا ہے ۔

(ساتواں شعر) ذرہ ذرہ ہے یہاں کا رہرو راہ فنا — سامنے کی بات تھی جس کو خبر سمجھا تھا میں

(معنی) عالم کا ذرہ ذرہ فنا کی طرف جا رہا ہے ۔ اگر بالغ نظری ہو تو یہ مناظر ہم روز دیکھتے ہیں یعنے یہ سامنے کی بات ہے اس لئے اس کی صداقت کے لئے نہ کسی ثبوت کی ضرورت ہے اور نہ اس میں کسی شک کی گنجائش ۔ مگر دنیا کے لوگ باوجود دن رات مناظر فنا دیکھنے کے اُس کو ایک مسلم الثبوت صداقت نہیں سمجھتے بلکہ محض ایک خبر سمجھتے ہیں جو ممکن ہے رہی ہو اور ممکن ہے غلط ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ دنیا کی محبت کے فریب میں آجاتے ہیں ورنہ اگر مناظر فنا سے عبرت حاصل کریں تو دنیا کی کسی چیز سے وابستہ نہ ہو کر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے زندگی گذار دیں جیسا کہ اکابر مذاہب کا شعار رہا ہے ۔

یہ شعر سر تیج بہادر سپرو نے اپنے انتخاب میں لیا ہے اس پر اعتراض کرکے آپ نے اُن کے ذوق سلیم پر بھی حملہ کیا ہے ۔

(آٹھواں شعر) رقص مستی دیکھتے جوش تمنا دیکھتے — سامنے لاکر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

(معنی) شعر بہت صاف ہے اور زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم کسی طرح معشوق کو اپنے سامنے لاتے تو کیا ہوتا ۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت تمناؤں میں ایک جوش ہوتا اور خود شاعر دنیا و مافیہا کو بھول کر ایک مستی کے عالم میں ہوتا ۔ اتنا ہی نہیں مستی خود ایک مستی کے عالم میں آکر رقص کرنے لگتی ۔

(نواں شعر) اس طرح کچھ رنگ بھر جاتا نگاہ شوق میں — جلوہ خود بیتاب ہوجاتا وہ پردہ دیکھتے

(معنی) شاعر کہتا ہے کہ نگاہ شوق میں اس طرح کا رنگ بھر جاتا ۔ یعنے اتنی سچی لگن ہوتی کہ جب یہ نگاہ شوق پردہ پر جا پڑتی تو خود حسن یعنے جلوہ کو ترس آتا اور وہ خود ظاہر ہونے کے لیے بیتاب ہونے لگتا ۔

(دسواں شعر) ترے قربان ساقی اب یہ کیا عالم ہے مستوں کا — کبھی عالم تو ہوتا ہے کبھی عالم نہیں ہوتا

(معنی) شعر نہایت صاف ہے ۔ تعجب ہے کہ اس کا بھی مفہوم سمجھ میں نہیں آسکا ۔ سُنئے شاعر جو کہ ایک رند ہے ساقی کے قربان جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ عالم مستی میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کبھی تمام عالم موجود معلوم ہوتا ہے

اور کبھی اُس کا وجود گم ہو جاتا ہے۔

(گیارھواں شعر) یہ اقرار خودی ہے دعویٰ ایمان و دیں کیسا　　　ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

(معنی)، واقعی مفہوم کے اعتبار سے شعر بہت اعلےٰ ہے اس لئے ممکن ہے کہ عوام کی سمجھ سے باہر ہو۔ خدا کے بارہ میں جو کچھ مختلف مذاہب یا فلسفہ و سائنس میں ملتا ہے اُسے آدمی اپنی فہم کے مطابق سمجھ کر اپنے خدا کو تشکیل دیتا ہے۔ انسان کا خدا در اصل انسانی دماغ کی پیداوار ہے ورنہ اُس کی اصلیت کسی کو معلوم نہیں

اسی مضمون کو اصغر صاحب نے "نشاط روح" میں یوں کہا ہے ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

اسی لئے شاعر کہتا ہے کہ خدا کا اقرار جو دعوے دین و ایمان پر مبنی ہے اقرار خدا نہیں ہے بلکہ اقرار خودی ہے۔ خدا کا اقرار جب ہی ممکن ہے جبکہ آدمی اپنے سے علیحدہ ہو جائے اپنے سے علیحدہ ہونے پر اگر کوئی شے خدا دکھائی پڑے تو واقعی اُس کا اقرار خدا کا اقرار ہو گا

(بارھواں شعر) بہار جلوۂ رنگیں کا اب یہ عالم ہے　　　نظر کے سامنے حسن نظر مجسم ہے

(معنی)، یہ شعر اُن لوگوں کے لئے صاف ہے جو موجودہ فلسفہ کی (Subjectivity) سے واقف ہیں۔ برکلے اور مصنف ویدانت ویاس وغیرہ کا مقولہ ہے کہ دنیا میں کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ تمام اشیاء کو ہم لوگوں نے اپنے احساس سے پیدا کر لیا ہے۔ شاعر کی نگاہ اس حقیقت تک پہونچ چکی ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ اب بہار جلوہ رنگیں کی ساری حقیقت یوں معلوم ہوتی ہے کہ گویا اپنا ہی حسن نظر مجسم ہو گیا ہے اور بس۔

(تیرھواں شعر) جسم کو اپنا سا کرکے لے اُڑی افلاک پر　　　اللہ اللہ یہ کمال روح جولاں دیکھئے

(معنی)، یہ شعر بھی بہت صاف ہے روح میں جب کمال پیدا ہو جاتا ہے تو وہ دور دور تک کی سیر اس طرح کراتی ہے کہ گویا وہ معہ جسم کے وہاں گئی تھی۔ وہاں کی چیزیں اس طرح صحیح صحیح بیان کرتی ہے کہ گویا اپنی آنکھوں دیکھی بیان کر رہی ہے۔ پہونچے ہوئے لوگ ہزاروں میل کے جزئیات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا وہ وہیں بیٹھے ہوئے تھے اسی مضمون کو شاعر کہتا ہے کہ روح نے گویا میرے جسم کو بھی لطیف بنا دیا اور معہ جسم کے افلاک پر اُڑ گئی۔ اس شعر میں واقعہ معراج کی طرف بھی اشارہ ہے۔

(چودھواں شعر) ایک میرا ہی فسانہ ز ازل تا بہ ابد　　　یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھ کو

(معنی)، شعر نفسیات کا معمولی مسئلہ سامنے رکھتا ہے۔ ایک آدمی کے سامنے اُسی کے کارنامے کافی دیر تک کہتے رہیے تو اگر وہ باحیا انسان ہے تو محجوب ہونے لگے گا۔ انسان خدا سے کہتا ہے کہ ازل سے لے کر ابد

تک میرا ہی فسانہ کہا جا رہا ہے۔ مجھ کو میرے ہی سامنے اس طرح رسوا نہ کرنا تھا۔

(پندرھواں شعر) میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے، اصغرؔ کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

(معنی) یہ شعر اصغرؔ صاحب کا کارنامہ ہے۔ اور اس کی قدر صاحبان دل ہی کر سکتے ہیں۔ عاشقان حقیقی کے لئے حرز جاں بنانے کے قابل ہے۔ طالب کہتا ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ مجھے معشوق کی طلب اور ضرورت ہے۔ مجھے یہ کیا خبر تھی کہ خود معشوق مجھ پر اتنا کرم کرے گا کہ خود مجھے وہ سراپا لے کر اپنا لے گا۔

(سولھواں شعر) حوصلے عشق کے پامال ہوئے جاتے ہیں اب یہ بیداد کہیں حسن پہ بیداد نہ ہو

(معنی) یہ شعر مومنؔ کے رنگ میں نہایت کامیاب تغزل کا نتیجہ ہے۔ اصغرؔ صاحب مومنؔ خاں کے سلسلہ میں ہیں بھی اس لئے ایسا شعر کہنا اُن کے لئے زیبا اور مناسب ہے۔ نیازؔ صاحب آپ مومنؔ خاں کے بڑے معرفوں میں ہیں اور نگار میں مومن نمبر بھی نکال چکے ہیں۔ پھر اس شعر کا آپ کی سمجھ میں نہ آنا تعجب سے خالی نہیں ہے۔ سُنیئے۔ بیداد معشوق بڑی بہتر چیز ہے جس کا عاشق بڑے جوش اور سرگرمی سے استقبال کرتا ہے۔ مگر بیداد کی ایک حد ہوتی ہے اُس کے بعد بیداد کا کوئی لطف نہیں رہ جاتا۔ جگرؔ صاحب کا ایک مصرع ہے۔ ع کیا لطف جب ہمیں نہ رہے اختیار میں۔ جب بیداد اس مقام پر پہونچ جاتی ہے تو عاشقوں کے حوصلے پامال ہونے لگتے ہیں۔ لوگ عشق کرنے سے جھجکنے لگتے ہیں۔ جب لوگ عاشقی سے بھاگنے لگیں گے تو حسن کا کوئی قدرداں نہ رہ جائے گا اور یہ انتہائی ظلم جو عاشقوں پر کیا گیا تھا خود حسن کے لئے ظلم ہوگا۔

(سترھواں شعر) اب نہ یہ میری ذات ہے اب نہ یہ کائنات ہے میں نے نوائے عشق کو ساز سے یوں ملا دیا

(معنی) اس شعر میں ایک معمولی سا استعارہ تھا جس کا فہم سے باہر ہو جانا بھلے بدقسمتی کے اور کیا ہے۔ سُنیئے جب گانے والا اپنی آواز ساز سے ملا دیتا ہے اور دونوں میں انتہائی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو ایک مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے جس میں دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ میں نے نوائے عشق کو ساز سے یعنے مظاہر حُسن سے اس طرح ملا دیا کہ اب ایک مستی کا عالم ہے جس میں میں اپنی ہستی کیا ہستی عالم فراموش کر بیٹھا۔

(اٹھارھواں شعر) عکس جمال یار کا آئینۂ خودی میں ہے یہ غم ہجر کیا دیا مجھ سے مجھے چھپا دیا

(معنی) یہ شعر عوام کے لئے ذرا مشکل ضرور ہے مگر سمجھ داروں اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے نہیں۔ اصغرؔ صاحب کے نظریہ (Subjective ideals) کا ہم ایک بار ذکر کر چکے ہیں کہ وہ حسن معشوق کو اپنے ہی خیالات و تصورات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے جب معشوق سامنے رہتا ہے (یعنی حالت وصل میں) تو معشوق کا حسن سامنے نہیں رہتا بلکہ عاشق آئینۂ خودی عاشق میں جمال یار کا گویا عکس دیکھتا ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن ہجر میں عاشق عین بیتابی میں بے خود ہو جاتا ہے اور معشوق کا تصور بھی نہیں جا سکتا جو کہ خود اس کے ہی

دماغ کا نتیجہ ہے۔ اسی کو شاعر نے دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا ہے کہ حالت ہجر میں عاشق خود اپنے کو نہیں دیکھ پاتا۔

ابھی تک جناب نیاز ان اشعار پر تنقید کرتے رہے جو یکسر مفہوم سے معرا تھے مگر جن کی حقیقت ناظرین کرام پر بخوبی روشن ہو چکی ہے۔ اب نیاز صاحب اصغر صاحب کے ان اشعار پر تنقیدی لیاقت دکھاتے ہیں جن میں ان کی فہم کے مطابق کوئی مفہوم تو ہے لیکن کوئی نہ کوئی نقص اس میں ضرور پایا جاتا ہے۔ انشاء اللہ اس کی بھی حقیقت کھلی جاتی ہے۔

قطعات

(جناب حکیم افتخار علی صاحب جگر صدیقی وارثی)

آئینہ جب سامنے آئے نظر کر غور سے　　شکل اچھی ہے تو اس سے بڑھ کے اچھے کام کر
اور اگر بر عکس ہے دو عیبوں کو یکجا نہ کر　　ہے بری صورت برے کاموں سے اپنے دل میں ڈر

جو دیکھتے ہیں تو ناپائدار دنیا میں　　برائے نام خوشی ہے مگر بہت سے ہیں غم
اگر لگاتے ہیں بحر جہاں میں ہم غوطہ　　تو سنگریزے ہیں ملتے زیادہ موتی کم

کسی کے دم پہ بنی ہے خمار پیری سے　　کسی کو دیکھو تو ہے بادۂ شباب سے مست
کچھ ایسا پردۂ غفلت پڑا ہے آنکھوں پر　　زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

ایک نکتہ خوب ہے یہ بہر تسخیر قلوب　　گر تجھے منظور ہے مجھ پر زمانہ جان دے
ابر کے مانند عالی ہمتی سے کام لے　　دے ضرورت پر جسے جو کچھ دے بے احسان دے

ایک نے سقراط سے اک دن کہا　　اے حکیم وقت مرد با خدا
وہ جو ہے اک مرد جاہل خود نما　　اس نے گالی دی برا تجھ کو کہا
ہنس پڑا یہ سن کے مرد باصفا　　یہ جواب اپنے مخاطب کو دیا
اس نے غیبت میں برا مجھ کو کہا　　سامنے تو گالیاں ہے دے رہا

شیر شاہ سوری کے چند آئینی نقوش

(جناب منشی انوار احمد علوی صاحب بی۔اے)

(بسلسلۂ ماہ دسمبر ۳۶ء)

مال گذاری

سلطنت دہلی کے ابتدائی سلاطین خود کو زمین کا حقدار سمجھتے اور اسی بنا پر کل زمین کی پیداوار کو اپنا حق جانتے اور غریب کاشتکار کے لئے صرف اس کی وجہ معاش کے لئے کچھ چھوڑ دیتے۔ سلطنت کا کوئی مقررہ اصول پیداوار کے متعلق نہ تھا۔ مال گذاری یا تو قیاس سے طے ہوتی تھی یا تخمینہ لگا کر شمار کی جاتی تھی۔ علاؤالدین خلجی نے سب سے پہلے جریب کے طریقے کو رائج کیا لیکن اس طریقے نے زیادہ رواج نہ پایا کیونکہ اس کی موت کے بعد ہی غازی الدین تغلق نے اپنے افسروں کو جو ہدایات مال گذاری کے متعلق کیں وہ یہ تھیں۔

"مال گذاری کی تشخیص یا تو قیاس پر کرو یا اطلاع دینے والوں کی اطلاع کے بموجب تخمینہ لگا کر اندازہ کر دو" (ضیاء برنی صفحہ ۳۲۹ = الیٹ جلد سوم صفحہ ۲۳۰)

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر علاؤالدین کے طریقے نے رواج پا لیا ہوتا تو ہدایات اس طرح کی نہ ہوتیں۔ علاؤالدین نے کل پیداوار کا نصف سلطنت کا حق قرار دیا۔ اس کے علاوہ بھینس۔ بکری اور گائے کے اوپر بھی ٹیکس مقرر تھا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں دوآبہ کے ہندوؤں کی شرارت کی بنا پر اس مال گذاری میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔ مگر یہ صرف دوآبہ کے لئے تھا اور دوسرے مقامات اس سے محفوظ تھے۔ فیروز تغلق کی تخت نشینی پر اس میں تبدیلی ہوئی۔ لیکن حاکم اور محکوم میں براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب حیا نہ طریق عمل اور شاہی مراعات خاک میں مل جاتے تھے کیونکہ سپاہیوں کی دست برد اور ہندو مقدموں کے بے جا ظلم و تعدی سے غریب کاشتکار بالکل پس جاتے تھے۔ سپاہیوں کو تنخواہ کے عوض جاگیر دینے کا طریقہ ہمایوں کے زمانہ تک رہا (صرف علاؤالدین خلجی کے عہد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا) جاگیردار اور افسران فوج اپنی رعیت پر بالکل خود مختارانہ طریقے سے حکومت کرتے اور جو چاہتے اُن سے وصول کر لیتے۔ مقدم اور چودھری بھی اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھ کر غریب کاشتکاروں سے خوب روپیہ وصول کرتے تھے اور اگر زمیندار کبھی کمزور ہوا تو وہ خود زمیندارانہ حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔ اور چونکہ مال گذاری وصول کرنے کے طریقوں سے یہی لوگ واقف ہوتے تھے اس بنا پر حاکم اور محکوم دونوں ان کے ہاتھ میں تھے۔ ابھی تک کسی بادشاہ یا وزیر نے اس محکمہ کی

جانچ نہیں کی تھی جو از سرتا پا غبن اور ہر قسم کی خرابیوں سے پُر تھا۔ اس خرابی کا علاج علاؤالدین کا جور اور تعدی نہ تھا۔ بلکہ اس کا علاج یہ تھا کہ رعیت اور سلطان میں براہ راست تعلق ہو۔ مال گذاری مناسب اور واجب ہو اور اس کی تشخیص کے لئے کوئی آزمودہ طریقہ کار ہو۔

شیر شاہ نے تخت نشین ہو کر اُسی طریقہ پر عمل کیا جو اُس نے اپنی جاگیرداری کے وقت سہسرام میں جاری کیا تھا۔ زمین کی پیمائش ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق کی گئی۔ سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں زمین کی پیمائش گز سے ہوتی تھی جس کی لمبائی ۳۲ اُنگل ہوتی تھی۔ شیر شاہ نے سوتی جریب ۵۵ گز فی گز ۳۲ انچ ایجاد کی (اسی پر اکبر نے اتنا اضافہ کیا کہ رسّی کے بجائے بانس سے بیگھ کی پیمائش ہونے لگی)۔ بیگھ اور جریب دونوں ہم معنے تھے۔ ایک جریب یا بیگھ میں ۳۶۰۰ مربع گز ہوتے تھے۔ ہر کاشتکار کی زمین کی علیحدہ علیحدہ پیمائش ہوتی تھی اور پیداوار کا چوتھائی حصہ بطور سرکاری مال گذاری کے مقرر تھا۔ اس سے قبل یہ طریقہ تھا کہ کاشتکار مال گذاری چاہے غلہ کی شکل میں ادا کرے چاہے نقد۔ لیکن ترجیح دوسرے ہی طریقے والے کو تھی۔ شیر شاہ نے اسی طریقہ کو جاری رکھا۔

"پیمائش کرنے والوں کا مستقل عملہ ملازم رکھا گیا۔ سہ جدید پیمائش کی رو سے افراد جمع بندی تیار ہوئیں ایوان کی رو سے خراج بحق دیوان (سلطنت) وصول ہوتا، پیداوار زرعی کا نصف حصہ کاشتکاروں کا حق ہوتا۔ اور نصف حصہ میں سے آدھا مقدم (زمیندار) کو ملتا۔ آدھا بحق دیوان وصول ہوتا۔ مقدم کا استحقاق اس لئے رکھا گیا کہ وہ گاؤں کا نگراں ہوتا، کاشتکاروں کی ضروریات کا مہیا کرنا، اُن کے خانگی تنازعات کا تصفیہ کرنا، وصولی میں شاہی ملازموں کو مدد دینا، ہر قابل انتظام امور کی حاکم پرگنہ کو اطلاع دینا۔ یہ سب کام اس کی ذات سے تعلق رکھتے"

(صولت شیر شاہی۔ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ ۱۹۳۷ء۔ صفحہ ۸۶)

یوں تو مقدم مال گذاری وصول کرتے۔ لیکن رعیت سے اس بات کی خواہش کی جاتی کہ وہ براہ راست خزانہ میں داخل کریں تاکہ مقدم کی اہمیت کم ہو اور رعایا اور بادشاہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں۔ بہت سے خلاف قانون ٹیکس جو اب تک جاری تھے اور جن سے مال گذاری وصول کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ وہ سب شیر شاہ نے موقوف کر دیے۔ شیر شاہ نے صرف دو نئے ٹیکس لگائے۔ جریبانہ۔ محصلانہ اور ان دونوں کی مقدار وہ خود ہی مقرر کرتا تھا۔

" جریبانہ و محصلانہ و خوراک محصلاں معین ساختم "　　(عباس صفحہ ۲۸)

تشخیص لگان اور وصول یابی کی اجرت اسی چہ حصہ مال گذاری میں شامل تھی۔ افسروں کا بھتہ

اور وصولیابی کا کمیشن غالباً شاہی خزانہ سے دیا جاتا تھا، اگر آئین اکبری کی مندرجہ ذیل عبارت پر اعتبار کیا جائے، جس میں ٹیکس جمع کرنے والے افسروں کو ہدایات کی گئی ہیں۔ عبارت یہ ہے:۔

"جب گاؤں کے مکھیا (مقدم) کی کوشش سے کل مال گذاری وصول ہو جائے اسے (افسر مال گذاری کو) چاہیئے کہ وہ ہر بیگہ زمین پر نصف بسوہ بطور انعام اسے دے۔ یا یہ معاوضہ کسی اور شکل میں دے۔"

اس عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ۲½ فی صدی مقدم کو دیا جاتا تھا۔

اب ذرا الیٹ صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:۔

"اس نے (شیر شاہ) اپنے گورنروں کو ہدایت کی کہ ایک حصہ کا نصف کاشتکار کو دیا جائے اور باقی نصف کا نصف مقدم کو دیا جائے[1]۔"

عباس کے مسودہ میں اس عبارت کا ذکر نہیں۔ یہ بات ذرا بعید از قیاس ہے کہ شیر شاہ جو مقدم کی اہمیت کو کم کرنا چاہتا تھا کس طرح نصف مقدم کو دیتا۔ اکبر کے زمانے میں ۲½ فی صدی ملتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ۵ یا ۱۰ فی صدی دیتا لیکن نصف یعنی ۵۰ فی صدی وہ کسی طرح نہیں دے سکتا تھا۔ آج کل سرکار انگریزی بھی مقدم یا نمبردار کو پانچ فی صدی ہی دیتی ہے۔ اس واسطے صولت شیر شاہی اور الیٹ صاحب کا یہ بیان کہ "پیداوار کا نصف حصہ کاشتکاروں کا حق ہوتا اور نصف کا نصف مقدم کو ملتا" ذرا بعید از قیاس اور مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے۔

شیر شاہ حاکم و محکوم کے تعلقات میں یکسانیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ "اگر رعیت کے ساتھ تھوڑا سا سلوک کیا جائے تو اس سے بادشاہ ہی کو فائدہ پہونچتا ہے۔" اس کی عام ہدایت اپنے مال گذاری وصول کرنے والوں کو یہ تھی کہ:۔

"تشخیص لگان کے وقت جتنی رعایت ممکن ہو کرو لیکن وصولی کے وقت رعایت پاس نہ پھٹکنے پائے۔"

چونکہ شیر شاہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مکمل وصولی ہی سے اور سلطنت کی بقا ہے اس واسطے اسے بالکل خوشی اس بات کی نہ ہوتی تھی کہ اس کے ملازمین کاغذ کے اوپر بہت مال گذاری کی امید دلائیں اور وصولی کے وقت اس کا قلیل حصہ خزانہ میں آئے۔ بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ جتنی بھی مال گذاری ہو جائے وہ قلیل ہی رقم کیوں نہ ہو سب وصول ہو جائے بقایا نہ رہنے پائے کیونکہ بقایا بقائے سلطنت کے لیے بہت مضر ہے۔ بجز اس کے کہ بارش بالکل نہ ہو اور خشک سالی کی

[1] الیٹ جلد چہارم ص ۴۱۳

بنا پر کاشتکار موجودہ رقم نہ ادا کر سکے اور کوئی صورت مال گذاری نہ ادا کرنے کی نہ تھی ایسی صورت میں کاشتکاروں سے خاص رعایت ہوتی تھی۔ اور یہ سختی بالکل بجا تھی کیونکہ تشخیص لگان کے وقت انتہائی نرمی سے کام لیا جاتا تھا۔

سلطنت کے ذرائع آمدنی میں اُس نے دو طریقے سے اور اضافہ کیا۔ ایک تو سپاہیوں کو تنخواہ کے عوض جاگیریں دینا بند کر دیں۔ اور دوسرے بہت سی زمینیں جو متولیان مسجد نے ناجائز طریقے سے دبا رکھی تھیں اُن کو تحقیقات کر کے اُن کے قبضے سے نکال دیا۔ لودی سلاطین کے زمانے میں بیشمار مساجد کی تعمیر ہوئی اور اُن کے اخراجات کے لئے زمینیں وقف کردی گئیں ان مساجد کے اماموں نے سلطان ابراہیم لودی کے افسروں کو رشوتیں دے کر ناجائز طور پر بہت سی زمینیں حاصل کر لیں۔ ان باتوں کی اطلاع پا کر شیرشاہ نے بذات خود تفتیش کی اور ایسی تمام ناجائز طور پر حاصل کی ہوئی زمینوں کو اُن کے قبضہ سے نکال لیا۔ اور جتنی زمین کہ جائز تھی اس کا فرمان عطا کیا۔ لیکن چونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ قابل اعتبار نہیں ہیں اس واسطے ایسے تمام فرامین اُس نے اُن کے ہاتھوں میں نہیں دیے بلکہ سرکار متعلقہ کے شقداروں کے پاس براہ راست وہ فرامین بھجوا دیے۔ اس کے بعد اُس نے سفر خرچ دے کر رخصت کیا۔ اس طریقہ سے سلطنت کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ (الیٹ جلد چہارم ص۴۲۲)

شیرشاہ کا یہ ملکی و مالی نظام جو ٹوڈرمل کے بندوبست کے نام سے مشہور ہے مغلوں کے عہد میں بھی قائم رہا اور عہد انگریزی میں بھی مع اپنے ضروری اجزاء کے "رعیت داری" طریقہ کے نام سے جاری ہے اور اس کی متفقہ طور پر تعریف کی جاتی ہے۔ اُس کا منشا اور قصد تو یہ تھا کہ اس طریقہ کو اپنے پورے ممالک محروسہ میں جاری کرے لیکن عملی دقتوں اور چند ملکی مصالح نے اُسے اس بات پر مجبور کیا کہ بعض حصص ملک میں وہ اُن جگہوں کے مروج طریقہ پر عمل کرے۔ چنانچہ ملتان میں اُس نے ہیبت خاں نیازی کو حکم دیا کہ وہ وہاں کے باشندوں کے رسم و رواج کا لحاظ کرے اور بٹہ حصہ لگان بلا پیمائش کے وصول کرے۔

صدر شقدار کی عملی سرگرمیوں سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ اس مالی و ملکی نظام پر عمل درآمد کتنی سختی سے ہوتا ہے۔ حمید خاں ککر۔ نگرکوٹ۔ جوالا مکھی۔ دھداول اور کوہستان جموں پر حاکم تھا اور اس قدر رعب و داب کا حاکم تھا کہ پہاڑی قوموں میں سے کسی کو بھی اُس کے آگے چوں وچرا کی گنجائش نہ تھی۔ ان پہاڑیوں سے اُس نے زمین کی پیمائش سے لگان وصول کیا۔ عیسٰے خاں شروانی

سنبھل میں تھا اور اتنی سختی اس نے وہاں کے سرکش زمینداروں پر کی کہ وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ ان جنگلوں کو جو بغاوت کے وقت اُن کی جائے پناہ ہوا کرتے تھے کاٹ کر لگان ادا کریں ہیبت خاں نیازی نے قنوج کے متمرد لوگوں کو پیمائش کے بعد لگان دینے پر مجبور کیا۔

ظاہر ہے کہ ان سختیوں کو وہ طبائع جنھیں خلاف قانون زندگی بسر کرنے کی عادت پڑ گئی ہو۔ جو گذشتہ بیس برس سے من مانی حکومت کرتے ہوں اور جنھیں کسی بیرونی مداخلت کا شان و گمان بھی نہ ہو کیونکر برداشت کر سکتی ہیں۔ نتیجہ جو ہونا چاہیئے وہی ہوا یعنی دریائے جمنا اور چمبل کے مضافات کے زمینداروں نے متحدہ طور پر بغاوت کر دی۔ شیر شاہ نے سنبھل سے ۱۲۰۰۰ فوج بلا کر اُن کی قرار واقعی گوش مالی کی۔

اگر شیر شاہ دس بیس برس اور زندہ رہتا تو زمینداروں کا طبقہ یا تو بالکل قابو میں آجاتا یا اس کا وجود ہی نہ رہتا اور ہندوستان کے طول و عرض میں سوائے محنتی اور ایماندار کسانوں کے اور کوئی نظر نہ آتا۔ جن کی تمام تر توجہ اپنی زمین کی بہتری میں صرف ہوتی اور جن کے دل و دماغ اپنے ارد گرد کی مسموم فضا سے بالکل پاک و صاف ہوتے۔ لیکن شیر شاہ کی زندگی اتنی مختصر ہوئی کہ سلطنت کے دور دراز حصے پرانے طرز کے زمینداروں سے آباد رہے۔ لیکن وہ اتنے خطرناک نہ تھے کیونکہ وہ سب سرحد پر تھے اور انھیں بیرونی حملہ کے خلاف اپنی تمام تر توجہ صرف کرنی پڑتی تھی چہ جائیکہ وہ ہندوستان میں بغاوت کا خیال کر سکیں۔

سکہ

شیر شاہ نے تخت نشین ہو کر دار الضرب کی حالت زراعت سے بھی بدتر پائی۔ سونے اور دیگر ادنیٰ دھاتوں میں کسی تناسب کے نہ ہونے سے اور دھاتوں میں میل ہونے کی وجہ سے سکے بالکل ردی اور از کار اور بیکار ہو رہے تھے۔ اس نے بہت جلد سکوں کی طرف توجہ کی۔ اعلےٰ پیمانہ پر ان کا انتظام کیا جتنے پرانے آمیزش والے سکے تھے ان سب کو موقوف کر کے نئے سکے رائج کئے۔ اس نے بہت کثیر تعداد میں ایک نیا تانبے کا سکہ رائج کیا جو بعد میں دام کے نام سے مشہور ہوا۔ جس کے متعدد حصے بھی مثل ½ - ¼ - ⅛ - 1/16 کے تھے۔ اس سے فوج کو نقد تنخواہ دینے کی فوری ضرورت پوری ہو گئی۔

طامس کی رائے ملاحظہ ہو:-

"شیر شاہی عہد ہندوستان کے سکوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ اُس نے نہ صرف دار الضرب درست کرائے بلکہ گذشتہ بادشاہوں کے سکوں میں جو خامیاں تھیں انھیں

دور کیا۔ جنھیں بعد کو مغلوں نے اپنا لیا"

(Thomas: Chronicles of the Pathan Kings P. 403)

ہندوستانی سکہ جات کے اوپر لکھتے ہوئے Smith صاحب باوجود اپنی اکبر نوازی کے رقم طراز ہیں:-

"شیر شاہ کے سر سکوں کی باقاعدہ تنظیم کا سہرا ہے۔ اس کے اس طریقہ کو بغیر کسی تغیر و تبدل کے مغلوں نے جاری رکھا اور انگریزوں نے بھی ۱۸۳۵ء تک اس پر عمل کیا اور انگریزوں کا موجودہ انتظام بھی قریب قریب وہی ہے۔ اس نے خراب قسم کی آمیزش کے سکے یک قلم موقوف کر دیے اور سونے۔ چاندی اور تانبے کے سکے باہم وزن میں تناسب رکھ کر ایجاد کئے۔ اس کے چاندی کے روپیہ میں جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا۔ ۱۷۵ گرین خالص چاندی ہوتی تھی۔ اس طرح سے اس کا روپیہ موجودہ روپیہ کے برابر تھا"

(Imperial Gazetteer ii 145-146)

شیر شاہی سکے ایک حیثیت سے اور قابل لحاظ ہیں۔ ان کی وجہ سے بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ ان کی بدولت اس کے ملکی حدود اور دیگر معلومات حاصل ہوئیں۔ فارسی مورخین بہت زیادہ ناقابل اعتبار ہیں۔ انھوں نے کہیں بھی اس کی فتح سندھ کا ذکر نہیں کیا۔ سکوں پر ٹکسال کا نام موجود ہونے سے ان کی تاریخی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ گو کہ یہ قاعدہ کوئی نیا نہ تھا پھر بھی شیر شاہ نے اس کو ترقی دی اور اکبر نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ یہ صرف اس کے سکوں ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کی سلطنت کوہستان آبو اور سکر بھکر (سندھ) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اگر یہ سکے نہ ہوتے تو مختلف مورخین کے بیان سے جو غلط فہمی پیدا ہوتی تھی اس کا اندفاع نہ ہوتا۔ اس کے سکوں سے ایک بات اور ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مفتوحہ ممالک میں کس قدر جلد انتظام قائم ہو جاتا تھا۔ زمین کی پیمائش۔ سڑکوں کی تعمیر۔ دار الضرب کا قائم ہونا۔ یہ سب گویا اس کی افواج کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ جو سکے ۹۴۹ھ ۹۵۰ھ ۹۵۱ھ میں علی الترتیب اجین۔ سکر بھکر (سندھ) اور کوہستان آبو سے جاری ہوئے ان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کی فتوحات کے چھ ہی مہینے بعد ان مقامات میں انتظام قائم ہو چکا تھا۔

ایک اور دلچسپ حقیقت کا انکشاف ان سکوں کے متعلق تحقیقات کرنے سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ شیر شاہ نے متعدد شہروں کو اپنے نام سے موسوم کیا تھا اور کچھ نئے بسائے بھی تھے۔ مثلاً شیر گڈھ عرف دہلی۔ شیر گڈھ عرف قنوج۔ شیر گڈھ عرف سکر بھکر۔ اگر ان شہروں کا عرف نہ ہوتا تو واقعی بہت دقت ان کے ایک دوسرے سے تمیز کرنے میں ہوتی اور ان سب مقامات کے نکلے ہوئے سکوں کو قلعہ شیر گڈھ

نزد سہسرام سے نکلا ہوا سمجھا جاتا جسے اس نے اپنی فتح بنگال سے قبل بنایا تھا۔

شیر شاہ کے سکے مربع اور گول دونوں قسم کے تھے۔ خالص دھات کے سونے کے سکے جن کا وزن ۱۶۸۰۵ گرین۔ اور ۱۶۶۰۴ گرین۔ چاندی کا نصف روپیہ جس کا وزن ۸۸ گرین اور تانبے کے سکے جن کا وزن ۳۱۱ گرین اور ۳۲۲ گرین کے درمیان ہوتا تھا۔ پائے گئے ہیں۔ چاندی اور تانبے کے سکہ کی شرح تبادلہ ۱: ۶۴ تھی۔

سکوں کے اوپر بادشاہ کا نام فارسی اور ناگری دونوں زبانوں میں کندہ ہوتا تھا۔ ۹۴۸ھ کا جو سکہ شریف آباد کا پایا گیا ہے اُس میں اوپر حضرت ابوبکرؓ۔ نیچے حضرت عثمانؓ۔ دائیں جانب حضرت عمرؓ اور بائیں جانب حضرت علیؓ کے نام ہیں۔ خود بادشاہ کا لقب یہ تھا۔ السلطان العادل المؤید الرحمۃ الدنیا والدین ابوالمظفر شیر شاہ سلطان خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ۔

صاحب صولت شیر شاہی لکھتے ہیں:۔

"سکہ اپنے نام کا جو اس نے جاری کیا، وہ بھی اس کی غیر متعصبی کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ جس کے ایک رخ پر بخط فارسی "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ" اور دوسری طرف بخط ہندی "سلطان شیر شاہ سور خلد اللہ ملکہ سلطان حفظ الدنیا والدین سری شیر شاہ" کندہ تھا۔

سلاطین سابق کے عہد میں اس کی مثال شاید ہو مگر میری نظر سے نہیں گذری اکبر اور جہانگیر کا عہد تالیف قلوب اقوام اور رعایا نوازی میں مشہور ہے مگر ان کے عہد میں بھی اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔

چونکہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک، اور زبان بھی ان کی ہندی۔ اس لئے سکوں کے حروف پڑھنے اور سمجھنے کے لئے مذہبی تعصب کو دل میں جگہ نہ دے کر ناگری حروف کا سکوں میں نقش کرانا سلطان نے ضروری سمجھ کر بے تعصبی کی عمدہ مثال قائم کی تھی۔"

(صولت شیر شاہی۔ مطبوعہ یونیورسٹی پریس علی گڈھ۔ صفحہ ۱۱۱)

مندرجہ ذیل دارالضرب کے مضروب شدہ سکے پائے گئے ہیں۔

آگرہ۔ بھانپور۔ فتح آباد۔ گوالیار۔ کالپی۔ رسول پور عرف شمس آباد۔ سات گاؤں۔ شریف آباد۔ شیر گڈھ (سہسرام)، چنار۔ سنبھل۔ اجین۔ آبو۔ مالور۔ بیانہ۔ حصار۔ نرول۔ لکھنؤ۔ شیر گڈھ عرف قنوج۔ شیر گڈھ عرف حضرت دہلی۔ شیر گڈھ عرف سکر بھکر۔ مالوٹ۔

تاریخہائے الم رحلت

۱۹۳۶ ء

بر

سنگ مزار مولوی نور الحسن صاحب علوی کاکوروی

۱۳۵۵ ھ

ابن محسن عالم جناب مولوی محسن کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۵۵ ھ

اُدخلی فی عبادی وادخلی جنتی

۱۹۳۶ ء

(۱)

بجنت مولوی نور الحسن رفت
براخلاق نکویش فخر ما بود
دل اہل نظر را چوں سویدا
رقم سال وفاتش کرد حامد

دُر یکتا ز گنج علم شد گم
چنانکہ آسمان بر ماہ و انجم
بہ چشم اہل دل مانند مردم
کہ نیّر داخل فردوس ہشتم

۱۰۹۵ + ۲۶۰

۱۳۵۵ ھ

(۲)

ایسا صدمہ ہے وفات مولوی نور الحسن
لوح تربت کے لئے حامد ہے تاریخ وفات

کب چھپائے سے ترے لے دیدۂ پرنم چھپا
آج گیا اوج ادب کا نیر اعظم چھپا

۱۳۵۵ ھ

حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج، آگرہ

نظرے خوش گذرے

فروری نمبر شائع نہ ہوا تھا کہ ۳۰ر مارچ کو حکومت صوبجات متحدہ کی طرف سے اُس کمیٹی کے تقرر کا اعلان ہوگیا جس کا گورنر صاحب نے ۱۴ر نومبر کو مدح صحابہ کمیٹی کے وفد سے وعدہ کیا تھا اور ایڈیٹر الناظر کے وقت کا بیشتر حصہ کاغذات کی تیاری، وکلا سے مشورہ اور مصارف کے لئے سرمایہ کی فراہمی میں صرف ہونے لگا۔ جیسے جیسے کمیٹی کی نشست کا زمانہ قریب آتا گیا مصروفیت بڑھتی گئی اور ۲۰ر اپریل سے ۱۰ر مئی تک کمیٹی کی کارروائی کے دوران میں تو تقریباً سارا وقت اسی کام کے نذر ہوا۔ کمیٹی کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ہی الناظر کی طباعت شروع کردی گئی اور خیال تھا کہ مارچ و اپریل کا یہ مشترکہ پرچہ مئی کے اندر اندر شائع ہوجائے گا بلکہ اسی خیال سے ایک طرف حجم میں کسی قدر کمی کی گئی اور دوسری طرف خود اپنے معروضات کو آئندہ کے لئے ملتوی کرنا پڑا مگر دفعتہً ۲۰ر اپریل کا دن گذرنے کے بعد نصف شب کے قریب شیعوں کی ایک جماعت سنیوں سے لڑ پڑی اور موقع پر موجود ہونے کی بنا پر راقم الحروف کا سر بھی لاٹھی کی ضرب سے مجروح ہوگیا اور اُسی وقت سے شہر کے مغربی حصص میں جو شیعہ آبادی کا مرکز ہے جا بجا سنیوں پر حملے ہونے لگے اور برابر دو دن تک راستوں اور گلیوں میں باہم جنگ ہوتی رہی۔

رات ہی کو اسپتال میں زخمی سر کی مرہم پٹی کرانے کے بعد ۲۱ر اپریل کی صبح سے شہر کے دیگر سُنّی معززین کے ساتھ مل کر حالات کی اصلاح اور عامۂ مسلمین کی خبرگیری کے لئے معروف ہوجانا پڑا اور سنی ریلیف کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت میں کامل دو ہفتے اسی خدمت میں گذر گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ الناظر کی طباعت رُک گئی اور اب اس کا موقع ملا ہے کہ پرچہ کی تکمیل ہو۔ کوشش کی جارہی ہے کہ یہ پرچہ جون کے دوسرے ہفتہ میں شائع ہوجائے اور اس کے بعد ہی مئی و جون کے مشترکہ پرچہ کی طباعت کا سلسلہ شروع کردیا جائے تاکہ جون کے اندر اگر نہیں تو جولائی کے ہفتہ اول میں اُس کی اشاعت کی جاسکے اور پھر ماہ بماہ الناظر کے چھپنے اور روانہ ہونے کا سلسلہ قائم ہوجائے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

جن اصحاب کے مضامین بہت دنوں سے آئے رکھے ہیں اور اس نمبر کے لئے لکھوائے گئے تھے افسوس ہے کہ ناگزیر اسباب سے روک لینا پڑے۔ خدا نے چاہا تو آئندہ پرچہ میں جو کافی ضخیم ہوگا اکثر مضامین درج ہوسکیں گے۔ احباب بددل نہ ہوں۔

رات دن سلے رسا یہی ہے کام
خیر نواب کی مناتے ہیں

ساقی ہوش بنا ہوئے آج مستانہ ہیں (۲۵) اپنی آنکھوں کا تصدق ایک پیمانہ ہیں

بھاگتے ہیں دور ہم سے کہہ کے دیوانہ ہیں — کردیا ہے عشق میں اپنوں نے بیگانہ ہیں
اک بیان نامہ برنے کچھ تسلی دی تو کیا — رات دن کوئی سنائے اُن کا افسانہ ہیں
ساری وحشت اس دل وحشی کی ہوجاتی ہے دور — مسکرا کر جب وہ کہہ دیتے ہیں دیوانہ ہیں
اس لیے پہلو میں رکھا ہے دل بیتاب کو — اک بت سفاک کو دینا ہے نذرانہ ہیں
حضرت زاہد کو جب ہم دیکھ لیتے ہیں کبھی — یاد آجاتی ہے شکل پیر میخانہ ہیں
اُف رے شوق میکشی اللہ رے ذوق بیخودی — ہوش جب آتا ہے یاد آتا ہے پیمانہ ہیں
غش ہمیں آیا تو اب پھرتے ہو گھبرائے ہوئے — تم نے جلوہ کیوں دکھایا بے حجابانہ ہیں
درد فرقت سے بُری شے دوست دشمن کوئی ہو — ہر کس و ناکس سے کہنا اپنا افسانہ ہیں
اُس کے در پر ناصیہ سائی ہمارا کام ہے — آزمانا ہے مقدر اپنا روزانہ ہیں
تجھ سے ناداں کو دیا دل پھر نباہی عمر بھر — اس لیے خلق خدا کہتی ہے فرزانہ ہیں
ہائے ویسی صحبتیں وہ لطف وہ جلسے کہاں — یاد آتا ہے بہت جنت میں میخانہ ہیں
رات دن رہنا وہیں چلنا وہیں پھرنا وہیں — گھر سے بڑھ کر ہوگیا وحشت میں ویرانہ ہیں
گھر کیا کس کی تجلی نے دل مشتاق میں — آج آتا ہے نظر روشن یہ کاشانہ ہیں

دل کسی کو کچھ سمجھ ہی کر دیا ہے اے رسا
ہیں وہ دیوانے سمجھتے ہیں جو دیوانہ ہیں

اُف تک نہ نکلے منہ سے گو صدمے جان پر ہیں (۲۶) ہم بھی ہیں بات والے اپنی زبان پر ہیں

اچھی کہی کہ صدمے کیوں تیری جان پر ہیں — یوں ہیں کہ ایسی باتیں تیری زبان پر ہیں
ہر دم نئی جفائیں اس ناتوان پر ہیں — کتنی بلائیں آخر اس آسمان پر ہیں
آئینہ سامنے ہے غش اپنی آن پر ہیں — چاہت کے اب تو صدمے دشمن کی جان پر ہیں
جتنے ہیں مرنے والے تیری زبان پر ہیں — صدقے ہزار جانیں اس ایک جان پر ہیں
لے تیغ آج چل کر قاتل سے سرخرو ہو — اہل وفا کے جوہر تیری زبان پر ہیں
تم عرض مدعا پر میری زبان نہ کھینچو — ہاتھوں میں چھپ نہ جائیں کانٹے زبان پر ہیں

آتا ہے جی میں قاصد تیری بلائیں لے لوں
اُن کی زباں کے فقرے تیری زبان پر ہیں

چلتی ہیں تیر ہوتا اُن کی تو بات کیا تھی
رونا تو یہ ہے سارے طعنے زبان پر ہیں

پھر کوستے مجھے دو تم کو قسم ہے میری
یہ لو وہ پھر دعائیں میری زبان پر ہیں

تسکین ہو تو کیا ہو اقرار پر تمھارے
لب پر ہے مسکراہٹ وعدے زبان پر ہیں

اس طرح چپ کھڑے ہیں وہ مجھ کو قتل کر کے
گویا تمام صدمے ان ہی کی جان پر ہیں

تم ایسے کیوں ہوئے تھے بیدرد ہوں تو میں ہوں
لوگوں کے صبر سچ ہے میری ہی جان پر ہیں

آپ ہی تو ذکر دشمن ہوتا ہے میرے منھ پر
پھر آپ ہی پوچھتے ہیں کیا صدمے جان پر ہیں

میرے ہی دم قدم سے محفوظ ہے زمانہ
جتنی ہیں سب بلائیں میری ہی جان پر ہیں

دشمن نے کیں خطائیں مجھ کو ملی سزائیں
اوروں کی بھی بلائیں میری ہی جان پر ہیں

فرقت میں کچھ نہ پوچھو جو کچھ گذر رہی ہے
اللہ جانتا ہے جو صدمے جان پر ہیں

کہتے ہیں کس ادا سے سُن سُن کے میری آہیں
کمبخت سو بلائیں میری ہی جان پر ہیں

یہ آئے دن کی چوٹیں کس پر ہیں میرے دل پر
یہ آئے دن کے صدمے میری ہی جان پر ہیں

دنیا میں رہ کے ہم سے رندوں کو تنگ کرتے
اچھا ہے یہ فرشتے سب آسمان پر ہیں

کیا کوئی پوچھتا ہے فرقت کی رات کیا ہے
ان میں کی اک بلا ہے جو آسمان پر ہیں

آہوں کو باز رکھا نالوں کو قید رکھا
احسان میرے کیا کیا اس آسمان پر ہیں

پہلوئے غیر میں وہ بیٹھے ہیں بن سنور کر
کس دن کو یہ بلائیں اس آسمان پر ہیں

کس ڈھب کے آدمی ہیں یہ حضرت رسا بھی
سو بار توبہ کر کے مے کی دوکان پر ہیں

وصل کی شب پیار کی باتوں میں شکوا کیوں نہ ہو (۲۷) جب محبت دو دلوں میں ہو تو جھگڑا کیوں نہ ہو

اشک سے یارب مرے طوفان برپا کیوں نہ ہو
قطرۂ ناچیز تو چاہے تو دریا کیوں نہ ہو

شام ہی سے وصل کی شب کا سویرا کیوں نہ ہو
آپ جس گھر میں ہوں اُس گھر میں اجالا کیوں نہ ہو

ہم اگر روئیں تو مائل دل کسی کا کیوں نہ ہو
اشک حسرت مرہم داغ تمنا کیوں نہ ہو

دل کی خواہش پر ہمارا اُن کا جھگڑا کیوں نہ ہو
جب انھیں پیارا ہے دل پھر ہم کو پیارا کیوں نہ ہو

اب انھیں اپنی نظر سے بھی حجاب آنے لگا
ہو گئے پردے کے جب قابل تو پردا کیوں نہ ہو

شاید اُس کو رحم آجائے یہ حالت دیکھ کر　بیکسی کے بھیس میں میری تمنا کیوں نہ ہو
جانتی ہے کس کی جلوہ گاہ میں روشن ہے تو　شمع شب افروز تیرا رنگ پھیکا کیوں نہ ہو
آئینہ ہے سامنے محو خود آرائی ہیں وہ　ایسے میں کوئی بلائیں لینے والا کیوں نہ ہو
ہم کو عادت ہے وفا کی اُن کو ہے خوئے جفا　ہم سے اُن سے آئے دن جھگڑے پہ جھگڑا کیوں نہ ہو
دیکھ میری ہجر کی شب کا نہ پردہ فاش ہو　اے قیامت پہلے ہی تیرا سویرا کیوں نہ ہو
دن ہے کم اور داستان غم ہماری ہے بہت　روز محشر اپنے دل میں تھوڑا تھوڑا کیوں نہ ہو
کاٹ دیتا ہوں شب غم اُن کے صدقے میں رسا
ایک اک تارا مری آنکھوں کا تارا کیوں نہ ہو

نیچی نظروں سے نہ دیکھو سر محشر دیکھو　(۲۸) دادخواہوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھو
ہو کے شمشیر بکف سیر گھڑی بھر دیکھو　مرنے والوں کی وفا تیغ کے جوہر دیکھو
آہ کیسی کبھی شکوہ بھی تمہارا نہ کیا　ایسے ہم ضبط محبت کے ہیں خوگر دیکھو
سنگ دل تم تھے تو دل تم سے لگانا ہی نہ تھا　پڑ گئے ہائے مری عقل پہ پتھر دیکھو
غیر کو جھانکتے ہو روزن دیوار سے تم　اور ڈھاتے ہو ستم پردہ کے اندر دیکھو
جی میں چھپتاؤ گے برباد اگر مجھ کو کیا　ہوگا پھر چاہنے والا نہ میسر دیکھو
وعدۂ حشر بھی پھر وہ بھی زمانے بھر سے　کوئی دامن نہ پکڑ لے سر محشر دیکھو
غیر کا دم مرے سامنے بھرا کرتے ہو　کرتے ہو میری برائی مرے منہ پر دیکھو
اُن کو دشمن سے جو اُلفت ہے تو پروا نہ کرو
اے رسا تم بھی کسی اور پہ مر کر دیکھو

جو تجھ سے دور ہو جو ترے دل سے دور ہو　(۲۹) کیونکر قرار سے وہ دل ناصبور ہو
معشوق وہ کہ جس میں ادا ہو غرور ہو　یہ کیا ضرور ہے کہ وفا بھی ضرور ہو
ساقی اگر ہے سامنے دل غم سے دور ہو　پھر تو ہمیں بغیر پیے بھی سرور ہو
کاش اُن کا آئینہ یہ دل ناصبور ہو　اُن کو غرور ہو تو ہمیں بھی غرور ہو
واعظ کی بات کا تو نہیں کوئی اعتبار　تم دو قدم چلو تو قیامت ضرور ہو
ہم بھی دکھائیں اس دل حسرت زدہ کا حال　آئینہ سامنے سے اگر اُن کے دور ہو
نخوت بھی ان بتوں کی عجب دل پسند ہے　اتنا ہی پیار آتا ہے جتنا غرور ہو

کوچہ تمھارا چھوڑ کے جنت میں جائیں کیوں — تم ہو تو کیا کسی کو تمنائے حور ہو
جب زندگی میں وصل کی امید کچھ نہیں — واعظ کسی کو خاک تمنائے حور ہو
برباد کر دیا ہے مجھے نامراد نے — غارت خدا کرے یہ دل ناصبور ہو
ساقی نے دست غیر سے ساغر دیا ہمیں — ایسے میں خاک تشنہ لبی کا سرور ہو

اُن کا گلہ زبان پہ آئے نہ اے رسا
وہ کیوں کرو جو مہر و مروت سے دور ہو

کرتا ہوں نذر قدر دل زار بھی تو ہو (۳۰) کھوٹے کھرے کو چشم خریدار بھی تو ہو
یارب ترا کرم ہے گنہگار پر ضرور — لائق ترے کرم کے گنہگار بھی تو ہو
کیونکر کہیں کسی سے محبت کا راز ہم — یہ داستان قابل اظہار بھی تو ہو
ان سے شکایت ستم ناروا عبث — دور اپنے دل سے لذت آزار بھی تو ہو
موجود میرا دل بھی ہے حاضر جگر بھی ہے — سیدھی کہیں ادھر نظر یار بھی تو ہو
ہم بھی فغاں سے باز نہ آئیں گے اب کبھی — آزار دینے والوں کو آزار بھی تو ہو
کہتے ہیں لاکھ بار تصور میں آئیں ہم — کوئی ہمارا دل سے طلبگار بھی تو ہو
ہم سے تغافل اور کرم ہے رقیب پر — تم جتنے بے خبر ہو خبردار بھی تو ہو
پھر عیادت آئے وہ بیری تو یہ کہا — دیکھیں کسی کو کیا کوئی بیمار بھی تو ہو
عذر وصال کر کے مجھے قتل کیجیے — انکار ہے تو ہاتھ میں تلوار بھی تو ہو
مدت ہوئی کہ سر کو جھکائے ہوئے ہیں ہم — قائل ہمارے قتل پہ تیار بھی تو ہو
ممکن نہیں نہ راہ پہ آئے وہ سنگدل — تاثیر کچھ میں آہ شرربار بھی تو ہو

تم کو کریں وہ قتل تو اچھا ہے اے رسا
جینے سے تنگ جان سے بیزار بھی تو ہو

ہم دیکھ رہے ہیں تری مستانہ ادا کو (۳۱) ساقی ابھی رہنے دے مئے ہوش ربا کو
جی چاہا جدھر چھوڑ دیا تیر ادا کو — چٹکی میں اڑاتے ہوئے پھرتے ہیں قضا کو
بچھڑوں کا بھی موقع نہ رہا اہل وفا کو — پھر پھر کے مٹاتے ہیں وہ نقش کف پا کو
کیوں دل میں نہ رکھوں تری شرمیلی ادا کو — تو نے بھی تو آنکھوں میں جگہ دی ہے حیا کو
جب پاتے ہیں سر دھنتے ہی پلتے ہیں رسا کو — سمجھائے کہاں تک کوئی اس مرد خدا کو

یوں ہم نے چھپائی ہے ترے وصل کی حسرت
جس طرح خطاوار چھپاتا ہے خطا کو

جاتی ہے مگر باب اثر تک نہیں جاتی
دشمن کی نظر لگ گئی کیا میری دعا کو

کہتے ہیں بٹھایا ہمیں کمبخت نے گھر میں
چھپتے ہیں مگر کوستے جاتے ہیں حیا کو

اس حال کو پہونچا ہوں شب غم کہ مرے پاس
آتے ہوئے آتی ہے اجل میری قضا کو

ہاتھ آتا ہے جو صید وہ چھٹتا نہیں ان سے
اُڑتے ہوئے دیکھا نہ کبھی رنگ حنا کو

وہ لذت تعذیر نے رتبہ مجھے بخشا
تحقیر سمجھتا ہوں میں تھوڑی سی خطا کو

اول تو ہوئی مرنے پہ میرے انھیں حیرت
پھر دیکھ لیا آئینہ میں اپنی ادا کو

بے دم نہیں روتے ہیں ہم ہاتھ اُٹھا کر
تاثیر کے پہلو میں بٹھاتے ہیں دعا کو

جب ہوش میں پاتے ہیں وہ مجھ کو سر محفل
کرتے ہیں اشارہ نگہ ہوش ربا کو

بے جان کیا دست حنائی کو دکھا کر
مٹھی میں لیے بیٹھے تھے کیا میری قضا کو

سرہی کو جھکا لو دم اظہار تمنا
کس دن کے لیے رکھا ہے انداز حیا کو

مجبور رہوں کیونکر ہوا نہیں قدر وفا کی
قابو ہو تو رکھ دوں دل دشمن میں حیا کو

کانٹے بھی تو صحرا کے کھٹکنے لگے اے دل
اب چھوڑ دے اندیشہ مجھ آبلہ پا کو

دیکھو تو خجل میں ہوں کہ تم ہو سر محشر
اب تول لو نظروں میں وفا اور جفا کو

ناکامی تقدیر سے کیا ناک میں دم ہے
آتی نہیں ہر چند بلاتا ہوں قضا کو

اب چھوڑ رسا عشق بتاں دیکھ کہا مان
کمبخت تجھے منہ بھی دکھانا ہے خدا کو

---

(۲۲)

دل چلا ٹوٹ کے جس وقت ترے تیر کے ساتھ
حسرتیں پھوٹ کے روئیں مری تقدیر کے ساتھ

نہیں جاتی نہیں بنتی فلک پیر کے ساتھ
رات دن پھرتی ہے گردش مری تقدیر کے ساتھ

منہ ہے کس کا جو تری شان کریمی دیکھے
اپنے جی میں کوئی شرمائے تو تقصیر کے ساتھ

تم جو تقدیر میں ہوتے تو شکایت کیا تھی
کچھ نہیں ضد تو نہ تھی کاتب تقدیر کے ساتھ

دل وفادار ہے آنکھ اُس سے چُراؤں کیونکر
کس کلیجہ سے کروں اس کو ترے تیر کے ساتھ

ہم جنوں میں بھی رہے ضبط فغاں کے پابند
آہ کھینچی نہ گئی نالۂ زنجیر کے ساتھ

تم تو ہنس ہنس کے غیروں میں گذارو اپنی
میری تقدیر کا رونا مری تقدیر کے ساتھ

یہ بھی کمبخت پریشاں ہے پریشاں وہ بھی　　دل کو نسبت ہے تری زلف گرہ گیر کے ساتھ
اپنی آنکھوں سے یہ نقشہ نہیں دیکھا جاتا　　اُن کی تصویر کھنچے غیر کی تصویر کے ساتھ
اک جہاں کہتا ہے ناکام محبت مجھ کو　　میں بھی بدنام ہوں پھوٹی ہوئی تقدیر کے ساتھ
تم نے پھر روزن دیوار سے جھانکا مجھ کو　　چھیڑ اچھی نہیں ہوتی کسی رہگیر کے ساتھ
غیر تو غیر ہر اک چین سے سوئے اب تو　　کہ زمانہ کی ہے گردش مری تقدیر کے ساتھ
بہہ گیا ساتھ میں اُس کے اُسے اچھی سوجھی　　شور محشر ہے اُٹھا نالۂ شبگیر کے ساتھ
وصل کیا اُنھیں نفرت ہے یہاں تک مجھ سے　　دیکھ سکتے نہیں تصویر بھی تصویر کے ساتھ
پاؤں پھیلاؤں جنوں میں مجھے کچھ ضبط نہیں　　کہ بسر کرنی ہے برسوں ابھی زنجیر کے ساتھ
اپنی تصویر پہ خود بھی انھیں حیرت چھائی　　آپ بھی بن گئے تصویر وہ تصویر کے ساتھ
کچھ نہ کچھ غیر کی تقدیر سے حصہ لیتے　　ہم نہ تھے روز ازل کاتب تقدیر کے ساتھ
قابل دید تھی اس وقت جگر کی حسرت　　جس دم اپنا دل مجروح چلا تیر کے ساتھ
یہ تو کمبخت ازل ہی سے ملی تھی اُلٹی　　تم نہ پھرنا کہیں مجھ سے مری تقدیر کے ساتھ
اب تو یہ جی میں سمائی ہے کہ یکتا ہوں میں　　اب تو نفرت ہے انھیں اپنی ہی تصویر کے ساتھ
خط مرا دے کے مرا حال بھی کہنا قاصد　　دل گواہی کے لیے ہے اسی تحریر کے ساتھ

اُن کی محفل میں رسا آپ ذرا جائیں تو
وہ بٹھائیں گے بہت آپ کو توقیر کے ساتھ

سوتا نہیں ہے قبر میں کوئی کسی کے ساتھ (۴۲) وہ زندگی کی بات گئی زندگی کے ساتھ

وہ خوش کسی کے ساتھ ہیں ناخوش کسی کے ساتھ　　ہر آدمی کی بات ہے ہر آدمی کے ساتھ
ہم اُن کے ساتھ رہتے ہیں وہ مدعی کے ساتھ　　کوئی کسی کے ساتھ ہے کوئی کسی کے ساتھ
ممنون بیکسی کا نہ کیوں بعد مرگ ہوں　　ماتم میں ہیں شریک مری بیکسی کے ساتھ
لاکھوں جفائیں سینکڑوں صدمے ہزار غم　　اک آسمان ٹوٹ پڑا زندگی کے ساتھ
ممکن نہیں کہ دل سے نکل جائے آرزو　　یہ میرے دم کے ساتھ ہے یہ میرے جی کے ساتھ
دشمن کو لے کے آئے ہیں تو دور سے سلام　　پورا نہ مدعا ہو مرا مدعی کے ساتھ
رکھتا ہوں چھیڑ چھاڑ کسی کے خیال سے　　کٹتی ہے اپنی رات عجب دل لگی کے ساتھ
اب کیا کروں میں شکوۂ بیداد حشر میں　　منھ میرا تک رہے ہیں وہ کس بیکسی کے ساتھ

مرتے تو اُن کی یاد بھی آتی نہ بعد مرگ — قدر جناب خضر بڑھی زندگی کے ساتھ
گھبرا کے مجھ کو دیتے ہیں دامن کی وہ ہوا — اُڑتے ہیں اُن کے ہوش مری بیخودی کے ساتھ
آراستہ ہیں پھولوں کے زیور سے وصل میں — ان کا بناؤ بھی ہے عجب سادگی کے ساتھ
تم ہم پہ مہرباں ہو تو دنیا ہے مہرباں — دشمن بھی پیش آنے لگے دوستی کے ساتھ
ہنس ہنس کے دل دکھاتے ہیں دشمن کے سامنے — وہ رنج دے رہے ہیں مجھے کس خوشی کے ساتھ

اُن سے گلہ ہی کیا ہے نہ ملنے کا اے رسا
جھگڑے لگے ہوئے ہیں ہزار آدمی کے ساتھ

آرزو سے دل نکالی جائے گی (۲۴۴) جان لے کر جانے والی جائے گی
میری حسرت اور نکالی جائے گی — وعدۂ محشر پہ ٹالی جائے گی
کچھ نہ کچھ لے جائے گی دل سے نظر — اس بھرے گھر سے نہ خالی جائے گی
بات اُن کے کان میں تو ڈال دوں — دل میں کیونکر اُن کے ڈالی جائے گی
کیا چڑھاؤ گے مری تربت پہ پھول — خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی
ہر تسکیں ساتھ میری قبر میں — اُن کی تصویر خیالی جائے گی
باغ میں دیکھا ہے اُن کو بے نقاب — آنکھ نرگس کی نکالی جائے گی
پوچھتا ہوں ہر نجومی سے یہی — کیا مری آشفتہ حالی جائے گی
آئینہ رو دیکھ آئینہ نہ دیکھ — دیکھ شان بے مثالی جائے گی
میکدے میں اک بڑا جلسہ ہے آج — شیخ کی پگڑی اُچھالی جائے گی
بن سنور کر اب وہ شکل دلفریب — نور کے سانچے میں ڈھالی جائے گی
پاؤں میں مل کر حنا بیٹھو نہ تم — آرزو سے پا ئمالی جائے گی
اُن کے وعدہ کی وفا کے واسطے — عمر رفتہ پھر منا لی جائے گی

اے رسا اب دل ہے اور عشق بتاں
یہ بنا کعبہ میں ڈالی جائے گی

مرتے دم قول و قسم وعدہ وفائی کے ہوئے (۲۴۵) کب سلیقے مری آہوں کو رسائی کے ہوئے
ہاتھ رکھ رکھ کے کلیجے پہ کہا غیر سے حال — مضمحل خوب مرے درد جدائی کے ہوئے

نالے منہ سے مرے نکلے تو کہیں کے نہ رہے
نارسائی کے ہوئے یہ نہ رسائی کے ہوئے

وہ گنہگار خدا کے بھی نہ ٹھہرے افسوس
جن سے ہم ملکے گنہگار خدائی کے ہوئے

پھر رہی غیر کے ذکر پہ تیوری بگڑی
پھر رہی دیکھیے آثار لڑائی کے ہوئے

نہ رہے ہم جو کہیں کے تو بلا سے نہ رہے
خیر سے تم تو چلو ساری خدائی کے ہوئے

دونوں عالم سے ہوئی عشق کے ہاتھوں ذلت
نہ خدا کے ہی ہوئے ہم نہ خدائی کے ہوئے

منع کرتے ہیں اجل کو یہ غضب تو دیکھو
کون وہ روکنے والے مری آئی کے ہوئے

شکوۂ جور پہ کچھ شرم تو آئی نہ انھیں
الٹے شکوے مری قسمت کی برائی کے ہوئے

آکے اک روز ذرا دل پہ ہمارے رکھ دو
صدقے سو جان سے اس دست حنائی کے ہوئے

وصل ان کا مری قسمت میں لکھا تھا تو کیا
یہ بھی دو حرف مری ناصیہ سائی کے ہوئے

دشت میں بچھ گئے جس وقت رکھا میں نے قدم
خار ممنون مری آبلہ پائی کے ہوئے

تذکرے میرے ہوئے بزم میں ان کی تو کیا
سو بھلائی کے ہوئے لاکھ برائی کے ہوئے

حشر والوں سے تھی محشر میں بہت کچھ امید
وہ بھی شاہد مرے قاتل کی صفائی کے ہوئے

آج اس ناز سے قاتل نے چلایا خنجر
دیکھنے والے بھی قربان کلائی کے ہوئے

خضر بھی ہو گئے مجبور رہ الفت میں
راستے بند مری راہ نمائی کے ہوئے

عندلیب چمنستان فصاحت ہوں رسا
چرچے دنیا میں مری نغمہ سرائی کے ہوئے

تیرے در پر جب نہ کچھ امید بر آئی مری (۳۶) کام کیا کعبہ میں آئے گی جبیں سائی مری

طاق پر رکھی رہی سب ناصیہ سائی مری
جس گھڑی تقدیر بگڑی کچھ نہ بن آئی مری

حشر میں بھی ایک خلقت ہے تماشائی مری
ہوں بھری محفل میں رسوا ہائے رسوائی مری

جب یہ آتی ہے پھپک جاتے ہیں سارے داغ دل
ہے مرے گھر کا اجالا شام تنہائی مری

ضعف میں کچھ بن نہیں پڑتی تو کر لیتا ہوں صبر
میری مجبوری کا پردہ ہے شکیبائی مری

نقش ہوگا ان کے دل پر میرے خط کا حرف حرف
رنگ لائے گی کسی دن نامہ فرسائی مری

ان کے آتے ہی اجل نے بھی قدم رنجہ کیا
کیا غضب ہے وہ ادھر آئے ادھر آئی مری

تجھ سے ناداں کو دیا دل میری نادانی ہے یہ
تجھ سے ناداں سے نباہے یہ ہو دانائی مری

ہو محبت کا برا اس کا یہی دستور ہے
آج رسوائی تمہاری کل ہے رسوائی مری

ہوں جنوں سے تنگ دامن میں کہاں صحرا کہاں | پھوڑنے اپنے پھپھوے آبلہ پائی مری
صبر کر لے دل کہ اب ہوتا ہے اُن کا وصل بھی | چار دن کی چاندنی ہے شام تنہائی مری
قلب گو مضطر ہے لیکن طاقت جنبش نہیں | ناشکیبائی میں شامل ہے شکیبائی مری
وہ نہ آئیں گے تو تیری بھی بگڑ جائے گی بات | جذبۂ دل تیری رسوائی ہے رسوائی مری
لے بلا سے آسماں خاطر میں کیا لاؤں تجھے | سو بلاؤں کی بلا ہے شام تنہائی مری

اے رسا ہندوستاں میں نام میرا ہو گیا
کی مرے سرکار نے وہ عزت افزائی مری

بے نقاب آئے اگر وہ تو یہ صورت ہو گی (۴۷) بزم کی بزم اک آئینۂ حیرت ہو گی

یاس آ کر جو شریک غم فرقت ہو گی | اک مصیبت میں گرفتار مصیبت ہو گی
دل کہیں رہتا ہے خالی مرے ارمانوں سے | ایک نکلے گی اگر دوسری حسرت ہو گی
ایک عالم ہے محبت پہ تمہاری نازاں | اس کی تقدیر تمہیں جس سے محبت ہو گی
آج پھر ابر ہے میخوار چلے آتے ہیں | گرم پھر محفل یاران طریقت ہو گی
یہی رفتار اگر ہے تو ہزاروں فتنے | تم سلامت ہو تو سو بار قیامت ہو گی
آیئے جو بھی کہنا ہے وہ خلوت میں کہوں | چار میں آپ سنیں گے تو ندامت ہو گی
جب کہا میں نے کہ میں جی سے گذر جاؤں گا | مسکرا کر یہ کہا اُس نے عنایت ہو گی
زندگی ہے تو نہ ہو گا دل ویراں برباد | لاکھ ارمان اگر جان سلامت ہو گی
اُن کی فریاد نہ کرنا سر محشر اے دل | اُنگلیاں اُٹھیں گی بدنام محبت ہو گی
صدقے ہوں گے ترے قامت پہ قیامت والے | اس قیامت کی جگہ اور قیامت ہو گی
بخش دیں گے وہ اگر جرم محبت میرا | اُن کی محفل ہی مرے واسطے جنت ہو گی
کیا توقع ہے ملے روز جزا مجھ کو جزا | ساتھ میرے مری پھوٹی ہوئی قسمت ہو گی

اے رسا دیکھیے کب تک مرے دن پھرتے ہیں
دور کس روز بلائے شب فرقت ہو گی

اُس نے کو نظر میں مری سو فتنہ گر آئے (۴۸) تجھ سا نظر آیا ہے نہ تجھ سا نظر آئے

جو چرخ سے آئے وہ بلا میرے گھر آئے | دنیا میں نہ ہو جس کا ٹھکانا ادھر آئے
محشر میں بھی وہ بن کے قیامت نظر آئے | کیا میری نگاہوں میں کوئی فتنہ گر آئے

کس طرح یقیں تیرا مجھے نامہ بر آئے
ایسی مری تقدیر کہ وہ میرے گھر آئے

وحشت میں شب و روز ہیں کام یہی ہے
گھر سے کبھی صحرا گئے صحرا سے گھر آئے

کھل جائے بھرم ضبط محبت کا نہ اُن پر
ڈرتا ہوں کہیں آنکھ میں آنسو نہ بھر آئے

اس دل پہ فدا جس میں تصور ہے تمہارا
اس آنکھ کے قربان جسے تم نظر آئے

پردہ اسے کہتے ہیں یہ ہیں شرم کی باتیں
چڑھ کر وہ نظر پر مرے دل میں اُتر آئے

ان سے ہی اُجالا ہے سیہ خانے میں میرے
اپنے تو بڑے کام یہ داغ جگر آئے

میخانہ پہ کیا ابر ہے چھایا ہوا یا رب
جلوے تری رحمت کے یہاں بھی نظر آئے

صدموں سے ہمارا بھی ہے پتھر کا کلیجہ
تیر نگہ ناز سنبھل کر ادھر آئے

کرتا ہوں دعائیں تو یہ آتی ہیں ندائیں
تو ہو کسی قابل تو دعا میں اثر آئے

وہ عرض تمنا پہ یہ منہ پھیر کے بولے
اللہ کرے تیری تمنا نہ بر آئے

آئینہ کو ہر وقت مری جان نہ دیکھو
ایسا نہ ہو دل آپ ہی کا آپ پہ آئے

یوں لاکھ حسیں ہم کو نظر آئے جہاں میں
جب آنکھ پڑی تم پہ تمہیں تم نظر آئے

کرتا ہے وہی دل میں رسا کے جو ٹھنی ہے
سمجھانے کو سمجھاتے ہیں سب اپنے پرائے

(۳۹) ہر بات لاجواب مرے دلربا کی ہے
انداز دلفریب ہیں شوخی بلا کی ہے

بے انتہا تپش ہے خلش انتہا کی ہے
حالت خراب اپنے دل مبتلا کی ہے

یارب ترے کرم پہ ہیں دست دعا بلند
اب تیرے ہاتھ شرم ہماری دعا کی ہے

اللہ رے جمال کہ آئینہ دیکھ کر
وہ خود یہ کہہ رہے ہیں کہ قدرت خدا کی ہے

ہم اور تری جفا کی شکایت زبان پر
لے بیوفا یہ شان ہماری وفا کی ہے!

جس پر مٹا اُسی نے مٹایا غریب کو
تقدیر ہی خراب دل مبتلا کی ہے

کیسے تو رات کس نے کیا تم کو بے حجاب
نیچی نگاہ آج تمہاری حیا کی ہے

برباد کر رہے ہیں بتان ستم شعار
ان کافروں کے بس میں خدائی خدا کی ہے

ہوں خاک بھی تو خاک وہاں جائے کس طرح
اس کی گلی میں جائے یہ قدرت ہوا کی ہے

برباد کر دیا ہے زمانہ کو بے گناہ
لے بانیِ جفا کوئی حد بھی جفا کی ہے

یہ حال اب تو ہے ترے بیمار ہجر کا
کہتے ہیں چارہ گر بھی کہ مرضی خدا کی ہے

سچ پوچھیے تو جذب محبت ہے اس کا نام
محفل میں اُن کی آج رسائی رسا کی ہے

(۴۰)
جو دن کے دن کہیں عذر وصال ہو جائے — تو مجھ غریب کی گردن حلال ہو جائے
جو کہنے سننے سے اُن کا وصال ہو جائے — تو خامشی مرے لب پر سوال ہو جائے
انھیں جو سیرِ چمن کا خیال ہو جائے — تو چار دن ہمیں جینا محال ہو جائے
عدو سے اُن سے اگر کچھ ملال ہو جائے — رسا کی پھر تو نہ پوچھو نہال ہو جائے
ہمارے دل کی سی حیرت کہاں نصیب اُسے — ہزار آئینہ محوِ جمال ہو جائے
ملال کرتا ہے اُن کا یہ ناز سے کہنا — خدا کرے تری گردن حلال ہو جائے
میں بدگمان ہوں تم سے مجال ہے میری — مرا خیال اور ایسا خیال ہو جائے
وہ غم نصیب ہوں دل میں کہیں جو بھولے سے — خوشی بھی آئے تو آ کر ملال ہو جائے
وہ میرے بعد سناہے کریں گے ترکِ جفا — جو میں مروں تو خدائی نہال ہو جائے
ہمارے جذبِ محبت کی آبرو رکھ لیں — جو وہ نہ آئیں تو ان کا خیال ہو جائے
جو مرنے والوں سے مرنے کا لطف ہو معلوم — تو جینے والوں کو جینا محال ہو جائے
بڑی ہی دھوم سے دعوت ہو پھر تو زاہد کی — یہ مے جو چار گھڑی کو حلال ہو جائے
اُڑا نہ لے تری رفتار کا کہیں انداز — کہیں نہ ایسی قیامت کی چال ہو جائے

رسا بتوں سے اگر دل کو تم لگا بیٹھو
تو اس خدائی میں رہنا محال ہو جائے

(۴۱)
کسی کی دوستی دیکھیے کسی کی دشمنی دیکھیے — بتوں سے کوئی اپنا دل لگا کر دل لگی دیکھیے
اس آئینہ کا کیا منھ ہے جو شانِ دلبری دیکھیے — ہماری آنکھ سے کوئی تری جلوہ گری دیکھیے
گرفتارِ محبت ہم نے دنیا میں سبھی دیکھے — یہی وہ مدعا ہے جس کے لاکھوں مدعی دیکھے
وہ عالی ظرف ہے یا ہم ہیں کھل جائے گا دم بھر میں — ہمیں اہرِ بلا دیکھیے ہمارے ساتھ پی دیکھیے
کسی کو مر کے جینے کا اگر بادر نہ آتا ہو — تری صورت پہ مر دیکھیے تری ٹھوکر سے جی دیکھیے
گئے جس وقت وہ کوئی نہ پوچھے ہم پہ کیا گذری — قیامت دیکھنی ہو جس کو رخصت کی گھڑی دیکھے
جو اُن کے سامنے جا کر محبت ہم جتاتے ہیں — تو فرماتے ہیں ہنس کر کوئی صورت آپ کی دیکھیے
مری تصویر لے کر ہاتھ میں کس ناز سے بولے — خدا سمجھے بُری نیت ہے گر ہم کو کوئی دیکھے

خدا شاہد بت کافر ترا ثانی نہیں دیکھا　　خدائی میں خدا کی ہم نے لاکھوں آدمی دیکھے

مقابل روئے روشن کے رسا تاب نظر کب ہے
کوئی اُن کو جو دیکھے بھی تو کیونکر بھر کے جی دیکھے

عاشق کو تیرے لاکھ کوئی رہنما ملے　(۴۲)　تیرا پتہ ملا ہے نہ تیرا پتہ ملے

میں خاک میں ملوں تو کہیں کچھ پتہ ملے　　نقش قدم بنوں تو ترا نقش پا ملے

تم مجھ سے آ ملے کبھی دشمن سے جا ملے　　جب یہ مزاج ہے تو کوئی تم سے کیا ملے

بعد فنا بھی خیر سے تنہا نہیں ہیں ہم　　بندوں سے چھُٹ گئے تو فرشتوں میں آ ملے

وہ زخم دو کہ زخم کے لب پر دعا بھی ہو　　نقش حنا کے پاس ہی نقش وفا ملے

زاہد ہے تو ہی بندۂ اللہ ہم نہیں　　کوئی حدیث ہے کہ تجھی کو خدا ملے

رسم وفا ہے ترک تو نیچی نظر بھی ہے　　جب دل نہیں ملا تو تری آنکھ کیا ملے

نخوت سے وہ زمین پہ رکھتے نہیں قدم　　کیونکر کسی کو اُن کا کوئی نقش پا ملے

جب دیر میں یہ دیکھا کہ اپنا گذر نہیں　　کعبے کے جانے والوں میں مجبور جا ملے

آئینہ بات کرنے کی فرصت بھی دے تمہیں　　تم کیا ملو کسی سے کوئی تم سے کیا ملے

شوق وصال یار میں ہاتھوں سے دل چلا　　ارمان بھی سلے تو ہمیں دلربا ملے

زاہد تجھے غرور مجھے انفعال ہے　　محشر میں دیکھنا ہے کہ کس کو خدا ملے

وہ بدگمان ہوں اُسے سمجھوں میں کوئے غیر　　اپنی گلی میں بھی جو ترا نقش پا ملے

دیکھو رسا چلے تو ہو تم توبہ توڑنے
در پر نہ میکدے کے کوئی پارسا ملے

در جاناں تک اپنی رسائی ہوتی جاتی ہے　(۴۳)　جدائی تجھ سے اے درد جدائی ہوتی جاتی ہے

ترے جلوہ کی قائل اک خدائی ہوتی جاتی ہے　　خدا کی شان شان دلربائی ہوتی جاتی ہے

انھیں مد نظر تیغ آزمائی ہوتی جاتی ہے　　بہت بدنام اب نازک کلائی ہوتی جاتی ہے

مری ضد سے بہت خواہاں تمہارے ہو چلے ہیں　　ملا صدقہ کہ صدقے اک خدائی ہوتی جاتی ہے

وہاں بھی قطع ہوتی ہیں زبانیں دادخواہوں کی　　سر محشر بھی خنجر آزمائی ہوتی جاتی ہے

غرور اُن کی بلائیں لے رہا ہے وقت آرائش　　انھیں پر لوٹ اُن کی خودنمائی ہوتی جاتی ہے

یہ کس دست حنائی کا ہمیں مضمون سوجھا ہے　　زمین شعر کی رنگت حنائی ہوتی جاتی ہے

اُٹھاتا ہوں جو ساغر منہ سے توبہ بھی نکلتی ہے
ادا پینے میں رسم پارسائی ہوتی جاتی ہے

ہمیں تو ہجر کا دن بھی اسی دقت میں کٹتا ہے
یہ تھوڑی تھوڑی کیوں شام جدائی ہوتی جاتی ہے

طریق عشق و الفت میں مجھے رستہ بتاتے ہیں
جناب خضر اچھی رہنمائی ہوتی جاتی ہے

وہ آتے ہیں تو کیوں تعظیم کو اُن کی نہیں اُٹھتا
یہ جرأت تیری سلے درد جدائی ہوتی جاتی ہے

چمک کر داغ دل نے کچھ عجب عالم دکھایا ہے
قیامت کی سحر شام جدائی ہوتی جاتی ہے

وہ وعدہ کرکے کہتے ہیں ہوئی فرصت تو آئیں گے
فلک کے ساتھ شامل بے وفائی ہوتی جاتی ہے

ہمارا جی کے کیا ہوگا ہمارا کون پرساں ہے
خدا رکھے انھیں جن کی خدائی ہوتی جاتی ہے

وہ وصف غیر کرتے ہیں کریں اس کا نہیں شکوہ
یہ شکوہ ہے کہ کیوں میری برائی ہوتی جاتی ہے

ہزاروں پڑتے ہیں چتون پہ بل وقت خود آرائی
اب اُن کی خود نمائی خود نمائی ہوتی جاتی ہے

گیا گذرا ابھی دنیا سے لیکن پھر رسا ہوں میں
تعجب کیا اگر اُن تک رسائی ہوتی جاتی ہے

(۴۴)

وہ میرے دل میں آتے ہیں بڑھانے آبرو دل کی
ٹھکانا اب دل دشمن میں کرلے آرزو دل کی

یہ ناکام محبت کام سے خالی نہیں رہتے
کیا کرتے ہیں خاک رہگذر میں جستجو دل کی

ادھر ہم دل کی حالت پر کف افسوس ملتے ہیں
اُدھر بیٹھی ہوئی سر پیٹتی ہے آرزو دل کی

ہوئی جب وہ مرے دل کی تو دل سے تجھ سے کیا مطلب
بس اب اے آرزوئے دل نہ دل تیرا نہ تو دل کی

تمہارا ہو چکا جب دل تو رسوائی سے کیا مطلب
مری جاں اب تمہاری آبرو ہے آبرو دل کی

بس اک قطرہ لہو کا رہ گیا ہے جسم کے پہلو میں
اسی کو دل سمجھ لو تم اسی کو آرزو دل کی

دل گم گشتہ کو کیا خاک ڈھونڈھیں بیخودی میں ہم
جو خود کھوئے ہوئے ہیں اُن کو کیسی جستجو دل کی

جو تم بے چین شوخی سے تو یہ بے چین فرقت سے
بہت کچھ ملتی جلتی ہے تمہاری خو سے خو دل کی

رسا کوئی نہ کوئی اس نے دل پامال کر ڈالا
ہمیں آتی ہے خاک رہگذر میں آج بو دل کی

(۴۵)

ترے پاس نزاکت نے مٹا دیں گو بیاں دل کی
نکلتی ہے مگر آہستہ آہستہ فغاں دل کی

خموشی نے محبت اُن پہ سب کردی عیاں دل کی
ہماری بے زبانی بن گئی گویا زباں دل کی

یہ حالت ہو گئی ہے اس نحیف و ناتواں دل کی
کہ آئی ٹھوکریں کھاتی ہوئی لب تک فغاں دل کی

ہجوم حشر میں کیا ہم سے حالت ہو بیاں دل کی
بھری محفل میں کیونکر کوئی کہدے داستاں دل کی

الٰہی کھول دے باب اثر صدقہ خدائی کا — بڑا ارمان ہے کہ آج نکلی ہے فغاں دل کی
وہ مجھ سے اُن سے گو ان بن سہی اس کا نہیں شکوہ — مگر شامت ہے میرے اور اُن کے درمیاں دل کی
کبھی ناقوس کی آواز بن کر دیر میں پہونچی — کبھی کعبہ میں جا پہونچی اذاں بنکر فغاں دل کی
الگ سینہ سے ہو خارِ تمنا ہو نہیں سکتا — نشانی اک یہی باقی ہے میرے نشاں دل کی
نہ نکلی آج تک دل سے نہ نکلے گی قیامت تک — رہی ہے دل میں میرے آرزو بنکر فغاں دل کی
سُنایا حال دل اُن کو تو یوں مُنھ پھیر کر بولے — کسی نے مُنھ لگایا چھیڑ بیٹھے داستاں دل کی
مزا آجائے گا دن کی اگر اللہ نے سُن لی — خدائی بھر تو ہوگی حشر کے دن ہمزباں دل کی
تری کافر نگاہوں میں سمائیں شوخیاں بن کر — زہے قسمت ٹھکانے لگ گئیں بیتابیاں دل کی
تمھیں چاہا ہے میں نے دل کو کیوں پامال کرتے ہو — خدا میری سہی لیکن خطا لے مہرباں دل کی

ٹھکانا دونوں عالم میں نہیں ہے سلئے رسا اس کا
نہ پرسش ہے یہاں دل کی نہ پرسش ہے وہاں دل کی

(۴۶)

ہم بوند بھر شراب کو ساقی ترس گئے — یوں ہی یہ دن بہار کے اب کی برس گئے
کردے رہا کہ سیر چمن کو ترس گئے — صیاد تیرے صدقے اسیر قفس گئے
صورت کو زندگانِ عدم کی ترس گئے — ہم کو اسی طرح سے تڑپتے برس گئے
آکر دل حزیں میں ہمارے وہ بس گئے — قربان تیری شان کے فریاد رس گئے
اُٹھتے کہاں ہیں نقش قدم کی طرح سے ہم — اب تیرے ہو رہے ترے کوچے میں بس گئے
مدت ہوئی ہے خانہ خرابی ہے اور ہم — سمجھا وطن اُسی کو جہاں رات بس گئے
اُس شخص کے نصیب جسے تم ہوے نصیب — تقدیر اُس مکان کی تم جس میں بس گئے
نقش قدم نے آپ کے مجبور کر دیا — ہم کو چہ رقیب میں کچھ اپنے بس گئے
اف رے حجاب پردۂ دل میں وہ چھپ رہے — اللہ ری نازکی کہ نگاہوں میں بس گئے
دیکھوں نہ آنکھ اُٹھا کے میں حورِ بہشت کو — ایسے کسی کے جلوے نگاہوں میں بس گئے
کیا خاک زندگی ہے اسیری کی زندگی — گویا کہ جان ہی سے اسیر قفس گئے
کنج قفس میں رہنے کی عادت سی پڑ گئی — آزاد ہو کے بھی نہ اسیر قفس گئے
وہ دل میں با وفا تو سمجھنے لگے مجھے — مجھ پر جفا کے تیر بلا سے برس گئے
لکھوں سنائیں شکوۂ دشمن پہ آپ نے — کب سے بھرے ہوئے تھے جو ایسے برس گئے

وہ نامراد ہیں نہ ملا ہم کو قافلہ — ہم جس طرف کو سُن کے صدائے جرس گئے

پردے میں چھپ کے بیٹھے ہیں شرم و حیا سے وہ — اچھا ہوا کہ غیر بھی ان کو ترس گئے

یہ آپ کا طفیل ہے یہ دل کا ہے سلوک — اغیار مجھ پہ سینکڑوں آوازے کس گئے

وحشت نے کس قدر مجھے بدنام کر دیا — نکلا جدھر سے سینکڑوں پتھر برس گئے

بدلے گئے ہو جب سے ملیسر کو تم رسا
صورت بھی دیکھنے کو تمہاری ترس گئے

(۴۷)

دشمن کی بات جب تری محفل میں رہ گئی — امید یاس بن کے مرے دل میں رہ گئی

بیتاب ہو کے حسرت دل دل میں رہ گئی — لیلیٰ تڑپ کے پردۂ محمل میں رہ گئی

تو ہم سے چھپ گیا تو تری شکل دلفریب — تصویر بن کے آئینۂ دل میں رہ گئی

دشمن کے بھیس میں نہ کہا مدعائے دل — یہ چال ہم سے یار کی محفل میں رہ گئی

کم آب تیغ سے بھی نہ سوز دروں ہوا — اک آگ تھی کہ سینۂ بسمل میں رہ گئی

دیکھا جو قتل عام تو ہر لاش پر اجل — اک آہ بھر کے کوچۂ قاتل میں رہ گئی

اک آرزوئے غیر کہ نکلی ہزار بار — اک میری آرزو کہ مرے دل میں رہ گئی

نکلا وہاں سے میں تو مرے دل کی آرزو — سر پیٹتی ہوئی تری محفل میں رہ گئی

حیرت نے میری کام کیا جلوہ گاہ میں — آئینہ بن کے اُن کے مقابل میں رہ گئی

دل سے جو نکلی آہ تو لب تک نہ آسکی — تھک کر غریب پہلی ہی منزل میں رہ گئی

شاید تصدق آپ کے جلوے کا مل گیا — اتنی جو روشنی مہ کامل میں رہ گئی

دیکھا نہ اُس نے آنکھ اُٹھا کر بھی سوئے غیر — آج اپنی شرم یار کی محفل میں رہ گئی

میں کیا کہوں رسا کہ مرے دل پہ کیا بنی
تلوار کھنچ کے جب کف قاتل میں رہ گئی

(۴۸)

گیا ہے بن سنور کے غیر کے گھر میہماں کوئی — اب ایسے میں نہیں آتی بلائے ناگہاں کوئی

عدو کے گھر نہیں آتی بلائے ناگہاں کوئی — وہاں کیا پایا الٰہی دوسرا ہے آسماں کوئی

ستانے کا نتیجہ اس ستمگر کو بھی مل جائے — ملے اس آسماں کو بھی الٰہی آسماں کوئی

سنے بیداد گر تم حشر میں ہم کس طرح کہہ دیں — عدالت سے یہاں کیونکر ملائے ہاں میں ہاں کوئی

کسی کا دل چرا لو تم تو یہ کیسی قیامت ہے — تمہارے بھولے پن پہ کر نہیں سکتا گماں کوئی

رسالہ نگار بھوپال و لکھنؤ

جلد ۸ نمبر ۲ اگست سنہ ۲۵ء — ۳/
۹ نمبر ۳ تا ۶ سنہ ۲۶ء — ۱۲/
۱۰ نمبر ۳-۵ و ۶ سنہ ۲۶ء — ۸/
۱۱ نمبر ۳ تا ۵ سنہ ۲۷ء — ۸/
۱۶ نمبر ۳-۵ و ۶ سنہ ۲۹ء — ۸/
۱۷ نمبر ۲-۳ و ۵ سنہ ۳۰ء — ۸/
۱۸ نمبر ا و ۳ تا ۶ سنہ ۳۰ء — عہ/
۲۰ نمبر ۵ و ۶ سنہ ۳۱ء — ۶/
۲۲ نمبر ا سنہ ۳۲ء — ۳/
۲۶ نمبر ۲ تا ۵ سنہ ۳۴ء — ۱۲/

رسالہ مرقع - لکھنؤ

جلد اول سنہ ۲۶ء (کامل ۱۲ پرچے) — سے/
جلد دوم سنہ ۲۷ء (۹ پرچے) — ۸/
جلد سوم سنہ ۲۸ء (۶ پرچے) — عہ/

رسالہ دلگداز لکھنؤ

جلد ۲۵ مئی، جون، جولائی سنہ ۲۴ء — ۲/
جلد ۳۰ جنوری تا جولائی سنہ ۳۰ء — ۶/
جلد ۳۱ - بابتہ سنہ ۳۱ء ۹ نمبر علاوہ فروری مارچ و اپریل — ۸/
جلد ۳۲ جنوری تا اپریل سنہ ۳۳ء — ۴/

رسالہ چاند الہ آباد

جلد اول نمبر ا ۲ و ۵ — ۱۲/

رسالہ زبان منگرول (کاٹھیاوار)

جلد اول سنہ ۲۶ء نمبر ا و ۲ و ۳ و ۴ و ۶ — ۸/
جلد دوم سنہ ۲۷ء نمبر ا و ۲ و ۵ و ۶ — ۶/
جلد سوم سنہ ۲۸ء نمبر ۴ و ۵ — ۴/

رسالہ شمع آگرہ

جلد اول نمبر ۵ و ۶ مئی و جون سنہ ۲۵ء — ۶/
جلد دوم نمبر ۳ ستمبر سنہ ۲۵ء — ۴/
سوم نمبر ۳ و ۴ و ۶ و ۷ (مارچ تا جولائی سنہ ۲۶ء) — ۱۴/
چہارم نمبر ۲ و ۴ و ۵ (اگست تا نومبر سنہ ۲۶ء) — ۸/
ششم نمبر ا و ۲ و ۳ (جولائی تا اگست سنہ ۲۷ء) — ۸/

رسالہ نیرنگ - رامپور

جلد ا نمبر ا دسمبر سنہ ۲۴ء — ۲/
" نمبر ۱۱ اکتوبر سنہ ۲۵ء — ۲/
جلد ۴ سنہ ۲۸ء ۱۱ پرچے معہ غالب نمبر تنقید نمبر و نیر نمبر — سے/
جلد ۵ سنہ ۲۹ء ۹ پرچے — ۸/

ادبستان (باتصویر) بمبئی

جلد اول سنہ ۲۶ و ۲۷ء (۷ پرچے) — عہ/
" نمبر ۳ — ۲/

متفرق سہ ماہی رسالے

رسالہ سائنس نمبر ا جلد ا - جنوری سنہ ۲۸ء — عہ/
" تاریخ نمبر ۲ جلد ۲ - اپریل سنہ ۲۹ء — ۱۲/
" اورنٹیل کالج میگزین - نمبر ا جلد ا - فروری سنہ ۲۵ء — ۸/

بنام خداوند جان آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجراء الناظر ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی))

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

نمبر ۵ و ۶	مئی و جون ۱۹۳۷ء	جلد ۲۳

فہرست مضامین

قیمت: فی پرچہ ۵ روپیہ

کتب خانہ

میں حسب ذیل اُردو کتابوں کی ضرورت ہو تو ہم سے طلب فرمائیے۔ ادبی کتابوں کا اتنا عمدہ اور بڑا ذخیرہ ہندوستان بھر میں کہیں یکجا نہیں کیا گیا۔ قدردانوں کی توجہ سے ذخیرہ کو اور ترقی ہوگی۔

تاریخ ادب

- تاریخ زبان اردو
- تاریخ ادب اردو
- تاریخ نثر اردو (حصہ اول)
- دکن میں اردو
- اردو کے اسالیب بیان
- شعر العجم ۵ حصے
- سیر المصنفین ۲ جلد
- مرحوم دہلی کالج
- خطبات گارسن دتاسی
- شعر الہند ۲ حصے
- تاریخ ادبیات ایران
- عربی ادب کی تاریخ

ادب و شاعری

- مقدمہ شعر و شاعری
- موازنہ انیس و دبیر
- نیرنگ خیال ۲ حصے
- ایشیائی شاعری
- [illegible]
- ہماری شاعری
- جدید اردو شاعری
- نقد الادب
- روح تنقید
- مرآۃ الشعر
- مثنویات
- دو میرزا
- شرح دیوان غالب طباطبائی
- ، ، حسرت موہانی
- ، ، نظامی بدایونی
- ، ، آسی
- ، ، بیخود دہلوی
- ، ، سہا
- شرح کلام غالب
- غالب اور انکی شاعری
- محاسن کلام غالب
- اقبال
- بزم خیال
- حسن خیال
- نشاط سخن ۲ حصے
- مقدمہ ادب اردو

شعرا و مصنفین

- حیات انیس
- یادگار انیس
- حیات دبیر ۲ جلد
- یادگار نسیم
- یادگار غالب
- بہادر شاہ ظفر
- طرۂ امیر
- تذکرہ رند
- حیات حالی
- حیات داغ
- حیات النذیر
- سوانح مولانا روم
- حیات سعدی
- خیام
- حیات حافظ
- حیات جامی
- حیات خسرو
- تذکرہ حزیں
- البیرونی

تذکرے

- آب حیات
- ارباب نثر اردو
- تذکرۂ آب بقا
- تذکرۃ الخواتین
- تذکرہ کاملان رامپور
- تذکرہ خندۂ گل
- تذکرہ مشاہیر کاکوری
- خمخانۂ جاوید جلد سوم
- ، ، جلد چہارم
- سخن شعرا
- گل رعنا
- نگارستان فارس
- ہندو شعرا
- (بزبان فارسی)
- تذکرہ اردو (میر حسن)
- نکات الشعرا (میر تقی)
- چمنستان شعرا (شفیق)
- گلشن بیخار (شیفتہ)
- مخزن نکات (قائم)
- مخزن شعرا
- تذکرہ گردیزی
- تذکرہ ہندی مصحفی
- ریاض الفصحا ،
- تذکرہ گلزار ابراہیم
- مجموعہ نغز (قاسم)

خطوط

- اردوئے معلی
- عود ہندی
- ادبی خطوط غالب
- مکاتیب امیر
- خطوط سرسید
- مکاتیب محسن الملک
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مکاتیب شبلی ۲ جلد
- خطوط اکبر
- اتالیق خطوط نویسی
- مرقع ادب ۲ جلد
- عورتوں کی انشا
- مکتوبات حالی
- مکاتیب اکبر

یزیدی

اُن کے عقائد و مراسم

(جناب مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب)

ایک زمانہ ہوا کہ میں نے یزیدیوں کے متعلق ایک کتاب عربی میں دیکھی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ مصنف کا نام قسطنطین زریق، استاد تاریخ مشرقی، جامعہ بیروت، تھا۔ مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ پھر وہ ایسی گم ہوئی کہ باوجود تلاش نہیں ملی۔ مصر کا رسالہ المقتطف (بابتہ ماہ مارچ جو ستمبر میں آیا ہے) (ابھی زیں کہ رسیدیم آسماں پیدا است) انھیں اسی کتاب کا خلاصہ کرکے کسی صاحب نے یزیدیوں کا حال لکھا ہے۔ اگرچہ بوجہ اختصار اس میں وہ لطف نہیں، لیکن پھر بھی خاصہ دلچسپ ہے۔ شاید کوئی اور صاحب بھی پسند فرمائیں۔ میں کچھ کمی بیشی کے بعد اس کو پیش کرتا ہوں۔

یہ چیزیں تطابق مذاہب پر غور فرمانے کے لیے شاید مفید اور ضروری ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی صاحب ذوق اسے پسند فرمائیں۔

یزیدی بیشتر کردی نسل کے ہیں۔ لیکن یہ دعوے نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا خون بالکل صاف ہے۔ یا، عراق اور ارمینیہ میں اُن کا میل سامیوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ علمائے تاریخ اس پر متفق ہیں س قوم کا نام یزیدی نہیں ہے، بلکہ ایزدی ہے اور یہ مشتق ہے فارسی الاصل لفظ ایزد سے۔ اور اگر یزیدی

ہی فرض کر لیا جائے تو مشتق ہے یزدان سے اس کے معنی کیے جاتے ہیں "وہ لوگ جو صرف عبادت ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں" یہ تعریف صرف ملائکہ کی ہو سکتی ہے۔ اُن کی ایک اور صفت یہ ہے کہ وہ واسطہ ہوتے ہیں مابین خالق و مخلوق کے۔ یزیدی کہتے ہیں کہ ہم ملائکہ ہی کے متبع ہیں۔ اسی لیے یہ دونوں صفات صرف ہمارے ہی اوپر صادق آتی ہیں۔

اُن کا ہر کچھ بھی دعوے ہو مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو چھپاتے ہیں اس لیے اُن کے دعووں کو جانچنا مشکل ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کا کوئی فلسفہ بھی ہے، یا جو اُن کے دعوے ہیں وہ محض خود ساختہ پرداختہ ہی باتیں ہیں۔ جب اُن کے مذہب[1] و معتقدات کا صحیح حال معلوم نہیں تو اور باریک باتوں کی کون کہے۔ تاہم بہر کیف، اُن کا ایک خاص مذہب ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو مذہب بھی خالص نہیں، کیونکہ وہ مشرق ازلی کے تمام نہیں تو اکثر مذاہب کا ملغوبہ معلوم ہوتا ہے۔

اُن کا نبی یا بانی اول، ایک صوفی منش آدمی، شیخ عادی ہے۔ یہ شخص پانچویں اور چھٹی صدی کے درمیان گذرا ہے۔ یہ موصل میں رہتے تھے۔ وہیں یہ پلے اور بڑھے تھے۔ یہ صرف قیاسات ہی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کے تمام حالات، ان کے سوانح عمری، اُن کے مذہب کی حقیقت اور اس کی تاریخ پر رموز و غوامض، اوہام و خرافات کے ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اُن کے غیر کو ان پردوں کا اُٹھانا کچھ ناممکن سا ہے۔ صحیح تو یہ ہے کہ یہ بھی بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ اگر یہ پردے اُٹھ بھی گئے تو اصل حقیقت عریاں ہو جائے گی، یا وہی تاریکی بدستور باقی رہے گی۔ اُن کی تاریخ و حالات کی تلاش میں ناکامیابی ہی ہوئی ہے۔ یہ کسی طرح امید ہی نہیں کہ یزیدی اپنے مذہب کو وا شگاف کریں گے؛ اُس کے اسرار و غوامض کا تو کیا ذکر ہے۔ جو کچھ بھی معلوم ہے وہ یہ ہے کہ مدتیں ہوئیں کہ یزیدی، بہ تعداد کثیر، انہاے بلاد عجم و عراق و شوریہ و دیگر متفرق مقامات میں رہتے تھے۔ وہیں تکریت، سامرہ، شرقاط (واقع عراق) نواح حلب و شام، اورفہ، حران، سعرہ، نصیبین، بیرہ جیک، عین تاب، نواحی فزان اور اُن کے علاوہ اور بہت سے مقامات میں، لاکھوں کی تعداد میں پھیلے۔ ترکوں کے زمانہ دولت میں ان سے سخت تعصب دینی برتا گیا اور اُن پر بڑے بڑے ظلم ہوئے۔ اس وجہ سے اب ان کی تعداد پچاس ہزار کے قریب رہ گئی ہے۔ یہ ہر طرف سے سمٹ کر اب موصل کے قریب قریہ قضاء الشیخان اور کوہ سنجار میں رہ گئے ہیں، یا بلاد عجم اور ارمینیہ میں ترکی روسی سرحد پر کوہ کلیس، عین تاب، دیاربکر اور ماردین میں بھی کچھ لوگ

---

[1] میں نے "دانستہ" مذہب" کہا ہے، "دین" نہیں کہا۔ مجھے شک ہے کہ یہ لفظ میں نے صحیح استعمال کیا ہے، یا نہیں۔ جہاں تک قیاس کام کرتا ہے یہ "دین" تو ہے نہیں۔ اگر مذہب ہے تو کس دین کا؟ (مترجم)

ملتے ہیں۔ ان کا مرکز اب بھی موصل کے شمال و مغرب میں، قضاء الشیخان کے قریب ایک قصبہ موسومہ بادری میں ہے۔ یہیں ان کے ہادی اول، شیخ عادی کا مزار ہے اور یہیں اُن کے امیر میر میران کا صدر مقام ہے۔

عام حالت | یزیدیوں کی اصل زبان کردی ہے۔ اس کو وہ مختلف لہجوں میں بولتے ہیں۔ جو لوگ ایشیائے کوچک میں رہتے ہیں وہ ترکی بولتے ہیں۔ سوریا اور عراق کے رہنے والے عربی بولتے ہیں۔ اپنی زبان کردی کو وہ مقدس سمجھتے ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اللہ نے آدم (علیہ السلام) سے اُن ہی کی زبان میں بات کی تھی اور موسیٰ (علیہ السلام) کے احکام اسی زبان میں نازل فرمائے تھے۔

یہ لوگ بڑے محنت کش، دراز قد، مضبوط ہاتھ پیر، جسم بھرے بھرے کے ہوتے ہیں۔ اُن کی تپلیاں کالی ہوتی ہیں اور رنگ سرخ و سفید ہوتا ہے۔ داڑھی لمبی رکھتے ہیں، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، عادت و خصلت اور طور و طریق کے بہت پسندیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں اور اُن کے اخلاق عام طور پر اچھے ہوتے ہیں۔ جو کوئی کام بھی اُن کے سپرد کیا جائے اُس کو بڑی محنت اور ایمانداری کے ساتھ پورا کر دیتے ہیں۔ آزادی و استقلال کے دلدادہ ہیں۔ نیک چلنی اور صفائی میں ان کی شہرت ہے۔ زنا سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس فعل بد کو کرتا ہے تو اُس کو بدترین عبرت انگیز سزا دیتے ہیں۔ معاملے کے بہت صاف ہیں، فن فریب انھیں نہیں آتا۔ اپنے بڑے آدمیوں کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔ زراعت کرنا اور جانوروں کو پالنا اُن کا خاص پیشہ ہے۔ اُن میں سے زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو خانہ بدوش ہیں۔ یہ مختلف قبائل میں منقسم ہیں۔ یہ لوگ اُن کی زبان میں "کوچر" کہلاتے ہیں۔ اُن کی برادری کا نظام اجتماعی ہے اور اپنے قبیلے کا بہت زیادہ لحاظ و خیال رکھتے ہیں۔ ہر قبیلہ ننہیال اور ددھیال میں منقسم ہوتا ہے اور ہر قبیلے میں جو سب سے بڑی عمر کا آدمی ہوتا ہے وہی اُس قبیلے کا سردار مانا جاتا ہے؛ وہی تمام قبیلے کا نگراں و حاکم ہوتا ہے۔ بڑا قبیلہ ایک مقررہ قاعدے کے موافق اور کئی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اور اُن کے الگ الگ کام اور پیشے مقرر کر دیے جاتے ہیں؛ مثلاً کھیتی باڑی، جانوروں کی پرورش، مزدوری، صناعی، روحانی و مذہبی فرائض، وغیرہ۔ یہی آخری فرقہ کے لوگ مذہبی مقتدا ہوتے ہیں اور ان ہی کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ چھوٹے اور بڑے قبیلے کے تمام آدمیوں کو، خواہ وہ کسی پیشے کے ہوں منظم رکھیں اور قبیلے کے بوڑھے آدمی کے نائب کی حیثیت سے سب کی نگرانی کریں۔ یہی برادری کی تقسیم اجتماعی و دینی حدود کی سخت نگرانی اور حفاظت کرتے ہیں اور اپنے ہم مذہب لوگوں کو اپنے مذہب کا انتظام قائم رکھنے میں بڑی شدت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی برادری سے نکل کر غیر جگہ یا اپنے سے اعلیٰ طبقے میں شادی کر لے تو یہ قصور معاف نہیں کیا جاتا۔ مصیبت تو اُس کی ہے جو اُن سے نکلتے مرتا فی

کرے۔ یا تو وہ سنگسار کر دیا جاتا ہے، یا مارے بیدوں کے اُس کی کھال اُدھیڑ دی جاتی ہے، یا کسی بدترین قسم کی موت سے مار دیا جاتا ہے۔

یزیدی جماعت کے دو شیخ ہوتے ہیں! ایک امورِ دنیوی کا نگراں ہوتا ہے۔ قبیلے کا وہ بڑا آدمی، جس کا ابھی اوپر ذکر آیا ہے وہ اسی شیخ کو جواب دہ ہوتا ہے۔ یہ شخص یزید الملقب بہ میر میران (امیر الامرا) کی اولاد سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جاتا ہے یہ قصبہ باعدری میں رہتا ہے۔ جو لوگ کہ شہروں میں رہتے ہیں اُن کے دنیوی کام اس شیخ سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کو عالم خارجی کا امام سمجھنا چاہیے۔

دوسرا شیخ امورِ روحانی کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ بمنزلہ بادشاہ روحانی کے ہے۔ مذہب و عقائد کے متعلق تمام مسائل اسی کے سامنے پیش و فیصل ہوتے ہیں۔ اُس کا حکم و فتوے حکم آخر و ناطق ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت پانچ حکام ہوتے ہیں؛ ان پانچوں کو الگ الگ قسم کا لباس پہننا ہوتا ہے۔ اُن کے مذہبی اعمال وغیرہ مقرر ہیں۔ اُن کے نام اور کام یہ ہیں :-

(۱) شیخ از روئے درجہ و رتبہ سب سے بڑا ہوتا ہے اور اُس کا وہی درجہ مانا جاتا ہے جو انبیا کا۔

(۲) پیر۔ صوم و افطار اس سے متعلق ہیں۔

(۳) فقیر۔ غریبوں کی اولاد کو مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور شیخ عادی کی قبر کے خادم بھی یہی ہیں۔

(۴) قوال۔ دف اور دیگر مزامیر بجاتے ہیں اور اللہ اور ملائکہ کی مدح گاتے ہیں۔

(۵) کوچک۔ تجہیز و تکفین ان کے سپرد ہے۔ خوابوں کی تعبیر بتلانا ان ہی کا کام ہے۔

عقائد مذہبی | عام طور پر یہ مشہور ہے اور اسی پر سب کا اتفاق ہے کہ یزیدی شیطان کو پوجتے ہیں۔ لیکن اگر اُن کے جتنے عقائد معلوم ہیں اُن پر غور کیا جائے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا ایک الگ مستقل "دین" ہے۔ اُن کے بعض معتقدات البتہ عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں، اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اُس میں قدیم زمانے کی بت پرستی، زرتشتیت، یہودیت، نسطوریت، بگڑا ہوا سا تصوف، صابئیت اور شامانیت کے عناصر ملے ہوئے صاف نظر آتے ہیں۔

اُن کے مذہب (دین؟) کا رکن اعظم ایک اِلٰہ کبیر و خالق کے وجود پر ایمان لانا ہے۔ اس اِلٰہ کے سات ملائکہ ہیں، جو اُس اِلٰہ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان پر ایمان لانا بھی فرض ہے۔ ان ملائکہ کے یہ نام ہیں :- عزرائیل، دردائیل، میکائیل، اسرافیل، زرزائیل، شمخائیل اور نورائیل[1]۔

---

[1] ان میں سے بعض نام علیات سفلی میں ملتے ہیں۔ میں اس وقت یہ نہیں بتلا سکتا کہ آیا یہودیوں کے یہاں بھی ان ناموں کے ملائکہ ہیں، یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کہیں ہمارے یہاں کے علیات میں یہ نام یزیدیوں سے تو نہیں آئے۔ عامل حضرات ۔۔۔! غور فرمائیں شاید جواب دے سکیں۔ بہرحال سوال شاید دلچسپ ہے۔

ان میں سے ہر ایک کو خدا (اِلٰہ) نے دنیا کی کسی نہ کسی چیز اور کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ جب یہ سب پیدا اور مکمل ہو چکے تو خدا نے ان سب میں سے عزرائیل کو بڑی عظمت عطا فرمائی اور سب سے افضل کر دیا اور اُس کو دنیا کے بڑے بڑے کاموں پر متعین کیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر وہ دنیا میں کسی بات میں سرکشی کرتا، یا نافرمانی کی طرف مائل ہوتا ہے، تو خدا اُس کو سزا دیتا ہے، اور جب وہ نادم ہو کر اپنے کیے پر پچھتاتا اور روتا ہے تو اُس کے آنسوؤں سے جہنم کی آگ بجھ جاتی ہے، اور خدا اُس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور اُس کو اُس کا بلند درجہ عطا فرما دیتا ہے اور دنیا کے کاموں پر بدستور تعینات کر دیتا ہے۔

یزیدی عزرائیل کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کا دوسرا نام "ملک الطاؤس" بھی ہے۔ یہ گویا ہر جگہ اور ہر موقع پر حاضر و ناظر ہے۔ چونکہ وہ دنیا کی تدبیر کرتا ہے اور دنیا و ما فیہا کا محافظ بھی ہے، اس لیے اُسی کے سامنے تضرع و زاری کی جاتی ہے۔ اُسی کو طفیل و شفیع بنا کر اپنے پیغمبر شیخ عادی، سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ بعض وقت اس کے بالعکس بھی کرتے ہیں۔ اس سے ایک قسم کی مقدس تثلیث پیدا ہو جاتی ہے، جس کے ارکان ثلاثہ الٰہ، ملک طاؤس اور شیخ عادی ہوتے ہیں۔ یزیدیوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کے اصول مذہب میں ملائکہ اور اولیا کو زیادہ دخل ہے۔

ان کے مذہب کے موافق روزے بہت رکھے جاتے ہیں۔ بعض بعض عیدوں اور تہواروں پر قربانیاں بھی کرنی ہوتی ہیں۔ غالباً یہ اسلام کا اثر ہے۔ عشاء ربانی اور شراب کی حلت اُن میں نسطوریوں سے آئی ہے۔ یہودیوں سے بعض چیزوں کا حرام ہونا لیا ہے۔ بعض مادی چیزوں کو سجدہ کرنا بت پرستوں سے سیکھا ہے۔ خوابوں کی تعبیر اور بہ حالت عبادت رقص کرنا شامانیوں کا ہے۔ حلول اور کود کر اچھلنا صابئیوں سے آیا ہے۔

اُن کا اس پر پکا اعتقاد ہے کہ عالم آخرت میں محافظ فرشتوں کی طرح ہر یزیدی کے ساتھ ایک بھائی ہوگا، جو اُس کی تعظیم و تکریم کو قائم رکھے گا۔ یہ لوگ اپنے اعمال کو سختی کے ساتھ چھپاتے ہیں؛ اسی لیے کہتے ہیں کہ نماز کو چھپا کر پڑھنے میں زیادہ فضیلت ہے۔ وہ فرائض کی کوئی تحدید نہیں کرتے۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ کتب سماوی اُن کے دلوں میں ہیں؛ بہ آوازِ بلند اُن کو پڑھنا، یا سنانا بیکار ہے۔ ملک طاؤس بھی اپنے دوستوں اور معتقدوں کو بغیر کتاب کے ہدایت کرتا ہے۔ اور دور ہی سے بیٹھے ہوئے سیدھا راستہ دکھلاتا اور بتلاتا ہے۔ ہر شخص کی تعلیم . . . . ملک طاؤس اُس کے ظرف اور اُس کے زمانے کے موافق کرتا ہے۔ تاہم وہ دو کتابوں کو مقدس سمجھتے ہیں: ایک کا نام "جلوہ" ہے اور دوسری کا "مصحف رش" (یہ آخری لفظ کردی زبان کا ہے اور اس کے معنی ہیں سیاہ کتاب) ان دونوں کتابوں میں

اُن کے مذہب کے اُصول، نماز کی ترکیب، تہلیل و تکبیر کی صورت، مراسم مذہبی کی تفصیل، عیدین کے اوقات اور دیگر ضروری باتیں درج ہیں۔

کتب مقدس کے بعض مضامین | اگرچہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ دونوں متذکرہ بالا کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ لیکن جو کچھ بمشکل تمام معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

دنیا اس طرح پیدا ہوئی کہ پہلے کچھ نہ تھا۔ جب خدا نے چاہا کہ کچھ پیدا کرے تو اُس نے سب سے پہلے اپنی سواری کے لیے (غالبًا) گھوڑا پیدا کیا۔ پھر اُس پر سوار ہو کر سمندروں کا دورہ کیا۔ پھر کسی بات سے اُسے اُس سواری پر غصہ آ گیا اور اُسے توڑ پھوڑ کر پھینکا۔ اس غضب الٰہی سے پہاڑ بن گئے، اور دھواں جو نکلا اس سے آسمان پیدا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر خدا اُن (آسمانوں، یا آسمان) پر چڑھ گیا اور اُن کو ویسے ہی، اُدھر جا کر کھڑا کر دیا۔

اب رہ گئی آبادی۔ اُس کی تفصیل قریبًا ویسی ہی ہے جیسی کہ توریت میں بیان ہوئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان کا بنانے والا ملک طاؤس ہے۔ جب آدم کا پتلا مٹی، پانی، آگ اور ہوا سے بن چکا تو ملک طاؤس نے اُس کے دونوں کانوں میں پھونک ماری وہ فورًا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ملک طاؤس نے اُس کو جنت رہنے کو دی۔ پھر ملک طاؤس نے اُس کے واسطے، اُس کے داہنے بازو سے، حوا کو پیدا کر دیا اور اُس کو انسان اول آدم کے ساتھ رکھا اور اُس کو اعمال بشریہ سکھلائے۔ گیہوں کے درخت کے بیج دونوں کو کھانے سکھلائے۔ چالیس برس کے بعد حکم دیا کہ دونوں کو فردوس سے نکال دیا جائے۔ دونوں نے کچھ تامل کیا تو ملک طاؤس نے ان کے پیٹوں پر پھونک ماردی اور اُن کو اُٹھا کر زمین پر پھینک دیا۔
جب وہ زمین پر آئے تو دونوں بلا کسی مخرج کے تھے۔ اس سے ان کو سخت تکلیف معلوم ہوئی، تو ملک طاؤس نے یہ دیکھ کر ایک پرندہ اُن کے پاس بھیجا، جس کا نام "قلاج" تھا۔ دونوں سو رہے تھے کہ قلاج نے اُن کے ٹھونگیں ماریں۔ اس سے اُن کے مخرج کھل گئے۔ اس سے اُن کو بڑی راحت ملی۔ اس کے بعد دونوں کے آپس میں نسل کے متعلق جھگڑا ہو پڑا۔ آخر یہ یوں طے ہوا کہ دونوں اپنے اپنے نطفوں کو ایک تھیلی میں بند کر کے اُن پر اپنی اپنی مہر کر دیں اور نو مہینوں کے بعد اُس کو کھولیں، چنانچہ یہی ہوا۔ نو مہینوں کے بعد آدم نے جو اپنی تھیلی کھولی تو اس میں سے دو بچے برآمد ہوئے، ایک لڑکا اور دوسری لڑکی۔ دونوں کے نام علی الترتیب شیث اور ہوریہ رکھے گئے۔ آدم دو برس تک دونوں کو دودھ پلاتا رہا۔ ان ہی دونوں کی اولاد یزیدیہ ہیں۔ حوا کی تھیلی میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ گندہ ہو گیا اور حوا کی صورت بھی ایسی بگڑ گئی کہ بہت دنوں کے بعد آدم پہچان سکا کہ یہ میری بیوی ہے۔ اس مرتبہ ان سے دو سوتے ہوئے بچے پیدا ہوئے،

ایک لڑکا تھا دوسری لڑکی۔ ان کے نام، علے الترتیب، قابین اور ہلیونہ رکھے۔ ان کی نسل سے تمام دنیا کے آدمی ہیں۔

طوفان کا قصہ بھی اُن کے یہاں موجود ہے۔ اُس کی وہی صورت ہے جو توریت میں مذکور ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن کے طوفان کے نوح کی کشتی کوہ سنجار پر ٹھہری تھی۔

مقدس دن اور تہوار | یزیدیوں کے یہاں روز چہارشنبہ مقدس تھا؛ اُس دن وہ کوئی کام کاج نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب مسلمانوں کے میل جول کی وجہ سے جمعے کو مقدس ماننا شروع کر دیا ہے۔

اُن کے دین اور اُس کے مختلف مذاہب کی عیدیں بہت سی ہیں۔ ان میں خوب رونق ہو جاتی ہے۔ ہر سال کا پہلا دن عید ہوتا ہے۔ اس عید کو کُردی زبان میں "سرصالی" کہتے ہیں۔ یکم نیسان (اپریل) کو یہی عید ہوتی ہے۔ اس کی آدھی رات کو ان کی عورتیں اپنے مقدور بھر اچھے کپڑے اور زیور پہنتی ہیں، خوشبو لگاتی ہیں، ہر طرح کے سنگار کر کے مردوں کے ساتھ مل کر گیت گاتی اور اُس کے تال اور سُر پر ناچتی ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اس وقت ملائکہ آتے ہیں اور اُن کے اس فعل کو اُن کے نامۂ اعمال میں بمنزلۂ عبادت لکھتے ہیں۔

تمام ماہ نیسان گویا عید کا مہینہ ہے؛ شاید کوئی دن عید سے خالی جاتا ہو۔ ان میں سبز لباس پہنتے ہیں اور خوبصورت پھولوں سے اپنے آپ کو سجاتے ہیں اور میدانوں میں سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں[۱]۔ اپنے گھروں اور دروازوں کو پھولوں سے سجاتے ہیں۔

اس مہینے کے پہلے چہارشنبے کو، حسب حیثیت، بھیڑ، بکری، گائے، مُرغ کی قربانی لازمی ہے۔ قربانی کا گوشت پکا کر ہانڈیوں یا دیگچیوں کو بطور صدقہ اپنے اپنے مُردوں کی قبروں پر رکھ آتے ہیں۔ اس مہینے کی آخری عید اُن کے بادشاہ یزید کی یوم ولادت کی ہوتی ہے۔ ان عیدوں میں یزیدی اپنی عورتوں سے پرہیز کرتے ہیں؛ کیونکہ اس مہینے میں اُن کے انبیا نے شادیاں کی تھیں اُن کا احترام لازمی ہے۔

یکم کانون اول (مطابق دسمبر) کو بھی ایک عید بڑے دھوم دھام کی ہوتی ہے۔ اس میں خوب دعوتیں ہوتی ہیں اور شراب پی جاتی ہے۔

۱۰ ماہ ایلول (ستمبر) کو تمام یزیدی اپنے شیخ عادی کی قبر کی زیارت کرنے جاتے ہیں۔ وہاں اپنے بادشاہ یزید کا تخت بچھاتے ہیں اور اُس کے گرد بیٹھ کر عید مناتے ہیں۔ ہر دو شیخان وقت ہر قبیلے کے سردار کو خلعتہائے مطلا عطا کرتے ہیں۔ یہاں بھی خوب گانا بجانا ہوتا ہے۔ سال بھر وہ ایک بیل پالتے ہیں اور

---

[۱] مقابلہ کیجیے مسلمانوں کے آخری چہارشنبہ کے دن سبزے کو روندنے کی رسم سے۔

اس کو مقدس سمجھتے ہیں۔ اسی روز اُس کو ذبح کرتے ہیں اور اُس کا گوشت پکا کر لٹا دیتے ہیں۔ جس کے ہاتھ ایک لقمہ بھی آجاتا ہے وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے اور اُس سے یہ شگون لیتا ہے کہ وہ اپنی مراد کو پہونچ جائے گا اور سال بھر برابر اس کو ہر طرح کی برکات ملتی رہیں گی۔ اس موقعے پر شیخ عادی کی قبر پر ہر شخص کو حسب حیثیت بہترین نذریں چڑھانی پڑتی ہیں۔

یہ تو بڑی بڑی عیدیں ہوئیں، چھوٹی چھوٹی عیدیں الگ رہیں۔ منجملہ ان کے ایک عید قربان کہلاتی ہے۔ یہ عید (حضرت) ابراہیم (علیہ السّلام) کے بیٹے (حضرت) اسحٰق (علیہ السّلام) کی قربانی کی یادگار میں منائی جاتی ہے۔ اس عید میں زیدی کسی معین پہاڑی مقام پر جاتے ہیں اور وہاں لکڑیاں جمع کر کے اپنے امیر کے باورچی خانے کے خرچ کے واسطے پہونچا دیتے ہیں۔ آج بھی ہر زیدی کو کچھ نہ کچھ قربانی کرنا لازمی ہے۔ ماہ شباط (فروری) کی نوچندی جمعرات کو ایک عید خضر و الیاس کے نام پر ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی عید الفطر سے دو روز پہلے یزیدیوں کے اولیا میں سے ایک کی قید سے خلاصی کی خوشی میں عید کی جاتی ہے۔ کانون اول (دسمبر) کی دسویں تاریخ کو مردوں کی یادگار میں عید ہوتی ہے۔ اُس روز قبروں پر جاتے ہیں، مُردوں کا ذکر خیر کرتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، صدقے دیتے ہیں۔ اس کے گویا متصل ہی کانون ثانی (جنوری) میں چالیس دن کے روزے شروع ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماہ تموز (جولائی) میں بھی روزے رکھنے پڑتے ہیں۔ ان کے دوران میں ملک طاؤس کے فقرا کو صدقے دینے ہوتے ہیں۔

بعض اعتقادات و مراسم یزیدیوں کا اعتقاد ہے کہ ساتوں ملائکہ نے مل کر حکیم سلیمان کے لیے دنیا میں ایک جھنڈا بنایا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد یہ جھنڈا یزیدیوں کے بادشاہوں کے ہاتھ آیا۔ ان بادشاہوں نے اُس کی نقل کر کے کئی اور جھنڈے بنوائے، جو تانبے اور لوہے کے تھے۔ اُن کے سروں پر طاؤس کی صورت بنی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک یزیدیوں کے دونوں شیخوں کے امیر کے پاس محفوظ ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے طلسم بھی محفوظ ہیں، جو بعض قدیم معبدوں کے تبرکات ہیں۔ یہ طلسم کیا ہیں؟ سانپ اور بچھو اور دیگر موذی کیڑوں کی تصویریں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ ملک طاؤس ان ہی کی شکلیں اختیار کر کے خفیہ طور سے نکل کر دنیا میں آجاتا ہے۔ اس لیے وہ ان جھنڈوں اور طلسموں کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور اُن کے کاہن اُن کے شہروں اور قصبوں میں بعض تہواروں میں لا کر اُن کا طواف کراتے ہیں۔ یہ رسم سال میں تین مرتبہ ادا کی جاتی ہے؛ اور ہر مرتبہ نذریں چڑھانا پڑتی ہیں۔

جس وقت یہ جھنڈے نکالے جاتے ہیں تو قوال کسی درخت کے کھٹے پھلوں کو گرم پانی سے دھوتے ہیں

اور پھر اُن کو پکا کے شیخ عادی کے مزار کی مٹی کے ساتھ گوندھ لیتے ہیں اور اُن سے طرح طرح کی تصویریں بناتے ہیں۔ لوگ بہ طور تبرک ان کو اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ جب یہ یزیدیوں کے کسی گاؤں کے پاس پہونچتے ہیں تو ایک آدمی، بہ آواز بلند، لوگوں کو ملائکہ کی تصویروں کے استقبال کے لیے بلاتا ہے۔ اس کو سُن کر لوگ سفید، پاک صاف کپڑے پہنے ہوئے، ننگے پیر، جلتے ہوئے بخورات ہاتھوں میں لیے، عطر میں ڈوبے ہوئے نکل آتے ہیں۔ عورتیں گیت گاتی ہوئی جھنڈوں کے آگے آگے ہوتی ہیں۔ یہ جلوس گاؤں کے کسی میدان میں آکر ٹھہر جاتا ہے۔ حاضرین میں سے ہر ایک جھنڈے کو اپنے گھر میں داخل کرتا ہے۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو برادری کے کسی بڑے آدمی کے مکان کے صدر مقام پر، ایک اونچے چبوترے کے اوپر یہ جھنڈا رکھ دیا جاتا ہے؛ اور پھر نہایت ادب و احترام کے ساتھ طاؤس کی تصویر اُس کے اوپر قائم کر دی جاتی ہے اور اُس کے سامنے روشنی کی جاتی ہے۔ پھر قوال اُس کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور مزامیر کے ساتھ گاتے ہیں۔ حاضرین تال اور سُر میں اُس کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ فعل بڑا موجب ثواب سمجھا جاتا ہے۔ ہر شخص طاؤس کے گرد نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے، سات بار طواف کرتا ہے۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ اس سے اُن کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ طاؤس کے سامنے سجدے کرتے ہیں، اُس کو چومتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ قوال دعائیں پڑھ پڑھ کر حاضرین کے سروں پر دم کرتے ہیں اور اُن کے لیے دعائے خیر و برکت و مغفرت کرتے ہیں۔ رات کو اُسی کھٹے پھل کے پانی سے طاؤس کو غسل دیتے ہیں اور اُس پر تیل ملتے ہیں۔ جو پانی اور تیل اس غسل سے گرتا ہے وہ زائرین کو، بطور تبرک، دے دیتے ہیں۔ وہ اُس کو اپنے بدنوں پر ملتے ہیں۔ اعتقاد یہ ہے کہ اس سے ظاہر و باطن گناہ دُھل جاتے ہیں۔

بعض مراسم و عادات | ایک زمانہ ہوا کہ وہ اپنی کسی بات کو ظاہر نہ ہونے دیتے تھے؛ یہاں تک کہ عام یزیدیوں کو پڑھانا لکھانا بھی ممنوع تھا کہ کہیں وہ آزادی کے جوش میں اُن کے اسرار کو ظاہر نہ کر دیں۔ تعلیم و تعلم ایک خاص خاندان، یا قبیلے کے لیے مخصوص تھا۔ چند روز سے انھوں نے اس معاملے میں چشم پوشی کر رکھی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ اُن کے متمول لوگوں کی اولاد بیروت کے کالجوں میں تعلیم پا رہی ہے۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا کہ ان آزاد خیال نوجوانوں نے اکثر باتوں کو ظاہر کر دیا۔ لیکن اب بھی بیشتر باتیں ایسی ہیں جو پردۂ خفا میں ہیں اور غالباً مدتوں رہیں گی۔ بہر کیف؛ مقتدایان دینی و مذہبی داڑھیاں نہیں منڈاتے؛ بلکہ اُس کو خیر و برکت و تقدس کی علامت سمجھتے ہیں۔ عوام الناس ہلکے نیلے رنگ کی چادر نہیں بناتے۔ کوئی یزیدی اپنا گریبان کھُلا نہیں رکھتا۔ اپنے مکان میں قضائے حاجت نہیں کرسکتے؛

بلکہ تھوکتے تک نہیں. کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرتے، بیٹھ کر پاجامہ نہیں پہنتے. ان کے خلاف کرنا حرام ہے اور حرام بھی شیطان کے نام پر. ہر اچھی چیز اور اچھی بات کو ملک طاؤس سے منسوب کرتے ہیں.
سُور، مُرغ، ہرن، مچھلی نیز وہ ترکاریاں جو پتوں سے ڈھکی رہتی ہیں، بھنڈی، کدو اُن کے یہاں حرام ہیں. کوزے سے پانی پینا ناجائز ہے. اُن کی حرام و حلال کی فہرست بہت لمبی ہے کہاں تک بیان کی جائیں.

شادی، بیاہ ودیگر تقاریب | شادی، بیاہ کے موقعے پر اعلان کے واسطے ڈھول، یا اسی قسم کی بلند بانگ چیز بجانا اور بلند آواز سے گانا لازمی ہے. شادی کی تقریب میں کھانا برادری کا کوئی متمول آدمی، یا گاؤں کا شیخ دیتا ہے؛ اُن ہی کا دیا ہوا کھانا دولھا، دولھن کو کھلایا جاتا ہے؛ اُن کے لیے کوئی خاص اور الگ اہتمام نہیں ہو سکتا. نکاح ہمیشہ سب کے کھانا کھا لینے کے بعد پڑھایا جاتا ہے. نکاح کے بعد بہ بانگ دہل اعلان: نکاح ہوتا ہے اور اسی غرض سے آتش بازی چھوڑی جاتی ہے. اس کے بعد دولھن رخصت ہوتی ہے. کوئی شخص اُس کے ساتھ نہیں جاتا؛ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں. کوئی شخص اپنے کنبے اور اپنی حیثیت سے زیادہ لوگوں میں شادی نہیں کر سکتا، مگر متمول لوگوں کو اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہیں شادیاں کر لیں. ناتے نسبت کی گفتگو ۱۲ برس سے ۱۸ برس کی عمر تک شروع کر دینا چاہیے؛ اس کے بعد ناجائز ہے اور شیخ کی اجازت درکار ہے. کوئی شخص ایک سے زائد بیوی نہیں کر سکتا لیکن اگر اولاد نہ ہو تو چھ تک بیویاں، بیک وقت، رکھنی جائز ہیں؛ مگر شرط یہ ہے کہ موجودہ بیوی اجازت دے، اس کے بغیر اور شادی کرنا حرام ہے. جب اولاد ہو جائے تو کوئی اور شادی ناجائز ہے.
بیٹی اپنے باپ کی وارث نہیں ہو سکتی. اگر وہ اپنے والدین کے قرار دادہ رشتے سے انکار کرے، تو اُسے بطور جرمانہ سونا، چاندی ماں باپ کو دینا پڑتا ہے، ورنہ عمر بھر اُن کی خدمت کرنا پڑتی ہے.
اگر کوئی کسی غیر شخص کی بیوی کو بھگا لے جائے، تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اُس شخص کو اپنی بیوی، یا بہن، حتیٰ کہ اپنی ماں دے دے؛ اگر یہ نہ کرے تو مُنہ مانگا مال دے کر اُس کو راضی کرے.
اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ایک سال الگ رہے، تو وہ بیوی اُس پر حرام ہو جاتی ہے. بھتیجی، پھوپھی، خالہ کی بیٹی سے نکاح حرام ہے. ایک ہی ماں، باپ کی بیٹیوں سے، بیک وقت، نکاح نہیں ہو سکتا.
اُن کے نزدیک دنیا کی آخری منزل موت نہیں ہے. مرنے والا کئی مرتبہ اس دنیا میں آتا ہے. اگر مرنے والا کوئی بدکار تھا، تو کسی جانور کی جون میں آئے گا؛ اگر نیک اعمال ہے، تو موجودہ زندگی سے کسی بالاتر درجے میں واپس آئے گا. یہ آواگون اُس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اُس کو درجہ کمال حاصل

ہو جائے. لطف یہ ہے کہ درجہ کمال کا کوئی تعین نہیں ہے. جب کوئی مرتا ہے تو اُس کے بدن پر شیخ عادی کے مزار کی مٹی مل دی جاتی ہے اور وہی اُس کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے. دفن کے بعد ایصال ثواب کے لیے برادری کو کھانا دیا جاتا ہے. اُس کی قبر پر چند روز تک چوکی دار بٹھا دیے جاتے ہیں. اُن کا یہ کام ہے کہ وہ یہ دیکھتے رہیں کہ اُس کی قبر پر کیا گذری.

اور کہاں تک عرض کیا جائے. مختصر یہ ہے کہ یہ لوگ، ان کا دین، ان کے مذاہب، ان کے راہ ورسم بہت دلچسپ اور اس قابل ہیں کہ اُن کو بغور دیکھا جائے اور تحقیق کیا جائے. لیکن ظاہر ہے کہ یہ بہت مشکل ہے. ممکن ہے کہ تعلیم ان کے نوجوانوں میں ایک طرح کی بغاوت پیدا کر دے اور وہ اپنے دین کے فلسفے کے نام ہی سے اپنے راز خود کھول دیں. مگر اس کے لیے برسوں درکار ہیں.

افکار رضی

(جناب مولوی سید محمد رضی صاحب رضی بدایونی)

دھجیاں لپٹی ہیں کانٹوں میں گریبانوں کی　　یادگاریں ابھی محفوظ ہیں دیوانوں کی

بارش اے ابر کرم اس قدر احسانوں کی　　گردنیں اُٹھ نہیں سکتی ہیں پشیمانوں کی

اشک خونیں میں ہیں شرحیں مرے ارمانوں کی　　سرخیاں خون جگر سے ہیں ان افسانوں کی

اب وہ ہنگامۂ فریاد نہیں زنداں میں　　بیڑیاں کٹ گئیں شاید ترے دیوانوں کی

ذرہ ذرہ میں ہے اک درس بصیرت پنہاں　　ادب آموز فنا خاک ہے پروانوں کی

نالۂ مرغ چمن - آہ سحر - تیر قضا　　سب ہیں بدلی ہوئی شکلیں ترے پیکانوں کی

کتنی پرکیف ہے صہبائے محبت ساقی　　روح ہر قطرہ میں کھنچ آئی ہے میخانوں کی

ہوں میں اس دشت جنوں خیز میں گرم جولاں　　جس کے ہر ذرے میں وسعت ہے بیابانوں کی

حد منزل پہ بھی آسودہ نہیں ذوق طلب　　غیر محدود ہے دنیا مرے ارمانوں کی

حسن کے جلوے ہیں نیرنگ نظر کے تابع　　سرخیاں روز بدلتی ہیں ان افسانوں کی

بیخودی شوق کی ہے مایۂ صد ناز خرد　　عالم ہوش ہے دنیا ترے دیوانوں کی

بے نقاب آج وہ غارتگر دیں آتا ہے　　خیریت اب نظر آتی نہیں ایمانوں کی

خود جگا دیتا ہوں - وہ خو گر ایذا ہوں رضی
آنکھ جب لگتی ہے زنداں کے نگہبانوں کی

(جناب کالج منشی امیر احمد علوی صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(۶)

ادیب اُردو | جنوری ۱۹۲۲ء میں "ادیب" کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ ۲۰×۲۶ کی تقطیع پر ۳ جزو کا حجم جس میں ۱۶ صفحے نور اللغات حرف الباء کے شامل تھے۔ کاتب غفلت شعار تھا اور نیز ناآزمودہ کار۔ کتابت اور طباعت کی عام شکایت ہوئی لہذا فروری سے کاغذ بہتر لگایا گیا اور چھپائی بھی دیدہ زیب ہوئی۔ ابتدائی پرچوں میں مولوی احسن اللہ خاں ثاقب۔ مولانا علی حسن احسن مارہروی۔ سید اولاد حسین شاداں۔ منشی عبدالوحید نیرنگ۔ منشی عبدالرفیع اثر۔ حضرت حمد لکھنوی۔ صفدر مرزا پوری۔ نواب لاڈلے واقف فرخ آبادی وغیرہم نے اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھے۔ ریاض خیرآبادی۔ فصاحت لکھنوی۔ نصرت لکھنوی کی غزلیں شائع ہوئیں مدیر رسالہ نے بعض ادبی مضامین "نقاد" یا "نشتر" وغیرہ فرضی ناموں سے شامل کئے۔ چند ماہ کے بعد اودھ پنچ کے بہترین مضامین کا انتخاب بھی مسلسل شائع ہونے لگا اور "ادیب اُردو" کو ہندوستان کے موقت الشیوع رسالوں میں درجۂ امتیاز حاصل ہوگیا۔

اجرائے رسالہ کی اصلی غرض تدوین لغت کے لئے زبان و محاورات کی تحقیق تھی "اور مشورہ طلب" کے عنوان سے مولوی نور الحسن سوالات شائع کرتے تھے اور ملک کے ممتاز اہل قلم ان کے جوابات تحریر فرماتے تھے۔ مثلاً پہلے پرچہ میں حسب ذیل سوالات تھے:۔

۱۔ "ذرا" کا املا ذال سے صحیح ہے یا زے سے۔

۲۔ الفاظ ہندی میں اضافت فارسی کے متعلق کیا رائے ہے؟۔ اُردوئے معلّےٰ۔ عرصۂ دراز۔ تعویذ لحد وغیرہ کی اضافت صحیح ہے یا نہیں۔

۳۔ "بم پولس" کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی اصل کیا ہے؟

۴۔ "عطائی" کا املا کیا ہے۔ اتائی صحیح ہے۔ یا عطائی۔

مارچ ۱۹۲۲ء کے پرچے میں حضرت شاداں بلگرامی کے مفصل جوابات مع دلائل کے شائع ہوئے اس کے بعد بعض دیگر زباں دانوں نے اظہار خیال سے سرفراز فرمایا۔ مولف نور اللغات نے دلائل پر غور کرکے حسب ذیل تصفیہ کیا۔

۱۔ "ذرا" کا املا ذال سے صحیح ہے۔

۲۔ الفاظ عربی و فارسی جن کے معنوں میں اہل ہند نے تصرف کر لیا ہے مگر وہ الفاظ بہ معانی دیگر ہنوز فارسی یا عربی میں رائج ہیں تو ایسے الفاظ کو مضاف یا معطوف بطور فارسی کے کرنا جائز ہے۔

۳۔ انگریزی میں بم (Bum) بہ معنی سُرین اور پلیس (Place) بہ معنی جگہ کے ہے اور بم پلیس بول چال میں بیت الخلا کا مرادف ہے۔ لہذا بم پولس کو بم پلیس کا محرف سمجھنا چاہئے۔

۴۔ "اتائی" ہندی لفظ ہے۔ جس شخص نے کوئی ہنر شوقیہ سیکھا ہو۔ وہ اُس کا آبائی پیشہ نہ ہو یا اُس نے باقاعدہ تعلیم اُس ہنر کی نہ پائی ہو تو اس کو "اتائی" کہتے ہیں۔ حضرت شاداں نے لکھا تھا کہ اس کا املا عین سے ہے اور وہی کا مرادف ہے مگر مولف نور اللغات نے امیر مینائی کی تقلید کی اور اس لفظ کو ہندی قرار دیا۔

ناظرین کی دلچسپی کے لئے چند سوالات اور نقل کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ قسائی کا املا سین سے ہے یا صاد سے؟

۲۔ "مبارکبادی" صحیح ہے یا غلط؟

۳۔ آبدست مذکر ہے یا مونث۔ بول چال میں "کرنا" کے ساتھ ہے یا "لینا" کے ساتھ؟

۴۔ مجلس۔ محفل۔ بزم میں کیا فرق ہے؟

جوابات سُنئے:۔

۱۔ عربی میں قص (بالصاد) کے معنی "کاٹنا" ہیں۔ قسا اور قسوۃ (بالسین) کے معنی سختی دل کے ہیں۔ اہل ہند نے قسا پر "ای" نسبت کے واسطے بڑھا کر "قسائی" بنایا۔ لہذا صحیح لفظ قسائی ہے۔ قصاب خالص عربی لفظ ہے اور یقیناً صاد سے ہے۔

۲۔ "مبارکبادی" صحیح ہے۔ (زلالی)

خلیل اللہ را در مسلخ خونریز فرزندش مبارکبادی قرباں بماہ عید قرباں زد

(داغ) غم جاوید نے دی مجھ کو مبارکبادی جب سنا یہ کہ انھیں شیوۂ بیداد آیا

۳۔ آبدست کو بعض اہل زبان مذکر بولتے ہیں لیکن بیگمات کی زبان مونث ہے "کرنا" اور "لینا" دونوں مصدروں کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ (محشر)

حج کر کے آئیں بڑھ گئی گوہر کی آبرو اب آبدست لیتی ہیں موتی کی آب سے

۴۔ اہل ہند نے مجلس کو بنا رغم کے لئے اور محفل کو بنار شادی کے لئے مخصوص کر لیا ہے

بزم مشترک ہے لیکن بیشتر عیش و نشاط کے مجموں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
غرض اس قسم کے لطیف سوالات "ادیب" میں شائع ہوتے تھے اور اُن کے جوابات سے لغت کی تدوین میں مدد لی جاتی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ "جس قدر ہمت افزائی نوراللغات کی تالیف میں حضرت ریاض خیرآبادی نے کی اتنی ہندوستان بھر میں کسی نے نہیں کی۔ اور امور مشورہ طلب کے تحقیقی جوابات جس قدر کاوش سے مع اسناد کے حضرت شاداں بلگرامی نے تحریر فرمائے کسی اہل قلم نے عنایت نہیں کئے"۔
شاہزادہ مرزا ثریا قدر بہادر (نبیرۂ امجد علی شاہ بادشاہ چہارم ملک اودھ) بہ اعتبار علمی قابلیت اور مذاق سخن کے نواب زادگان لکھنؤ میں ممتاز تھے۔ انھوں نے بھی بعض "امور مشورہ طلب" کے جوابات تحریر فرمائے اور ایک قطعہ تاریخ اجرار "ادیب" کا لکھا جو مارچ ۱۹۱۲ء کے پرچے میں شائع کیا گیا۔
نواب شاہزماں مرزا عرف المن صاحب سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے نواب وزیر مرزا بہادر المتخلص بہ کدر کا بہا شا کلام مرحمت فرمایا اور بعض قدیم محاورات کا پہلو سے استعمال بتایا۔
چونکھی کی ایک سن رسیدہ بیگم صاحبہ ادیب کی سرپرست ہوئیں اور بیگماتی رسوم و اصطلاحات کی تشریح سے مؤلف نوراللغات کے سرمایۂ تحقیق میں اضافہ کیا۔
فصاحت لکھنوی۔ نصرت لکھنوی۔ عزیز لکھنوی سے ملاقاتیں ہوتیں اور دشوار ادبی مباحث اُن کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔ صبح سے شام بلکہ نو دس بجے رات تک یہی مشاغل رہتے تھے۔ البتہ جمعہ کے دن دفتر بند ہوتا۔ اُس دن پرائیویٹ خطوط کے جوابات لکھتے۔ روشن الدولہ کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے اور امامت صلوٰۃ فرماتے تھے۔
۲۸ر جنوری ۱۹۱۲ء کو ادیب کا پہلا پرچہ شائع ہونے کے بعد ایک عزیز کو لکھتے ہیں :-
"بہت مدت کے بعد خط آیا۔ بیشک مجھ کو فرصت بہت کم ملتی ہے لیکن اگر تمھارا خط پنجشنبہ یا جمعہ کو ملے تو اس وجہ سے کہ جمعہ کو میں نے تعطیل رکھی ہے اور اس دن مطبع بھی بند ہوتا ہے خط کا جواب برابر پہونچتا رہے گا۔
ادیب اُردو میں وہ مضامین ہونا چاہئے جن کو اُردو لٹریچر سے تعلق ہو۔ صفات و تشبیہات کے متعلق کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے انتخاب شائع کرنا مناسب نہیں ہے

تم ابھی چند نمبر ادیب کے دیکھ لو پھر رائے قائم کرنا کہ کس قسم کے مضامین لکھنا چاہئے۔
خدا کا شکر ہے کہ ادیب کے متعلق ملک کا خاص رُجحان ہے اور کل ہی کی بات ہے کہ ایک قدر داں نے اس کی سالانہ قیمت میں ۵۰؍ عطا فرمائے ہیں۔ رسالہ فروری کا تیار ہو چکا تھا اور مطلق گنجائش نہ تھی ورنہ ایسے قدردان کا شکریہ ادیب ہی کی زبان سے ادا کیا جاتا۔
فروری کا رسالہ پچاس صفحوں کا کر دیا ہے اور کاغذ بھی بہتر لگایا ہے۔ امید ہے کہ اول ہفتہ فروری میں رسالہ جملہ حضرات کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے گا۔"

تعلیم و تربیت سے دلچسپی بدستور رہی۔ نبی حسن انگریزی پڑھتے تھے۔ طاہر حسن کی عربی تعلیم جاری تھی۔ بشیر احمد مدرسہ میں داخل تھے لیکن اُن کی نگرانی اور تربیت مد نظر رہتی تھی۔ طرّہ یہ ہوا کہ ندوۃ العلما کے ارباب حل و عقد نے آپ کو کالج کی کمیٹی انتظامیہ کا ممبر بنا دیا اور انگریزی تعلیم کی نگرانی سپرد کی۔ کچھ وقت اس خدمت کے لئے بھی نکالنا پڑا۔ دو ایک بار حاکم ضلع سے ملنے کا اتفاق ہوا "خلاصۂ نظائر اردو" کی شہرت عام تھی۔ جوڈیشل کمشنر اودھ نے حاکم ضلع سے مولانا کی قانون دانی کی تعریف کی تھی۔ ڈپٹی کمشنر لکھنؤ نے آپ کو اختیارات اسسٹنٹ کلکٹری درجۂ اول عطا کئے جانے کی سفارش کی۔ اس خدمت سے تالیف لغت میں ہرج کا اندیشہ تھا مگر ترک موالات کا زور شور تھا اس لئے صاف الفاظ میں آنریری خدمت سے انکار نامناسب معلوم ہوا۔

القصہ۔ قیصر باغ کے پُر فضا سبزہ زار کی سیر دلچسپ تھی۔ نور اللغات کے لئے مفید۔ ادیب اردو کے لئے سودمند اہل زبان سے ملاقات کا ذریعہ اور مولانا کی شہرت عام کا وسیلہ لیکن سن شریف پنجاہ و پنج سے متجاوز ہو چکا تھا۔ شبانہ روز کی محنت صحت کے لئے مضر تھی۔ فراغت قلبی اور آسائش جسمانی میسر نہ تھی۔ مصارف دو چند ہو گئے تھے۔ ادیب کی آمدنی اس کے اخراجات کے لئے کافی نہ تھی۔ نور اللغات کی طباعت کے لئے کوئی رقم پس انداز نہ ہو سکتی تھی اور اُس کے صرف چھ جزو چھ مہینے میں شائع ہوئے تھے۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہونے لگا تھا کہ اسسٹنٹ کلکٹری کے فرائض اگر سپرد ہوئے تو اجلاس کے لئے کاکوری جانا لازم ہو جائے گا اسی اثنا میں نبی حسن کو لکھنؤ کی آب و ہوا ناپسند ہوئی اور وہ وطن چلے گئے۔ بشیر احمد نے علیگڈھ کالج میں تعلیم پانے کا شوق ظاہر کیا اور قیصر باغ سے رخصت ہوئے۔ مولوی احمد حسن پاٹا نالہ پر ایک جداگانہ مکان میں سکونت پذیر تھے مولوی حامد حسن نے خواہش کی کہ نیر پریس

وہیں منتقل کیا جائے تاکہ کرایہ میں کفایت ہو۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں نبی حسن بیمار ہوئے مرض میں اشتداد ہوا۔ بغرض معالجہ لکھنؤ آئے۔ جھوائی ٹولہ کے حکیم عبد الحمید سے رجوع کرنا تھا اس لئے پاٹا نالہ پر مولوی احمد حسن کے ساتھ ٹھہرے۔ مولوی نور الحسن اور مولوی انوار حسن تیمارداری کے لئے ساتھ رہے۔ دوا دوش میں کوتاہی نہ ہوئی مگر قضار خداوندی ٹل نہ سکتی تھی ۶ مئی ۱۹۲۱ء کو سہ پہر کے وقت قلب کی حرکت یکایک بند ہوئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ نعش کے ہمراہ کاکوری گئے اور شب کو گورستان تکیہ میں دفن کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دوسرے دن شام کے وقت لکھنؤ واپس آئے لیکن تہیہ کر لیا کہ قیصر باغ کی سکونت ترک کی جائے۔ نیر پریس پاٹا نالہ پر رہے مگر نور اللغات اور ادیب اُردو کا دفتر کاکوری میں قائم کیا جائے۔ اسباب کاکوری پہونچانے۔ مطبع کا سامان اُٹھانے میں ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ لگا! بالآخر ۱۶ر جون ۱۹۲۱ء کو وطن میں مستقل سکونت کے عزم سے کاکوری پہونچے۔

کاکوری میں مستقل قیام | برآمدہ پر قیام پسند فرمایا۔ دیواروں میں تختے لگا کر کتب خانہ بنایا گیا۔ اہل خانہ کی آسائش کے لئے برآمدہ اور محلسرا کے درمیان ایک جدید ڈیڑھ تعمیر ہوا۔

نوجوان داماد کی ناگہانی موت سے طبیعت اداس تھی۔ علمی مشاغل میں دل نہ لگتا تھا عاقبت کی فکر ہر وقت دامنگیر تھی۔ ایک عزیز کو لکھا تھا کہ "کشتی عمر لب ساحل پہونچ گئی۔ ناخدا نے لنگر ڈال دیا۔ اب کوئی دم میں بغیر یار و مددگار۔ بے ساز و برگ۔ یکہ و تنہا۔ بیک بینی و دوگوش منزل اول میں قدم رکھنا ہے۔ فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین"

لغت نویسی ملتوی تھی لیکن ادیب کے لئے مضامین مرتب کر کے لکھنؤ روانہ کرتے تھے اور مولوی حامد حسن کی نگرانی میں پاٹا نالہ سے رسالہ شائع ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں اسسٹنٹ کلکٹری درجۂ اول کے اختیارات عطا ہوئے۔ گزٹ دیکھ کر منشی مقبول علی نے حالات دریافت کئے۔ ۱۲ر اگست ۱۹۲۱ء کو جواب میں تحریر فرمایا:۔

"اسسٹنٹ کلکٹر ہونے کی ابھی تک کوئی باضابطہ اطلاع مجھ کو نہیں ہے۔ پچھلے ڈپٹی کمشنر صاحب نے میرا ذکر جوڈیشل کمشنر سے سنا تھا اور اُنھوں نے کوئی یادداشت میری نسبت چھوڑی تھی موجودہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے برادر عزیز سے تذکرہ کیا اور گورنمنٹ میں رپورٹ کر دی میری کوئی خواہش اس عہدے کی نہ تھی لیکن انکار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ سُنا ہے کہ کام بہت ہے۔ وہ کیا جائے گا۔ اگر لغت کے کام میں ہرج ہوگا تو ترک کر دوں گا۔"

چند روز کے بعد ضابطہ کے احکام آ گئے۔ مقدمات کی مسلیں پہونچیں۔ پیشکار مقرر ہوا۔ کوٹھی کے مغربی دالان میں مولوی انوار الحسن مجسٹریٹی کا اجلاس کرتے تھے۔ مشرقی دالان میں اسسٹنٹ کلکٹری کی کچہری قائم ہوئی۔ قانون داں۔ معاملہ فہم اور جفاکش تھے۔ کام بہت بڑھ گیا اور دن کا بیشتر حصہ شہادتیں قلمبند کرنے اور تجویزیں لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ صبح کے وقت بعد وظائف کے "ادیب اردو" اور "نور اللغات" میں مشغول رہتے۔ دوپہر کو کتب تصوف کا مطالعہ کرتے اور تیسرا پہر مقدمات کے لئے وقف تھا۔ مولوی طاہر محسن کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کچھ وقت اُن کے پڑھانے میں صرف ہوتا تھا۔ نور اللغات کا ایک جزو ماہ بماہ ادیب کے ساتھ نکلتا تھا۔ ستمبر ۱۹۱۲ء کے پرچے میں ایک محاورہ "بانسوں اُچھلنا یا کودنا" درج ہوا اور اس کے معانی "خوشی یا غصے کی شدت میں کودنا۔ بے حد خوشی منانا" لکھے گئے اور داغ کا حسب ذیل شعر سند میں پیش کیا گیا۔

فرطِ خوشی میں مکیش بانسوں اُچھل رہا ہے　　　وہ جوش ہے کہ پانی بانسوں اُچھل رہا ہے

منشی مقبول علی نے ایک عریضہ لکھا کہ "بانسوں اُچھلنا" خوف کے محل پر استعمال ہوتا ہے اور مثال میں یہ شعر لکھا:-

چھپے چوری ہوا ہے آج اُن سے وصل کا وعدہ　　　کلیجا ہاتھ بھر کا ہے مگر بانسوں اُچھلتا ہے

استاد نے جواب[1] میں تحریر فرمایا:-

"اس شعر میں خوف کا احتمال بھی نہیں ہے۔ چھپے چوری وعدہ نہ ہوتا تو کیا کوئی بازاری ہے جس سے کھُلم کھُلا وعدہ ہوتا۔ مگر سے خوف کا احتمال کس طرح ہوگا۔ شاعر کہتا ہے کہ کلیجا خوشی سے ہاتھ بھر کا ہو گیا ہے۔ ہاتھ بھر کا کلیجہ ہے پھر بھی بانسوں اُچھلتا ہے۔ ہاتھ بھر کے کلیجے کا بانسوں اُچھلنا حیرت انگیز ہے اور اس حیرت کو "مگر" سے ظاہر کرتا ہے۔"

نبی حسن مرحوم کے انتقال کے تین چار مہینہ بعد اُن کی بیوہ کے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو ڈیڑھ ماہ زندہ رہ کر ستمبر ۱۹۱۲ء میں قضا کر گئی۔ مولوی نظیر الحسن مرحوم کی کثیر متروکہ جائداد کا داخل خارج نبی حسن کے انتقال کے بعد اُن کی نوزائیدہ لڑکی کے نام ہونے والا تھا مگر وہ بھی رخصت ہو گئی تو وراثت کا سوال پیدا ہوا۔ بیوہ کا حق چہارم نکالنے کے بعد ہزاروں روپیہ کی جائداد بچتی تھی اور بہت سے اعزہ اُس میں حصہ پانے کے امیدوار تھے۔ مولوی نور الحسن اور انوار الحسن کا حق بہ حیثیت عصبہ ہونے کے فائق تھا لیکن ہمشیرۂ مولوی نظیر الحسن (یعنے زوجۂ اولیٰ مولوی نور الحسن) کی اولاد ترکہ کی

[1] مکتوب مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء

اس بنیاد پر دعویدار تھی کہ یہ جائداد اُن کے نانا مولوی محمد احسن مرحوم کی ہے اور عصبات میں تقسیم ہونے سے پہلے اُن کی مادر مرحومہ کا حصہ مشخص ہونا چاہیئے۔

ایک دن صبح کے وقت راقم الحروف خدمت میں حاضر تھا کہ ایک عزیز قریب نے مولوی محمد احسن مرحوم کی کل متروکہ جائداد کو اس سبب سے منحوس بتایا کہ اُن کے بیٹے اور پوتے کو اس سے منتفع ہونا نصیب نہ ہوا تھا اور مولوی نور الحسن کو صلاح دی کہ وہ اس جائداد میں حصہ نہ لیں۔ میں نے عرض کی کہ کل جائداد کی بابت تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن جس وقت "جزء یہ گڈھی والا باغ" مولوی محمد احسن مرحوم خرید کر رہے تھے تو میرے سامنے کسی شخص نے مولوی صاحب مرحوم سے کہا تھا کہ یہ باغ منحوس ہے اس کو آپ خرید نہ کریں اور مولوی صاحب لاحول پڑھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ استاد یہ قصہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ میں اس جائداد کو لینا نہیں چاہتا لیکن احمد حسن اور حامد حسن کو نانا کی میراث ضرور ملنا چاہیئے۔

دراندازوں نے معاملہ کو طول دلایا اور مولوی نور الحسن اور انوار الحسن کے درمیان شکر رنجی پیدا کرا دی۔ کئی مہینہ تک مناقشہ رہا۔ بالآخر تصفیہ ہوا کہ کل متروکہ کا ½ حصہ بیوہ نبی حسن یعنے دختر مولوی نور الحسن کو دیا جائے۔ اور ¼ حصہ مولوی احمد حسن و حامد حسن کو دیا جائے۔ بقیہ جائداد مولوی نور الحسن اور انوار الحسن بحصہ برابر تقسیم کر لیں۔ اس تصفیہ کے بعد بیوہ نبی حسن مرحوم کا عقد مولوی احسن مجتبےٰ خلف مولوی انوار الحسن کے ساتھ ۸ رجمادی الثانیہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۶ رجنوری ۱۹۲۳ء کو ہوا اور اس کے چند ماہ کے بعد مولانا نے وہ چہارم حصہ بھی جو تقسیم کے بعد اُن کو ملا تھا مولوی احمد حسن و حامد حسن کو ہبہ کر دیا اور کاغذات سرکاری میں دونوں صاحبزادوں کا نام اپنی جگہ درج کرایا۔

ہنوز یہ تصفیہ ختم نہ ہوا تھا کہ مولانا نے اپنی موروثی جائداد کا بیشتر حصہ وقف علے الاولاد کیا اور اگست ۱۹۲۳ء میں دستاویز وقف نامہ کی رجسٹری کرا دی۔ تقریباً دو سال ان کھیڑوں میں صرف ہوئے اس مدت میں شعر گوئی کی بھی فرصت کم ملتی تھی۔ لغت کی ترتیب مقدمات کی تجویز اور خانگی نزاعات کے تصفیہ سے جو وقت بچتا وہ کتب تصوف کے نذر ہوتا تھا۔

۱۹۲۳ء میں صرف ایک غزل لکھی اور وہ صوفیانہ مذاق سے رنگین ہے:-

وہ کیا پردے میں بیٹھے جس کا چرچا جا بجا بھی ہے	برنگ بوئے گل مخفی بھی ہے جلوہ نما بھی ہے
حیا ایسی کہ گھونگھٹ سے خیال و وہم سے اُس کو	اور اُس پر خود نمائی یہ کہ عالم آشنا بھی ہے
تری رحمت کے آگے بار عصیاں چیز ہی کیا ہے	پھر اپنا شافع محشر محمد مصطفےٰ بھی ہے

کبھی آنکھوں میں رہتے ہو کبھی تم دل میں بستے ہو　　　تمھیں تو ہو محلہ بھر میں کوئی دوسرا بھی ہے
بت کافر نے دل چھینا خدا حافظ ہے ایماں کا　　　یہی بستی میں کلمہ گو تھا کوئی دوسرا بھی ہے

اسی زمانہ میں "شمائل نبوی" بطرز مسدس نظم کرنے کا قصد کیا۔ مارچ ۱۹۱۱ء میں چودہ بند کہے مدعت کے بعد دس بند اور لکھے لیکن نظم تمام کرنے کی فرصت نہ ملی نمونہ کے لئے ایک بند نقل کیا جاتا ہے :-

جھکتی نہ اگر رحمت عالم سوئے پستی　　　معمور نہ ہوتی کبھی آدم کی یہ بستی
افلاک رسالت کی نہ ہوتی کوئی ہستی　　　ایمان کے تاروں کے لئے خلق ترستی
یہ مہر نہ ملتا کبھی یہ ماہ نہ ملتا
بالفرض یہ ملتے مگر اللہ نہ ملتا

تصوف کی بابت اس زمانہ میں جو خیالات تھے وہ مندرجۂ ذیل خط سے ظاہر ہوتے ہیں جو ۲۸ر فروری ۱۹۱۱ء کو منشی مقبول علی کے نام لکھا تھا :-

"تصوف کے مذاق میں شاعری کا لطف ہے اس وجہ سے وہ دل خوش کن ہے لیکن صرف الفاظ سے لطف اٹھانے کی عمر گذر گئی۔ اب دل اشارات و کنایات سے خوش نہیں ہوتا۔ وہ کچھ اور ہی ڈھونڈھتا ہے۔ دیکھئے پردہ کب اُٹھتا ہے۔ جو اصل حقیقت کو پہونچ گئے اُن کی زبان بند ہو گئی اور جو ظاہری ٹیم ٹام میں مبتلا رہے وہ لفاظی کرتے رہے۔ فی الحقیقت تنکے کی اوٹ پہاڑ ہے۔"

مولوی طاہر حسن کی والدہ کو سفر حج کی آرزو تھی۔ اُن کی نانی یعنی بیوۂ منشی محفوظ علی مرحوم ڈپٹی کلکٹر پنشنر بھی سامان سفر درست کر رہی تھیں۔ منشی اسحاق علی علوی۔ اڈیٹر "الناظر" بھی عازم بطحا تھے۔ اور بھی بعض اعزہ اس سال عرب جانے والے تھے۔ مولانا نے قصد کیا کہ وہ بھی اس قافلہ کے ساتھ دوبارہ سعادت حج و زیارت سے فیضیاب ہوں۔

۲۵ر مارچ ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"بہ میخانہ جامی نہ از خود رود　　　گر ہمت شیخ با مش برد
و منشأ قصد روانگی ہو گیا ہے۔ اپریل کے آخر یا مئی کے اول میں قصد روانگی ہے۔ طاہر کی نانی صاحبہ اور طاہر کی والدہ کا قصد باعث میرے ارادہ کا ہوا ہے۔ شوال میں دریا کے تموج کا احتمال ہے اس واسطے پیشتر سے روانگی کا قصد ہے۔ کاکوری سے

منشی انور علی[1] - منشی اسحاق علی - بھائی ظہور[2] کی ہمشیر عازم ہیں۔ رشید[3] بھائی کا بھی قصد ہے لیکن خفیہ ہے صحیح تاریخ روانگی سے بعد کو اطلاع دوں گا۔"[4]

۱۴ راپریل ۱۹۱۳ء کو بدایوں تشریف لے گئے۔ راقم الحروف کی ایک لڑکی کی شادی خاں صاحب منشی عبدالقادر علوی کاکوروی کے صاحبزادے سے قرار پائی تھی۔ وہ اُس وقت بریلی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور راقم بدایوں میں تعینات تھا اس لیے طے ہوا کہ نکاح بدایوں میں کردیا جائے۔ فریقین کے اعزہ بدایوں آئے۔ ۷ ار شعبان ۱۳۳۱ھ کو سہ پہر کے وقت عقد ہوا اور دوسرے روز غریب خانہ پر بزم مشاعرہ منعقد کی گئی۔ طرح تھی۔ ع۔ تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔ استاد نے باوجود اصرار کے غزل نہ لکھی تھی سخن سنجان بدایوں کی موثر اور پرکیف غزلیں سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔ خود میر مجلس تھے اختتام بزم کے وقت شمائل نبوی کے چند بند پڑھے۔ اساتذۂ فن نے قدر کی اور مندرجہ ذیل شعر اہل ذوق کو حفظ ہو گیا :-

سجدے میں ستارے گرے اور جھوم کے اُٹھے جس طرح مصلّے کو کوئی چوم کے اُٹھے

بدایوں سے واپس آکر سفر حجاز کا تہیہ شروع کیا۔ ۷ رمئی ۱۹۱۳ء کو کاکوری سے رخصت ہوئے۔ جہاز کی روانگی میں دیر تھی۔ بمبئی میں انتظار کرنا پڑا۔ وہاں بلغمی تپ میں مبتلا ہوئے اور بحری سفر کے قابل نہ رہے۔ مولوی طاہر حسن مع اپنی والدہ کے راہی عرب ہوئے اور مولانا کاکوری واپس آئے۔ یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ مولوی حامد حسن کی دُلہن بہت بیمار ہیں۔ اس کل داستان کو مولانا ہی کی زبان سے سنئے :-

(۱) "بمبئی میں ۱۴ رمئی کو مجھے بلغمی تپ ہوئی جس سے تھرما میٹر انتہائی درجے پر پہونچ گیا۔ تیسرے روز میں اورنگ آباد مشفقی ظہور الدین احمد کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے اور اُن کی بیوی نے جس اخلاق و محبت سے تیمار داری کی اُس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹری علاج کیا۔ ۱۷ رمئی کو بخار کم ہونا شروع ہوا۔ بخار کی پریشانی میں میں نے والدۂ طاہر کو بمبئی سے بلا لیا تھا۔ بخار اُتر جانے کے بعد میں نے اُن کو مع طاہر کے بمبئی بھیج دیا اگرچہ وہ مجھ کو چھوڑ کر جانے پر رضامند نہ تھیں۔ میں ۲۸ رمئی کو اورنگ آباد سے روانہ ہو کر ۲۹ رمئی کو کاکوری پہونچا۔ ۳۰ رمئی کو طاہر مع اپنی ماں، ہمشیر اور نانی کے سردستان جہاز میں بمبئی سے روانہ ہوئے۔

---

[1] منشی انور علی خلف خان بہادر منشی اطہر علی مرحوم [2] سید ظہور الدین احمد مسبوق الذکر
[3] حاجی رشید الدین مرحوم مسبوق الذکر [4] مکتوب مورخہ ۲ رجون ۱۹۱۳ء بنام منشی مقبول علی۔

یہاں آکر مجھ کو معلوم ہوا کہ حامد کی دُلہن کو حرارت رہتی ہے اور اطبا پھیپھڑے میں فساد تجویز کرتے ہیں جس سے نہایت پریشانی ہوئی۔ یہاں جو ڈاکٹر آئے ہیں وہ اس مرض کے واسطے پچکاری دیتے ہیں۔ یہ پچکاری حال میں ایجاد ہوئی ہے۔ یہاں دو مریض ان کے زیر علاج ہیں دونوں کی تپ دفع ہو گئی ہے۔ میں نے فرنگی محل لکھا تھا کہ مریضہ کو یہاں بھیج دیں مگر وہاں سے یہ جواب ملا کہ اطبا اجازت نہیں دیتے۔ اس علالت سے نہایت پریشانی ہے۔ شافی مطلق اُس کو شفا عطا فرمائے۔ مجھ کو ضعف بہت ہے۔ خط لکھنا بھی بار ہے۔ معالجہ ہوتا ہے۔"

(۲) "پرسوں میں انتظار میں بلکہ اُس وقت جب میں انتظار کرتے کرتے نہایت پریشان اور مضطر ہو رہا تھا۔ برخوردار طاہر سلمہ کا خط مورخہ ۲۳ جون آیا جس سے ان لوگوں کا مع الخیر مکہ معظمہ پہونچنا اور گیارہ گنی میں مکان لے کر متصل بیت اللہ مقیم ہونا معلوم ہوا۔ الحمد للہ کہ سفر کا ایک مرحلہ طے ہوا۔ اور زیارت بیت اللہ نصیب ہوئی۔ میری فریاد تو یہ ہے۔

قافلہ شد واپسی ما بہیں　　　اے کس ما بیکسی ما بہیں

برخوردار حامد حسن سلمہ کی دُلہن کی حالت تردد انگیز ہے۔ شافی مطلق شفا عطا فرمائے حامد حسن بہت پریشان ہیں اسی وجہ سے ادیب جون میں نہیں نکل سکا۔ اب جولائی جون کا ایک پرچہ نکالا ہے۔"

(۳) "دعا ہائے صحت و عافیت و فلاح دارین۔ تین روز سے بار بار تمہارا خیال آتا تھا اور کئی بار ارادہ ہوا کہ تم کو خط لکھوں۔ کل شام کو تمہارے خیال کے ساتھ یہ شعر زبان پر رہا۔

رہ گئی بات کرتے گئی شب ہجر　　　تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

آج صبح کو تمہارا خط ملا۔ بے اختیار دعائیں زبان سے نکلیں۔ اللہ تعالے شرف قبول عطا فرمائے طاہر سلمہ کا خط مکہ معظمہ سے آیا۔ یہ خط ۴ اگست کا لکھا ہوا تھا جو ۷ ستمبر کو مجھ کو ملا وہ لوگ ۸ اگست کو مدینہ طیبہ روانہ ہوئے ہوں گے۔ صفر کے آخر یا ربیع الاول کے اول ہفتہ میں یہاں پہونچ جائیں گے انشاء اللہ۔ انور سلمہ کا خط بھی اسی مضمون کا آیا ہے۔ حامد حسن سلمہ کی دُلہن کی حالت خطرناک ہے۔ معالجہ ہو رہا ہے۔ کسی دوا علاج سے افاقہ نہیں ہوتا۔ منشی اسحاق علی سلمہ کا خط اُن کے گھر آیا ہے اُن کو بخار آگیا تھا اس وجہ سے وہ مکہ معظمہ سے روانہ نہیں ہوئے۔"

سلہ مولوی حامد حسن پسر دوم مولوی نور الحسن　　　سلہ مکتوب مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۲۳ء

سلہ مکتوب مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۲۳ء

(۴) "۳ر اکتوبر کو برخوردار طاہر سلمہ مع دیگر اعزہ کے شام کی گاڑی میں مع الخیر یہاں پہونچے سب لوگ گرمی کی شدت سے حبشی ہو گئے ہیں۔"

القصہ بمبئی سے واپس آنے کے بعد تدوین لغت کی طرف زیادہ توجہ کی۔ مولوی حامد حسن اپنی بیوی کی شدید علالت کی وجہ سے پریشان تھے۔ ادیب کی اشاعت میں تعویق ہوتی تھی علاوہ اس کے دو سال کی مدت میں صرف چھ بیس جزو لغت کے شائع ہو سکے تھے اور حرف لبا بھی تمام نہ ہوا تھا لہذا طے کیا گیا کہ دسمبر ۱۹۱۲ء سے ادیب بند کر دیا جائے اور نور اللغات کا ایک حصہ بڑی تقطیع پر چھپوا کر ملک کے سامنے پیش ہو۔ اگر قدر دانی ہوئی تو بقیہ حصص طبع کرلئے جائیں گے ورنہ کتاب غیر مرتب چھوڑ دی جائے گی۔

۹ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو مولانا کی چھوٹی ہمشیرہ یعنی والدۂ منشی وزیر احمد تحصیلدار کا یکایک انتقال ہو گیا۔ اس سانحہ سے دل و دماغ کو سخت صدمہ پہونچا۔ ۹ر دسمبر کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"اس زمانہ کی پریشانیوں سے حواس درست نہیں ہیں۔ والدۂ وزیر احمد کے انتقال نے زندگی کا حوصلہ پست کر دیا۔ اُن کا انتقال ایسا ہوا جیسے اولیاء اللہ کا ہوتا ہے۔ خدائے تعالے مغفرت فرمائے حامد حسن سلمہٗ کی دُلہن کی حالت روز بروز خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ حامد حسن بہت پریشان ہیں۔ ادیب کی اشاعت بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ نور اللغات کو مرتب کر دوں کیونکہ میرے بعد اس کا مکمل کرنے والا ہندوستان میں کوئی نظر نہیں آتا۔"

جنوری ۱۹۱۳ء میں زوجۂ حامد حسن کی علالت ناقابل علاج ہو گئی۔ معالجہ اور تیمارداری کی پریشانیوں سے مولوی حامد حسن خود بیمار ہو گئے۔ مونیہ کا سخت حملہ ہوا۔ مولوی نور الحسن و انوار الحسن لکھنؤ پہونچے۔ ۵ر فروری ۱۹۱۳ء کو وہ بیوی راہی جنت ہوئیں۔ مولوی حامد حسن کو ڈاکٹروں نے جواب دیا۔ باپ چچا بھائی بدحواس ہو گئے۔ اطبائے یونانی کی طرف رجوع کیا۔ شفا اُن کے ہاتھ مقدر تھی۔ ایک ہی نسخہ سے افاقہ شروع ہوا اور چند روز میں صحت ہو گئی۔ ادیب اُردو بند کر دیا گیا۔ نور اللغات کا حصہ اول نیر پریس میں چھپ رہا تھا۔ مولوی حامد حسن کی پریشان خاطری اور شدید علالت سے طباعت میں تعویق ہوئی۔ اپریل ۱۹۱۳ء تک اس جلد کا نصف حصہ بھی تیار نہ ہو چکا تھا کہ مولانا کا چھوٹا لڑکا ناصر حسن جو ۲ر نومبر ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوا تھا بیمار ہوا اور اُس کی علالت کی سبب مولانا بھی طباعت کی دیکھ بھال نہ کر سکے۔ اہل خانہ مع بیمار بچہ کے لکھنؤ میں تھیں اس لئے

مکتوب مورخہ ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء بنام منشی مقبول علی۔

بار بار دفتر سے غیر حاضر ہونا پڑتا تھا اور پروف کی کاپیاں صحیح کرنے میں تاخیر ہوتی تھی۔ جون میں بچہ کو افاقہ ہوا تو جولائی میں زنانخانہ میں آگ لگ گئی۔ لغت چھپوانے کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی اور غیر معمولی اخراجات یکے بعد دیگرے پیش آتے تھے۔ سارا وقت تحقیق الفاظ و محاورات کے نذر کرنا چاہتے تھے مگر ہجوم افکار اجازت نہ دیتا تھا۔ اس زمانہ کے دو خط پڑھنے کے قابل ہیں۔

(اوّل) عزیز بجان سلمہ الرحمٰن۔ دعا ہائے صحت و عافیت و فلاح دارین۔ تمہارے خط سے مجھے وہ فرحت ہوتی ہے جو مُردے کو فاتحہ کے ثواب سے اور اسی وجہ سے عالم بے اختیاری میں جواب لکھتا ہوں۔ میں اس عالم میں کہاں ہوں جس سے تم خط نہ لکھنے کی شکایت ہو۔ خدا معلوم کس دھن میں مبتلا ہوں۔ کبھی کسی دوست کا خط آجاتا ہے چونک پڑتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ابھی لوگ میرا شمار زندوں میں کرتے ہیں۔ ناصر کو اب کسی قدر افاقہ ہے۔ میں دس روز لکھنؤ رہ کر چلا آیا ہوں۔ یہاں دو چار روز رہ کر پھر لکھنؤ کا قصد ہے۔ حامد حسن کے متعلق ابھی کیا رائے قائم کی جائے۔ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے برخوردار امیر احمد سلمہٗ نیمچ کی چھاؤنی میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر مقرر ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُس کو صحیح و سلامت و با اقبال رکھے اور عمر طبعی عطا فرمائے۔

نورالحسن

۲۹ مئی پنجشنبہ

(دوم) دعا و سلام۔ خط آیا۔ آگ لگنے کا واقعہ عجیب و غریب ہے۔ زنانہ مکان کے برد ے میں آگ لگی۔ بچا س من خشک لکڑی اور متفرق اسباب تھا۔ سب جل گیا۔

اس موسم میں کہیں آگ لگتے نہیں سنا۔ پریشانیوں کی حالت خدا ہی جانتا ہے۔ ایک سلسلہ ہے جس کی انتہا کا خدا کو علم ہے۔ دعا کرو کہ خدائے تعالیٰ مجھ کو استقلال عطا فرمائے۔ سُننا نہ سُننا اُس کے اختیار میں ہے۔ اُس سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ بیشمار نعمتیں اور بے حد احسانات ہیں پھر بھی جب ذرا سی کوئی بات طبیعت کے خلاف ہوتی ہے تو شکوہ مُنہ کی زبان سے نہیں تو دل کی زبان سے ضرور نکلنے لگتا ہے۔ مایوسی ہوتی ہے تو اُس کے ساتھ ہی رحمت عام سے زیادہ امیدیں ہو جاتی ہیں۔ اسی رحمت کے بھروسے پر عمر بسر ہوتی ہے۔

یا رب تو بفضل خویش کارے بکن　　با من تو ہماں کن کہ بہ آں معروفی

نورالحسن　　۱۱ جولائی　　۸ ذیقعدہ جمعہ

نور اللغات جلد اول | باوجود خانگی ترددات ۔ افکار و آلام کے اسی زمانہ میں نور اللغات پر ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا جس میں اُن الفاظ و محاورات کی تفصیل تھی جو متقدمین اور متوسطین کے کلام میں پائے جاتے ہیں مگر اب متروک یا قلیل الاستعمال ہیں۔ آگو۔ ٹک ۔ پرے ۔ آئے ہے ۔ جائے ہے وغیرہ قدیم الفاظ و محاورات کے علاوہ حسب ذیل الفاظ بھی اس فہرست میں شامل تھے !

بارے ۔ (آخر الامر ۔ آخر کار ۔ الغرض) بن ۔ (بغیر)
بھانا ۔ (پسند آنا ۔ خوش آنا) لکھنؤ میں صرف عورتوں کی زبان پر ہے ۔
بھیتر ۔ (اندر) پر ۔ (لیکن)
پنھانا ۔ (پہنانا) تلک ۔ (تک)
جان ۔ " یہ لفظ پہلے مذکر استعمال ہوتا تھا لیکن اب بالاتفاق مونث ہے "
جانی ۔ " یہ لفظ اب فصحا استعمال نہیں کرتے ۔ متقدمین کے کلام میں موجود ہے مثلاً
لڑکپن میں یہ ضد ہے جانی تمہاری ابھی دیکھنی ہے جوانی تمہاری (نسیم دہلوی)
لکھنؤ میں ابا جانی ۔ اما جانی کی ترکیب سے عورتوں کی زبان پر ہے "
جوبن ۔ (بہ معنی پستان متروک ۔ بہ معنی حسن و جمال مستعمل ہے)
چکھا ۔ (بہ تشدید کاف فصیح ہے)
حشر ۔ (میر نے مونث کہا ہے لیکن اب بالاتفاق مونث ہے)
حلال خوری ۔ حلال خورنی ۔ (اب لکھنؤ میں حلال خورن بولتے ہیں)
دھرنا ۔ (رکھنا) ڈھیل ۔ (تاخیر)
رکھا ۔ (بہ تشدید کاف فصحا کے استعمال میں ہے) سدا ۔ (ہمیشہ)
سر ۔ (بالفتح کی جگہ بالکسر یعنی "سِر" فصحا کی زبانوں پر ہے)
سلانا ۔ (سلوانا) فی الواقعی ۔ (فی الواقع)
کفارہ ۔ (بہ تشدید حرف دوم صحیح ہے)
ناگوارا ۔ (ناگوار) یہ ہی ۔ (یہی)

متروک الفاظ کی طویل فہرست کے علاوہ چند ضروری قاعدے بھی مقدمہ میں درج تھے ۔ مثلاً
(۱) ہندی الفاظ کی جمع الف نون سے قطعاً متروک ۔ فارسی الفاظ کی جمع الف نون سے صفت یا اضافت کی حالت میں مستعمل ہے ۔

(۲) جب ترکیب فارسی ہو جیسے تارج فرمان، تو آخر لفظ کی نون کو باعلان پڑھنا متروک ہے۔
(۳) جو لفظ خود جمع ہے اُس کی جمع بقاعدۂ اُردو بنانا جائز ہے جیسے احباب و اغیار کی جمع احبابوں و اغیاروں۔
(۴) لفظ ہر کو جمع کے ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ "ہر علما نے کہا" غلط ہے۔ "ہر عالم نے کہا" صحیح ہے۔
(۵) جو شخص مر گیا ہو اُس کے نام کے ساتھ صاحب کا لفظ لگانا معیوب ہے۔ لقب کے ساتھ مضائقہ نہیں۔
(۶) "لانا" اور "سمجھنا" مصادر کے فاعل کے ساتھ لفظ نے کا نہ لانا فصیح ہے مثلاً میں یہ رسالہ لایا۔ میں سمجھا۔ وہ کتاب لائی۔ وہ سمجھی۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

خدا خدا کر کے نومبر ۱۹۱۱ء میں حصہ اول کی طباعت سے فراغت ہوئی اور دسمبر ۱۹۱۱ء میں یہ جلد شائقین کے ہاتھوں تک پہونچی۔ اس جلد میں صرف الف اور ب کے الفاظ و محاورات تھے۔
حرف الف کے الفاظ امیر اللغات سے اخذ کیے گئے تھے لیکن بہت سے الفاظ و محاورات جو امیر اللغات میں سہواً رہ گئے تھے نور اللغات میں اضافہ کیے گئے۔ مثلاً

آب زلال۔ آب کوثر سے زبان دھو ڈالنا
آبگیر۔ (تالاب) میر نے کہا ہے۔
اپنے روتے ہی روتے صحرا میں گوشے گوشے میں آبگیر ہوئے
آتشدان۔ (انگیٹھی) آسودگی۔ (راحت آرام۔ خوشحالی۔ سیری)
آشفتگی۔ (پریشانی)
آنچل پکنا۔ (عورتوں کی زبان میں چھاتی میں زخم ہونے کو کہتے ہیں)
آندھی روگ۔ (چلتے چلتے تھک جانے کی جگہ)
آنی جانی چیز۔ (ناپائدار) آوارگی۔ (شہدپن)
ادھ کٹی۔ (ناتمام۔ ناقص)۔ شاد
ادھ کٹی کہہ کر نہ چھوڑ دو نیم جاں بات کا انسان پورا چاہیے
اندھیر کھاتا۔ (سخت بدمعاملگی۔ بے ایمانی) داغ۔ وہاں انصاف پھر کیا ہو جہاں اندھیر کھاتا ہو۔
(مختصر۔ حرف الف کے الفاظ و محاورات میں امیر اللغات سے بہت اضافہ تھا اور حرف الف

کے لئے جو کدوکاوش مولانا نے کی اُس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس مقام پر تین لفظ اور نقل کئے جاتے ہیں :-

(۱) بوالہوس ۔ بعض فرہنگ نویسوں کی رائے ہے کہ ہوس فارسی ہے اس پر الف لام تعریف کا لانا صحیح نہیں ہے۔ لہذا اس لفظ کو بل (بہ معنی بہت) اور ہوس (بہ معنی آرزو) سے مرکب سمجھنا چاہیئے۔ لغات عربی میں ہوس بہ معنی جنون اور دیوانہ ہونے کے ہے۔ اُردو میں بوالہوس کے معنی "نہایت آرزومند" "بڑا حریص" "بہت ہوس رکھنے والا" "خواہش نفسانی کا پابند" ہیں۔

(۲) بادیہ۔ تانبے کا بڑا پیالہ یا کٹورا۔ (جان صاحب)

جنگل میں گھومے بادیہ لائے نہ آج تک کہتے تھے مل کے شہر میں دیں گے جام ہم

مولف نفائس اللغات نے "بادیان" لکھا ہے۔ ترکی میں بڑے پیالے کو "بادیہ" کہتے ہیں۔

(۳) بگولا۔ چکر کھاتی ہوئی ہوا۔ بونڈرلا۔ اکثر شعرا نے بگولے اور ببولے کو بہ معنی "گردباد" کہا ہے لیکن مولف کی رائے میں "بگولا" بہ معنی گردباد اور "ببولا" بہ معنی حباب ہے۔ "ببولا" لفظ "باد" بہ معنی ہوا اور "بُلا" بہ معنی حباب سے مرکب ہے لہذا اس کا استعمال بہ معنی گردباد صحیح نہیں ہے۔ بہ معنی حباب صحیح ہے۔

یہ ریویو نا تمام رہے گا اگر اس مقام پر اُن ضروری قواعد کا حوالہ نہ دیا جائے جو مولانا نے امالے کی بابت تحریر فرمائے۔ اصطلاح میں "امالہ" کے معنی ہیں "ہائے ہوز یا الف مقصورہ کو جو الفاظ کے آخر میں پڑیں یائے مجہول سے بدل دینا" جیسے بندہ سے بندے۔ تذکرہ سے تذکرے اُردو میں یہ "امالہ" صرف جمع کی حالت میں یا حرف ربط[۱] کے ساتھ استعمال ہونے کی حالت میں ہوتا ہے۔ اور صحیح اُردو لکھنے کے لئے ان اصول سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ جلد اول کے صفحات ۳۵۷ و ۳۵۸ پر یہ سب قاعدے بتفصیل لکھے گئے ہیں۔ مولانا کو خود ان قواعد کے فراہم کرنے پر ناز تھا اور شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ "امالے کے قواعد جو میں نے نور اللغات کی پہلی جلد میں لکھے ہیں دیکھ لو۔"

خلاصہ ان قواعد کا حسب ذیل ہے :-

(۱) عربی اور فارسی الفاظ کا اصلی "الف" کسی صورت میں یائے مجہول سے نہیں بدلتا۔

---

[۱] حروف ربط یہ ہیں:- "سے۔ میں۔ تک۔ پر۔ نے۔ کو۔ کا۔ کے۔ کی"

جیسے دعا۔ قضا۔ جزا وغیرہ کا الف (اس قاعدہ سے "سودا" کا لفظ مستثنےٰ ہے۔ اُس کا "الف" امالہ قبول کرتا ہے)

(۲) عربی الفاظ کی جمع میں امالہ جائز نہیں جیسے طلبہ۔ اشقیا۔ انبیا۔ اولیا۔ علما وغیرہ۔

(۳) اسم فاعل اور اسم مفعول میں تصرف جائز نہیں جیسے دانا۔ بینا۔ شنیدہ۔ مرتضےٰ وغیرہ (اس قاعدہ سے "مُردہ" مستثنےٰ ہے)۔

(۴) جن عربی الفاظ کے آخر میں الف مقصورہ ہوتا ہے کوئی تصرف نہیں قبول کرتے جیسے طوبیٰ۔ اعلیٰ۔ ادنیٰ وغیرہ (اس قاعدہ سے۔ دعویٰ۔ شکویٰ۔ بلویٰ۔ تقویٰ مستثنےٰ ہیں۔

(۵) عربی الفاظ جن کے آخر میں ہائے ہوز پڑھی جاتی ہے امالہ قبول کرتے ہیں جیسے تذکرہ۔ جلسہ۔ فدیہ وغیرہ۔

(۶) جن الفاظ کے آخر میں "عین" ہوتا ہے حرف ربط آنے سے حرف ما قبل عین کو کسرہ دیتے ہیں جیسے مصرَع سے مصرِع۔ مطبَع سے مطبِع۔

جمع کی حالت میں یائے مجہول اضافہ کرکے اور عین کو تلفظ سے ساقط کرکے بولتے ہیں جیسے مصرعے۔ مقطعے وغیرہ۔

(۷) آدمیوں اور شہروں کے ناموں میں امالہ جائز نہیں بعض حضرات کی رائے ہے کہ کلکتہ آگرہ وغیرہ کو جب (ی) کی آواز سے بولیں تو اسی طرح لکھیں بھی۔ جیسے "تم کلکتے گئے" "ہم آگرے آئے" لیکن جمہور اس کے خلاف ہیں۔

(۸) ہندی اور اُردو کے اسماء و صفات جن کے آخر میں الف ہوتا ہے یائے مجہول سے بدلے لکھے جاتے ہیں جیسے بھلا۔ اچھا۔ نیلا۔ پیلا وغیرہ (اس قاعدہ سے سوا۔ پردا۔ پچھوا۔ مستثنےٰ ہیں)۔

(۹) اُردو کے تمام مصادر میں حرف ربط کے ساتھ امالہ ہوتا ہے لیکن جمع کی حالت میں نہیں ہوتا۔

نوراللغات کی پہلی جلد بصرف زر کثیر شائع ہوئی لیکن دوسری جلد چھپوانے کے لیے سرمایہ نہ تھا اوقات فرصت لغت کی تدوین میں بدستور صرف کرتے تھے مگر طے کر لیا تھا کہ دوسری جلد اُس وقت تک پریس کو نہ دی جائے گی جب تک کہ جلد اول کی اس قدر کاپیاں فروخت نہ ہو جائیں کہ اخراجات طباعت جلد ثانی اُس رقم سے ادا ہو سکیں۔ مندرجہ ذیل خط اسی زمانہ کی یادگار ہے:۔

"دعا و سلام۔ خط آیا۔ تم کو معلوم نہیں کہ میں کس طرح کام کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہوں۔ لغت کی تکمیل کوئی معمولی بات نہیں اُس کے علاوہ ایک کام عدالت کا بھی ہے۔ بڑا حصہ وقت کا لغت میں

صرف ہوجاتا ہے بقیہ حصہ میں سے دو تین گھنٹے عدالت کے کام کے ہیں۔ انصاف کرو کہ اب وقت کہاں ہے جو اور کوئی کام چھیڑا جائے۔ لغت کا کام اب اتنا ہوگیا ہے کہ اُس کے ترک کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اگر موقع ملا تو بعد تکمیل لغت کے نعت میں وقت صرف کرنے کا قصد ہے انشاء اللہ۔ نور اللغات چار جلدوں میں شائع ہوگی۔ دوسری جلد کی طباعت اس انتظار میں ملتوی ہے کہ از غیب کوئی سامان ہوجائے۔ دیکھئے اس کی نوبت کب آتی ہے۔

گرمی کی وہ شدت ہے کہ یاران فراموش کردند عشق " نورالحسن

۴ جون ۲۵ء

۱۹۲۵ء ختم ہوگیا اور جلد دوم کی طباعت شروع نہ ہوسکی۔ ۳ جنوری ۲۶ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

" نور اللغات کے پہلے حصہ میں جو مصارف پڑے اُن کو خیال کرکے دوسری جلد چھپوانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالے مسبب الاسباب ہے، غیب سے کوئی سامان ہوجائے تو یہ کتاب چھپ جائے ورنہ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ "

نور اللغات جلد دوم | خداوند کارساز نے کتاب کی اشاعت کی یہ صورت پیدا کی کہ ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے گورنر سر ولیم میرس کی توجہ زبان اُردو کی ترقی کی طرف مبذول ہوئی۔ وزیر تعلیمات اور ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے مشورہ سے اُنھوں نے نور اللغات کی سرپرستی کی۔ منجانب حکومت سو کاپیاں خریدکیں اور دو ہزار روپیہ سالانہ تین برس کے لئے بطور زر امداد منظور فرمایا۔

محکمہ تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ میں اعانت کی سفارش کی۔ ریاستہائے میسور و حیدرآباد نے کتب خانوں کے لئے نور اللغات کو موزوں تجویز کیا۔ بعض ڈسٹرکٹ بورڈوں نے مدرسوں کے لئے اس کی جلدیں خریدکیں اور ملک کے ہر گوشہ سے کتاب کی طلب ہونے لگی۔

مولانا نے امداد غیبی کا شکر ادا کیا اور حکومت سے دو ہزار روپیہ کی پہلی قسط پاتے ہی کاغذ خرید کرکے دوسری جلد کی طباعت شروع کرادی۔ مئی ۱۹۲۶ء میں امداد کی منظوری آئی اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں دوسری جلد تیار ہوگئی۔

اس جلد میں پ لغایت ع کے الفاظ و محاورات تھے۔ تحقیق و تدقیق کا یہاں بھی وہی عالم تھا جس کی جھلک جلد اول کی تقریظ میں دکھائی گئی ہے۔ نمونہ کے لئے تین لفظ نقل کئے جاتے ہیں:۔

(۱) پچھوانا۔ یہ " پوچھنا " کا متعدی المتعدی ہے۔ اس کا املا بغیر " وا " کے ہے یعنی " پوچھوانا "

غلط ہے۔"پچھوانا" صحیح ہے۔

(۲) تماچا۔ یہ لفظ تاے فوقانی سے لکھنا چاہیے۔ طپانچہ لکھنا غلط ہے کیونکہ یہ لفظ فارسی ہے

(۳) تماکو۔ یہ لفظ امریکہ کی زبان میں "ٹوبے کو" تھا۔ اس کا رواج جلال الدین اکبر کے وقت میں اول اول دکن میں پھر تمام ہند میں ہوا۔ لکھنؤ کی بیگمات پینے کا ہو تو "تماکو" اور پان میں کھانے کا ہو تو "تمباکو" کہتی ہیں۔ دہلی والے پینے کا ہو تو "تمباکو" اور کھانے کا ہو تو "زردہ" کہتے ہیں۔ اہل فارس "تنباکو" لکھتے ہیں۔

اُردو کانفرنس کی صدارت | جلد دوم ہنوز مطبع سے باہر نہ نکلی تھی کہ آل انڈیا اُردو کانفرنس کا اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ۲۶، ۲۷ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو بہ مقام دہلی منعقد ہوا اور مولانا اس جلسہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اجلاس سے صرف پانچ روز بیشتر مولانا کو اطلاع ملی۔ شکریہ کے بعد اس عزت کے قبول کرنے سے انکار کرنا چاہا لیکن بعض عزیزوں اور شاگردوں کے اصرار سے راضی ہوئے۔ خطبہ صدارت مرتب کرنے کا وقت نہ تھا۔ بہ عجلت تمام چند اوراق لکھے اتفاق سے روانگی کے وقت اسٹیشن پہونچنے میں دیر ہوئی۔ جیسے ہی گاڑی میں قدم رکھا ریل چھوٹ گئی اور ملازم مع سامان واسباب کے رہ گیا۔ رات کے وقت دہلی پہونچے۔ جاڑوں کا موسم اور سامان سرمائی ہمراہ نہیں۔ کارکنان کانفرنس نے اسباب راحت فراہم کیا۔ صبح کو اجلاس تھا۔ چند اوراق مولانا کی جیب میں تھے جن میں بعض الفاظ کی تحقیق و تشریح تھی انھیں کو اضافہ اور ترمیم کے بعد کانفرنس میں پڑھا۔ اہل بزم نے نہایت قدر کی۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے سہ ماہی رسالہ "سہیل" نے دسمبر ۲۶ء کے "شمارہ" میں اسی مضمون کو "خطبہ صدارت کے" عنوان سے شائع کیا اور "شذرات" میں نوٹ لکھا کہ "مولانا نورالحسن صاحب نیر بی اے ال ال بی مولف نوراللغات کو فرائض صدارت سے عہدہ برآ ہونے کا بہت کم وقت ملا۔ تاہم خطبہ صدارت عام طور پر نہایت مقبول ہوا۔ ہم جملہ اراکین کی طرف سے ممدوح کے شکر گذار ہیں"!

مشاعرے | مقامی حکومت کی امداد نے مولوی نورالحسن کو طباعت لغت کے اخراجات سے ایک حد تک بے فکر کر دیا۔ دو جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور فروخت ہو رہی تھیں۔ تیسری اور چوتھی جلد کی تدوین ہو چکی تھی صرف نظر ثانی کی احتیاج تھی۔ اسسٹنٹ کلکٹری کی خدمت سپرد تھی۔ دن کا بڑا حصہ اسی کام میں گذرتا تھا۔ کاکوری میں ایک انگریزی اسکول مدت سے قائم تھا اب اس کی نگرانی مولانا نے اپنے ذمہ لی اور روزانہ کچھ وقت اُس کے انتظامات کی درستی میں صرف کرتے تھے۔ ندوۃ العلما کی مجلس انتظامیہ

شرکت کے لئے گاہ گاہ لکھنؤ جاتے تھے۔ اعزہ اور ارباب برادری کی باہمی نزاعات کا تصفیہ اگر ان کے سپرد کیا جاتا تو بدل وجان کوشش اور پیروی کرتے تھے۔ شعر و سخن سے ذوق ترقی پر تھا۔ نوجوانان وطن میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلا مشاعرہ ۵ رجولائی ۱۹۲۷ء کو ہوا۔ منشی نورالدین احمد کیفی جو منشی محمد رضا صبر کاکوروی کے شاگرد اور نہایت کہنہ مشق لطیف البیان بذلہ سنج شاعر تھے اُس وقت تک بقید حیات تھے انھوں نے بھی مشاعرے کے لئے غزل لکھی۔ چند اشعار بطور نمونہ کے نقل کئے جاتے ہیں :۔

منصور نے کہا تھا انا الحق کہ یار نے ۔۔۔ اک بے گنہ کا خون کیا مفت دار نے
ملے شیخ دیکھ حشر میں عصیاں کا مرتبہ ۔۔۔ پوچھا ہمیں کو رحمت پروردگار نے
پیری میں بھی تو کم نہ ہوا جوش عشق کا ۔۔۔ آیا ہزار ضعف طبیعت کو مار نے
یکتائی کا جواب جو پایا غضب ہوا ۔۔۔ آئینہ چور چور کیا رشک یار نے
وعدہ خلاف تجھ کو مبارک ہو خواب ناز ۔۔۔ کیفی کی نیند کھوئی ترے انتظار نے

اُستاد کی غزل سنئے :۔

اب کے نیا شگوفہ کھلایا بہار نے ۔۔۔ ہم دل ہی چیز سے چلے صدقے اُتار نے
پہلے یہ رنگ روپ نہ تھا یہ ادا نہ تھی ۔۔۔ آئینہ کو بنا دیا تصویر یار نے
شکوہ ہے دل سے اور کا کیوں نام لیجئے ۔۔۔ دھوکا دیا ہے ہم کو اسی راز دار نے
ارماں زمانہ بھر کے نکالے تو کیا کیا ۔۔۔ حسرت نہ میری دل کی نکالی بہار نے

۲۸ راگست ۱۹۱۸ء کو دوسرا مشاعرہ ہوا۔ کیفی کی غزل تھی :۔

جوش شباب کی ہے تڑپ حسن یار میں ۔۔۔ جلوہ ہے آفتاب کا نصف النہار میں
آئیں جو جھوم جھوم کے گلشن میں بدلیاں ۔۔۔ رندوں کی توبہ اُڑ گئی باد بہار میں

سلہ ولادت۔ محرم ۱۲۹۹ھ۔ وفات ۲۷ر ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ (مطابق ۱۸ر مئی ۱۹۲۸ء)

ده شیخ ظہورالدین احمد علوی المتخلص بہ ظہور شاگرد شیخ عبدالرؤف شعور کے صاحبزادے تھے۔ کچھ عرصہ تک پولس میں ملازم رہے بعد ازاں وسط ہند میں مدت تک سررشتہ دار مجسٹریٹی رہے۔ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ شعر و سخن کا ذخیرہ ایک لاکھ بیت سے زائد ہے۔ دو مرتب دیوان موجود ہیں۔ نثر بھی خوب لکھتے تھے ایک داستان "نو نگار" بطرز بوستان خیال لکھنا شروع کی تھی اور ۲۴ جلدیں تحریر فرما چکے تھے کہ پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

اس ضبط کا بُرا ہو کہ آہیں ہیں مضطرب　　نالے تڑپ رہے ہیں دل بیقرار میں
رکھو نہ حشر پر مرے شکووں کا فیصلہ　　کیا بات رہ گئی جو کھلا مُنھ ہزار میں
کیفی یہی ہے آبلہ پائی کی آرزو　　دو دو ہزار نوک ہوں اک ایک خار میں

اُستاد نے فرمایا:—

اس طرح گل کھلے ہیں دل داغدار میں　　تارے چھٹک رہے ہیں شب تیرہ تار میں
زاہد کی ہم تو ایک نہ مانیں ہزار میں　　توبہ کسی نے کی بھی ہے فصل بہار میں
گردش سے تیری چشم کے حیراں ہوئے فروش　　اب کوئی پوچھتا نہیں فصل بہار میں
یارب ہمارے دل کو بنا دے سدا بہار　　یکساں ہرا بھرا ہو خزان و بہار میں
فتنے جو بچ رہے تھے تری چال ڈھا رہے　　وہ آگئے ہیں گردش لیل و نہار میں

۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو تیسرا مشاعرہ ہوا۔ کیفی کی غزل تھی:—

خدا بچائے ہے نازک معاملہ دل کا　　پڑا ہے سنگدلوں سے مقابلہ دل کا
ہجوم حسرت و حرماں ہے ساتھ لاشے کے　　چلا ہے شہر خموشاں کو قافلہ دل کا
کبھی ہے چشم عنایت کبھی نگاہ عتاب　　بڑھا بڑھا کے گھٹاتے ہیں حوصلہ دل کا
ذرا سی پی کے بہت مستیاں ہیں کیفی کی　　تجھے خراب کرے گا یہ ولولہ دل کا

اُستاد نے فرمایا:—

الٰہی کس طرح چھوڑوں میں شکوہ جور قاتل کا　　کہے دیتے کہ بھی اک رہ گیا ہے مشغلہ دل کا
جوانی اب کہاں ہاں کچھ کچھ اُس کے داغ باقی ہیں　　مہک سی رہ گئی ہے پھول تو مُرجھا گیا دل کا
چھپانے سے مرے راز محبت چھپ نہیں سکتا　　لکھا ہے لوح پیشانی پہ گویا مدعا دل کا
الٰہی مجھ کو ناکامی سے مایوسی نہیں ہوتی　　تری رحمت سے اتنا بڑھ گیا ہے حوصلہ دل کا
ترے دربار میں نیّر کو رہنے کی اجازت ہو　　یہی ہے آرزو دل کی یہی ہے حوصلہ دل کا

اسی زمانہ میں مولانا نے ایک جدید مکان محلہ کھٹل تلہ میں خرید کیا۔ محلسرا کی مرمت کرائی۔ احاطہ میں باغ لگایا اور ۱۹۲۸ء سے وہیں سکونت اختیار کی۔ ۳۱ر اگست ۱۹۲۸ء کے خط میں منشی مقبول علی کو لکھتے ہیں:—

"دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے　　بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

تمھارے محبت بھرے انداز تحریر نے نشتر کا کام کیا۔ پچھلا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اللہ اللہ

کیا زمانہ تھا اور کیا سچی محبتیں تھیں۔

میں جس مکان میں بیٹھا ہوا یہ تحریر لکھ رہا ہوں وہ جدید مکان ہے جس کو تم لڑکپن میں "پھاٹک بند" کہا کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء تک یہ کھنڈر تھا۔ بحمد اللہ اب پر فضا مقام ہے۔ زنانہ مکان قریب قریب مکمل ہو گیا ہے۔ مردانے میں ایک خس پوش بنگلہ ہے جس کے پچھم میں پائیں باغ ہے مرتع موتیے سے رخت لگے ہیں۔ مقبول کا خیال بارہا آیا اور اشتیاق ملاقات میں آنکھیں نم ہو گئیں پھر جی ہلا لیا۔ کل امی مرحومہ بادفا تھا سے کچھ تسکین ہو گئی۔ نور اللغات کی تیسری جلد چھپ رہی ہے۔ بمبئی سے نور اللغات کی کاپیاں طلب ہوئی ہیں۔ دور پہونچی ہے اپنی رسوائی۔ والسلام"

اسی سلسلہ میں مندرجہ ذیل خط بھی پڑھنا چاہئے :۔

"میں نے ایک بنگلہ مردانے مکان میں بنا لیا تھا وہ امسال مارچ کی آندھی میں اڑ گیا۔ اس وقت میں مع نامحسن کے اسی بنگلہ میں تھا۔ خدا تعالی نے اپنے خاص فضل و رحمت کا نمونہ دکھایا اور ہم دونوں کو ضرر سے محفوظ رکھا۔ الحمد للہ یا رہ سیتہ ستون منہدم ہو گئے۔

نور اللغات جلد سوم ہنوز دفتری کے پاس ہے۔ جز بندی نہیں ہو چکی ہے۔ جس وقت آئے گی تم کو بھیجوں گا انشاء اللہ۔ نور الحسن۔ ۲۵ مارچ ۱۹۲۹ء"

خان بہادر منشی تاج الدین جج المتخلص بہ جذب شاگرد منشی محمد رضا صبر کاکوروی کے باکمال صاحبزادے منشی معراج الدین اس زمانہ میں کاکوری میں رونق افروز تھے۔ وہ حافظ جلیل حسن جلیل تلمیذ امیر مینائی کے شاگرد تھے اور خسرو تخلص کرتے تھے۔ مدت تک ریاست حیدر آباد میں مناصب اعلیٰ پر سرفراز رہے۔ "نواب حسین نواز جنگ" خطاب پایا۔ بڑے عالی ہمت۔ سیر چشم۔ طباع اور ذہین تھے۔ ملازمت سے کنارہ کش ہو کر وطن میں سکونت پذیر ہوئے۔ شعر و سخن سے موزونی ذوق موسیقی سے عشق تھا۔ حال و قال کی محفلوں میں حاضر ہوتے اور آستانۂ کاظمیہ کے خدام پر جان و دل نثار کرتے تھے۔ الفت آل نبی سے سرشار تھے۔ سیکڑوں سلام اور مرثیے تصنیف کئے۔ آخری زمانہ کا شعر ہے۔

ناز خسرو کو محبت پہ ہے طاعت پہ نہیں ۔۔۔ روٹھا بیٹھا ہے اسے آ کے منائیں شبیر

سلہ ولادت ۲۹ شعبان ۱۲۶۰ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۴۳ء روز پنجشنبہ۔

وفات ۱۹ محرم ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء روز پنجشنبہ۔

عشق و محبت کی روداد نظم کرتے اور عاشقانہ غزلیں خوب کہتے تھے۔ اُن کی شرکت مشاعروں میں رونق ہوتی تھی اور سخن فہم کلام کی داد دیتے تھے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۸ء کو اپنے دولتکدہ پر ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ طرح تھی۔ گذرتی ہے شب فرقت میں کیونکر آپ کیا جانیں۔

فرماتے ہیں :۔

ستم کہتے ہیں کس کو بندہ پرور آپ کیا جانیں
بگڑ کر مجھ سے بن بیٹھے ستمگر آپ کیا جانیں

خمار آلودہ آنکھوں سے نگاہیں جو نکلتی ہیں
پلاتی ہیں مجھے ساغر پہ ساغر آپ کیا جانیں

عجب انداز کی چھل بل ہے جو فتنے جگاتی ہے
قیامت بن گئی شوخی سمٹ کر آپ کیا جانیں

حسیں ہیں نازنیں ہیں مہ جبیں ہیں بھولے بھالے ہیں
لگاوٹ عشق کی ! اللہ اکبر آپ کیا جانیں

یہ کیا انداز ہے کس کس کی دیکھیں موت آتی ہے
قیامت کر رہے ہیں آج تیور آپ کیا جانیں

مولوی نور الحسن تجلی مشاعرے میں شریک تھے۔ اُن کی طبع آزمائی ملاحظہ کیجئے :۔

کوئی شے چبھ رہی ہے دل کے اندر آپ کیا جانیں
یہی ہے درد الفت بندہ پرور آپ کیا جانیں

خدا رکھے سلامت آپ کی اس تیکھی چتون کو
بھری محفل میں دل لیتی ہے کیونکر آپ کیا جانیں

یہ عاشق دل دیا کرتے ہیں پہلے جان اس کے بعد
ہماری مانئے۔ ایسا ہوا کرتا ہے اکثر آپ کیا جانیں

یہ سچ ہے مرنے والے اپنی موت مرتے ہیں
ہے کس کا نام قاتل اور ستمگر آپ کیا جانیں

یہ دل کی پھانس ہے ظالم ذرا چھیڑا تو کھٹکے گی
نکل جائے گی آپ ہی جان لے کر آپ کیا جانیں

اس مشاعرے سے چار روز پہلے انجمن اخوان الصفا کاکوری سے ایک بزم شعرا منعقد کی تھی اور اس کے لئے بھی استاد نے غزل لکھی تھی۔ چند اشعار اس کے بھی سُنئے :۔

جذب الفت کھینچ کر کوچے میں تیرے لے گیا
تھی مقدر اس بہانے سے قضا میرے لئے

توبہ توبہ میں بھی کچھ تھا لیکن اب تو کچھ نہیں
ہو گئی کیا پھر دنیا کی ہوا میرے لئے

پھرتے ہی تیری نگہ کے اک زمانہ پھر گیا
ایک ہے ہیں بے وفا اور باوفا میرے لئے

پہلے اے زاہد تو اُس کافر صنم سے دل لگا
پھر ذرا تجویز کر یاد خدا میرے لئے

رفتہ رفتہ آرزوئیں ساتھ سے رخصت ہوئیں
رہ گیا باقی دل بے مدعا میرے لئے

خسرو بھی شریک محفل تھے۔ ارشاد فرمایا تھا :۔

رد کش آئینہ اپنی طبع موزوں ہو گئی
جام جم ہے۔ بزم اخوان الصفا میرے لئے

منشی اعجاز حسین اعجاز کاکوروی کا اسم گرامی پچھلے اوراق میں کسی جگہ آ چکا ہے وہ مدت

ترک وطن کئے ہوئے ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے۔ پچیس برس کی مفقود الخبری کے بعد گھر یاد آیا اور ۱۹۲۶ء میں ایک مثنوی "یاد وطن" نام تصنیف کرکے مولوی نورالحسن کی خدمت میں اسقام و اغلاط دور کرنے کے لئے روانہ کی۔ استاد نے شرف اصلاح سے مزین فرمایا۔ دو شعر راقم کو یاد ہیں:—

ٹھوکریں کھاؤں پر وطن میں رہوں　　کانٹے چنتا ہوا چمن میں رہوں
اُن بزرگوں کا رنگ روپ نہیں　　اب وہ سورج نہیں وہ دھوپ نہیں

مئی ۱۹۳۱ء میں کاکوری تشریف لائے۔ اُن کی دلچسپی کے لئے بزم مشاعرہ منعقد کی گئی۔ طرح تھی "یہ نازک وقت ہے تم بال بکھرائے کہاں آئے"۔
منشی احتشام علی صاحب کی عالی شان کوٹھی میں محفل تھی۔ رؤسا قصبہ موجود تھے۔ منشی صاحب نے پہلے ایک غیر طرح غزل ہم وطنوں کو سنائی اور در و دیوار سے آفریں و مرحبا کی صدائے بازگشت سنی۔ چند اشعار اس غزل کے نقل کئے جاتے ہیں:—

نہال سبز ہوں پر زینت صحرائے غربت ہوں　　نہ پہونچے جو گلستاں تک میں ایسے گل کی نگہت ہوں
ہے دل افسردہ میرا گو شریک بزم عشرت ہوں　　ہنسی رونے سے بدتر ہے کہ میں زخموں کی صورت ہوں
زرا یوسف کی میرے مجھ کو بوئے پیرہن لا دے　　مثال پیر کنعاں اے صبا مشتاق عترت ہوں
قفس کی تیلیاں مانع نہیں میری رہائی میں　　کہ میں پرواز میں بیمار کے چہرے کی رنگت ہوں
نہ کیوں ہر اک نفس ہو رشک عیسیٰ نام ہے میرا　　کہ میں اعجاز ہوں اُن کی مسیحائی کی زینت ہوں

اس کے بعد طرح کی غزل پڑھی جس کو اُستاد کی اصلاح کا شرف حاصل تھا:—

مقید جسم کی صورت میں، ہو کر مثل جاں آئے　　تعجب اپنی ہستی پر ہے ہم کو ہم کہاں آئے
جسے کہتے ہیں دنیا اصل میں کلفت کی بستی ہے　　ملا کب چین اُن کو جو کہ زیر آسماں آئے
مبارک شیخ صاحب تم کو کعبہ۔ کیوں بگڑتے ہو　　سمجھ کر بتکدہ۔ آوارہ کوئے بتاں آئے
کہیں کیا۔ کس طرح سے خانہ ویراں چمن سے ملے　　برنگ بوئے گل نکلے تھے اور مثل خزاں آئے
گراں اعجاز کا شیون نہ کیوں ہو ہم صفیروں کو　　نہ اس کا سا بیاں آئے نہ اُس کی سی زباں آئے

مولوی نورالحسن نے سخنوروں کی محفل میں حسب ذیل غزل سنائی اور اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھایا:—

اُڑاتے دھجیاں آئے رگڑتے ایڑیاں آئے　　ترے نام و نشاں سے جان دینے نیم جاں آئے

تری سرکار میں ہم چھوڑ کر دونوں جہاں آئے
مکاں سے جب ہوا ترک تعلق لامکاں آئے

جوانی تک امنگیں ہیں ترنگیں ہیں بہاریں ہیں
گھڑی ساعت کو رخصت ہونے سارے میہماں آئے

یہ گردش ہے مقدر کی یہ چکر ہے نصیبے کا
خدا جانے کہاں ہم جانے والے تھے کہاں آئے

عجب وارفتگی ہے جب سے اپنا خانماں چھوٹا
ہمیں کیا گر چمن میں اب بہار آئے خزاں آئے

کسی جلوے کا شرمندہ ہمارا راز ہستی ہے
بس اتنا بھی نہیں سمجھے بڑے تم راز داں آئے

نہ اترا و یہ دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے نیر
خدا معلوم ہرجائی کہاں جائے کہاں آئے

نور اللغات کی تکمیل | نور اللغات کی تیسری جلد جون ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں حرف دال سے قاف تک الفاظ و محاورات تھے۔ تحقیق و تدقیق کا یہاں بھی وہی حال تھا جس کا تذکرہ ابتدائی دو جلدوں کے ریویو میں کیا جا چکا ہے۔ جانشین امیر مینائی حافظ جلیل حسن جلیل نے ایک منظوم تقریظ لکھی جس کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

نیر کا لغت ہے کان اردو
معیار زر زبان اردو

کیا نور فشاں ہے چشم بددور
آنکھیں جسے دیکھ کر ہوں پُرنور

ہر لفظ کی ہر لغت کی تحقیق
ہر قول کی ہر مثل کی توثیق

نکلے ہیں جو اس کے تین حصے
سرپارے ہیں وہ کتاب دل کے

تکمیل ہو اس کی جب مزا ہے
ہمت ہے اگر تو بات کیا ہے

اب کہئے جلیل طبع کا سال
او صاف کتاب پر جو ہے دال

تاریخ یگانہ ہے تو یہ ہے
اردو کا خزانہ ہے تو یہ ہے

اس جلد کی اشاعت کے بعد مولوی حامد حسن نیر پریس کی منیجری سے دستکش ہو کر تلاش ملازمت میں اورنگ آباد چلے گئے اور مطبع بند کر دیا گیا۔ لغت کی چوتھی جلد طباعت کے لئے "اشاعت العلوم فرنگی محل" کے سپرد کی گئی اور جنوری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ مولانا نے پندرہ برس پہلے جس عظیم الشان خدمت کا بیڑہ اُٹھایا تھا اور جس کا سرانجام تجربہ کار واقفان فن اُس وقت محال بتاتے تھے اُن کی ہمت و استقلال سے بحسن و خوبی تکمیل کو پہنچی۔ ابتدا میں وکالت کی فتنہ کاریاں اور بعدازاں اسسٹنٹ کلکٹری کی ذمہ داریاں سد راہ ہوئیں۔ خانگی فکروں۔ ناگہانی آفتوں۔ مالی مشکلوں نے کانٹوں میں اُلجھایا۔ صحت جسمانی بگڑی۔ اعضائے رئیسہ نے جواب دیا لیکن مولانا کی عالی ہمتی۔ جفاکشی اور استواری عزم کے سامنے ہر مشکل آسان۔ ہر آفت عافیت ہر زحمت رحمت تھی۔

جو خدمت ایک انجمن ایک جماعت کے لئے دشوار ہوتی وہ انھوں نے تنہا بے امداد غیرے انجام دی۔ کانٹے ہٹا کر مقصد کے پھول چنے۔ بالو کے ٹیلے سے آب شیریں کا چشمہ نکالا اور اردو کا وہ جامع لغت مرتب کر دیا جس کی تہذیب و تکمیل کا ارمان اساتذہ سابقین پورا نہ کر پائے تھے اور حسرت کا داغ دل میں لے کر ہمانسرائے دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

نفائس اللغات اور خزینۃ اللغات کے مختصر و ناکافی ہونے کا تذکرہ اس مضمون کے ابتدائی اوراق میں آچکا ہے۔ رشک لکھنوی کا لغت تقویم پارینہ تھا۔ البتہ انگریزی میں ایک ڈکشنری اردو الفاظ کی موجود تھی جس کو فیلن صاحب نے ۱۸۷۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں صرف الفاظ مع مختصر معانی کے تھے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے ایک لغت "ارمغان دہلی" کے نام سے شروع کیا تھا جو ۱۹۰۸ء میں "فرہنگ آصفیہ" کے نام سے مکمل ہوا۔ اس میں علاوہ الفاظ کے بعض محاورات بھی تھے۔ امیر مینائی اور جلال لکھنوی نے تدوین لغت کی کوشش کی مگر پایہ تکمیل کو نہ پہونچا سکے۔ لہٰذا "امیر اللغات" اور "سرمایۂ تحقیق" کا ذکر فضول ہے۔ ان کے بعد نور اللغات ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوا۔ اس میں الفاظ و محاورات مع اسناد و پہلوے استعمال کے درج تھے۔ اس لازوال خزانۂ زبان کو پیش نظر رکھ کر خواجہ عبدالمجید بی۔ اے نے جامع اللغات لاہور سے شائع کیا اور ۱۹۳۵ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس میں محاورات تقریباً وہی تھے جو نور اللغات میں درج ہو چکے تھے مگر الفاظ کا گنجینہ بہت زائد تھا اور اسناد حذف کر دیے گئے تھے۔

اس فرق مراتب کو ظاہر کرنے کے لئے صرف ایک لفظ پر اکتفا کی جاتی ہے وھو ہذا:۔

(۱) فیلن کی ڈکشنری

ارغواں۔ فارسی۔ اسم مذکر۔ ایک باجا۔

(۲) فرہنگ آصفیہ

ارغوان۔ یونانی۔ اسم مذکر۔ ارگن۔ ارغن۔ ایک قسم کا باجہ ہے جو افلاطون نے ایجاد کیا تھا۔
ارغوانی۔ فارسی۔ صفت۔ کسم کا رنگ۔ لال۔ چہچہاتا۔ نہایت سرخ۔ نارنجی رنگ کو بھی کہتے ہیں۔

(۳) نور اللغات

ارغنوں۔ (فارسی۔ بالفتح اور فتح سوم) مذکر۔ نام ایک باجے کا جس کا موجد افلاطون ہے۔ (آتش)

مجھ صوفی کے جو نعرے سے حال اس کو آگیا مطرب نے ٹکڑے سر سے مرے ارغنوں کیا

ارغوان۔ (فارسی۔ بر وزن پہلوان) مذکر۔ ایک درخت کا نام جس کی ٹہنیاں باریک ہوتی ہیں۔

اور موسم بہار میں پھولوں سے سُرخ ہوجاتا ہے۔ سُرخ رنگ کا پھول۔ مجازاً سُرخ رنگ (مصحفی)
کیوں ہوا مہندی نہ میں بوسے جو لیتا پاؤں کے		ارغواں برسوں اسی حسرت سے خوں رو یا کیا
ارغوانی۔ (فارسی) سُرخ پھول۔ سُرخ رنگ۔ سُرخ۔

(۴) جامع اللغات

ارغنون۔ (فارسی۔ مذکر) ایک باجے کا نام جو کوک دینے سے بجتا ہے۔ خیال ہے کہ اسے افلاطون نے ایجاد کیا تھا۔

ارغوان۔ (فارسی۔ مذکر) ایک پودا جس کے پھل اور پھول نہایت سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔
۲۔ اس پودے کا سُرخ رنگ کا پھول۔ ۳۔ سُرخ رنگ۔

ارغوانی۔ (صفت) سُرخ۔ قرمزی۔

نور اللغات کی تفصیل و تحقیق یقیناً فیلن کی ڈکشنری اور فرہنگ آصفیہ سے زیادہ ہے۔ جامع اللغات توضیح معانی کے اعتبار سے نور اللغات کا خلاصہ ہے لیکن اسناد کے حذف نے اہل زبان کے لئے اس کو ناکافی بنا دیا۔ ارغنون اور ارغوان کے مذکر ہونے کا ثبوت نور اللغات میں موجود ہے لیکن جامع اللغات میں نہیں ہے۔ تاریخی اور جغرافیائی واقفیت کے لئے جامع اللغات بیشک مفید ہے لیکن کسی محاورے کی بحث ہو یا سند مانگی جائے تو جامع اللغات بالکل بیکار ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مجلس میں دو طالب علم یہ بحث کر رہے تھے کہ تکان اور تھکن میں کیا فرق ہے اور تکان مذکر ہے یا مونث۔ پہلے جامع اللغات میں تکان کا لفظ تلاش کیا گیا۔

"تُکان۔ (فارسی مونث) حرکت۔ جنبش۔ ۲۔ اشارہ۔ جھٹکا۔
(ہندی مونث) تھکان کا مخفف۔ تھکاوٹ۔ کسلمندی۔ ہچکولوں کی وجہ سے تھکاوٹ سُستی۔ کاہلی"

اُس کے بعد تھکن تلاش کیا گیا تو اس کی بابت درج تھا "(مونث) تکن۔ ماندگی۔ کوفتگی۔ تکان" اور ایک۔ جدید لفظ تھکان بھی لکھا تھا جس کے معنی تھے "تھکن۔ تکان۔ ماندگی"

اب طالب علم کے لئے کئی سوالات پیدا ہو گئے۔
اول۔ تکان کے مونث ہونے کا کیا ثبوت؟
دوسرے۔ لفظ تھکن صحیح ہے یا تھکان یا تکن؟

تیسرے۔ تکان اور تھکن کے محل استعمال میں کیا فرق ہے؟
مجبوراً نور اللغات کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور وہاں ہر سوال کا جواب مل گیا۔ ملاحظہ ہو
تکان۔ (فارسی۔ ماندگی۔ تکاندن تکانیدن کا حاصل مصدر۔ لپیٹنا جیسے تو شک بتکاں۔ توشک لپیٹ دو۔ ۲۔ جھٹکنا۔ گرد سے صاف کرنا)
مونث۔ اکسلن ری۔ تھکاوٹ۔ اعضاشکنی سستی۔ کاہلی۔ ہچکولوں کا صدمہ (جان صاحب)
اب نہ بہلی پہ میں چڑھوں گی کبھی کیا کہوں کس قدر تکان ہوئی
۲۔ برچھی یا نیزے کو جھٹکا دینا۔ (انیس)
جب یہ للکار کے نیزوں کو تکاں دیتے تھے آہنی ڈھالوں میں سینے وہ چھپا لیتے تھے
تکان تھکن کا فرق۔ تکان وہ خستگی جو کسی متحرک چیز کی حرکت سے بدن میں پیدا ہو۔ یعنے اگر مرکب کی حرکت سے خستگی ہو تو تکان ہے اور اگر صرف سفر کی وجہ سے ہو تو تھکن ہے۔
نور اللغات میں تھکان یا تکن کوئی لفظ نہیں کیونکہ اہل زبان اس اصطلاح سے نا آشنا ہیں البتہ تھکن درج ہے اور اُس کے معانی لکھے ہیں" (مونث) ماندگی۔ کوفتگی۔ (منیر)
دن بھی ہے گرم دھوپ بھی ہے کڑی راہ چلنے کی بھی تھکن ہے بڑی
اسی طرح ایک بار شک پیدا ہوا کہ "عرض" بمعنی درخواست و التماس مذکر ہے یا مونث جامع اللغات نے مونث لکھا ہے لیکن کوئی سند نہیں درج کی۔ نور اللغات میں ہے
"مونث۔ درخواست۔ بیان۔ التماس (کرنا کے ساتھ) اس کے مفعول کے ساتھ "سے" مستعمل ہے۔ فقرہ۔ زید نے بکر سے عرض کی۔ (انیس)
اک دن رسول حق سے کسی نے یہ عرض کی ارشاد آپ کیجئے کچھ رتبۂ علی
منیر نے مذکر بھی کہا ہے ؎
ملبوس خلاف وضع کے شکوہ میں کچھ عرض کیا تو پائنچے تنگ ہوئے
ایک دیوبند کے تعلیم یافتہ نیم ملا نے راقم سے سوال کیا کہ "دودھ پینا" فصیح ہے یا "دودھ کھانا" جامع اللغات کی ورق گردانی کی۔ اُس میں "دودھ کھانا" کوئی محاورہ نہ ملا "دودھ پینا" کی بابت درج تھا" (لازم) دودھ نوش کرنا۔ ۲۔ بچے کا دودھ چوسنا"
نور اللغات سے استفادہ کیا تو جواب مل گیا۔
" دودھ پینا۔ شیر نوشیدن کا ترجمہ۔ (آتش)

ساقی معاف رکھ مجھے ساغرکشی سے تو　　　مے کیا ہے وہ دودھ جو پی کر اُبل چلے

۲۔ بچے کا دودھ پینا (رجا نصاحب)

ہو گیا شیطان ہے مردود پی کے میرا دودھ　　　اور آنا میں ہو میرے دودھ کی تاثیر نوح

ایسے محل پر جہاں معنی نمبر ۲ کا پہلو قابل مضحکہ ہو دودھ پینا کی جگہ "دودھ کھانا" "دودھ استعمال کرنا" بول چال میں فصیح ہے۔ جہاں ذم کا پہلو نہ ہو وہاں "دودھ پینا" ہی فصیح ہے۔

مثالیں کہاں تک نقل کی جائیں۔ مختصر یہ ہے کہ جامع اللغات باوجود نقش ثانی ہونے کے محقق زبان کے لئے بیکار ہے اور اردو الفاظ و محاورات کا مکمل اور جامع لغت ہنوز سوائے نور اللغات کے موجود نہیں ہے۔

نسب نامۂ مخدوم زادگان کاکوری موسوم بہ "نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد عبدالکریم" کے مولف نے لکھا ہے کہ "جب تک اُردو زبان کے بولنے اور سمجھنے والے گلشن ہند میں برقرار رہیں گے اس سدابہار شاہکار پر تعریف و توصیف کے گلدستے ملک کے ہر گوشے سے نثار ہوں گے ؛ خدا اس مولف کی دعا قبول کرے کہ "جب تک عطارد فلک کا میر منشی اور قمر نظام شمسی کا دستور اعظم ہے۔ نیر کا یہ دفتر تحقیق و تدقیق منازل اُردو کے رہ نوردوں کو شاہراہ فصاحت کی رہبری کرتا رہے اور اُن کے اسم گرامی کو حیات جاوید کے خلعت اور بقاے دوام کے تاج سے ملبوس و مزین رکھے"

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم　　　شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

قند پارسی

(جناب مولانا خیرالدین صاحب خیر)

لبِ خاموشِ تو خنجر چہ خنجر خنجرِ بُرّاں　　　نگاہِ سرمگیں قاتل چہ قاتل قاتلِ دوراں

حدیثِ دل نمی دانم مگر دانم چنیں قصّہ　　　چہ قصّہ قصّۂ غنچہ چہ غنچہ غنچۂ خنداں

بہ طوفانِ حوادث غرق شد اے ہمنوا کشتی　　　چہ کشتی کشتیٔ حسرت چہ حسرت حسرتِ پنہاں

نقابِ رُخ کشید وا ز دلم بُربید آں دلبر　　　چہ دیدی جلوۂ حُسنے چہ جلوہ جلوۂ یزداں

دلِ عالم کہ آں کافر مُسخر کرد از جادو　　　چہ جادو جادوے عشوہ چہ عشوہ عشوۂ مژگاں

سیاہ من سفید آخر بہ محشر گشت از قطرہ　　　چہ قطرہ قطرۂ رحمت چہ رحمت رحمتِ یزداں

امامِ میکدہ صد رشکِ جنت کرد از مستی　　　بدورِ جامِ مے محفل چہ محفل محفلِ مستاں

منِ بیچارہ می سوزم چو خیر از آتشِ سوزاں　　　چہ آتش آتشِ فرقت چہ فرقت فرقتِ یاراں

ہندوستانی صنعت کاغذ سازی

(جناب مولوی محمد احمد صاحب سبزواری بی۔ اے جامعہ عثمانیہ)

ہندوستان رقبہ کے لحاظ سے ایک نیم براعظم ہے یہاں مختلف قسم کے موسم، آب و ہوا، اور دوسری قدرتی خصوصیات موجود ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ خاص خاص چیزیں جو بڑی حد تک قدرتی ماحول کا نتیجہ ہوتی ہیں اُن کے لئے یہاں ہر قسم کی آسانیاں موجود ہیں۔ ہندوستان کی صنعتوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے حصہ میں، وہ صنعتیں ہیں جن کو گھریلو یا مقامی صنعتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کام چھوٹے پیمانہ پر ہوتا ہے۔ تھوڑے سے سرمایہ سے کام چل جاتا ہے اور اس وجہ سے ایسے کاروبار میں یا تو ذاتی سرمایہ لگا ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ دو چار ساجھی ہو جاتے ہیں۔ کاروبار چلانے کے لئے کسی اعلےٰ قابلیت یا عمدہ تنظیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ کاروبار کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس قسم کے مواقع پیش ہی نہیں آتے۔ صناع گھر والے ہی ہوتے ہیں اور اگر ضرورت ہوتی ہے تو چند مزدوروں کو نوکر رکھ لیا جاتا ہے۔ چونکہ ان مصنوعات کی طلب مقامی ہوتی ہے اس وجہ سے نہ تو ان کی طلب میں زیادہ تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ فیشن کی تبدیلی یا بیرونی مال کے مقابلہ کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری صنعتیں ہیں جن میں کاروبار بہت بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔ مشینی، دخانی، آبی یا برقی طاقتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مال کثیر تعداد میں تیار کیا جاتا ہے۔ کارخانوں میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں۔ اور کاروبار کے لئے لاکھوں کا سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ اب یا تو کاروبار کرنے والے کے پاس اتنی کثیر رقم ہوتی ہی نہیں یا اگر ہو بھی تو وہ اس کو ایک نئے کام میں لگا کے خطرات برداشت نہیں کرنا چاہتا اس وجہ سے سرمایہ چھوٹی چھوٹی تعدادوں میں ادھر اُدھر سے جمع کیا جاتا ہے۔ تیار شدہ مال نہ صرف ملک کے بڑے بازاروں میں بلکہ بعض اوقات بیرون ممالک کے بازاروں تک جاتا ہے۔ اور وہاں اس کو دوسرے ملکوں کے مال سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کاروبار کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جائے گا اتنی ہی اس کی نگرانی اور انتظام مشکل ہوتا جائے گا۔ اس وجہ سے ایسے کارخانوں کے نگراں اعلےٰ صلاحیتوں کے حامل ہی رکھے جاتے ہیں۔ اس قسم کی صنعتوں کو تنظیم شدہ صنعتیں کہا جاتا ہے۔ جن کی ہندوستان میں بہت کمی ہے۔ اور جو تھوڑی بہت موجود ہیں ان میں نمایاں سوتی پارچہ بافی، جوٹ، چرم سازی، شکر سازی، شیشہ سازی،

کاغذسازی، سیمنٹ سازی اور لوہے و فولاد کی صنعتیں ہیں۔ آج ان ہی میں کی ایک صنعت یعنی ہندوستان میں کاغذ کی صنعت کا مختصر حال پیش کیا جائے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ انسانی ترقی میں کاغذ کا بھی بہت بڑا حصہ رہا ہے تو غالباً کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ فنون لطیفہ، ادب و فنون، سائنس، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، سیاست سب میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے گا۔ زندگی کا کونسا ایسا شعبہ ہے جہاں کاغذ کی ضرورت ناگزیر نہ ہو۔ خواہ دنیا ہولناک بین الاقوامی جنگوں میں پھنسی ہوئی اور ایک قوم دوسرے کو نگلنے کی فکر میں ہو یا عالم میں صلح و آشتی کا ڈنکا بج رہا ہو۔ بہرحال دونوں صورتوں میں کاغذ سے مفر نہیں۔ اور اس کا تعین دشوار ہے کہ کس زمانہ میں کاغذ کی ضرورت زیادہ ہوگی۔ اس لئے اس قسم کی ضروری اور مفید صنعت کو ملک میں ترقی دینے کی کوشش کرنا یقیناً ملک کی مرفع الحالی اور تمدنی احتیاجات کے لیے اشد ضروری ہے۔ اس مضمون میں اس امر پر روشنی ڈالی جائے گی کہ اس صنعت کی جدید طریقے پر ابتدا کب ہوئی اور موجودہ دور میں اس کا کیا حال ہے اور آئندہ ترقی کے کیا امکانات ہیں۔

ہندوستان میں سب سے پہلا کارخانہ تجارتی اصولوں پر ۱۸۶۷ء میں "بالی ملس" کے نام سے بمقام ہگلی قائم کیا گیا۔ اس مقام کے گرد و نواح آج بھی اس صنعت کے خاص مرکز ہیں۔ کارخانہ میں اُس وقت پُرانے چیتھڑے اور ردی استعمال ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس وقت کاغذ بنانے کے لئے ان دونوں چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز کا علم ہی نہ تھا۔ کارخانہ میں مال بہت کم تیار ہوتا تھا اور اس کی طلب بہت زیادہ تھی۔ تقریباً ۱۵ سال تک یہ کارخانہ تنہا ملک کی مانگ کے کچھ حصہ کو پورا کرتا رہا۔ اسی زمانہ میں تھامس رُوٹ لیج نے جو برطانیہ کا کاغذ بنانے والا تھا۔ کاغذسازی کی اشیا کے متعلق تحقیقات کی۔ اس نے بانس، گھاس اور بعض دوسری اشیا پر تجربات کیے۔ اور اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کامیابی نے ہندوستانیوں کی توجہ بھی بانس اور ریشہ دار پودوں مثلاً مونج یا صابی گھاس کے استعمال کی طرف منعطف کرائی۔ ۱۸۸۰ء میں لارڈ رپن نے جو اس وقت وائسرائے تھے ملکی صنعت کو فروغ دینے کے لیے اس امر کا اعلان کیا کہ سرکاری ذخائر ملک کی تیار شدہ مصنوعات خریدا کریں۔ اس نئے اعلان سے اور یورپ اور امریکہ میں کاغذ کی قیمتیں گراں ہوجانے کی وجہ سے ہندوستان میں اس صنعت کو بڑی مدد ملی۔ اور لوگوں کو نئے نئے کارخانے کھولنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ میں اور ۱۸۸۲ء میں ٹیٹاگڑھ میں کاغذسازی کے کارخانے قائم ہوئے۔

اس کے بعد ہی تھوڑے عرصہ میں گوالیار، پونا، ٹراونکور، رانی گنج، اور کن کی نارا میں کارخانے کھل گئے اور انیسویں صدی کے اختتام تک ان تمام کارخانوں سے انیس ہزار ٹن سالانہ کاغذ تیار ہونے لگا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ میں لکڑی کے گودے سے کاغذسازی شروع ہوئی اور کثرت سے گودے کا کاغذ تیار ہونے لگا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاغذ کی قیمت گرنا شروع ہوئی۔ اور ہندوستان میں یہ سستا کاغذ بڑی مقدار میں درآمد ہونے لگا۔ چونکہ اس زمانہ میں تائین نہ تھی اس وجہ سے ہندوستان کو اس سستے کاغذ سے مقابلہ کرنے میں بڑی دقت ہوئی اور مصارف پیدائش نکالنے بھی دشوار ہو گئے۔ مختلف کارخانے بند ہونے لگے چنانچہ ۱۹۰۳ء میں ٹیٹاگڑھ کا کارخانہ "امپیریل" پیپرمل میں شامل ہوا جس کی بنیاد ۱۸۹۲ء میں کن کی نارا کے مقام پر پڑی تھی ۱۹۰۵ء میں "بالی ملس" کا دیوالہ نکل گیا۔ بہرحال اب اس بات کی سخت ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ارزاں کاغذ تیار کرنے کے لئے کسی نئی چیز کی دریافت کی جائے۔

۱۹۱۰ء میں دہرہ دون کے "فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ" نے جنگل کی پیداواروں پر مختلف تجربات شروع کئے۔ اس سلسلہ میں کاغذسازی کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔ ابتدا میں کاغذسازی کے تجربات سبائی گھاس پر ہوئے مگر بہت جلد اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ محض اس گھاس کی بدولت یہ صنعت ترقی نہیں کر سکتی۔ بہرحال مختلف قسم کی کوششوں اور تجربوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہندوستان میں کاغذسازی کے لئے بانس سے عمدہ کوئی چیز ملنا دشوار ہے۔ کیونکہ اول تو ہندوستان اور برما میں بانس کی بڑی کثرت ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کے جنگلات سے اتنا بانس کا گودا حاصل ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کی کاغذسازی کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ تجربہ گاہ میں مختلف تجربوں کے ذریعے معلوم کر لیا گیا کہ بانس کا گودا بہت آسانی سے اور کم مصارف سے حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ تجربات ابھی "تجرباتی اداروں" سے باہر نہ نکلے تھے کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اور اس نے ابتدا میں صنعت کی ترقی میں بڑی دشواریاں پیدا کر دیں اور کاغذسازی کی تنظیم کے متعلق جو اسکیم کہ پیش نظر تھیں ان کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر جب جنگ طویل ہو گئی اور بیرونی ممالک کی مصنوعات کی درآمد میں کمی ہونے لگی تو یہاں کی مصنوعات کو پنپنے کا موقع ملا۔ چنانچہ کاغذسازی کی صنعت میں بھی دوبارہ روح پیدا ہوئی۔ اور ۱۹۱۸ء میں "انڈین پیپر کمپنی لمیٹڈ" بمقام ہگلی قائم ہوئی اور اس نے بانس کے گودے سے کاغذ تیار کرنا شروع کیا۔ اس کمپنی کا

کام ۱۹۱۲ء سے شروع ہوا اور اس نے اپنے مصالحوں میں ایک نئے معالجہ سلفیٹ ایسڈ کا اضافہ کیا جس کی وجہ سے عمدہ کاغذ تیار کرنے میں بڑی مدد ملنے لگی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد حکومت نے فارسٹ ریسرچ کے لئے ایک مکمل اسکیم منظور کی۔ اور اس اسکیم کے تحت کاغذ سازی کے تجربات کے لئے ایک الگ شاخ قائم کی گئی۔ اور اس میں بانس کے گودے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس شاخ نے ۱۹۲۳ء میں اپنا کام شروع کیا اور ایک ہی سال بعد اپنے تجربات کو رپورٹ کی صورت میں پیش کیا۔ رپورٹ میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ ہندوستان میں بانس کے گودے سے کاغذ بنانے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔

اس زمانہ میں بیرونی ملکوں کے کاغذ کی درآمد زیادہ بڑھ گئی۔ اور ہندوستانی صنعت کو اس سے مقابلہ کرنا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ ابھی یہ صنعت اپنے پاؤں پر بھی کھڑی نہ ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف یورپ اور امریکہ میں دوران جنگ اور جنگ کے بعد اس صنعت میں بہت زیادہ ترقی ہو گئی تھی اور وہ کاغذ کی بڑی سے بڑی مانگ کو پورا کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ ان کارخانوں نے بڑی تیزی سے کثیر مقدار میں مال تیار کرنا شروع کیا۔ مگر جیسا کہ خیال تھا کہ جنگ کے بعد ہر صنعت کی طلب میں اضافہ ہوگا ایسا نہیں ہوا بلکہ طلب گھٹ گئی۔ کیونکہ جنگ کی وجہ سے نہ صرف حکومتیں بلکہ کروروں افراد بھی مفلس ہو چکے تھے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کارخانوں میں جو مال ضرورت سے زیادہ تیار ہو چکا تھا اس کی نکاسی کا راستہ تلاش کیا جانے لگا۔ اور اس کو ہندوستان سے اچھا اور کونسا بازار مل سکتا تھا چنانچہ اس مال کی ہندوستان میں "بھرمار" ہونے لگی اور "نہ ملنے سے کچھ ملنا بہتر ہے" والے اصول پر عمل شروع کیا گیا۔ اس وقت یہ خیال نہیں کیا گیا کہ قیمت کم ہے یا مصارف بھی مکمل رہے ہیں۔ بلکہ کوشش یہ شروع کی گئی کہ جس طرح ہو سکے ادنیٰ سے ادنیٰ قیمتوں پر مال نکال دیا جائے۔ ظاہر تھا کہ غریب ہندوستان میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ان حالات میں بیرونی مال کا مقابلہ کر سکے۔ صورت حال اس قدر نازک ہو گئی کہ حکومت کو اس صنعت کو تامین دینے کے لئے ایک تحقیقاتی بورڈ قائم کرنا پڑا۔ اس بورڈ نے تحقیقات کی اور اپنی رپورٹ شائع کی۔ اسی بنا پر ۱۹۲۵ء میں مجلس وضع قوانین میں ایک مسودہ پیش ہوا اور "پیپر انڈسٹری پرٹکشن ایکٹ" کی صورت میں اس کا نفاذ ہوا۔ اس قانون کی رو سے مختلف قسم کے کاغذوں کو ۷ سال کے لئے تامین ملی۔ بورڈ نے اپنی تحقیقات میں اس امر کی وضاحت کی تھی کہ ہندوستان میں یہ صنعت بہت اچھی طرح فروغ حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ اس کو بیرونی مقابلہ کے غیر مساوی حالات سے بچایا جائے۔

بورڈ نے سفارش کی تھی کہ کاغذ پر ارنی پونڈ تامین محصول لگایا جائے۔ اور "انڈین پیپر پلپ کمپنی" کو ۱۰ لاکھ روپیہ بطور قرض دیے جائیں تاکہ کمپنی مذکور نئے پودوں اور سلفیٹ ایسڈ پر تجربے کرسکے ارزاں کاغذ تیار کرسکے۔ سبائی گھاس سے کاغذ بنانے کے سلسلہ میں بورڈ نے کسی قسم کی تامین کی سفارش نہ کی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس گھاس کی وجہ سے یہ صنعت ترقی نہیں کرسکتی۔ حکومت نے بورڈ کی بعض سفارشات پر عمل کیا مثلاً کاغذ پر ارنی پونڈ تامین محصول عائد کردیا مگر حکومت نے کسی کارخانہ کو مالی مشکلات کی وجہ سے قرض دینے سے انکار کردیا۔

دوران تامین میں مختلف کاغذ سازی کے کارخانوں، اور دوسرہ دون کی کاغذ سازی والی شاخ نے اپنی کوششیں برابر جاری رکھیں۔ مختلف جنگلات کا مطالعہ کیا گیا۔ دو سات قسم کے عمدہ بانس تلاش کرکے ان پر مزید تجربات کیے گئے۔ جن میں بڑی کامیابی ہوئی۔ اور اس زمانہ میں کاغذ سازی کے نئے کارخانے کھلنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں راج مندری میں "کرناٹک پیپر ملس" کی بنیاد پڑی۔ جس نے دھان، بھوسہ اور بانس سے کاغذ تیار کرنا شروع کیا۔ پنجاب میں "پنجاب پیپر ملس" قائم ہوئیں اور اس نے اپنا کارخانہ سہارنپور کے قریب قائم کیا۔ یہ "بھابر" گھاس سے کاغذ تیار کرتا تھا۔ جو پنجاب میں بڑی کثرت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک کارخانہ آسام میں اور دوسرا چاٹگام میں کھلا۔ اب ہندوستان میں کاغذ سازی کے کارخانوں کی تعداد ۱۲ ہوگئی تھی اور آخرالذکر تین کو نکال کر بقیہ ۹ کارخانوں سے ۳۳۰۰۰ ٹن کاغذ تیار ہوا اور سب کارخانوں کی پیداوار ملانے سے یہ تعداد ۴۳۰۰۰ ٹن سے زائد تک ہوگئی۔

تامینی مدت ۳۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں ختم ہو جانے والی تھی۔ اس لئے ۱۹۳۱ء میں یہ مسئلہ "ٹیرف بورڈ" کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ معلوم کرے کہ اس صنعت کا دور تامین میں کیا حال رہا اور آئندہ اس کو کب تک اور کس مقدار میں تامین دی جائے۔ بورڈ نے صنعت کی تحقیقات کی اور معلوم ہوا کہ اس وقت ہندوستان میں سالانہ چالیس ہزار ٹن کاغذ تیار ہونے لگا ہے۔ اور بانس کا کاغذ دوسری چیزوں کے تیار شدہ کاغذ کے مقابلہ میں بڑھ رہا ہے مثلاً ۱۹۲۵-۲۶ء میں بانس سے تیار شدہ کاغذ کی مقدار ۴ ہزار ٹن تھی مگر ۱۹۳۱ء میں اس کی تعداد ۱۲ ہزار ٹن کے قریب ہوگئی۔ اگرچہ ترقی کی رفتار اس قدر تیز نہ رہی جتنا کہ اس کو رہنا چاہئے تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگل سے بانس لانے اور گودا حاصل کرنے، اور پھر اس گودے میں دوسرے مصالحہ ملاکر اس کا کاغذ تیار کرنے میں مہارت اور مشق کی ضرورت تھی اور ہندوستان میں اب تک با مہارت مزدوروں کی کمی تھی۔ بورڈ نے نہ صرف

تائین کو مزید سات سال تک جاری رکھنے کی سفارش کی بلکہ لکڑی کے گودے کی برآمد پر بھی
محصول لگانے کی سفارش کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ گودے کی برآمد میں کمی ہو جائے گی اور
اندرون ملک اس کا استعمال بڑھ سکے گا۔

حکومت نے بورڈ کی ان سفارشات کو منظور کر لیا اور ۱۹۳۲ء میں انھوں نے قانونی صورت
اختیار کر لی۔ اس نئی تائین سے ہندوستان میں بانس سے کاغذ سازی میں بڑی مدد ملی ۱۹۳۵ء
میں ہندوستان میں ۳۲ ہزار ٹن کاغذ بانس سے تیار کیا گیا۔ اور خیال ہے کہ دو سال کے عرصہ میں یہ
مقدار دوگنی ہو جائے گی۔ اس وقت ہندوستان میں جتنا بانس کا تیار شدہ کاغذ استعمال ہو رہا ہے
اُس کا ۷۵ فی صدی حصہ ہندوستان ہی میں تیار ہو رہا ہے۔ اور باقی ۲۵ فیصدی حصہ باہر سے آرہا ہے مختلف
کارخانوں اور دہرہ دون کی کاغذ سازی کی تجربہ گاہ میں مختلف تجربات ہو رہے ہیں۔ اور اس بات کی
کوشش کی جا رہی ہے کہ بہت جلد صنعت کو اس درجہ پر پہونچا دیا جائے کہ تائین کی ضرورت باقی نہ رہے
ہندوستان میں مختلف کاغذوں کے خرچ کا اندازہ ۱۹۳۵-۳۶ء میں ۲،۱۹،۰۰۰ ٹن کیا گیا تھا۔ اور
اس میں سے ۱۵ ہزار ٹن یعنی ۲۳ فیصدی حصہ دیسی مال کا تھا اور باقی ۱،۹۸،۰۰۰ ٹن یعنی ۷۷ فیصدی
حصہ باہر سے برآمد ہوا۔ ہندوستان میں اس سال میں جو کاغذ باہر سے برآمد ہوا اُس کی ترتیب
مختلف اقسام کے لحاظ سے حسب ذیل ہے۔

نام کاغذ	مقدار (ٹن)
۱۔ لکھنے کا کاغذ اور لفافے	۷،۳۶۱
۲۔ چھاپنے کا کاغذ	۱۸،۰۸۰
۳۔ اخباری کاغذ	۳۴،۳۱۸
۴۔ معمولی استعمال کا کاغذ	۱۰،۷۳۰
۵۔ پُرانے اخبارات	۵۷،۵۸۳
۶۔ کرافٹ پیپر	۹،۵۴۴
۷۔ مختلف قسم کے کاغذ	۳،۵۴۴
۸۔ دفتیاں، موٹے کاغذ اور پٹھے	۲۴،۱۷۵
۹۔ کاغذ کی مصنوعات	۲،۰۱۹
۱۰۔ دفتیوں کی مصنوعات	۶۷۱
کل مقدار	۱،۶۸،۰۲۵ ٹن

ان اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درآمد میں سب سے زیادہ اہمیت پرانے اخبارات کو ہے جو ہر سال ۵۸۳، ۵۰ ٹن برآمد ہوتے ہیں۔ یہ اخبارات، پھل، مٹھائیاں اور دوسرے سامان کی پڑیاں بنانے کے کام آتے ہیں۔ ملک میں معمولی کاغذ کے استعمال کا اندازہ ۰۰۰،۰۷ ٹن کیا جاتا ہے۔ اور اس کی طلب میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ ۲۶-۱۹۲۵ء میں یہ مقدار صرف ۷۲، ۳۲۰ ٹن تھی۔ مختلف قسم کی وقتیوں اور پٹھوں کا استعمال بھی ملک میں بڑھ رہا ہے چنانچہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں ۰۰۰،۲۴ ٹن کی مقدار درآمد ہوئی۔ ہندوستان میں ان چیزوں کی تیاری کے لئے ہر قسم کی خام اشیا مثلاً گھانس، بانس وغیرہ کی بڑی کثرت ہے۔ اور بڑی آسانی سے ان کو تیار کیا جا سکتا ہے چنانچہ حال ہی میں "امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ" نے "فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ" کو اس بارے میں تجربات کرنے کے لئے ایک معقول امداد دی ہے۔

۱۹۲۷ء کی انڈسٹریل سینس رپورٹ کی رو سے ہندوستان میں کاغذ سازی کے ۷ کارخانے ہیں اور کاغذ سازی کے لئے گودا بنانے والا ایک کارخانہ ہے۔ ان کارخانوں میں علی الترتیب ۵۰۶۱ اور ۱۵ مزدور کام کرتے ہیں۔

فارسٹ ریسرچ انسٹیٹیوٹ ۵ سال سے کرافٹ پیپر کی تیاری کے متعلق تجربات کر رہا ہے اور اس کو یقین ہے کہ وہ بہت جلد مختلف قسم کے کرافٹ پیپر بنانے میں کامیابی حاصل کرے گا۔ کیونکہ ملک میں اس کاغذ کے لئے ہر قسم کی خام اشیا میسر ہیں۔ اس کے علاوہ محکمہ استعمال کے لئے سستا کاغذ بنانے کی تجویز پر بھی غور کر رہا ہے۔ اگرچہ اس شعبہ میں مختلف مشکلات موجود ہیں مثلاً اس کاغذ کو باہر کے پرانے اور ارزاں اخبارات سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ تاہم ان دشواریوں پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

حکومت اس صنعت کے بارے میں بہت کچھ کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ حکومت نے جو آسانیاں بہم پہونچائی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے لئے سرکاری محکموں اور سرمایہ داروں کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ ملک میں سرمایہ موجود ہے، اگرچہ منتشر حالت میں ہے مگر تھوڑی بہت دقت سے جمع ہو سکتا ہے۔ آجکل شرح سود کم ہے۔ ملک میں محنت کا کوئی کال نہیں بلکہ ہمارے یہاں محنت جس قدر سستی ہے غالباً اس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ کاروباری اعلےٰ قابلیت و صلاحیت رکھنے والے افراد کی ملک میں کمی نہیں خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے بے روزگاری کے ہولناک بھنور سے بچنے کے لئے یہ ایک اچھا راستہ ہے۔ ایک وسیع بازار ہمارے ہاتھ میں ہے اور ابھی ملک میں اس صنعت کی ترقی کے کافی امکانات موجود ہیں۔ البتہ محنت اور کوشش شرط ہے۔

نیاز کی جرأت بے جا

(جناب منشی نانک چند سر یوستو صاحب عشرت ایم اے ۔ مولوی فاضل)

(بسلسلہ الناظر ماہ مارچ و اپریل ۱۹۳۲ء)

شعر اصغر | ساز دل کے پردوں کو خود وہ چھیڑتا ہو جب جان مضطرب بن کر تو بھی لب کشا ہو جا

اعتراض نیاز | اس شعر میں ساز۔ پردہ اور اس کو چھیڑنے والا سب مجازی معنے میں استعمال ہوئے ہیں اس لئے "جان مضطرب" کی جگہ "اضطراب جان" زیادہ موزوں تھا۔

عرض عشرت | "جان مضطرب" کے بجائے آپ "اضطراب جاں" اصلاح فرماتے ہیں اور آپ کی نگاہ میں یہی کسر شعر میں رہ گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ "تو لب کشا ہو جا" اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ جملہ "تو جان مضطرب ہو کر لب کشا ہو جا" درست ہے یا "تو اضطراب جاں بن کر لب کشا ہو جا" بجا ہے۔ صاحبان ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ لب کشا ہونے کے لئے "جان" ضروری چیز ہے۔ بے جان چیز لب کشا نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ جو زور "جان مضطرب" میں صوت و معنی دونوں لحاظ سے ہے وہ "اضطراب جاں" میں ناممکن ہے۔ کیونکہ روح کے مقابلے میں اضطراب بہت کم حیثیت چیز ہے چاہے وہ اضطراب روح ہی کا کیوں نہ ہو کیونکہ اس حالت میں "روح" کل اور "اضطراب" جزو ہے۔ شعر میں "کل" ہے اور آپ اپنی اصلاح میں صرف "جزو" پر قانع ہیں۔ آپ روح پر مادہ کو ترجیح دیتے ہیں مگر اصغر صاحب مادہ پرست نہیں ہیں۔

شعر اصغر | یہی نگاہ جو چاہے وہ انقلاب کرے لباس زہد کو جس نے کیا شراب آلود

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں بیان کی تعقید و تشویش ظاہر ہے۔ لفظ (وہ) بالکل زائد مستعمل ہوا ہے اور (انقلاب کرنا) محاورہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح لفظ (یہی) سراسر بے محل آیا ہے۔ اس کی جگہ (تری) ہونا چاہئے تھا۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا۔ ع تری نگاہ جو فتنہ کرے بپا کم ہے۔

عرض عشرت | پہلے مصرعہ میں نہ کوئی تعقید ہے نہ تشویش مگر خواہ مخواہ کسی کو معلوم ہی ہو تو شاعر سب کی فہم کا ٹھیکہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لفظ (وہ) آپ کو زائد معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر بھی معنے پورے ہوتے ہیں مگر بھائی صاحب میں بارہا لکھ چکا ہوں کہ زور یعنے (emphasis) دینے کے لئے زائد الفاظ لائے جاتے ہیں اور وہ زائد شمار نہیں کیے جاتے بلکہ اُن کا شمار محاسن میں ہوتا ہے کیونکہ اُن سے زور کلام

بڑھ جاتا ہے۔ غور کیجئے۔ دو جملے ہیں "آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں" اور "آپ جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں"۔ ادب کے پرستاروں پر روشن ہے کہ پہلا جملہ سادہ ہے اور اس میں کوئی زور نہیں ہے گو کہ مفہوم کے لحاظ سے مکمل ہے مگر دوسرا جملہ لفظ (وہ) کی وجہ سے زوردار بھی ہے اور سننے میں خوش آیند بھی۔ اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ 'انقلاب کرنا' محاورہ نہیں ہے۔ آپ کو فتنہ یا قیامت برپا یا بپا کر دینے سے دھوکا ہو گیا ہے آپ کے ذہن میں شاید یہی ہے کہ انقلاب کے ساتھ بھی "برپا" کا چپکا چاہئے۔ لفظ فتنہ کے لئے تو 'برپا' لازم ہے مگر قیامت کے ساتھ لازم نہیں۔ 'اس نے قیامت کردی' اور 'اس نے قیامت برپا کردی' دونوں جملے صحیح ہیں۔ مگر انقلاب کا برپا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انقلاب کرنا ہی لکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ لفظ (یہی) بیکار ہے۔ میں ایک بار لکھ چکا ہوں کہ اساتذہ اردو کا یہ ایک فرسودہ حربہ ہے کہ شعر میں یہ۔ وہ۔ یہی۔ وہی وغیرہ زائد ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں زائد ہوتا بھی ہے مگر اس کے لئے اساتذۂ اردو فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ جب زائد ہوتے ہیں کہ جب ان کے لئے ایک جملہ موصولہ 'جو' 'جس' وغیرہ سے شروع نہ ہو۔ چنانچہ اصغر صاحب کے شعر میں جملہ موصولہ بھی ہے ملاحظہ ہو۔ "جس نے کیا شراب آلود" یعنی یہی نگاہ جس نے لب اس زاہد کو شراب آلود کیا جو چاہے وہ انقلاب کرے اس جملہ میں لفظ (یہی) قطعی زائد نہیں ہے جب تک کہ سمجھنے والے میں عقل زائد نہ ہو۔ اس کے بعد آپ کی اصلاح ہے جس میں آپ نے "یہی نگاہ" کے بجائے "تری نگاہ" بنایا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ تغزل میں تخاطب اگر اس طرح کیا جائے کہ بجائے واحد حاضر کے واحد غائب استعمال کیا جائے تو ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے شعراء اسی لئے بجائے تم یا تو کے کوئی لکھتے ہیں اور اس غائبانہ تخاطب سے ایک لطف پیدا کر دیتے ہیں ایک میر کا شعر ملاحظہ ہو ؎

ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے رسوا کوئی   یہ بھی چھپنا ہے کوئی یہ بھی ہے پردا کوئی

شاعر معشوق حقیقی سے کہہ رہا ہے کہ تو ذرہ ذرہ میں رسوا نظر آتا ہے مگر بجائے تو کے لفظ کوئی استعمال کر کے شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔ اسی بنا پر اصغر صاحب نے بھی "تری نگاہ" کے بجائے "یہی نگاہ" لکھا۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اشارات کی شاعری زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ اب آپ خود ہی غور کریں کہ ایک لطیف اشارہ 'تری نگاہ' میں ہے یا 'یہی نگاہ' میں۔ اس کے علاوہ معشوق سے باتیں کرنے میں احترام حسن کی ادب شناسی یہ ہے کہ بجائے تو کے غائبانہ تخاطب کرے۔ ہاں ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ آپ کی اصلاح میں ایک بڑا نقص ہے وہ یہ کہ آپ نے محاورہ کے لفظوں کو مقدم و موخر کیا ہے۔ محاورہ برپا کرنا یا بپا کرنا ہے۔ ان الفاظ میں لوٹ پھیر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آپ نے "کرے بپا" لکھ مارا۔ معائب

شاعری میں اس کا نام "ضعف تالیف" ہے۔

شعرِ اصغر | کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا		خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ میں بجائے (جس کو) کے صرف (کہ) استعمال ہوا ہے جو درست نہیں۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا۔ ع ہے اپنا طرزِ نظر جس کو دیکھتا ہوں میں۔

عرض عشرت | آپ درست فرماتے ہیں کہ لفظ (کہ) (جس کو) کے معنے میں مستعمل ہوا ہے مگر آپ کو کیا خبر کس تقاضائے ادبیہ سے مجبور ہو کر اصغر صاحب نے ایسا کرنے کی ضرورت سمجھی۔ اگر آپ اسے سمجھ جاتے تو شاید اس ترکیب کی ترجیح کے لئے آپ آواز اٹھاتے۔ سُنئیے کبھی کبھی موصول وصلہ کے مفہوم میں اتنا اتحاد ہوتا ہے کہ الفاظ میں بھی وہ دوری برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسے موقع پر سب سے چھوٹا لفظ (کہ) موصولہ ہے۔ وہ اتنا مختصر ہے کہ جس سے موصول وصلہ کا اتحاد منقطع نہیں ہوتا جیسا کہ (جس کو) یا (جس سے) وغیرہ سے ہو جاتا ہے۔ یہ میں بتلا چکا ہوں اصغر صاحب فلسفہ (Subjectiveness) کے قائل ہیں۔ وہ عالم کو اپنی نظر کا رہون منت سمجھتے ہیں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ 'طرزِ نظر' اور 'عالم' بالکل ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے محض 'اپنا طرزِ نظر' نہیں لکھا بلکہ زور دینے کے لئے "خود اپنا طرزِ نظر" لکھا۔ اس کے بعد (جس کو) کے بجائے محض (کہ) لکھا جس سے 'طرزِ نظر' میں اور جو کچھ دیکھا جاتا ہے اس میں جو رشتہ اتحاد ہے اُس کو ضرب نہ پہونچے۔ مگر یہ بڑے پایہ کی باتیں ہیں۔ معمولی لوگوں کا تو ان کا سمجھنا دشوار ہے۔ آپ نے چونکہ یہ نکتہ سمجھ نہیں پایا۔ اپنی اصلاح میں لفظ 'خود' کو جو شعر کی جان ہے نکال دیا اور (کہ) کو جو اتنا نازک کام کر رہا ہے ہٹا کے (جس کو) کا ڈھیلا رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحی مصرعہ اصغر صاحب کے مصرعہ سے کس قدر پست و کمزور و بے کیف ہے۔

شعرِ اصغر | حسن کرشمہ ساز کا بزم میں فیض عام ہے		جان بلاکشاں بھی آج غرق ہے موجِ نور میں

اعتراض نیاز | موجِ نور کے استعمال کا کوئی قرینہ شعر سے ظاہر نہیں۔ پہلے مصرعہ میں حسن کرشمہ ساز لکھا ہے اور موجِ نور کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرح فیض عام کے زیر اثر جان بلاکشاں کو موجِ سرور و حسرت میں غرق ہونا چاہیئے نہ کہ موجِ نور میں۔ آج کا (ج) بھی تقطیع سے گرتا ہے بجائے اس کے (اب) ہونا چاہیئے

عرض عشرت | حسن کی کرشمہ سازی یہی ہے کہ جان بلاکشاں جو ہمیشہ شراب کے علاوہ کسی چیز کو کچھ نہیں سمجھتی اور جو شراب کی مستی میں دنیا و مافیہا کو یک لخت فراموش کئے رہتی ہے اس کو بھی آج معشوق نے اپنے نورِ حسن سے مسحور کر لیا اور یہاں تک کہ وہ لطف میخواری کو یک لخت بھول کر معشوق کے نورِ حسن میں دوسرے عاشقوں کے مانند غرق ہو رہے ہیں۔ کوئی سمجھنا چاہے تو سمجھ سکتا ہے کہ اس شعر میں بلاکشوں کی رعایت سے سرور و کیف کی ضرورت نہیں ہے اور موجِ نور کا محل استعمال بالکل بجا و درست ہے (آج) کے استعمال اور

خوبصورتی پر آپ کو اعتراض نہیں۔ تقطیع میں چونکہ آج کا (ج) گر جاتا ہے اسی لئے آپ اسے اب کرنا چاہتے ہیں۔ فارسیت کے آپ بڑے مدعی ہیں۔ اپنے مکتوبات میں آپ فارسی اشعار کا اکثر اعادہ کیا کرتے ہیں مگر آپ کو معلوم نہیں کہ فارسی شعرا کے یہاں یہ جائز ہے۔ کلیات خاقانی اتفاق سے سامنے ہے اس کے کئی شعر اسی بحر میں دیے جاتے ہیں جن میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک حرف بعینہ اسی طرح تقطیع سے گرا ہوا ہے۔

اشعار خاقانی

(۱) تاجورم چوں آفتاب انفیت عجب کہ بے بہا — بر سر خاک عورتن نور تنم و ریغ من
(۲) رفتہ نگینہ در فراق از جہ ز امتلائے خوں — راست چوں پشت نیشتر خوں چکدش معصفری
(۳) چنگی آفتاب بردی از پئے ارتفاع من — چنگ نہادہ ربع وش بر برو چہرہ بر بری
(۴) چرخ سد لبے از لبش دوش فقع کشاد گفت — انفیست نسیم مشک پاش انفیست فقاع شکری
(۵) گاؤ سفالیں اندر آر کاتش موسوی درو — تا چہ کنند خاکیاں گاؤ زرین سا حری
(۶) مے بہ سفال خام نوش انفیست چمانہ طرب — لب بہ کلوخ خشک مال اینت شمامۂ تری
(۷) گنبد آبگینہ رنگ نیست فرشتہ خوے رد — سنگ بر آبگینہ زن دیو دلی کن اے پری
(۸) در قصب سر دامنی آستیں دو بر فشاں — پائے طرب سبک بر آر از چہ زمے گراں سری
(۹) ہفت طواف کعبہ را ہفت بتاں لبندہ اند — ماو سر پنج کعبتین داد بہ ہفت آوری
(۱۰) حیدر آسماں حسام احمد مشتری نگیں — رایض رائے آسماں صیقل جاہ مشتری

مرقومہ بالا دس اشعار سے آپ کی تقطیع کی حقیقت ظاہر ہے۔

شعر نمبر ۱۵: موجوں کا عکس ہے خط جام شراب میں — یا خوں اچھل رہا ہے رگ ماہتاب میں

اعتراض نیاز: خط جام ایک فرضی خط ہے اور اگر فرضی نہ ہو تو بھی اس میں موجوں کا عکس نمایاں نہیں ہو سکتا دوسرے مصرعہ میں جام شراب کو (ماہتاب) کہا ہے حالانکہ (آفتاب) کہنا زیادہ مناسب تھا۔

عرض حسرت: اعتراض اول یہ ہے کہ خط جام شراب اگر فرضی نہ ہو تو بھی اس میں موجوں کا عکس نمایاں نہیں ہو سکتا۔ دوسرے رگ ماہتاب کو رگ آفتاب کہنا چاہئے۔ اگر خط جام فرضی نہیں تو اس پر سرخ مے کی موجوں کا عکس شیشہ کے باہر سے کیوں نمایاں نہیں ہو سکتا؟ ہاں اگر پیالہ شیشہ کا نہ ہو تو نہیں ہو سکتا مگر ایسا فرض کرنے کے لئے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اب صرف یہ رہ گیا کہ جام کو آفتاب کہنا چاہئے یا ماہتاب۔ آپ شاید شراب کی رعایت سے آفتاب کہنا چاہتے ہیں کیونکہ آفتاب کے معنی شراب کے بھی ہوتے ہیں مگر اگر محض اتنی سی بات ہے، تو یہ لکھنؤ کی اس رعایت لفظی کی ٹکسال ہے جس کا ذرہ میاں

امانت کے عہد میں تھا مگر جس سے اب شعرائے لکھنؤ بھی متروک سمجھ کر پرہیز کرتے ہیں۔ کوئی سمجھدار اب اسے رواج دینا نہیں چاہتا۔ خیر اب مناسبت استعارہ کو دیکھئے۔ شاعر کو اگر محض ایک مدور چیز کی مثال دینا ہوتی تو آفتاب یا ماہتاب دونوں کہہ سکتا تھا کیونکہ بدر و آفتاب دونوں مدور ہیں گو کہ اس اعتبار سے بھی ماہتاب ہی زیادہ موزوں تھا کیونکہ آفتاب کا مدور ہونا چکا چوند کے مارے سوائے صبح یا شام کے ٹھیک نہیں دکھائی پڑتا مگر بدر کا گول دائرہ ہر وقت پورا پورا دکھائی پڑتا ہے لیکن خیر آفتاب سے بھی تشبیہ دے سکتے تھے کیونکہ وہ بھی گول ہے گو کہ وہ ماہتاب سے بدتر تشبیہ ہوتی۔ مگر جب شاعر خوبصورتی جام مدور دکھانا چاہتا ہو تو سوائے ماہتاب کہنے کے چارہ نہیں کیونکہ خوبصورتی بدر کی مسلم ہے۔ آفتاب کسی ادب میں خوبصورتی کے لئے مشہور نہیں۔ آفتاب تیزی و تمازت کے لئے لایا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس مقام پر آفتاب کی تشبیہ بالکل غلط ہے اور ماہتاب کی بالکل بجا و درست۔

شعر صفر｜اُس دن بھی میری روح تھی محو نشاط دید　　موسیٰ اُلجھ گئے تھے سوال و جواب میں

اعتراض نیاز｜پہلے مصرعہ کے انداز بیان کے لحاظ سے دوسرے مصرعہ کے الفاظ یوں ہونا چاہئے تھا۔ جب موسیٰ سوال و جواب میں اُلجھے ہوئے تھے۔ لفظ (جب) کا اظہار ضروری ہے اور "الجھ گئے تھے" بھی بے محل استعمال ہوا ہے۔ یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے۔

اُس دن بھی میری روح تھی محو جمال جب　　موسیٰ الجھ رہے تھے سوال و جواب میں

عرض عشرت｜شاعر کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ یعنے شاعر کی روح جلوہ طور کے دن کے پہلے بھی محو نشاط تھی اور اس دن بھی جس دن موسیٰ سوال و جواب میں اُلجھ گئے تھے۔ مصرعہ میں جو لفظ (بھی) ہے وہ اس معنے پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں (جب) کا لکھنا شبہ پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ ایک خاص وقت یعنے (Point of time) بتاتا ہے اور وقفہ یعنے (Period of time) نہیں بتاتا جو لفظ دن میں موجود ہے۔ اسی لئے شاعر نے اُسے ترک کر دیا۔ لیکن قرینہ سے اس کا مطلب صاف نکل آتا ہے اور اس طرح کے اشارات شاعری میں جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن سمجھے جاتے ہیں۔ آج کل کے اُردو ادیب پُرانے اساتذہ کا یہ بچہ داسُننے کو تیار نہیں کہ اس شعر میں فلاں لفظ کی ضرورت باقی رہ گئی مگر ہاں اگر سیاق عبارت سے اس کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہو۔ اب رہ گئی یہ بات کہ بجائے 'الجھ گئے تھے' کے 'اُلجھے ہوئے تھے' یا 'اُلجھ رہے تھے' ہونا چاہیے۔ سنیے اگر شعر میں بجائے اُس دن کے اس وقت ہوتا تو شاید آپ کا کہنا بہتر ہوتا گو کہ 'الجھ گئے تھے' پھر بھی غلط نہ ہوتا۔ مگر اُس دن کے ساتھ جو کچھ اصغر صاحب نے لکھا وہی زیادہ موزوں ہے گو کہ آپ فرما رہے ہیں وہ غلط نہیں ہے۔

شعر مضطر| میں اضطراب شوق کہوں یا جمال دوست یک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

اعتراض نیاز| تھوڑی سی تبدیلی کے بعد یہ شعر اس سے بہتر ہو سکتا تھا ؂

میں اس کو فرط شوق کہوں یا جمال دوست اک برق سی جو کوند رہی ہے نقاب میں

عرض مشرت| اس میں محض شعر کو بہتر کرنے کے لئے اصلاح دی ہے مگر شعر بدتر ہو گیا۔ آپ نے ' اضطراب شوق' کے بجائے 'فرط شوق' کر دیا ہے اور ' برق' کو ' برق سی' اور دونوں محض بیکار ہی نہیں بلکہ مفہوم شاعر کو برباد کرنے والی ہیں۔ برق کے کوندنے کی کیفیت کے لئے اضطراب نہایت ضروری لفظ ہے کیونکہ برق کوندنے میں ایک خاصہ اضطراب پایا جاتا ہے۔ اتنے برمحل لفظ کو جو شعر کی جان ہے آپ نے بدل کر شعر کو پست کر دیا دوسرے یہ بات علم معنی و بیان میں مسلم ہے کہ تشبیہ سے استعارہ زوردار ہوتا ہے مگر اس کے برخلاف (سی) زائد کر کے آپ نے استعارہ کو تشبیہ سے بدل دیا۔ دوسرے لفظوں میں آپ نے زوردار کو پھیکا۔ بلند کو پست اور چست کو سست کر دیا۔

شعر مضطر| میخانۂ ازل میں جہاں شراب میں ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

اعتراض نیاز| پہلے مصرعہ میں لفظ (نہ) دونوں ٹکڑوں کے درمیان لانا مناسب تھا اور دوسرے مصرعہ میں (ایک جگہ) کے بجائے (کسی جگہ) ہونا چاہئے تھا۔ دوسرا مصرعہ یوں ہو سکتا ہے۔ ع ٹھہرا گیا نہ مجھ سے کہیں اضطراب میں۔

عرض مشرت| (نہ) لانے کی ضرورت پہلے مصرعہ میں بالکل نہیں۔ مفہوم یوں بھی صفائی سے ادا ہو رہا ہے دوسرا اعتراض آپ کا ہے کہ بجائے (ایک جگہ) کے (کسی جگہ) ہونا چاہئے اور اسی کی رعایت سے آپ نے 'کہیں' اصلاح دی ہے۔ مگر ایسا کرنے سے شعر کا سارا زور جاتا رہا۔ زور لفظ (ایک) کی وجہ سے ہے۔ مگر شاید آپ زور یعنی (Emphasis) کا مرتبہ شعر میں بالکل نہیں مانتے کیونکہ اس سے پہلے بھی اس طرح کے لایعنی اعتراض آپ نے کئے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک بڑے پہلوان کے سامنے ایک جماعت پہلوانوں کی موجود ہے مگر وہ ان میں سے کسی کو خیال میں نہیں لاتا۔ وہ اُن سے یوں کہے گا "تم میں کوئی مجھ سے نہیں لڑ سکتا" مگر اگر اُسے اپنی بات پر زور دینا ہے تو وہ یوں کہے گا "تم میں سے ایک بھی مجھ سے نہیں لڑ سکتا" دوسرے جملہ میں جو زور موجود ہے وہ محض لفظ 'کوئی' کو 'ایک' سے بدل دینے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے مگر جو رازدار بیہ سے واقف نہیں ہے وہی 'ایک' کے بجائے 'کوئی' یا 'کسی' کے پھیر میں پڑے گا۔

شعر مضطر| یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اعتراض نیاز| کس کو گلستاں بنا دیا؟ سوائے کلیوں کے اور کسی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا اور کلیوں کو

گلستاں بنادینا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ علاوہ اس کے لب کشائی کا نتیجہ گلستاں بنادینا بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ غزلخواں ہوتا تو خیر تعلق پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ نقص پھر بھی باقی رہتا کہ کس کو غزلخواں بنا دیا۔

عرض عشرت| آپ پوچھتے ہیں کس کو گلستاں بنادیا؟ یہ بعینہٖ وہی اعتراض ہے کہ "عاشق کس چیز کو ان کا دل سمجھتا ہے" اور جس کی حقیقت کھل چکی ہے۔ سنئیے "بنا دیا" یعنے "تیار کردیا" ہے۔ یعنے معشوق نے لب کشائی کر کے ایک گلستاں تیار کردیا۔ اب آپ کا صرف یہ اعتراض رہ گیا کہ لب کشائی کا نتیجہ (گلستاں بنادیا) سمجھ میں نہیں آتا۔ تعجب ہے کہ آپ اُردو ہندی کا مشہور محاورہ "منھ سے پھول جھڑنا" نہیں جانتے۔ جب کوئی نہایت خوبصورتی سے بات کرتا ہے تو لوگ یہی کہتے ہیں کہ اس کے منھ سے پھول جھڑتے ہیں معشوق کی لب کشائی کی کیا تعریف کی جائے۔ اسی لئے شاعر نے لکھ دیا کہ لب کشائی کر کے اُس نے گویا ایک گلستاں تیار کردیا۔

شعر صفیر| ہم اس نگاہ ناز کو سمجھے تھے نیشتر　　تم نے تو مسکرا کے رگ جاں بنا دیا

اعتراض نیاز| پہلے مصرعہ میں (اس) بالکل غیر ضروری ہے۔

عرض عشرت| (اس) آپ کی سمجھ میں نا درست ہے مگر حقیقتاً ضروری ہے۔ ہر نگاہ ناز نیشتر نہیں ہوتی۔ ایک خاص موقعہ کی نگاہ نیشتر ہوتی ہے اسی لئے شاعر لکھتا ہے کہ "ہم اس نگاہ کو (جو اس وقت ہم پر ہوئی ہے) نیشتر سمجھے تھے۔"

شعر صفیر| بلبل بہ آہ و نالہ و گل مست رنگ و بو　　مجھ کو شہید رسم گلستاں بنا دیا

اعتراض نیاز| پہلے مصرعہ کے دونوں ٹکڑے ترکیب کے لحاظ سے غیر متوازن ہیں۔ علاوہ اس کے (بلبل بہ آہ و نالہ) کی ترکیب بھی اس موقع پر صحیح نہیں ہے۔ بجائے اس کے (بلبل رہین نالہ) کہہ سکتے تھے۔

عرض عشرت| آپ کے توازن کے بارے میں میں اب کیا لکھوں۔ بارہا اس کی قلعی کھول چکا ہوں۔ مگر معلوم نہیں کہ (بلبل بہ آہ و نالہ) کی ترکیب میں قواعد کی کون غلطی ہے۔ ترکیب بالکل صحیح ہے اس میں قطعی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح کہ بجائے (بلبل بہ آہ و نالہ) کے (بلبل رہین نالہ) ہونا چاہئے۔ آپ نے پھر شاعر کے مفہوم کو کم کر دیا جو آپ کی اصلاح کا طرۂ امتیازی ہے۔ شاعر نے آہ و نالہ دو چیزیں لکھی ہیں اور دونوں چیزیں ایک نہیں ہیں کہ ایک ان میں سے چھوڑ دی جائے جیسا کہ آپ نے اپنی اصلاح میں کیا ہے۔

شعر صفیر| شک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو　　خود کو آزمانے بیٹھے مجھ کو آزمانے میں

اعتراض نیاز| اگر امتحان (آزمائش) میں عاشق رونے لگا تو اس سے خود معشوق کا اپنے آپ کو آزما بیٹھنا کیونکر ظاہر ہوتا ہے اور اس سے معشوق کی آزمائش کیا ہوئی یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے۔

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو گیا ملا اُنھیں آخر مجھ کو آزمانے میں

عرض عشرت | افسوس ہے کہ آپ شعر مطلق نہیں سمجھے۔ پہلا مصرعہ عاشق کی حالت نہیں بیان کرتا بلکہ معشوق کی حالت کا بیان ہے۔ مگر آپ نہ جانے کیا سمجھ کر لکھتے ہیں کہ " اگر امتحان و آزمائش میں عاشق رونے لگا "۔ خیر شعر کا مطلب سُنیے۔ معشوق عاشق کے صبر کی آزمائش کرتا تھا کہ کہاں تک وہ صبر کے ساتھ معشوق کا ظلم برداشت کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ معشوق کو یہ بھی خیال تھا کہ مجھے اپنے دل پر قابو ہے۔ عاشق کی حالت زار دیکھ کر میری حالت کبھی متغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے معشوق نے انتہائی ظلم کیے۔ جس سے عاشق کی حالت اتنی غیر ہو گئی کہ جسے دیکھ کر کوئی بھی اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکے۔ ایسی حالت میں معشوق کی آزمائش ہو گئی معشوق اپنے دل پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اس کے اشک متواتر گرنے لگے۔ چلے تھے عاشق کی آزمائش کرنے مگر خود معشوق کی آزمائش ہو گئی کہ ان کو اپنے دل پر کہاں تک قابو ہے۔

شعر صفحہ | زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اُٹھاتا ہوں تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

اعتراض نیاز | زخم لینا خلاف محاورہ ہے (زخم آپ کھاتا ہوں) ہونا چاہیئے۔

عرض عشرت | محض زخم لینا پر اعتراض ہے۔ آپ کی سمجھ میں "زخم کھانا" ہونا چاہیئے۔ زخم کھانا اُردو کا مشہور محاورہ ہے مگر شاعر کا کام اس سے نہیں چلا۔ شاعر کا مفہوم اس سے وسیع تر تھا۔ اردو میں اپنے موافق لفظ یا محاورہ نہ پا کر شاعر نے ایجاد کی۔ ایجاد اچھی ہے یا بُری اس کا فیصلہ زمانہ کرے گا۔ اگر ایجاد بہتر ہے تو اس کا رواج عام ہو جائے گا اور اگر ردی ہے تو وہ موجد ہی تک محدود رہ جائے گی۔ مگر یہ آئندہ کی بات ہے۔ آپ شعر کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں جس سے مجبور ہو کر شاعر نے " زخم لینا " لکھا ہے۔ زخم کھانے میں قبول و تسلیم کر لینے کا مفہوم نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ اس نے چار زخم کھائے تو اس جملے سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اُس نے اپنی پسند یا طبیعت سے زخم کھائے بڑی خوشی سے ان زخموں کا استقبال کیا اور اُن سے اس کو ایک خاص لذت مل رہی ہے۔ مگر شاعر کو یہ تمام مفہوم ادا کرنا تھا اس لیے اُس نے " زخم لینا " لکھا جس میں قبول و استسلام کے ساتھ ایک لذت بھی شامل ہے۔

شعر صفحہ | سرو بھی جو بار بھی لالہ و گل بہار بھی جس سے چمن چمن بنا ایک وہ مشت پر نہیں

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں ٹکڑوں کی تقسیم غلط ہے (گل) کے بعد (بھی) ہونا ضروری تھا اور اس کے نہ ہونے سے (گل) بہار کے ساتھ مل کر گل بہار ہو جاتا ہے۔ دوسرا مصرعہ سست ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہیئے

سرو بھی جو بار بھی۔ گل بھی ہے اور بہار بھی جس سے مگر چمن بنا اک وہی مشت پر نہیں

عرض عشرت | اعتراض ہے کہ پہلے مصرعہ میں ٹکڑوں کی تقسیم غلط ہے کیونکہ (گل) کے بعد (بھی) ہونا ضروری

تھا۔ ٹکڑوں کی تقسیم بالکل صحیح ہے۔ سرو ایک چیز ہے لہذا اس کے بعد (بھی) ہے۔ جوئبار ایک چیز ہے لہذا اس کے بعد بھی (بھی) موجود ہے مگر لالہ و گل بہار تینوں چیزیں مل کر باغ میں ایک ہو جاتی ہیں کہ بہار کا لالہ و گل سے تعلق ہی نہیں بلکہ اتحاد ہے۔ بہار کو سرو و جوئبار سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ سرو ہر موسم میں سر سبز رہتا ہے اور جوئبار بھی اپنی روانی کے لئے بہار کا محتاج نہیں۔ برخلاف اس کے لالہ و گل کا تعلق بہار سے ایسا ہے کہ باغ میں ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے شاعر نے لالہ و گل بہار تینوں چیزوں کو ایک ساتھ لے کر ان تینوں لفظوں کے لئے الگ الگ (بھی) نہیں لکھا بلکہ ان تینوں لفظوں کے بعد (بھی) استعمال کیا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ گل بہار سے مل کر گلبہار ہو جاتا ہے یہ عجیب اعتراض ہے جا ہے جن دو لفظوں کو ایک میں ملا کے لکھ دیجئے اور اعتراض جڑ دیجئے۔ مثلاً آپ کے اصلاحی مصرعہ میں (گل) بھی کے ساتھ مل کر گلبھی ہو جاتا ہے۔ یہ بیکار کا اعتراض ہے۔ اعتراض کی صورت تو جب ہوتی کہ جب دونوں لفظوں کے ملنے سے ایک مکروہ لفظ بنے جیسے مرزا دبیر کے ایک مصرعہ میں الفاظ "تار پہ دوڑے" پر لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ "پہ دوڑے" مل کے "پدوڑے" ہو گیا جو ایک مکروہ لفظ ہے یہی بات آپ کے ذہن میں تھی مگر آپ کو اس کا محل استعمال نہیں معلوم تھا۔ تیسرا اعتراض ہے کہ دوسرا مصرعہ سست ہے اسی لئے آپ نے اس پر اصلاح دی ہے۔ اصغر صاحب کے مصرعہ میں "چمن چمن" کی تکرار نے بڑا زور یعنی (Emphasis) پیدا کر دیا ہے جس نے پورے شعر کو خوبصورت اور زوردار بنا دیا ہے آپ نے اس خوبصورت تکرار کو بدل کے پورا مصرعہ سست کر دیا مگر اپنے دہی کو کھٹا کون کہتا ہے۔

شعر اصغر | جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے — اے شعبدہ پرداز یہ کیا طرز نظر ہے

اعتراض نیاز | شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جینے مرنے کا ہوش کسے نہیں ہے۔ محبوب کو یا عاشق کو۔ اس لئے پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے۔ ع جینے کا مجھے ہوش نہ مرنے کی خبر ہے۔

عرض عشرت | جس میں ذرا سا بھی ذوق سلیم ہو وہ الفاظ "شعبدہ پرداز" اور "طرز نظر" سے سمجھ لے گا کہ یہ معشوق کے لئے ہیں اور الفاظ "مرنے جینے" سے سمجھ لے گا کہ یہ عاشق کے لئے ہیں۔ اصغر صاحب شعر نہ بچوں کے لئے کہتے ہیں اور نہ جاہل و نیم تعلیم یافتہ جماعت کے لئے۔ ادب کا اور خصوصاً شاعری کا ایک اہم اصول ہے کہ جو بات کنایۃً کہی جا سکتی ہو اُسے صراحۃً نہ کہا جائے مگر آپ نے اپنی اصلاح میں جو کنایہ تھا اُسے بالصراحت بیان کر کے شعر کا لطف چوپٹ کر دیا۔ اگر ایسی ہی اصلاحیں عام طور سے ہونے لگیں تو اُردو ادب کا سر نیچا ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اصغر صاحب کے مصرعہ میں لفظ (کچھ) بڑا زور پیدا کر رہا ہے مگر آپ زور یعنی (Emphasis) کے دشمن ہیں کیونکہ اصغر صاحب کے اشعار میں جہاں جہاں

(ادعماناسعدحک) تھا آپ نے اصلاح دے کے اُسے سادہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

شعر مصنف | ہے تابش انوار سے عالم تہ و بالا — جلوہ وہ ابھی تک تہ دامان نظر ہے

اعتراض نیاز | نہ تابش انوار سے عالم تہ و بالا ہو سکتا ہے اور نہ جلوہ کا دامان نظر سے کوئی تعلق ہے اگر یہ کہا جاتا کہ "وہ جلوہ ابھی تک زیر نقاب ہے" تو البتہ درست ہو سکتا تھا۔

عرض عشرت | اعتراض ہے کہ "تابش انوار سے عالم تہ و بالا" نہیں ہو سکتا۔ آپ شاید تہ و بالا کے معنی نہیں سمجھے۔ آپ اس کے لفظی معنی سے دھوکا کھا گئے اور سوچا کہ "تابش انوار" سے عالم چمک سکتا ہے تہ و بالا یعنے اوپر نیچے نہیں ہو سکتا۔ مگر معمولی سے معمولی علم و عقل کا آدمی بھی جانتا ہے کہ اُردو میں "تہ و بالا" ہونے کے معنے انقلاب ہونے کے ہیں مگر اعتراض آپ کا اب بھی قائم ہے کہ تابش انوار سے کوئی انقلاب بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ آپ کی بھول ہے۔ جلوۂ طور سے پہاڑ جل گیا تھا۔ کیا یہ کوئی انقلاب نہ تھا؟ انقلاب ممکن ہے مگر اس کے لئے کافی زوردار تابش انوار چاہئے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ طور کے جل جانے سے بھی انکار کر جائیں کیونکہ بہت سے مذہبی مسلمات سے آپ صاف انکار کر جاتے ہیں۔ مگر یہ بات فارسی اور اُردو ادب میں مسلم ہے اور ادب کے واقعہ کی صحت کا لزوم نہیں۔ دوسرا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ "جلوہ کا دامان نظر" سے تعلق نہیں ہے۔ سبحان اللہ۔ اگر جلوہ کا تعلق نظر سے نہیں ہے تو کیا اینٹ پتھر سے ہے؟ مگر شاید آپ یہ لکھنا چاہتے تھے کہ جلوہ کا دامن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے آپ "تہ داماں" کے بجائے اپنی اصلاح میں "زیر نقاب" تجویز فرماتے ہیں۔ آپ نے "تہ داماں" کے استعارہ کو بالکل نہیں سمجھا گو کہ ہندوستانی عورتوں میں یہ رسم عام ہے کہ جب وہ چراغ (دیا) لے کر ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی اور صحن یا اور کسی کھلی جگہ سے انھیں گزرنا پڑتا ہے تو وہ روشنی کو آنچل سے چھپا لیتی ہیں تاکہ ہوا سے بجھ نہ جائے۔ روشنی باریک آنچل سے چھن چھن کر نکلتی رہتی ہے۔ اصغر صاحب نے یہیں سے استعارہ لیا ہے جس پر الفاظ "تابش انوار" دال ہیں۔ شعر کے معنی یہ ہوئے کہ جلوۂ حقیقت اتنا زبردست ہے کہ گو کہ وہ انسانی نظر کے دامن کے نیچے چھپا ہے پھر بھی تمام عالم میں اُس کی تابش انوار سے ایک انقلاب ہو رہا ہے اب شاید آپ کا اعتراض ہو کہ نظر کا کام دیکھنے کا ہے چھپانے کا نہیں۔ اس بات کو بھی سمجھ لیجئے۔ نظر کا کام جہاں دیکھنا ہے وہاں حقیقت کو چھپا دینا بھی ہے۔ نظر جب حسن حقیقت کو دنیا میں پھیلا ہوا دیکھتی ہے تو اُسے رنگ و بو۔ لالہ و گل۔ دریا۔ پہاڑ وغیرہ کہہ کر اُس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اصغر صاحب نے یہ مضمون بار بار کہا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

(۱) کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے — مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

(۲) لالہ و گل کا حجگر خون ہوا جاتا ہے — سب سمجھتے ہیں جو ناکام تماشا مجھ کو
(۳) فصل گل۔ جوش نمو۔ ظلمت زیبائے بہار — عرض دیدار پہ یک جلوۂ مستور ہے آج
(۴) صوفی کو ہے مشاہدۂ حق کا ادعا — صدہا حجاب دیدۂ بینا لئے ہوئے
(۵) نیرنگ تماشا وہ جلوہ نظر آتا ہے — آنکھوں سے اگر دیکھو پردا نظر آتا ہے

ایک میرا بھی شعر اسی مضمون کا ملاحظہ ہو ؎

سیکڑوں بار مرے سامنے آیا ہے مگر — چشم بینا کو بنائے ہوئے پردا کوئی

شعر اصغر | در پہ جو تیرے آگیا اب کہیں اُٹھا سے مجھے — گردش مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اعتراض نیاز | پہلا مصرعہ ترکیب نظم کے لحاظ سے بہت سست ہے اور علاوہ اس کے گردش مہر و ماہ کا ذکر بھی بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے۔ اصغر صاحب نے جو مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے اُس کے لحاظ سے شعر یوں ہونا چاہئے تھا ؎

بات نصیب کی ہے یہ در ترا مجھ کو مل گیا — گردش مہر و ماہ بھی دیکھی ہے ورنہ راہ میں

عرض عشرت | اعتراض یہ ہے کہ پہلا مصرعہ سست ہے۔ آپ نے اصلاح دی ہے اور ہمیشہ کی طرح چوپٹ اصغر صاحب کے شعر میں "در پہ جو تیرے آگیا" میں جو لطف اور جو التجا اور لجاجت ہے وہ آپ کی اصلاح میں مفقود ہے۔ آپ کا اصلاحی مصرعہ اصغر صاحب کے مصرعہ سے ہر معنی میں سست ہے۔ اصغر صاحب کے دوسرے مصرعہ میں الفاظ "دیکھ چکا" لاکھ روپیے کے ہیں جن سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ اب دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ مگر آپ نے اصلاح میں یہی الفاظ نکال کر شعر کو مفہوم کے اعتبار سے اور لفظی خوبصورتی کے بھی اعتبار سے مٹا کر رکھ دیا۔

شعر اصغر | تو بہت سمجھا تو کہہ گذرا فریب رنگ و بو — یہ چمن لیکن اُسی کی جلوہ گاہ ناز ہے

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ میں لفظ (لیکن) کا استعمال صحیح نہیں ہوا۔ اس جگہ (ورنہ) ہونا چاہئے۔

عرض عشرت | نیاز صاحب آپ شاعر کا پورا مفہوم نہیں سمجھے۔ شاعر کہتا ہے کہ تو نے اگر چمن کی حقیقت جاننے میں بڑی تحقیق کی تو یہاں تک پہونچا کہ اس کو فریب رنگ و بو کہہ گذرا۔ اس کے بعد یہ جملہ (اگر تیری تحقیق میں یہی آتا ہے تو یہی کہتا رہ) چھپا ہوا ہے جو قرائن سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ لیکن یہ چمن اسی کی جلوہ گاہ ہے۔ یعنے تیری تحقیق میں اگر چمن فریب رنگ و بو ہے تو تو اس کو مانا رہ یا کہتا رہ لیکن یہ چمن اسی کی جلوہ گاہ ناز ہے۔ اس میں (ورنہ) کی گنجائش کہیں نہیں ہے اور (لیکن) کا حرف برمحل ہے۔

شعرِ اصغر | بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا — اب قفس بھی ہم اسیروں کو پرِ پرواز ہے

اعتراضِ نیاز | ذوقِ رہائی اور رہائی میں بڑا فرق ہے اس لئے جب تک پہلے مصرعہ میں واقعتاً رہائی نہ دکھائی جائے۔ دوسرے مصرعہ میں یہ دعوے کر بیٹھنا کہ قفس بھی پرِ پرواز ہوگیا ہے درست نہیں۔

عرضِ حسرت | آپ اکثر استعاروں کو لفظی معنی میں سمجھ کر اُردو ادب پر بڑی بیداد کرتے ہیں۔ اصغر صاحب نے لکھا کہ "قفس بھی پرِ پرواز ہے" اس سے آپ کے اڑے بلبل محبوس واقعی اُڑنے لگا۔ سنئے۔ جس چیز سے آدمی منع کیا جاتا ہے اس کی طرف طبیعت خواہ مخواہ مائل ہوتی ہے۔ یہ نفسیات کا ایک مسلم الثبوت مسئلہ ہے جس سے جاہل تک واقف ہے۔ بلبل میں آزاد رہ کر سیرِ چمن کی تمنا فطری ہے۔ مگر جب اُسے قفس میں رکھا گیا تو اس کی فکرِ رہائی و آزادی اور تیز ہوگئی۔ اس کا خیال قفس سے اُڑ کے باغ کی سیر کرنے لگا۔ کوئی خیال کو بیڑی نہیں پہنا سکتا بلکہ خیال بیڑیوں سے اور آزاد ہو جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہے اور آپ نے خدا جانے کیا سمجھا کہ رہائی اور ذوقِ رہائی میں فرق دکھانے لگے۔

شعرِ اصغر | عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا ظرف دید — میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

اعتراضِ نیاز | پہلے مصرعہ میں لفظ عام کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ بجائے اس کے "ایک" کا لفظ زیادہ برمحل ہے۔

عرضِ حسرت | آپ کو لفظ (عام) پر اعتراض ہے۔ شاعر کا مفہوم کہ جلوۂ حقیقت سب جگہ بے پردہ نمایاں ہے اور سب کے لئے عام ہے۔ لفظ عام کے لئے ایک شعر میر ابھی ملاحظہ ہو:

اس کم نظری نے مجھے محروم ہی رکھا — جلوہ ہے ترا عام مگر عام نہیں ہے

مفہوم کے لحاظ سے لفظ (عام) شعر میں نہایت ضروری ہے مگر آپ اُسی کو بدل رہے ہیں۔

شعرِ اصغر | دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے — جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا ہونا

اعتراضِ نیاز | پہلے مصرعہ میں لفظ (سے) نمایاں کے ساتھ تو استعمال ہو سکتا ہے لیکن پنہاں کے لئے (میں) چاہئے اس لئے یہ مصرع اس طرح ہونا چاہئے تھا۔ ع دہر ہی سے وہ نمایاں ہے اسی میں پنہاں۔ دوسرے مصرعہ کی ردیف بالکل بیکار ہے کیونکہ (ہونا) کو حذف کر دینے کے بعد بھی معنے پورے ہو جاتے ہیں۔

عرضِ حسرت | اعتراض محض یہ ہے کہ پنہاں کے ساتھ (سے) غلط ہے (میں) ہونا چاہئے۔ آپ اکثر شاعر کا مفہوم کلیۃً نہیں سمجھتے اور استادی کے زعم میں خواہ مخواہ اصلاح دینے لگتے ہیں۔ شاعر کا مفہوم ہے کہ دہر جلوۂ حقیقت کے لئے ایک پردہ ہے مگر یہ پردہ ایسا نہیں ہے کہ جلوۂ حقیقت کو کلیۃً چھپا دے کیونکہ اسی میں سے ایک جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔ اب غور کیجئے کہ دہر ایک ایسا پردہ ہے جس سے

جلوۂ حقیقت نمایاں ہے اور جس سے جلوۂ حقیقت پنہاں بھی ہے۔ ایک چیز پنہاں پردے سے بھی ہو سکتی ہے اور پردہ میں بھی دونوں صحیح ہیں مگر آپ کو تو خواہ مخواہ کا اعتراض کردینا آتا ہے۔ آپ کا دوسرا اعتراض ہے کہ ردیف بیکار ہے۔ خیر بہتر ہے آپ شعر کی نثر کر ڈالیں وہ یوں ہوئی "دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے (اور) دہر ہی سے وہ پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا (کا) ہونا" آپ کے اعتراض کے مطابق ردیف (ہونا) بیکار ہے اُسے نکال ڈالئے۔ اب نثر یوں ہوئی "دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے (اور دہر ہی سے وہ) پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا" جملہ رہ جاتا ہے جب تک کوئی فعل ناقص اس میں نہ جوڑیے۔ چاہے آپ (ہونا) کے بجائے (ہوتی ہے) لکھیں یا اور کچھ لکھیں مگر بغیر اس کے لفظوں سے مفہوم ادا نہ ہوگا۔

شعر اصغر | جلوۂ ذوق پرستش۔ گرمیٔ حسن نیاز   ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

اعتراض نیاز | اس شعر میں بھی (ردیف) بیکار ہے اور (ہے) حذف کرنے سے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا علاوہ اس کے معنوی نقص یہ ہے کہ کعبہ کے لئے جلوۂ ذوق پرستش لائے ہیں اور بتخانے کے لئے گرمیٔ حسن نیاز۔ حالانکہ نیاز و پرستش میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے جو کعبہ و بتخانہ ایسی دو متضاد چیزوں کے امتیاز کو ظاہر کر سکے اسی کے ساتھ لفظ حسن کا استعمال بھی ذوق کے مقابلہ میں درست نہیں۔ حسب ذیل تغیر سے یہ شعر بلند ہو سکتا ہے ؎

ذوق خالص ہے یہاں واں ذوق کی صورتگری   ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

عرض عشرت | آپ کا اعتراض ہے کہ ردیف بیکار ہے مگر جب آپ اصلاح دینے لگے تو آپ نے بھی وہی غلطی کی۔ بندہ پرور ردیف بیکار نہیں ہے۔ زور دینے کے لئے (ہے) کا لفظ دہرایا گیا ہے۔ ورنہ اس کے حذف کرنے سے جیسا کہ آپ لکھتے ہیں اس کے حذف کرنے سے بھی مفہوم پورا ہو جاتا ہے مگر آپ نے (Emphasis) کے نکتہ کو سمجھنے میں ہمیشہ غلطی کی ہے۔ دوسرا اعتراض آپ کا یہ ہے کہ کعبہ و بتخانہ دو متضاد چیزیں ہیں مگر اصغر صاحب کی نگاہ بلند میں کعبہ و بتخانہ بالکل یکساں چیزیں ہیں کیونکہ دونوں جگہ اسی خدا کی پرستش ہوتی ہے۔ اس لیے دونوں کے لئے یکساں الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس لئے آپ کی اصلاح لایعنی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی اصلاح میں ایک فاش غلطی ہے۔ آپ نے لفظ (واں) وہاں کے معنے میں استعمال کیا ہے جو مدت ہوئی اُردو غزل میں متروک ہو چکا ہے۔

شعر اصغر | ہے تقاضا ترے جلوہ کی فراوانی کا   ہمہ تن دیدہ نہیں مجھ کو سراپا دیکھیں

اعتراض نیاز | دوسرے مصرعہ کا کوئی ایک سا ٹکڑا مفہوم پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دونوں میں ربط

اس لئے نہیں ہے کہ سراپا دیکھنے لئے ہمہ تن دیدبن جانا بالکل غیر ضروری ہے۔ علاوہ اس کے جلوہ کی فراوانی تو اس امر کی مقتضی ہے کہ ہمہ تن دیدبننے کے بعد بھی تکمیل نظارہ نہ ہو سکے۔ لفظ (تقاضا) بھی بےمحل استعمال کیا گیا ہے۔ میرا مشورہ اس شعر کے متعلق یہ ہے ؎

ہے یہ عالم ترے جلوہ کی فراوانی کا ہمہ تن دید ہوں پھر بھی نہ سراپا دیکھیں

عرض عشرت | دوسرے مصرعہ کے دونوں ٹکڑوں میں سے کوئی غیر ضروری نہیں ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ سراپا دیکھنے کے لئے ہمہ تن بالکل غیر ضروری ہے مگر یہ غلط ہے معشوق کو ایک ہی وقت سے سر سے پیر تک دیکھ لینے کے لئے ہمہ تن دید بننا لازمی ہے۔ آنکھ ایک وقت میں معشوق کے ایک مقام پر پڑے گی اس لئے معشوق کا سراپا دیکھنا بالکل ناممکن ہے۔ ہاں اگر ہمہ تن دیدبن جائے تو البتہ معشوق کو سراپا یک وقت دیکھ سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ لفظ 'تقاضا' کا استعمال بےمحل ہے۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ مفہوم شاعر یہ ہے کہ معشوق کے جلوہ کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مجھ کو سراپا دیکھنا چاہتے ہو تو ہمہ تن دیدبن جاؤ مگر خدا جانے آپ کیا سمجھ کر لفظ (تقاضا) کو بےمحل سمجھتے ہیں۔ دوسری بات آپ یہ لکھتے ہیں کہ "جلوہ کی فراوانی تو اس امر کی مقتضی ہے کہ ہمہ تن دید بننے کے بعد بھی تکمیل نظارہ نہ ہو سکے" اس لئے آپ نے اصلاح دی ہے "ہمہ تن دید ہوں پھر بھی نہ سراپا دیکھیں" آپ کی عبارت میں دو باتیں قابل دید ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کو لفظ (تقاضا) پر اعتراض ہے مگر مطلب ادا کرنے کے لئے آپ اُسی لفظ کی دوسری شکل (مقتضی) استعمال کرتے ہیں۔ یعنے مفہوم شاعر ادا کرنے کے لئے آپ بھی وہی لفظ استعمال کرنے کے لئے مجبور رہیں۔ دوسری بات آپ جلوہ کی فراوانی کے بارے میں تکمیل نظارہ نہ ہو سکنے کی لکھتے ہیں اور اسی پر آپ کی اصلاح کا دارومدار ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ جس طرف آپ اشارہ اور جس کے لئے آپ اصلاح کی زحمت اُٹھا رہے ہیں وہ بات کنایۃً شعر میں پہلے ہی موجود ہے۔ کنایہ یہ ہے کہ معشوق کو سراپا دیکھنے کے لئے ہمہ تن دیدبن جانے کی شرط ہے اور انسان کا ہمہ تن دید دفعۃً بن جانا ناممکنات سے ہے۔ اس لئے تکمیل دید بھی ناممکن ہے۔ مگر جو بات کنایہ میں کہی گئی تھی اُسے آپ نے بالصراحت بیان کی حالانکہ ادب لطیف کے لئے ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ کنایات اور اشارات پر مبنی ہو مگر شاید آپ ادب کے اس مسلم الثبوت اصول کی پروا نہیں کرتے۔

شعر صفر | ساقیا جام بہ کف پھر ہو ذرا گرم نوا حسن یوسف۔ دم عیسےٰ۔ ید بیضا دیکھیں

اعتراض نیاز | پہلے مصرعہ میں ساقی سے خطاب کرکے دو باتوں کی فرمائش کی جاتی ہے ایک یہ کہ جام بہ کف ہو اور دوسرے یہ کہ گرم نوا ہو حالانکہ لفظ (ہو) صرف ایک جگہ واقع ہے خواہ اُس کو جام بہ کف سے متعلق کیجئے یا گرم نوا سے۔ جام بہ کف ساقی کی صفت ہو نہیں سکتی کیونکہ حرف ندا اس کے بعد موجود ہے۔ اگر ساقی

جام بہ کف کیا جاتا تو یہ تعلق باقی نہ رہتا۔

عرض عشرت | آپ کے تمام اعتراض اس پر مبنی ہیں کہ آپ اصغر صاحب کے مصرعہ کی نثر نہیں کر سکے گو کہ اسکول میں چوتھی جماعت کا معمولی لڑکا بھی اس میں فیل نہیں ہو سکتا۔ سنئے۔ پہلے مصرعہ کی نثر یوں ہوئی "ساقیا جام بہ کف ذرا گرم نوا ہو" یعنے اے ساقی (تو) ذرا جام بہ کف گرم نوا ہو" دوسرے لفظوں میں۔ "اے ساقی ہاتھ میں جام لے کے ذرا پھر نغمہ سرائی کر" دوبارہ اس جملہ میں ہو لکھنا حماقت ہے اور اس پر اصلاح دینا حماقت در حماقت۔

شعر اصغر | عبث ہے دعوئ عشق و محبت خام کا اُن کو　　　یہ غم دیتے ہیں جس کو جوہر قابل سمجھتے ہیں

اعتراض نیاز | دوسرا مصرعہ مفہوم کے لحاظ سے ناقص ہے کیونکہ (یہ غم) کے بعد جب تک (اُسے) کا اضافہ نہ کیا جائے معنے پورے نہیں ہوتے۔

عرض عشرت | جس (اُسے) کی آپ ضرورت سمجھتے ہیں وہ اس جملہ میں محذوف ہے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ ان دونوں جملوں پر غور کیجئے (۱) ہم جس کو سمجھیں گے انعام دیں گے (۲) جس کو ہم بہتر سمجھیں گے اُس کو انعام دیں گے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے جملے میں سے اگر اُس کو نکال دیا جائے تو معنے میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا بلکہ ایک خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ عمدہ شاعری تمام تر اشارات پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں جتنے الفاظ نکالے جا سکیں نکال ڈالے جائیں مگر شرط یہ ہے کہ معنی آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔

نعتیہ غزل

(جناب مولانا فیض اللہ صاحب فیض خضری تونسوی)

فدا ہے یوں مرا دل جلوۂ محبوب یزداں پر　　　تصدق جس طرح کبک دری ہو ماہ تاباں پر

مرا رونا کبھی لے چشم تر خالی نہ جائے گا　　　یہ آنسو میرے پانی پھیر دیں گے فردِ عصیاں پر

زلیخا دیکھ لیتی میرے یوسف کو تو یہ کہتی　　　اسے ترجیح ہے دوچند حُسنِ ماہِ کنعاں پر

مدینہ سے صبا لائی ہے بوئے گیسوئے احمدؐ　　　عجب کیا اوس پڑ جائے چمن میں سنبلستاں پر

فدا ہو پہنچائے گا جب ہند سے مجھ کو مدینہ میں　　　کروں گا شکر کے سجدے درِ محبوبِ یزداں پر

سُنا ہے فیض تھی ساری خدائی تابع فرماں
کھُدا تھا نام شاہِ دیں کا کیا مُہرِ سلیماں پر

نواب سلطان بہو صاحبہ

محل خاص حضرت نصیر الدین حیدر تاجدار اودھ

(جناب شیخ تصدق حسین صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

نواب سلطان بیگم المخاطب بہ نواب سلطان بہو صاحبہ مرزا سلیمان شکوہ شہزادہ دہلی کی لاڈلی بیٹی اور حضرت شاہ عالم شہنشاہ دہلی کی پوتی تھیں۔ لڑکپن میں گھر والے پیار سے اُن کو بوا سلطانہ بھی کہتے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ حضرت شاہ عالم کے دوسرے بیٹے نواب قدسیہ بیگم کے بطن سے تھے جو ایران کے شاہی صفویہ خاندان کی ایک رکن اور امامیہ مذہب کی پیرو تھیں۔ شہزادہ موصوف بھی اپنی ماں کے مذہب پر تھے۔ بعد بغاوت غلام قادر روہیلہ جس نے شاہ عالم کو نابینا کر دیا تھا سلطنت دہلی کی حالت ابتر ہو گئی۔ اگلا سا وہ تجمل اور احتشام نہ رہا۔ جہاں ہر طرف غنچہ و گل تھے وہاں نیرنگی زمانہ سے اب بالکل خار ہی خار دکھائی پڑتے تھے۔ جب ضروریات زندگی کے بھی لالے پڑے اور پریشانیوں نے ہر طرف سے نرغہ کیا تو شہزادہ نے بصد حسرت و یاس ترک وطن کا عزم کیا۔ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے کئی گوجر ملازم رکھے اور ایک گھوڑا سواری کے لئے اُن کے ساتھ کر کے دریا کے پار اُتار دیا اور خود بھی تاریکی شب میں کمند ڈال کر قلعہ کی بلند فصیل سے نیچے اُتر آئے پھر ایک گوجر کی پیٹھ پر دریا عبور کر کے دوسری طرف آئے اور تیس کوس تک اُس برق رفتار گھوڑے پر چل کر داخل ریاست رامپور ہوئے۔ وہاں اُن کا بہت شاندار خیر مقدم ہوا۔ نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور نے خیمہ میں اتار کر گرانقدر نذرانہ پیش کیا جس سے کلفتیں دُور ہو گئیں اور سامان شاہانہ فراہم ہو گیا۔

وہاں سے رخصت ہو کر لکھنؤ کا رُخ کیا اور صوبہ اودھ میں داخل ہو کر ناکہ شہر لکھنؤ میں تکیہ بودعلی شاہ کے قریب ایک باغ میں بہ جمعیت پانچ ہزار سوار و پیدل شاگرد پیشہ وغیرہ فروکش ہوئے۔ خیموں میں قیام کیا۔ مگر شہزادہ کی آمد نواب آصف الدولہ کے بار خاطر ہو گئی انھوں نے داخلہ شہر کی اجازت نہ دی کیونکہ چار سال قبل ۱۷۸۸ء میں شہزادہ کے برادر معظم مرزا جہاندار شاہ عرف مرزا جواں بخت بھی دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تھے جن کی پنشن نواب آصف الدولہ نے نہایت فیاضی سے پچیس ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دی تھی مگر شہزادہ موصوف سے کچھ ایسے افعال ناروا سرزد ہوئے

سمجھتے تھے کہ آصف الدولہ کا آئینہ دل اُن کی طرف سے غبار آلود ہو گیا تھا جس پر اُنھوں نے لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے بنارس میں استقامت فرمائی۔

نواب آصف الدولہ خیال کرتے تھے کہ مرزا سلیمان شکوہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی کے ہو گئے اور اگر شہزادگان دہلی اسی طرح لکھنؤ میں آکر بستے رہے تو میری پوری آمدنی گذاروں اور پنشنوں کی نذر ہو جائے گی اس لئے نواب نے شہزادہ سے معذرت کہلا بھیجی کہ جو عہد نامہ میں نے سرکار انگریزی سے کیا ہے اُس کی رو سے بلا اصلاح و مشورہ نواب گورنر جنرل فوری حاضر خدمت نہیں ہو سکتا۔ آخر کار اکرام اللہ خاں نے اپنے بھائی تفضل حسین خاں نائب الریاست کو موافق کیا انھوں نے گورنر جنرل کو سمجھا بجھا کر اجازت ملاقات دلوائی۔ نواب نے شہزادہ کے قیام گاہ پر جاکر اُن کا استقبال کیا جو تخمیناً تین ماہ سے خیموں میں بسر کر رہے تھے۔ شہزادہ ایک کوہ پیکر ہاتھی پر متمکن ہوئے نواب حسب دستور وزیر اعظم خواصی میں بیٹھ کر مورچھل کو جنبش دیتے ہوئے بڑے جاہ و جلال سے لکھنؤ میں لائے۔ بنگلہ مرزا خلیل میں قیام ہوا جو قریب کوٹھی رزیڈنسی کنار دریا واقع تھا پھر جنرل مارٹین کی ٹیڑھی کوٹھی خرید کر اُس میں منتقل ہو گئے۔ اُس کے بعد لارڈ کارنوالس گورنر جنرل لکھنؤ تشریف لائے تو اُن کی سفارش سے چھ ہزار روپیہ ماہوار بطور مصارف باورچی خانہ سرکار نواب اودھ سے مقرر ہوئے۔ خان زادہ خاں کو داروغگی ذات خاص تفویض ہوئی۔ شہزادہ موصوف تاریخ آمد سے تا سنہ جلوس شاہ زمن غازی الدین حیدر کمال اعزاز و احترام سے لکھنؤ میں رہے جب نواب سعادت علی خاں مسند نشین ریاست ہوئے اور دولت خانہ قدیم تعمیر کردہ نواب آصف الدولہ کو چھوڑ کر عمارت فرح بخش جنرل مارٹن سے خرید کر اُس میں سکونت اختیار کی تو ہمسائیگی شاہزادہ کو خلاف آداب شاہی سمجھ کر کوٹھی آمل صاحب کنار دریا متصل رزیڈنسی بمعاوضہ ٹیڑھی کوٹھی شہزادہ کو دی۔

نواب سعادت علی خاں و نواب غازی الدین حیدر خاں تا قیام با وشاہت بطریق وزیر اعظم حسب دستور قدیم پیش آیا کئے یعنے شہزادہ کو نذر دیتے تھے اور خلعت پہنتے تھے اور جب کبھی شارع عام پر شہزادہ ممدوح اور نواب موصوف کی سواریوں میں مڈبھیر ہو جاتی تھی تو نواب کی سواری کا ہاتھی ازراہ ادب بٹھا دیا جاتا تھا اور شہزادہ کا ہاتھی نکل جاتا تھا۔

۱۸۱۸ء میں جب نواب غازی الدین حیدر خاں شاہ اودھ قرار پائے تو شہزادہ سے مساویانہ ملاقات کے طالب ہوئے مگر اُنھوں نے اپنی شان برقرار رکھ کر اس طور سے ملاقات کی کہ شاہ غازی الدین حیدر کا غنچۂ دل کھلا کر رہ گیا اُن کا منشا دلی پورا نہ ہوا اُس روز سے جانبین کے دل ایسے مکدر ہو گئے

کہ نصیر الدین حیدر کی شادی تک ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

بعد قیام بادشاہت غازی الدین حیدر نے خیال کیا کہ میں بادشاہ کے منصب جلیلہ پر فائز ہوا ہوں اب خاندان تیموریہ سے رشتہ قائم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اُنھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر کو مقرر کیا کہ وہ مرزا سلیمان شکوہ کو رضامند کریں کہ وہ اپنی دختر سلطان بیگم کی شادی ولی عہد سلطنت نصیر الدین حیدر سے کر دیں بعض شہزادگان دہلی مقیم لکھنؤ راوی ہیں کہ اولاً شہزادہ نے یہ رشتہ قائم کرنے سے بوجوہ صاف انکار کر دیا۔ اُس پر اُن کی تنخواہ روک دی گئی جس سے سخت مالی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور گوناگوں مصائب کا چشمہ اُبل پڑا۔ شہزادے کے متعلقین و متوسلین کی تعداد کئی سو تھی ایک روز روپیہ کا ایسا توڑا ہو گیا کہ دستر خوان پر صرف بھنے ہوئے چنے آئے اس پر شہزادہ اشکبار ہو گئے۔ آغا میر نے میر گلزار علی خاں رفیق الدولہ کو جو شہزادہ کے عقل کل تھے بہ طمع زر ہموار کیا انھوں نے شہزادہ کے محل خاص نواب نوازش محل کو نشیب و فراز سے باخبر کیا۔ بے زر بے پر ہوتا ہے آخر کار اپنی چہیتی اور دلنواز بیوی نواب نوازش محل اور مختار کے سمجھانے سے از راہ مصلحت و دور اندیشی رضامند ہو گئے۔

شادی بڑی دھوم دھام اور تکلفات شاہانہ سے ہوئی اس شادی سے غازی الدین حیدر کا غنچہ دل باغ باغ ہو گیا۔ نواب سلطان بیگم کو سسرال سے نواب سلطان بہو صاحبہ خطاب عطا ہوا اور پانچ کروڑ روپیہ مہر قرار پایا۔ بروقت شادی بجائے چھ ہزار روپیہ ماہوار گذارہ کے شاہ اودھ نے شہزادہ کے سات ہزار روپیہ ماہوار کر دیے اور جب دونوں سمدھیوں میں مساویانہ طور پر ملاقات ہوئی تو پانچ ہزار روپیہ اور اضافہ کر کے جملہ بارہ ہزار روپیہ ماہوار گذارہ کے کر دیے۔

نواب سلطان بہو نہایت مقبول صورت۔ خوش خلق اور پیکر شرم و حیا تھیں مگر میاں بیوی میں ہمیشہ اَن بَن رہی کبھی موافقت نہ ہوئی۔

اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے۔ تاجپوشی سے ایک سال کے اندر ہی جون ۱۸۲۸ء میں خسر اور داماد میں چشمک ہو گئی۔ سبب یہ ہوا کہ شہزادہ کی ایک بیگم سرفراز محل نامی ایک لڑکی مانخاں کلاونت کی لے کر بطور اپنی بیٹی کے ناز و نعم سے پالی تھی اس کا نام قمر چہرہ تھا اُس کا مکھڑا واقعی چاند کا ٹکڑا تھا۔ جب سن تمیز ان ہوئی تو اُس کے حسن و جمال کا شہرہ سُن کر نصیر الدین حیدر اُس کے عاشق زار ہو گئے اور اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں اپنے وزیر اعظم کو شہزادہ کے پاس بھیجا کہ اگر آپ اُس کا نکاح مجھ سے کر دیں تو پانچ ہزار روپیہ ماہوار اور اضافہ کر دوں گا۔ شہزادہ نے باعث بدنامی

سمجھ کر کہ گھر گھر چرچا ہوگا کہ اپنی بیٹی پر خود سوت مسلط کر دی قبول نہ کیا اس پر بادشاہ بہت چراغ پا
ہوئے اور ایک روز جب شہزادے کے محلات اپنے باغ جا رہے تھے تو نصیر الدین حیدر نے ایک کٹنی
کے ذریعے سے قمر چہرہ کی سواری نواب سلطان بہو کے محل میں اُتروا دی۔ شہزادہ نے خبر پاتے ہی اس
امر کی فریاد ریزیڈنٹ سے کی اُنھوں نے نصیر الدین حیدر سے کہلا بھیجا کہ اس معاملہ میں آپ کی بڑی
رسوائی ہوگی اور ہنگامہ عظیم ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے بہتر ہوگا کہ آپ اس لڑکی کو فوراً واپس
کر دیں۔ نصیر الدین حیدر نے قمر چہرہ کو سوار کر کے بھیج دیا اور رزیڈنٹ سے یہ کہہ کر بات بنا دی کہ وہ
اپنی ہمشیرہ نواب سلطان بہو کی ملاقات کو محل میں گئی تھیں یہ مجھ پر تہمت تراشی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ
نصیر الدین حیدر نے اُن کے گذارہ سے مبلغ پانچ ہزار روپیہ جو بر وقت ملاقات مساویانہ مقرر ہوئے
تھے تنخواہ سے کم کر دیے۔ جب قمر چہرہ شہزادہ کے یہاں واپس آئی تو اُنھوں نے اُس کے پیر میں
بیڑیاں ڈال کر قید کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد شہزادہ کو لکھنؤ میں رہنا وبال جان ہو گیا اُنھوں نے اپنے سمدھی کرنل گارڈنر
رئیس کاسگنج کو جن کی پوتی سوسن گارڈنر (Suzanne Gardner) شہزادہ کے ایک بیٹے
کو منسوب تھیں بلا بھیجا۔ کرنل موصوف لکھنؤ آکر شہزادہ کو کاسگنج لے گئے اور قمر چہرہ کو اپنی بیگم کی
نگرانی میں کر دیا جو صوبہ بمبئی کے ایک مسلمان رئیس کی بیٹی تھیں۔ یہاں کرنل گارڈنر کے بیٹے جیمس گارڈنر
پر قمر چہرہ کے حسن فسوں ساز کا ایسا جادو چل گیا کہ وہ اُسے لے اُڑے اور خفیہ طور پر الور جا پہونچے
کرنل گارڈنر جو نہایت ہی شریف النفس انگریز تھے اس حرکت نازیبا کی وجہ سے اپنے بیٹے کی صورت
سے بیزار ہو گئے۔ اُن کے خطوط کا بھی کبھی کوئی جواب نہ دیا۔ جیمس گارڈنر اور قمر چہرہ دو سال تک
متواتر جنگلوں میں حیران و پریشان گھومتے رہے۔ ایک روز جیمس گارڈنر نے اپنے باپ کو کشتی میں سوار
دیکھ کر تہیہ کر لیا کہ یا تو آج عفو تقصیر کراؤں گا یا جان پر کھیل جاؤں گا چنانچہ وہ کشتی کے ساتھ مسلسل
تیرتے رہے مگر کرنل گارڈنر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر کار جب اُنھوں نے دیکھا کہ جیمس گارڈنر بالکل
شل ہو گئے ہیں اور عنقریب غرق آب ہوا چاہتے ہیں تو محبت پدری قوت ارادی پر غالب آئی۔
اُنھوں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کشتی پر بٹھا لیا اور خطا بھی معاف کر دی اس کے بعد جیمس گارڈنر کی شادی
باقاعدہ قمر چہرہ کے ساتھ ہو گئی اور تین اولادیں بھی پیدا ہوئیں جن کے نام سلیمان۔ ولیم گارڈنر۔
اور نوشابہ بیگم ہیں۔

اس واقعہ سے شہزادہ کو اور بھی زیادہ کوفت ہوئی اور کاسگنج کی سکونت ترک کر کے اکبر آباد

میں قیام اختیار کیا۔ اُن کی صاحبزادی نواب سلطان بہو مثل سابق اودھ میں مقیم تھیں اور یہاں تیرِ ستم کا نشانہ بنتی رہیں۔ نصیر الدین حیدر نے اپنی تخت نشینی کا سالانہ جشن اکتوبر ۱۸۳۵ء میں بڑے تزک و احتشام سے منایا تھا۔ اُس روز ایک یورپین خاتون بیگمات شاہی کو دیکھنے کے اشتیاق میں دولتسرائے سلطانی گئی تھیں اُن کا بیان ہے کہ میں بادشاہ کے خاص محل نواب سلطان بہو کو نہ دیکھ سکی کیونکہ مجھے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ اُن پر عتاب شاہی نازل ہے اور وہ کسی محل میں اسیروں کی طرح زندگی کے دن گذار رہی ہیں۔

دیگر مورخین نے بھی واقعات متذکرہ بالا کی تصدیق و تائید کی ہے مثلاً فانی پارکس (Fanny Parkes) ایک فرانسیسی خاتون بسلسلہ سیاحت ہند ۱۸۳۱ء میں شہر لکھنؤ بھی آئی تھیں وہ اپنے سفرنامہ میں تحریر کرتی ہیں کہ بیگمات شاہی اودھ کے کچھ اندرونی حالات مجھے ایک ایسے شخص کی زبانی معلوم ہوئے جس نے مجھ کو تاکید کردی تھی کہ سردست یہ باتیں آپ اپنے تک رکھیے گا اور کسی کو نہ معلوم ہونے پائیں ورنہ آپ کی اودھ سے واپسی پر اگر یہ پتہ چل گیا کہ یہ راز ہائے سربستہ میں نے طشت ازبام کئے ہیں تو اس کی پاداش میں میری جان پر بن جائے گی۔ وہ حالات یہ ہیں:-

"ملکہ یعنے نواب سلطان بہو ہزرائل ہائینس (His Royal Highness) مرزا محمد سلیمان شکوہ کی بیٹی ہیں جو موجودہ شہنشاہ دہلی اکبر شاہ ثانی کے حقیقی بھائی ہیں۔ شادی کے اول ہی روز سے ملکہ صاحبہ کے ساتھ لاپروائی اور بے التفاتی برتی گئی اور مناسب برتاؤ بھی اُن کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ تھوڑے عرصہ قبل تک اُن کو صرف بیس روپیہ یومیہ یعنے چھ سو روپیہ ماہوار ملتے تھے آج کل وہ دو ہزار روپیہ ماہوار پا رہی ہیں مگر محل کے باہر قدم رکھنے کی اُن کو مطلق اجازت نہیں ہے۔ اُن کے خاندان کے کل قدیم ملازمین کو جواب دے دیا گیا ہے اور فی الحقیقت وہ ایک نظربند کی حیثیت سے ایام زندگی کاٹ رہی ہیں۔ نہ کبھی بادشاہ اُن کے پاس جاتے ہیں نہ بادشاہ کے کوئی عزیز اور رشتہ دار نہ کسی دوسرے شخص کی مجال ہے جو اُن کی قیام گاہ کی طرف رُخ بھی کر سکے۔ اہلیہ رزیڈنٹ نے مجھ سے بیان کیا کہ ملکہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہیں ایسی حسین و جمیل عورت میری نظر سے کبھی نہیں گذری مجھے اُن کی ہمشیرہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کو دیکھ کر میں بآسانی یقین کر سکتی ہوں کہ ملکہ کی رعنائی و زیبائی بیان کرنے میں ذرہ برابر مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی کتخدائی کو تخمیناً پانچ سال گذرے ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی کی زیادہ سے زیادہ سولہ یا سترہ بہاریں دیکھی ہوں گی۔

ملکہ کے والد عمدہ نواب آصف الدولہ سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ شاہ مرحوم غازی الدین حیدر نے اُن کو مجبور کیا کہ اپنی بیٹی کی شادی مرزا نصیر الدین حیدر اُن کے ولی عہد کے ساتھ کر دیں۔ مرزا سلیمان شکوہ کو باہزار روپیہ ماہوار بطور گذارہ ملتے تھے۔ اب اس رقم کی ادائی بھی رُک گئی ہوئی ہے اور ماہ جون ۱۸۳۱ء شاہزادہ موصوف کی ایسی توہین اور تذلیل کی گئی کہ وہ شہر لکھنؤ کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے خاندان تیموریہ کی یہ چشم و چراغ شہزادی بُرا سلطانہ اپنے باپ کے اس امر پر مجبور کئے جانے پر کہ وہ ان کی شادی نصیر الدین حیدر کے ساتھ کر دیں نہایت آزردہ اور برافروختہ ہیں اور بمقابلہ خود نصیر الدین حیدر کو اس قدر ادنیٰ اور کم ذات آدمی خیال کرتی ہیں کہ نہ وہ کبھی اپنے محل میں اُن کے آنے کی روادار ہوئیں نہ کبھی اپنے پلنگ پر انھیں قدم رکھنے دیا۔"

سلیمن صاحب رزیڈنٹ اودھ بھی نواب سلطان بہو کے بڑے معترف اور مداح تھے۔ اپنے سفرنامہ اودھ میں جو اُنھوں نے ۱۸۵۱ء میں مرتب کیا تھا اور جس میں ضبطی اودھ کی سفارش کی تھی وہ موصوفہ کی نسبت حسب ذیل تحریر کرتے ہیں:-

"شاہ نصیر الدین حیدر کی شادی شہنشاہ دہلی کی پوتی سے ہوئی تھی یہ نوجوان شہزادی بلا کی حسین ہیں اور نہایت نیک سیرت بھی ہیں۔ اراکین خاندان شاہی اودھ نیز باشندگان لکھنؤ اُن کی بہت تعظیم و توقیر کرتے ہیں۔ دربار شاہی کا رنگ بگڑا ہوا دیکھ کر اُنھوں نے شادی کے بعد ہی سے عزلت گزینی اختیار کی اور اس وقت سے صرف تین سو یا چار سو روپیہ ماہوار کی قلیل رقم پر جو اُن کو شاہ اودھ سے ملتی ہے وہ گذارہ کر رہی ہیں۔"

ایک دوسرے مقام پر وہ موصوفہ کی نسبت حسب ذیل رقم طراز ہیں:-

"وزیر اعظم کو ہمیشہ یہ ملحوظ خاطر رہتا تھا کہ بادشاہ سلامت کی محبوب ترین بیگم کو ترغیب و تحریص دے کر اپنا ہمخیال و ہمنوا بنائے رکھیں چونکہ بادشاہ کے محل خاص نواب سلطان بہو پر جو نہایت عظیم المرتبت اور والا دودمان شہزادی ہیں اثر جمانا اور اُن کو اپنی مٹھی میں کر کے اُن کی ہمدردی حاصل کرنا محال تھا اس لئے اُن کے لئے یہ صورت پیدا کی گئی کہ وہ قصر سلطانی کی سکونت ترک کر کے اپنے شوہر سے علیحدہ زندگی بسر کریں۔"

مرقومۂ بالا بیانات پڑھنے سے واضح ہو گا کہ گو مورخین میں بعض معاملات میں جزوی اختلافات ہیں مگر ان امور پر سب یک زبان ہیں کہ ملکہ کے ساتھ شروع ہی سے بہت ناروا برتاؤ کیا گیا۔ نہ مثل

دیگر محلات اُن کا بیش قرار وثیقہ مقرر ہوا نہ حسن سلوک سے اُن کی کبھی دلجوئی کی گئی بلکہ برعکس اس کے وہ زیر حراست رکھی گئیں۔ محل کے باہر جانے کی اُن کو مطلق اجازت نہ تھی۔ اُن کے قدیم ملازمین کو جو اُن سے ہمدردی کرتے تھے برخاست کر دیا گیا تھا اور کسی فرد بشر کی مجال نہ تھی جو اُن سے ملاقات کر سکتا۔

بیچارگی اور بے بسی میں مرزا سلیمان شکوہ نے اُن کی شادی جو نصیر الدین حیدر کے ساتھ کر دی تھی اس کا اُن کو دلی صدمہ تھا اور اپنی علو ہمتی سے ثابت کر دیا کہ گو باپ کی رضامندی جبر اور دباؤ سے حاصل کی جا سکتی ہے مگر بیٹی کی مرضی کسی قیمت پر بھی نہیں خریدی جا سکتی ہے۔ چنانچہ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے نصیر الدین حیدر کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ انھوں نے ملکہ کی طرف سے اپنا خیال ہٹا لیا۔ بعد میں اُن کو ایذائیں بھی پہونچائی گئیں۔ اُن کی سوتیلی ابن قمر چہرہ کو محل بنانے کی کوشش کی گئی مگر انھوں نے سب باتیں صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیں اور جس طرح دنیا میں آئی تھیں اُسی طرح کورے پنڈے کے ساتھ دنیا سے سدھار گئیں۔

۱۸۳۷ء میں بعد انتقال شاہ نصیر الدین حیدر جب بادشاہ بیگم صاحبہ نے مرزا فریدوں بخت عرف مُنّا جان کو خلاف منشائے گورنمنٹ محض اپنی ہماہمی اور زور زوری سے تخت اودھ پر بٹھانے کا تہیہ کیا تو راستہ میں حسن[1] باغ سے نواب سلطان بہو کو بھی اپنی مہم کو قوت پہونچانے کے لئے ساتھ لے لیا تھا مگر جیسے ہی بندوقیں چلنے لگیں اُن کی دو خادمائیں اُن کی پالکی لال بارہ دری کی بغلی صحنچی میں جا کے مفرق لے گئیں۔ ان میں سے ایک کا بازو چھروں سے بہت مجروح ہو چکا تھا مگر دوسری نے چند کپڑے باہم باندھ کر اُن کی مدد سے شہزادی صاحبہ اور زخمی خادمہ کو تخمیناً آٹھ گز کی بلندی سے نیچے صحن میں اُتار دیا جہاں سے اُن کے ملازمین اُن کو محلسرا واپس لے گئے اس طرح تینوں کی جانیں محفوظ رہیں۔ بارہ دری کے شمال رُخ دونوں پھاٹکوں میں سپاہی کھچا کھچ بھرے ہوے تھے اور سوائے اس طریقہ سے واپس آنے کے اور کسی طرح جانبری نہیں ہو سکتی تھی۔

سلیمن صاحب کے متذکرہ بالا بیان میں اور سید کمال الدین حیدر مصنف تاریخ اودھ کے اس موقع کے بیان میں قدرے اختلاف ہے آخر الذکر اس واقعہ کے متعلق حسب ذیل تحریر کرتے ہیں:۔

[1] ملکہ حسن باغ میں رہتی تھیں یہ باغ ۱۸۵۷ء میں اُجڑ گیا۔ اور اُس کی عمارت بھی منہدم کر دی گئی۔ میڈیکل کالج کا بورڈنگ ہاؤس (Hardinge bridge) کے پل کے اُس جانب اسی باغ کی آراضی پر تعمیر ہوا ہے اور جا بجا قدیم عمارت کے کھنڈر اب تک پائے جاتے ہیں۔

"جب لال بارہ دری میں ہنگامہ کارزار گرم ہوا تو سلطان بہو بیگم صاحبہ گھبرا کر پینس سے باہر نکل پڑیں اور بارہ دری کے پردے سے مثل گیند کے نیچے چلی آئیں ایک شخص نے اپنی گود میں اُتار لیا، پھر پینس میں سوار ہوئیں بموجب حکم صاحب سلامت اپنے حسن باغ میں چلی آئیں"

۱۸۵۷ء میں بعہد مرزا برجیس قدر سلطان بہو لکھنؤ ہی میں مقیم تھیں۔ اسی زمانہ میں شہزادہ فیروز شاہ پسر مرزا ناظم بخت نواسہ حضرت فرخ سیر بادشاہ دہلی مع دو سو سوار پانسو تلنگہ بہمراہی بخت خاں داخل لکھنؤ ہو کر ملکہ موصوفہ کے مکان میں بسبب قرابت کے فروکش ہوئے۔ سلطان بہو نے خوف زدہ ہو کر جناب عالیہ (والدہ برجیس قدر) سے کہلا بھیجا کہ مجھ کو اتنا مقدور نہیں ہے کہ ان کی خاطر خواہ تواضع کر سکوں۔ اُن کے قیام کے لئے دوسرا مکان تجویز ہونا چاہئے۔ چنانچہ حسن باغ کے قریب ایک دوسرا مکان تجویز ہوا شہزادہ اُس میں منتقل ہو گئے۔ حضرت محل والدہ برجیس قدر نے پانچہزار روپے دعوت کے بھیجے۔ جب باغی فوج لکھنؤ سے بھاگ گئی شہزادہ موصوف بھی سراسیمہ ہو کر بریلی چلے گئے۔

مرزا سلیمان شکوہ نے اکبر آباد میں بتاریخ ۲۴ر فروری ۱۸۳۸ء فرشتۂ اجل کو لبیک کہا اُن کی لاش چھ ماہ تک وہیں رہی بعدہ بمقام سکندرہ اکبر کے مقبرہ میں دفن کی گئی اور اس پر سنگ مرمر کی قبر بنوا دی گئی۔

بتاریخ ۲۰ر اکتوبر ۱۸۳۷ء شاہ نصیر الدین حیدر کو بھی زہر دے کر عین عالم شباب میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اب اس ڈرامہ کی ہیروئن صرف سلطان بہو پردۂ دنیا پر رہ گئیں۔ بعد ضبطی سلطنت اودھ عملداری سرکار میں وہ بھی کربلائے معلے چلی گئیں اور عراق میں چند سال قیام کرنے کے بعد موت نے اُن کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا اور میٹھی نیند سُلا کر دنیاوی بکھیڑوں سے آزاد کر دیا۔ اُن کا متروکہ نواب اقبال الدولہ پسر شمس الدولہ نواب احمد علی خاں برادر زادہ شاہ غازی الدین حیدر نے پایا جو قبل سے عراق میں مقیم تھے۔

ارغنونِ دل

(جناب مفتی محمد رشید الدین صدیقی صاحب رشید اکبرآبادی۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی)

دلِ پُرخوں کو یہ تلقین! ترکِ آرزو کردے
گلِ شاداب کیونکر ہائے قطعِ رنگ و بو کردے

زبانِ شوخ ایسی تیز، خونِ آرزو کردے
تبسم اس قدر چالاک، زخمِ جاں رفو کردے

زبانِ شوق کی لغزش، کہ شرحِ آرزو کردے
نگاہِ ناز کی گردش، کہ ختمِ گفتگو کردے

نگاہِ ناز کو ضد سی، کہ خونِ آرزو کردے
تبسم کو اشارہ سا، کہ زخمِ جاں رفو کردے

ہر آفت سے نڈر، جو بلائے گُل ہے، فطرتاً بلبل
قفس میں ظاہرا ترکِ تلاشِ رنگ و بو کردے

نہ مرہم ہے نہ تسلی ہے۔ نہ شور افشاں تبسم ہے
الٰہی کوئی میرے زخمِ پنہاں کا رفو کردے

یہ بلبل آتشِ غم سے قفس میں کیوں نہ پھنکے؟ یارب!
اگر برباد ہی کرنا ہے۔ گُل کے روبرو کردے

لگادی آگ ظالم نے گلستاں کو نشیمن کو
قفس کو بھی مجھے بھی بھسم۔ یہ سوزِ گلو کردے

رفوئے زخمِ جاں سے عقلِ سوزن کار عاجز ہے
بھرم رہ جائے، چاکِ جیب و دامن کا رفو کردے

بہار افزا ہو کیفیت، اگر اُس چشمِ میگوں کی
نسیم و لالہ و گُل کو، مے و جام و سبو کردے

چمن زادو! قفس میں باہمی پیکار، کیا معنے؟
وہ اِیکا ہو، کہ آزاد قفس لے رنگ و بو کردے

تبسم میں، تکلم میں، یہ جادو ہے، کہ وہ کافر
گُل و بلبل کو صحنِ باغ میں باہم عدو کردے

یہ صحرائے بلا خیز و، تلاشِ منزلِ لیلےٰ
الٰہی قیس کو، خوش کامِ کیفِ جستجو کردے

غزل گے پردۂ نازک میں گم ہے ارغنونِ دل
مبادا نارِ برہم ختمِ بزمِ ہاؤ ہو کردے

رشید مبتلا روزانہ شغلِ گریہ کرتا ہے
نمازِ عشق کیونکر ہو؟ اگر ترکِ وضو کردے

نظرے خوش گذرے

الناظر کی بے وقت اشاعت کے لیے بار بار معذرت کرتے ہوئے بھی ندامت ہوتی ہے مگر حالات گرد و پیش سے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یہ پرچہ وسط جولائی کے بجائے اگست کے تیسرے ہفتہ میں شائع ہوگا اور بجائے اس کے کہ جولائی سے ماہ بماہ اشاعت کا انتظام ہوتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ کو وقت پر لانے کے لیے ابھی ایک دو مشترکہ نمبر اور شائع کرنا ہوں گے۔

ارزاں ایڈیشن کا سلسلہ اب بند کر دیا جائے گا کیونکہ ادھر چند ماہ میں کھرا کاغذ بہت گراں ہو گیا ہے۔ جن اصحاب سے قیمت وصول کی جا چکی ہے اُن کے لئے تو اُس وقت تک ضرور کھرے کاغذ کا پرچہ چھپے گا جب تک اُن کی قیمت بیباق نہ ہو۔ البتہ آئندہ جن صاحب کی میعاد ختم ہو جائے وہ ارزاں ایڈیشن کے لئے چندہ نہ ارسال فرمائیں بلکہ اگر عہ سالانہ کی ادائی کا تحمل ہو تو معمولی سفید کاغذ کے پرچہ کے خریدار بن جائیں۔

سفید کاغذ بھی گراں ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کانپور کے مشہور رسالہ زمانہ تک کو چکنے سفید کاغذ کی جگہ کھرا کاغذ لگانا پڑا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو ہمیں بھی مصارف کم کرنے کے لئے موجودہ انتظام میں کچھ تبدیلی کرنا ہوگی۔ خواہ حجم میں کمی کرنا پڑے یا کاغذ کم قیمت کا لگایا جائے۔

ملک میں بہت سے اہل علم ایسے ہیں جو اپنی فرصت کے اوقات خاموشی کے ساتھ علمی و ادبی خدمات میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ انھیں میں ہمارے مکرم جناب مولوی حافظ عطا حسین صاحب ایم اے، سی ای، سابق ناظم تعمیرات ریاست حیدر آباد دکن ہیں جنھوں نے حال ہی میں نہایت آب و تاب سے سلطان دکن حضرت خواجہ گیسو دراز قدس سرہ العزیز کی قابل قدر کتاب "خاتمہ" جو شششہ کی تصنیف ہے تصحیح و تحشیہ کے بعد پہلی بار طبع کرا کے شائع فرمائی ہے۔

قلمی کتابوں کی تصحیح اور طبع و اشاعت کوئی آسان کام نہیں۔ مولوی سید عطا حسین صاحب نے ان سب مراحل کو بخوبی طے کیا اور شروع میں ۴۴ صفحے کا قابل قدر دیباچہ اضافہ کیا ہے جس میں حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور اس کتاب کے خصوصیات کا ذکر ہے جس کے لئے

صاحب ممدوح لائق شکریہ و مبارکباد ہیں۔

تصوف میں حضرت شیخ ابو النجیب سہروردی کی کتاب آداب المریدین بڑے پایہ کی تصنیف ہے حضرت خواجہ نے اپنے عہد کے لوگوں کی ضروریات و حالات کو پیش نظر رکھ کر فارسی میں اس کے مطالب کی وضاحت کے لئے متعدد شرحیں لکھی ہیں اور انھیں شروح میں سے ایک کے سلسلہ میں "خاتمہ" کی تصنیف ہوئی۔ اس کے مضامین بھی طالبان حق اور سالکان طریقت کے لئے آداب المریدین کی طرح نہایت نافع ہیں۔

ہندستان میں عربی فارسی کا مذاق کم ہوگیا ہے اس لئے بعض لوگ تصوف یا دیگر علوم کی کتابوں کے متن معہ ترجمہ کے شایع کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں "خاتمہ" کا ترجمہ بھی اگر آخر میں شامل کردیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔

خاتمہ کا حجم ۲۰۰ صفحہ، کاغذ، طباعت سرورق سب دیدہ زیب قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ مولوی سید عطا حسین صاحب۔ محلہ لنگم پلی۔ حیدرآباد دکن

حسن انتخاب

(مولفہ سید مظہر علیم بی۔ اے۔ علیگ)

لکھنؤ و دہلی کے اساتذہ کی جگر کاویوں مضمون آفرینیوں اور زبان آوری کا بہترین اور نہایت دلچسپ و دلکش مرقع ہے۔ اگر آپ کو میر و سودا، مومن خاں و مصحفی۔ انشاء و جراُت، ناسخ و آتش۔ غالب و ذوق۔ داغ و امیر کے مکمل دیوان پڑھنے کی مہلت اور فرصت نہیں ہے تو کم از کم اُردو ادب سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کو ضرور پڑھئے۔ ان اساتذہ کے کلام کا عطر ہے اور ہر شعر جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ ملک کے اہل الرائے نے بہترین رائیں اس کے متعلق ظاہر کی ہیں۔ اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے یہ شعر اس انتخاب پر بالکل صادق آتا ہے

رنگینیاں جو حسن ازل کی تھیں جا بجا سب کھنچ کے آگئیں نگہِ انتخاب میں

قیمت مع محصول ڈاک ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔

کتب خانہ رشیدیہ دہلی یا مؤلف سے حبیب گنج ضلع علیگڈھ سے طلب کریں

خطا پہ حشر میں نازاں ہوں اس لئے یارب
کہ مجھ غریب کی پرسش تری جناب میں ہے

پرائے دل کا ستانا روا ہے کب تم کو
یہ کس حدیث میں آیا ہے کس کتاب میں ہے

مجھے کچھ اور بھی کمبخت کے سوا کہئے
کہ یہ تو لفظ ازل سے مرے خطاب میں ہے

جگر میں اُٹھے کہ دل میں کہاں کہاں اُٹھے
کسی کا درد محبت بڑے عذاب میں ہے

ہم اور تلخی مے کا گلہ معاذ اللہ
روا ہے ہم کو اگر زہر بھی شراب میں ہے

سوال وصل پہ وعدہ بھی ہے تبسم بھی
امید و یاس کا پہلو ترے جواب میں ہے

نحیف جان کے مجھ کو کیا نہ کوئی سوال
فرشتے قبر کے بولے یہ کس حساب میں ہے

ہمیشہ کی ہے دربار پر جبیں سائی
یہ بندگی بھی الٰہی کسی حساب میں ہے

اثر پڑے نہ محبت کا اس کے کیا معنی
جو بیقرار ہیں ہم وہ بھی اضطراب میں ہے

رسا بھی آیا ہے محشر میں داور محشر
قصوروار بھی حاضر تری جناب میں ہے

(۵)

وفاداروں کا بندہ ہے اداوالوں کا بسمل ہے
رسا کا دم بھی کیا دم ہے رسا کا دل بھی کیا دل ہے

یہ کیوں آئینہ خفا تیرے رخ کے مقابل ہے
نہ اس کمبخت کی آنکھیں نہ اس کمبخت کے دل ہے

یہ دل اور بے وفائی توبہ توبہ یہ تہمت مشکل ہے
وفا ہے جان اس دل کی وفا کی شان یہ دل ہے

پڑی ہے ایک الجھن دیکھیے آتی ہے کس کس کی
الٰہی خیر باہر میان سے شمشیر قاتل ہے

ہمیں کیا ہے اگر بیٹھا ہے دشمن اُن کے پہلو میں
جسے چاہے بٹھائیں اُن کا گھر ہے اُن کی محفل ہے

کوئی آسان ہے آسان ہونا میری مشکل کا
مری مشکل ہزاروں مشکلوں میں ایک مشکل ہے

مجھے یہ ناز ہے اُن کی حیا کا رہ گیا پردہ
مرا ضبط محبت دل میں رکھ لینے کے قابل ہے

اجل مجھ کو گھڑی بھر تو یہ نقشہ دیکھ لینے دے
کہ سینے پر وہ قاتل ہے گلے پر تیغ قاتل ہے

لیے جاتے ہو دل لیکن اسے تم پیار سے رکھنا
کہ جس دل سے تمہیں ہم پیار کرتے تھے یہ وہ دل ہے

نئی باتیں نکلتی ہیں نئے فقرے ترشتے ہیں
نرالی اُن کی محفل ہے نرالا رنگ محفل ہے

حیات جاودانی ہے تصدق ایسے مرنے پر
کہ کھولے بال وہ میرے عزاداروں میں شامل ہے

محبت کا دل حسرت زدہ کی دیکھنا کیا ہے
تم اپنے دیکھ لو دل میں کہ دل آئینۂ دل ہے

مجھے آتے ہوئے دیکھا تو غیروں سے یہ فرمایا
کہ صورت سے سوال اس کی یہ شاید کوئی سائل ہے

جو اس کافر کو لائیں راہ پر تو کس طرح لائیں
ادھر پھوٹی ہوئی قسمت اُدھر ٹوٹا ہوا دل ہے

رسا شوق شہادت بعد مدت رنگ لایا ہے
رہے قسمت کہ سر اپنا تہ زانوے قاتل ہے

محبت یہ ہے آداب محبت، نام اس کا ہے (۵۲) کہ لب تک لا نہیں سکتا ہوں جو دل میں تمنا ہے

جدھر دیکھو ادھر اک مجمع اہل تمنا ہے
کسی کی بزم ہے ہنگامۂ روز جزا کیا ہے

انھیں ایسی غرض ہم سے وہ پوچھیں آرزو کیا ہے
کہ ہم سے نامرادوں کی تمنا کیا تمنا ہے

ہماری کچھ عجب حالت دم عرض تمنا ہے
کہ کچھ کہتے ہیں منھ سے اور زباں سے کیا نکلتا ہے

جوانی آنے والی ہے لڑکپن جانے والا ہے
خدا ان کو بچائے چشم بد سے کیا زمانا ہے

انھیں جب دیکھتا ہوں سامنے آئینہ رکھا ہے
تماشائی بنے ہیں آپ اپنے کیا تماشا ہے

نوشتہ میری قسمت کا کہاں سے ان کے ہاتھ آیا
کہ جو کچھ خط میں لکھا ہے مری قسمت کا لکھا ہے

اسی سے میرے دل کا نام روشن ہے زمانہ میں
چراغ خانۂ کعبہ مرا داغ تمنا ہے

وہی ہر وقت چپ رہنا وہی ہر اک کا منھ تکنا
تری تصویر کیا ہے میری حیرانی کا نقشا ہے

کیا ذکر عدو میں نے تو یوں منھ پھیر کے بولے
تجھے ہو جس کا شکوہ وہ برا بھی ہو تو اچھا ہے

نہیں ہے بات کرنے کا بھی دم مجھ میں فغاں کیسی
مرا ضبط محبت میری مجبوری کا پردا ہے

کسی گھر کا نہ رکھا ہم کو اس آشفتہ حالی نے
کہیں ہم ہیں کہیں دل ہے کہیں دل کی تمنا ہے

نہ پھرنا اپنے وعدوں سے سمجھ کر حشر کو دنیا
وہاں کا اور عالم ہے وہاں کی اور دنیا ہے

تصور میں کسی کے دیکھئے جانا نہیں اچھا
ادھر ہیں آپ بھی نازک ادھر نازک زمانا ہے

کہیں ہم تجھ سے کافر کو خدا یہ ہو نہیں سکتا
ہمیں دنیا سے جانا ہے خدا کو منھ دکھانا ہے

ترے اقرار سے دل کی جلن میں پڑ گئی ٹھنڈک
ترا حرف تسلی مرہم داغ تمنا ہے

وہ ہم کو رنج دیتے ہیں تو کچھ صدمہ نہیں ہوتا
ادھر پتھر ہے دل اور اس طرف پتھر کلیجا ہے

جدائی جب سے آئی ہے جدا ہے پاسباں ان کی
تصور بھی کسی کا اب نہیں آتا یہ پردا ہے

گلے شکوے کہاں سکے پیار الٹا آ گیا ہم کو
جب اس نے مسکرا کر ہم سے پوچھا آرزو کیا ہے

نہیں جو مانگنا ہے اے رسا اللہ سے مانگو
بڑی سرکار ہے اس کی بڑا وہ دینے والا ہے

میان سے باہر جو وہ تلوار ہو کر رہ گئی (۵۳) میری آسانی مجھے دشوار ہو کر رہ گئی

کاوش غم جان کو آزار ہو کر رہ گئی
پھانس جو دل میں چبھی تھی خار ہو کر رہ گئی

کام بگڑے بن گئے جس وقت دن اپنے پھرے
بدنصیبی طالع بیدار ہو کر رہ گئی

عرض مطلب پہ تسلی دے گئی نیچی نظر
شرم ان کی پہلوئے اقرار ہو کر رہ گئی

اس ادا سے میرے مرنے کا کسی نے غم کیا
ایک دنیا جان سے بیزار ہو کر رہ گئی

مجھ سے لاغر کی شب غم کیا کہوں کیونکر کٹی
جو شکن بستر پہ تھی تلوار ہو کر رہ گئی

بارہا بیمار غم کروٹ بدل کر رہ گیا
کس کے آنے کی خبر ہر بار ہو کر رہ گئی

غیر کا مذکور بھی کوئی پیام وصل تھا
کس لئے نیچی نگاہ یار ہو کر رہ گئی

آخر اُن کو بن سنور کے میرے گھر آنا پڑا
آرزو اُن کے گلے کا ہار ہو کر رہ گئی

ان بتوں کی چاہ کر کے کس بلا میں پڑ گیا
تیری کیا حالت دل بیمار ہو کر رہ گئی

دید کے قابل تھی حسرت اس دل مایوس کی
جب نظر اُن کی جگر کے پار ہو کر رہ گئی

ناامیدی نے شب غم ایسے کچھ چھینٹے دیئے
سرد اپنی آہ آتش بار ہو کر رہ گئی

اس نے وصف غیر کر کے دل کو زخمی کر دیا
بات جو ظالم نے کی تلوار ہو کر رہ گئی

تا دم آخر نہ حاصل کچھ محبت میں ہوا
جتنی کوشش ہم نے کی بیکار ہو کر رہ گئی

یا خدا جور بتاں سے ناک میں دم آ گیا
چار دن کی زندگی دشوار ہو کر رہ گئی

اے رسا رکھی رہی سب دادخواہی حشر میں
جب وہاں نیچی نگاہ یار ہو کر رہ گئی

(۵۴)

بدلی اِدھر نظر تو اُدھر بھی بدل گئی
اُن کی ہماری آنکھوں ہی آنکھوں میں چل گئی

مرجھائے داغ عشق جوانی جو ڈھل گئی
آندھی تھی یہ بہار کہ آئی نکل گئی

محشر میں بھی اسی بت کافر کی چل گئی
یہ کیا ہوا امید جزائے عمل گئی

ایسی کسی مریض کی حالت زبوں نہ ہو
سر پیٹتی ہوئی مرے گھر سے اجل گئی

مجرم سے اور پرسش اعمال حشر میں
کیونکر کہوں کہ شان کریمی بدل گئی

محفل میں ہائے اُن کی نظر غیر پر پڑی
بن کر چھری کلیجے پہ میرے نہ چل گئی

ذکر وفا پہ آپ کو شرم جفا ہے کیوں
اک بات تھی کہ میری زباں سے نکل گئی

دونوں کو سوز عشق نے آخر کیا تمام
پروانہ پہلے جل گیا پھر شمع جل گئی

نقش قدم سے ان کے یہ حاصل ہوا عروج
کوئے عدو میں خلق خدا سر کے بل گئی

جنت کا حال سن کے یہ دل سرد ہو گیا
اب گرمی تلافی حسن عمل گئی

مانیں گے ہم بھی اور کسی سے لگا کے دل — اب مل گئی ہے اُن سے اور ہم سے تو مل گئی
اے ہم نفس نہ پوچھ شب غم کا ماجرا — آئی تھی اک بلا مرے سر پہ جو ٹل گئی
پہلے تو اس نے دل کو مرے چاک کر دیا — پھر کہہ دیا کہ جا تری حسرت نکل گئی
اچھا کیا کہ آپ تصور میں آ گئے — دم بھر کو خیر میری طبیعت بہل گئی

کب تک رسا رہے گا حسینوں پہ مبتلا
کمبخت اب تو تیری جوانی بھی ڈھل گئی

تیرا خیال اس دل شوریدہ سر میں ہے (۵۵) جب گھر میں تو نہیں تری تصویر گھر میں ہے
صحرا تیرا کچھ پتہ ہے رسا کا نہ گھر میں ہے — وہ تیرا ہو چکا ہے تری رہگذر میں ہے
دل میں ہے داغ درد محبت جگر میں ہے — سر لے کے جائے گا یہی سودا جو سر میں ہے
اس رشک سے جواب بھی ہم نے نہیں سنا — کیوں اُن کی بات بھی دہن نامہ بر میں ہے
میں جانتا ہوں تاک مرے دل کی ہے تجھے — جو کچھ تری نظر میں ہے میری نظر میں ہے
کیا کیا مصیبتیں شب غم کی بیاں کروں — دنیا میں جو بلا نہیں وہ میرے گھر میں ہے
طرز خرام ناز نے کیا حال کر دیا — محشر قدم قدم پہ تری رہگذر میں ہے
غربت میں ہم کو کیا ہو تمنائے ہم نفس — تیرا خیال ساتھ ہمارے سفر میں ہے
لکھی ہے ہم نے خط میں مصیبت فراق کی — جو درد دل میں تھا کمر نامہ بر میں ہے
وہ ہے جگر جگر جو خدا نے ہمیں دیا — وہ درد درد ہے جو ہمارے جگر میں ہے
پہچانتا ہوں خوب زمانے کے رنگ کو — سب کچھ مری نظر میں ہے تو کیا نظر میں ہے
جائیں گے کس کے گھر یہ ستمگر ترے قدم — آنکھوں کا فرش آج تری رہگذر میں ہے
بھرتا ہے جب یہ زخم تو ہوتی ہے اک خلش — کوئی تو بات لذت زخم جگر میں ہے
آتا ہے یاد اُن کا یہ کہنا شب وصال — کمبخت کتنی دیر نمود سحر میں ہے

رکھیں گے غیر درد محبت کو دل میں کیا
یہ تو رسا کے دل میں رسا کے جگر میں ہے

جو ساقی ہے سلامت خانہ خمار باقی ہے (۵۶) زمانے کی نظر میں عزت میخوار باقی ہے
ترے بیمار ہیں کہنے کو جان زار باقی ہے — نہ ہونے کے برابر نبض کی رفتار باقی ہے
چلے ہیں ہم تو کیا ہے مجمع اغیار باقی ہے — خدا رکھے تمہیں سب زینت دربار باقی ہے

اگر انکار ہے تو صاف مجھ سے کیوں نہیں کہتے — تبسم کس لئے لب پر دم اصرار باقی ہے

گئے تھے سیر گلشن کو کملا یا کیا یہ گل تم نے — کہ جتنے پھول تھے ہر اک کے دل میں خار باقی ہے

غضب میں پڑ گیا ہوں وصل کی شب دل کے ہاتھوں سے — کہ جو حسرت نکلتی ہے وہی ہر بار باقی ہے

قیامت سے ڈرا کر دل دکھا میرا نہ اے واعظ — کہ اس دل میں امید رحمت غفار باقی ہے

بگڑ کر بن گئے ہیں انقلاب چرخ سے لاکھوں — مگر میرے لئے اس کی وہی رفتار باقی ہے

یہی ہے مشغلہ دن رات پیتا ہوں پلاتا ہوں — مرے دم سے بہار خانۂ خمار باقی ہے

سُنا یا ہے کہاں افسانۂ دل آپ کو پورا — ابھی اک بات ہے جو قابل اظہار باقی ہے

خطا کیا دیکھنے والوں کی اپنے حسن کو دیکھو — کہ جس کو دیکھ کر بھی حسرت دیدار باقی ہے

بڑا اک تیر مارا دل کو میرے کر دیا زخمی — ابھی تو یہ کلیجہ اے خدنگ یار باقی ہے

نہیں ہیں بے سبب رخنے تری دیوار میں ظالم — کوئی سر پھوڑنے والا پس دیوار باقی ہے

بچا لے گی ہمیں کیا سخت جانی دست قاتل سے — اگر خنجر گرا ہے ٹوٹ کر تلوار باقی ہے

وہ کہتے ہیں کہ محشر میں بھی کچھ کہنے نہ پاؤ گے — تو گویا اس دہن میں یہ زباں بیکار باقی ہے

تماشا دیکھنے پائیں گے ہم کیا خاک دنیا کا — اگر عمر رواں تیری یہی رفتار باقی ہے

گئے پہلو سے وہ اُٹھ کر کہ تڑپا یہ دل مضطر
رسا کو پھر وہی آزار کا آزار باقی ہے

خموشی نے چھپا رکھی ہے جو کچھ دل کی حالت ہے (۵۷) ہماری بے زبانی پردۂ راز محبت ہے

نکل کر دل سے لب تک آ سکے کیا تاب و طاقت ہے — بڑی پابندیوں میں آپ کا حرف محبت ہے

لب خاموش سے فریاد کرنا بھی قیامت ہے — کسی نے سچ کہا ہے ترک عادت بھی عداوت ہے

وفا کرتے ہیں ہم پھر بھی ہیں تم سے ندامت ہے — اسے کہتے ہیں الفت بندہ پرور یہ محبت ہے

کہاں جنت میں یہ باتیں کہاں ایسی مدارا تیں — خدا رکھے تمہاری بزم عشرت بزم عشرت ہے

اجل کی نذر کر دیں جان مضطر ہو نہیں سکتا — انہیں کو ایک دن سونپیں گے یہ جن کی امانت ہے

دم رفتار اُن کی راہ کے فتنے یہ کہتے ہیں — خبر ہے جس قیامت کی وہی تو یہ قیامت ہے

تمہارے در سے اُٹھ کر خاک جائیں قصر جنت میں — تمہارے خاکساروں کو جہاں تم ہو وہ جنت ہے

کبھی دل میں کبھی دل سے نکل کر سیدھے کلیجے میں — انہیں دو دردمندوں میں ترا درد محبت ہے

کسی دن دیکھیو تیرے ہی قدموں پر یہ سر ہوگا — جو ساقی ہم سلامت ہیں جو ساقی تو سلامت ہے

تم اپنی رہگذر میں بھی اُٹھا کے چلتے ہو دامن / ہماری خاک سے کس واسطے اتنی کدورت ہے

ہمیں جو فیصلہ کرنا ہے ہم سے فیصلہ کر لو / قیامت پر نہ رہنے دو قیامت پھر قیامت ہے

ہوا ہے آئینہ حیران ان کی دیکھ کر صورت / ہمارے دل کو حیرت ہے تو ہے پتھر کو حیرت ہے

مری ضد سے ہزاروں جان صدقے تم پہ کر دیں گے / کمی کیا مرنے والوں کی جو میرا دم سلامت ہے

محبت میں خدا حافظ ہے ہم سے مرنے والوں کا / جگر میں درد ہے دل میں خلش چکر میں قسمت ہے

تمہیں نفرت ہے کیوں مجھ سے مجھے اس کا نہیں رونا / مجھے تو اس کا رونا ہے عدو پر کیوں عنایت ہے

ہمیں ہم تھے رسا پہلے کسی کی بزم خلوت میں
مگر اب کچھ دنوں سے دور کی صاحب سلامت ہے

وہ بے سوال ہی عذر وصال کر بیٹھے / حلال کرنے سے پہلے حلال کر بیٹھے

خطا ہوئی جو کوئی ہم سوال کر بیٹھے / ذرا سی بات کا تم تو ملال کر بیٹھے

عدو کے بھیس میں ہم عرض حال کر بیٹھے / کسی کے ساتھ قیامت کی چال کر بیٹھے

وہ حشر میں بھی قیامت کی چال کر بیٹھے / کہ داد خواہوں پہ خنجر نکال کر بیٹھے

ہماری خاک سے وہ بدگمان کتنے ہیں / کہ جس جگہ گئے دامن سنبھال کر بیٹھے

خدا کے آگے بھی میری نہ ایک چلنے دی / وہ مجھ سے حشر میں لاکھوں سوال کر بیٹھے

حنا نہ تلووں سے ملئے کہ رنگ لائے گی / یہ دل نہیں ہے جسے پائمال کر بیٹھے

کوئی بھی ہوتا ہے ناراض مرنے والوں سے / ادھر تو دیکھئے کس سے ملال کر بیٹھے

انہیں بھی خوف ہے اپنی نظر کے فتنوں کا / کہ اپنی بزم میں بھی دیکھ بھال کر بیٹھے

وہ بے بلائے تصور میں میرے آئے ہیں / زہے نصیب کہ میرا خیال کر بیٹھے

ہم اور شکوہ یہ کہنے کی بات ہے کوئی / یہ کیا خیال ہے یہ کیا خیال کر بیٹھے

ہوا ہے زرد مری جان پھول سا چہرہ / عدو سے مل کے یہ کیا اپنا حال کر بیٹھے

رسا یہ دیکھئے اچھا نہیں ہے ظلم و ستم
کسی دن آہ نہ وہ خستہ حال کر بیٹھے

وہ ستمگر بے وفا مضطر دل مجبور ہے / (۵۹) اے مرے اللہ آخر کیا تجھے منظور ہے

غیر کی بھی التجا کرنی ہمیں منظور ہے / جس کے دل لو لگی ہی ہو وہ کہیں مجبور ہے

پی کے کر لیتا ہوں توبہ جب سے یہ دستور ہے / دل بھی روشن ہے مرا منہ پر بھی میرے نور ہے

تیری نخوت ہر کسی سے ملنے کب دے گی تجھے
یہ بڑی دل کو تسلی ہے کہ تو مغرور ہے

خوف یہ ہے مجھ کو محفل سے نہ اٹھوا دیں کہیں
پاس جو بیٹھے ہیں انکے انسے یہ کیا دور ہے

آہ کرتا ہوں تو برہم کس لئے ہوتے ہو تم
دردمندان محبت کا یہی دستور ہے

غیر سے ملنے کے شکوے پر قیامت ڈھا گیا
ان کا یہ کہنا کہ دل سے آدمی مجبور ہے

میں سوال وصل کر کے اس ادا پر مٹ گیا
ہنس کے فرمایا کہ یہ درخواست نامنظور ہے

دیکھتا ہے کب کسی کو دیکھتا ہے جو تمہیں
دیکھتے ہو آئینہ کو کس قدر مغرور ہے

نارسائی نے کئے ہیں پست سارے حوصلے
ہوں کسی قابل جو ملے آسماں کیا دور ہے

رنج سہتے سہتے یہ حالت ہماری ہو گئی
جس جگہ تھا داغ دل پر اب وہاں ناسور ہے

حلق سے اتری کہ سو جلوے نظر میں آ گئے
سچ تو یہ ہے کچھ عجب شے بادۂ انگور ہے

دل لیا جس کا اسی کے دشمن جاں ہو گئے
ان حسینان جہاں کا کیا برا دستور ہے

تیرا جلوہ دیکھنے کی تاب ہے ظالم کسے
آنکھ بھر کر تجھ کو دیکھے کوئی کیا مقدور ہے

حضرت زاہد مبارک حور جنت ہو تمہیں
جلوہ فرما اپنے دل میں ایک رشک حور ہے

حشر میں اللہ سے فریاد اُن کے ظلم کی
اے رسا یہ بات تو شرط وفا سے دور ہے

چھپ گیا کوئی دکھا کر شکل لاثانی مجھے (۷۰) دے گیا بیدرد کیا دردِ نہانی مجھے

اب خدا کے سامنے کیسی پشیمانی مجھے
کر دیا شان کرم نے محو حیرانی مجھے

چاک پیراہن ہوں میں ہو شرم عریانی مجھے
ڈھانک لے دامن میں اے گرد بیابانی مجھے

دل کے ہاتھوں سے یہاں تک ہے پریشانی مجھے
غیر سے کہنا پڑا ہے راز پنہانی مجھے

کیا کھلے عیار تیرا رنج پنہانی مجھے
دوستی میں تو نے جانا دشمن جانی مجھے

میرے رونے کی حقیقت کس طرح ان پر کھلے
سامنے آئے تو پایا خندہ پیشانی مجھے

جس طرف اُن کی نظر پھرتی ہے پھر جاتا ہوں میں
اپنے مرکز سے ہٹا دیتی ہے حیرانی مجھے

عمر بھر اپنی پریشانی کو میں رویا کیا
اب مری تربت پہ روتی ہے پریشانی مجھے

دل مرا خلوت کدہ ہے آؤ دم بھر کے لئے
تم سے کہنا ہے تمہارا راز پنہانی مجھے

دل لٹا کر بار غم سر پہ لئے پھرتا ہوں میں
دے گئی خانہ بدوشی خانہ ویرانی مجھے

لب پہ آتے آتے رہ جاتا ہے حرف مدعا
روک دیتی ہے کسی کی چین پیشانی مجھے

پہلے مجھ حسرت زدہ کا یہ کبھی نقشہ نہ تھا
تم نے کھینچ کر کر دیا تصویر حیرانی مجھے

قید سے آزاد ہو کر بھی وہیں کا ہو رہا
ناتوانی ہو گئی زنجیر زندانی مجھے

حشر میں فریاد سے روکا بت عیار نے
ڈال کر باہیں گلے میں کر دیا پانی مجھے

دست قاتل پر گرے خنجر پہ خنجر ٹوٹ کر
لاکھ پر بھاری کیا تو نے گراں جانی مجھے

میں کہاں سر در گریباں ہوں گریباں ہی نہیں
منفعل ہو کر بھی ہوتی ہے پشیمانی مجھے

کہتے ہیں نادان جب ہم ہیں تو کیوں چاہا ہمیں
لو وہ الٹا دیتے ہیں الزام نادانی مجھے

اس پہ آتی ہے نہ ہو جس کا زمانے میں جواب
دینے والے نے طبیعت دی ہے لاثانی مجھے

بزم کی زینت کو آئینہ مری جاں کم نہ تھا
پھر بنایا کس لئے تصویر حیرانی مجھے

دل جگر دونوں کے دونوں خاک جلکر ہو گئے
تو نے ٹھنڈا کر دیا اے سوز پنہانی مجھے

رحم کھا کر اپنے در پر وہ جگہ رہنے کو دیں
یا الٰہی ہو مبارک خانہ ویرانی مجھے

کس طرح شان کرم دیکھوں الٰہی حشر میں
آنکھ اٹھانے ہی نہیں دیتی پشیمانی مجھے

حشر میں جانا بھی اٹھ کر قبر سے دشوار ہے
ضعف کے ہاتھوں میسر ہے تن آسانی مجھے

زندگی بھر حضرت یوسف کو یہ شکوہ رہا
چاک داماں کر دیا اے پاک دامانی مجھے

پہلے کب یہ آتش افشانی تھی میری آہ میں
کر دیا ہے آگ تو نے سوز پنہانی مجھے

وہ جوانی کی امنگیں اے رسا سب مٹ گئیں
اب تو پیری میں ہے شغل سبحہ گردانی مجھے

(۶۱)

آئینہ خود نمائی اُن کو سکھا رہا ہے
کیا قہر کر رہا ہے کیا ظلم ڈھا رہا ہے

ساقی ترے کرم سے کیا لطف آ رہا ہے
کوئی تو پی رہا ہے کوئی پلا رہا ہے

چوری گیا گیا دل لیکن غضب تو یہ ہے
دل کا چرانے والا آنکھیں چرا رہا ہے

آنسو بہا رہا ہے وہ سوز دل پہ میرے
خود ہی لگا کے ظالم خود ہی بجھا رہا ہے

ان کو تو ہم نے چاہا وہ یوں ستا رہے ہیں
اے چرخ کینہ پرور تو کیوں ستا رہا ہے

دوزخ بنا دیا ہے دنیا کو ان بتوں نے
دنیا سے جانے والا جنت کو جا رہا ہے

پروا نہیں جو ہم سے قسمت بگڑ رہی ہے
بگڑی بنانے والا بگڑی بنا رہا ہے

عشق بتاں میں ہم نے دنیا کو خوب دیکھا
اب ایک دیکھنے کو روز معجزا رہا ہے

کوچے میں دشمنوں کے ہم اور سجدہ کرتے
نقش قدم کسی کا سر کو جھکا رہا ہے

آئے رُکے اُن سے کہنے اُن کے ستم کا قصہ
اس کا علاج کیا ہے اب پیار آ رہا ہے

آزردہ غیر سے ہیں لیتا ہوں میں بلائیں
روٹھے ہیں وہ کسی سے کوئی منا رہا ہے

یہ کم سنی یہ باتیں یہ سادگی یہ گھاتیں
کوئی سکھانے والا اُن کو سکھا رہا ہے

کوچہ میں ان بتوں نے رہنے دیا نہ شاید
سنتے ہیں اب رسا بھی کعبہ کو جا رہا ہے

یوں مجھے تعذیر بے تقصیر ہونی چاہیئے (۶۲) کچھ تو ظالم شرم دامنگیر ہونی چاہیئے

دل کو آئینہ بنا کر رکھئے زینت کے لئے
کچھ تو اس کمبخت کی توقیر ہونی چاہیئے

میکشوں کو حضرت واعظ سے ہے گا کچھ تو ڈر
میکدہ میں آپ کی تصویر ہونی چاہیئے

آپ کو شایاں ہے سب کچھ آپ ہیں ناوک فگن
آپ کی سیدھی نظر بھی تیر ہونی چاہیئے

کیا وہ بچ کر جائیں گے گور غریباں سے بھلا
مرمٹوں کی خاک دامن گیر ہونی چاہیئے

اس قدر مجبور ہوں دل سے کسی کے ہجر میں
غیر سے کہتا ہوں کچھ تدبیر ہونی چاہیئے

جس کی تم تقدیر میں ہو ہائے اس پر رشک ہے
دو گھڑی کو وہ مری تقدیر ہونی چاہیئے

ہو تصور آپ کا میرے دل مشتاق میں
آئینہ میں کاش یہ تصویر ہونی چاہیئے

تم سے مجھ سے کچھ نہیں مطلب تو مجھ ناشاد پر
کیوں جفائے آسمان پیر ہونی چاہیئے

حضرت واعظ نتیجہ کیا ہے ایسی پند سے
بات میں انسان کی تاثیر ہونی چاہیئے

دیکھ کر مجھ کو ہوا ارشاد یہ اغیار سے
اس کو بے تقصیر بھی تعذیر ہونی چاہیئے

ہائے وہ دشمن سے خوش ہوں ہائے وہ مجھ سے خفا
سچ تو یہ ہر کام میں تقدیر ہونی چاہیئے

ضعف سے صیاد ہل سکتے ہیں کب تیرے اسیر
ان کو کیا طوق کیا زنجیر ہونی چاہیئے

سُن کے حال زار ہیں ان کو باور ہو نہ ہو
پاس قاصد کے مگر تصویر ہونی چاہیئے

جب کبھی ان کی تمنا گدگدائی ہے رسا
سوچتا ہوں دل میں کیا تدبیر ہونی چاہیئے

پھر کوئی بات ہم سے وہ کیونکر بنائیں گے (۶۳) اک گھر عدو کے گھر کے برابر بنائیں گے

ششدر رہے گا آئینہ صورت کو دیکھ کر
پتھر کو آپ اور بھی پتھر بنائیں گے

عشاق کو نہ کوچے سے اپنے نکالئے
یہ خانماں خراب کہاں گھر بنائیں گے

ہے دم میں دم تو راہ پہ لائیں گے ہم تجھے
زندہ رہے تو دل میں ترے گھر بنائیں گے

جب جستجوئے یار میں رکھیں گے ہم قدم
نقش قدم کو یار کے رہبر بنائیں گے

غیروں سے ہو وفا کبھی ممکن ہی یہ نہیں
باتیں ہزار آپ کے منہ پر بنائیں گے

جاتے ہی ان کے ہوگا قیامت کا سامنا
دم بھر کو آ کے وہ مرے دم پر بنائیں گے

زاہد جو تجھ سے اُلجھے کسی روز مے پرست
ظرف وضو کو توڑ کے ساغر بنائیں گے

یارب جو تو بھی اُن کا طرفدار ہو گیا
ہم اور کس کو داور محشر بنائیں گے

بگڑے جو کوئی بات بنا لیں ہزار بار
بگڑے ہوئے نصیب کو کیونکر بنائیں گے

سو پہلوؤں سے لکھیں گے اک حرف مدعا
ہم اپنے خط شوق کو دفتر بنائیں گے

توبہ کے واسطے ہو ٹھکانا کہیں ضرور
مسجد بھی میکدہ کے برابر بنائیں گے

کس منہ سے تیرے سامنے محشر میں آئیں ہم
کیا بات تجھ سے داور محشر بنائیں گے

آئینہ بھی ہے سامنے اور دل بھی سامنے
یہ دیکھنا ہے کس کو وہ ششدر بنائیں گے

فریاد تیری تجھ سے ہی ظالم کریں گے ہم
تیری گلی کو عرصۂ محشر بنائیں گے

ہم اور اُن سے شکوۂ بیداد اے رسا
اتنی سی بات کہہ کے مکدر بنائیں گے

(۶۴)

مٹایا ہم کو یہاں تک کہ خاک بھی نہ رہی
غرض جفا میں تمھاری کوئی کمی نہ رہی

ملا کہیں نہ ٹھکانا اسے ہمارے بعد
رہے نہ ہم تو کسی گھر کی بے کسی نہ رہی

خودی ہو کس طرح ہم میکشوں میں اے زاہد
ذرا سی اور چڑھا لی جو بے خودی نہ رہی

دعائے وصل بھی نکلی نہ ناتوانی سے
زبان بھی غم فرقت میں کام کی نہ رہی

لیا ہے دل تو مری جان جان بھی لے لو
غم فراق میں یہ بھی رہی رہی نہ رہی

ہر اک کی آنکھ تمھیں پر پڑی سر محشر
تمھاری شکل تو لاکھوں میں بھی چھپی نہ رہی

ہوا ہوں ضعف سے مایوس ایسا فرقت میں
کہ خضر سے بھی تمنائے رہبری نہ رہی

مٹا جو دل تو کیا میں نے صبر یہ کہہ کر
کہ ایک شے مری تقدیر میں نہ تھی نہ رہی

عدو سے آپ تو مل کر کچھ ایسے کھل کھیلے
کہ اب وہ دل وہ طبیعت ہی آپ کی نہ رہی

گئے جو تم تو غم و یاس آ گئے دل میں
رہے نہ تم تو کسی بات کی کمی نہ رہی

کسی سے راز محبت کہیں تو خاک کہیں
کہ دوستوں میں بھی اب رسم دوستی نہ رہی

گیا جو دل تو ہمیں دل کا کچھ خیال نہیں
خیال ہے تو فقط یہ کہ دل لگی نہ رہی

رسا کا حال ہے ناگفتنی شب فرقت
فغاں سے کام ہے اس کو جو بے خودی رہی

ایسے برہم ہیں وہ مجھ ناکام سے (۶۵) آگ ہو جاتے ہیں میرے نام سے

روز پیش آتے ہیں وہ دشنام سے — کب ہیں ہم محروم اس انعام سے
حضرت دل آپ نے یہ کیا کیا — کی محبت ایک بت خود کام سے
رات دن مرنے کی کرتا ہوں دعا — تنگ آکر گردش ایام سے
کس قدر پیر مغاں سے ہوں خجل — توبہ کرکے بادۂ گلفام سے
غیر سے تم سے نہیں جب واسطہ — شرم کیوں آتی ہے اُس کے نام سے
اس کا کہنا تم کبھی کرتے نہیں — ایسی کیا ضد ہے دل ناکام سے
کیا شب غم کا کہیں ہم ماجرا — اک بلا ہوتی ہے نازل شام سے
ہائے ناکامی مری تقدیر کی — وہ رہا کرتے ہیں مجھ کو دام سے
چھپ گیا خورشید ہو کر منفعل — ہو چکی ضد اب تو اترو بام سے
دل کی حالت پر انھیں رحم آگیا — کام نکلا پھر اسی ناکام سے
ہجر میں موت آگئی اچھا ہوا — چھٹ گئے ہم روز کے آلام سے
حال دل اس پر ہو ظاہر کس طرح — جس کو نفرت نامہ و پیغام سے
کہتے ہیں تو نے ہمیں کیوں دل دیا — کرتے ہیں ملزم وہ اس الزام سے

اے رسا کیا اس سے اُمید وفا
باز آؤ اس خیال خام سے

الٹی اُدھر نقاب اِدھر دل نے آہ کی (۶۶) سینہ کے پار ہوگئی برچھی نگاہ کی

محفل میں تم نے غیر سے نیچی نگاہ کی — پھر مجھ سے یہ گلہ ہے کہ کیوں تم نے آہ کی
محشر میں اُس نے شرم سے نیچی نگاہ کی — ترکی تمام کی مری فریاد و آہ کی
جنت کو یہ بہار یہ زینت کہاں نصیب — ہے بات ہی کچھ اور تری جلوہ گاہ کی
خنجر کمر سے باندھ کے آئے ہیں حشر میں — تا کھل سکے زباں نہ کسی داد خواہ کی
کن ہیلوں سے کرتے ہیں وصف اپنے حسن کا — تعریف کر رہے ہیں ہماری نگاہ کی
میں نے ہی تم کو پیار سے قابل بنا دیا — میں نے جو چاہ کی تو زمانہ نے چاہ کی

ظلمت شب فراق کی نظروں سے گر گئی — اللہ رے تیرگی مرے بخت سیاہ کی
رکھ دوں گا دل کو داور محشر کے سامنے — کیا مجھ سے دل لگا کر کو حاجت گواہ کی
جب راہ پر وہ شوخ نہ آیا تو کیا کریں — مجبور ہم نے غیر سے بھی رسم و راہ کی

وہ تند خو ہے اور تم آزادوار رتسا
آتی نہیں نظر کوئی صورت نباہ کی

لطف اُن کے ستم کا نہیں جاتا مرے جی سے (۶۷) مجبور رہوں میں شیوۂ ایذا طلبی سے

نقش قدم یار پہ گذرا ہوں میں جی سے — اُٹھتا ہے جنازہ مرا دشمن کی گلی سے
ایسی تو رقابت نہ کسی کو تھی کسی سے — دنیا میں لگی آگ مرے دل کی لگی سے
میں تیرے لئے ہوں مرا دل تیرے لئے ہے — اے درد محبت تجھے کیا کام کسی سے
دامن پہ کبھی ہیں تو گریباں پہ کبھی ہیں — فرصت نہیں ہاتھوں کو مرے جامہ دری سے
کیا ترک محبت کروں مجبور رہوں ناصح — اس دل کی لگی ہے ارے اس دل کی لگی سے
مجبور رہے دل سے تو چاہا تھیں ہم نے — ہوتا نہیں برباد کوئی اپنی خوشی سے
غیروں کی خوشامد کبھی کی ہی نہ کریں گے — جب آپ ہی کام تو کیا کام کسی سے
ہر صبح پہونچ جاتے ہیں ہم اُن کی گلی میں — دو چار قدم آگے نسیم سحری سے
گفتار یہ کہتی ہے کہ سن ہی ابھی کیا ہے — رفتار یہ کہتی ہے قیامت ہو ابھی سے
یاد آتا ہے گلشن میں تبسم جو کسی کا — پھٹتا ہے کلیجہ مرا پھولوں کی ہنسی سے
کیا قہر ہے کہتے ہیں جفاؤں سے وہ توبہ — تنگ آئے ہیں ایسے مری ایذا طلبی سے
کیا قہر ہے بیداد بھی ہوتی ہے مجھی پر — پھر داد بھی وہ چاہتے ہیں اس کی مجھی سے

یہ حال رتسا کا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا
سچ ہے کہ محبت نہ کسی کو ہو کسی سے

اے دل نہ رکھ بتوں سے ارمان دوستی کے (۶۸) ملتے ہیں یہ کسی سے ہوتے ہیں یہ کسی کے

دل میں کسی کو رکھو دل میں رہو کسی کے — سیکھو ابھی سلیقے کچھ روز دلبری کے
ہم سے کسی کو نفرت قربان ہم کسی کے — کیا کیا کرشمے دیکھے کمبخت عاشقی کے
فرقت میں اشک حسرت ہم کیا بہا رہے ہیں — تقدیر رو رہی ہے پردے میں بیکسی کے
آسئے اگر قیامت تو دھجیاں اُڑا دیں — پھرتے ہیں جستجو میں فتنے تری گلی کے

ہر اک کے دل میں اچھا جانا نہیں تمھارا / اپنا کسی کو کر لو یا ہو رہو کسی کے

وہ بھی تو یہ سمجھے سے ہے کوئی شے وفا بھی / اس دل کو کوئی رکھ دے پہلو میں مدعی کے

اے ہم نفس کہیں کیا فرقت میں حال کیا ہے / دن پورے کر رہے ہیں ہم اپنی زندگی کے

دونوں نے حشر تک بھی تنہا ہمیں نہ چھوڑا / قائل ہیں یاس کے ہم ممنون بیکسی کے

سینہ پہ تھا وہ قاتل گردن پہ تیغ قاتل / وہ بھی عجب گھڑی تھی قربان اُس گھڑی کے

تم ہو نہ ہو ہمارے اللہ ہے ہمارا / تم ہو زمانہ بھر کے ہم بھی تو ہیں کسی کے

دنیا کو چھوڑتا ہے دم توڑتا ہے کوئی / اب شوق سے نکالو ارمان مدعی کے

اے ہوش تو نے آکر آفت میں ہم کو ڈالا / فرقت میں آ رہے تھے کیا لطف بیخودی کے

دے کر مجھے تسلی بے چین کر رہے ہو / ہنستے ہو وعدہ کر کے قربان اس ہنسی کے

یہ حضرت رسا بھی دیوانے ہو گئے ہیں
چکر لگا رہے ہیں اس شوخ کی گلی کے

اے دل تجھے کیوں آرزوئے روز جزا ہے / کیا عرصۂ محشر میں کوئی اور خدا ہے

ہم ایسے وفادار ہیں نام اس کا دغا ہے / جو شکوہ نکلتا ہے زباں سے وہ دعا ہے

اُن تک تو رسائی نہیں کہنے کو رسا ہے / کمبخت نے یہ نام بھی بدنام کیا ہے

ایسے بت مغرور پہ دل اپنا فدا ہے / جس نے کہ خدا کو بھی نہ سمجھا کہ خدا ہے

بے بات وہاں ظلم ہے بے جرم خطا ہے / ایسے سے نباہے بھی تو کیا کوئی نباہے

دیکھوں شب وعدہ کہ کہاں جاتے ہیں مہماں / جو میری دعا ہے وہی دشمن کی دعا ہے

کمبخت جب آتی ہے بنا دیتی ہے دم پر / میری شب غم ہے کہ کوئی اور بلا ہے

پھر ہوش میں آنے دے ہمیں بیخودی عشق / بیکار کسی کی نگہ ہوش ربا ہے

اللہ کے آگے کوئی دامن نہ پکڑ لے / اقرار قیامت کو وہ سمجھے ہوئے کیا ہے

غیروں سے کبھی الزام دھرے جاتے ہیں مجھ پر / کچھ میری خطا ہو کہ نہ ہو میری خطا ہے

آپ آئے ہیں اس پر جو زمانے کا ہے قاتل / یہ حضرت دل آپ کی شامت نہیں کیا ہے

بے چین ہوئیں دیکھنے والوں کی نگاہیں / شوخی کا مرقع ترا نقش کف پا ہے

واللہ عجب چیز محبت ہے بتوں کی / جو مرتے ہیں اُن پر انھیں مرنے کا مزا ہے

ہے شان کریمی پہ بھروسا ہمیں واعظ / کیا پرسش اعمال ہے کیا روز جزا ہے

رفتار پہ موقوف نہیں اسے بت کافر — جو تجھ میں ادا ہے وہ قیامت کی ادا ہے
آئینہ بھی اب سامنے آنے نہیں پاتا — اللہ ری حیا اپنی نظر سے بھی حیا ہے
تقدیر کو روتا ہوں محبت میں ابھی سے — اب دیکھئے آگے مری تقدیر میں کیا ہے
ہو شکوۂ بیداد رسا کی ہے یہ طاقت — یہ اس سے مری جان نہ ہوگا نہ ہوا ہے

محفل سے نہ اٹھوائیے للہ رسا کو
پھر آپ کا عاشق ہے برا ہے کہ بھلا ہے

(۷۰)

کچھ دنوں پہلے حسینوں کو حجاب آتا ہے — اپنے آنے کی خبر دے کے شباب آتا ہے
بے خودی چار قدم ہوتی ہے آگے آگے — کس تجمل سے ادھر جام شراب آتا ہے
موت آتی ہے شب ہجر نہ خواب آتا ہے — رات ہم پر نہیں آتی ہے عذاب آتا ہے
غیر اور آپ سے بیباک بھری محفل میں — مجھ کو کہتے ہوئے واللہ حجاب آتا ہے
مجھ کو آتا ہوا دیکھا تو کہا غیروں سے — وہی کمبخت وہی خانہ خراب آتا ہے
لاش قاصد کی چلی آتی ہے اے حضرت دل — لیجئے وہ مرے نامہ کا جواب آتا ہے
مجھ سے کہتے ہیں خدا بھی نہ سنے گا تیری — جب یہ حالت ہے تو کیوں روز حساب آتا ہے
ہم کو ساقی کے کرم پر ہے بھروسا پورا — صبر اے دل کہ ابھی جام شراب آتا ہے
بیٹھ کر گھر میں بھی ہیں ان کی نگاہیں نیچی — کتنا گستاخ ہے پردہ میں حجاب آتا ہے
ابر میں کوندکے رہ جاتی ہے بجلی گویا — کچھ تبسم جو انھیں زیر نقاب آتا ہے
میری تقدیر کا لکھا کہ بجائے قاصد — غیر کے ہاتھ مرے خط کا جواب آتا ہے
ہجر کی رات قیامت سے نہیں ہے کچھ کم — موت ہی آتی ہے کمبخت نہ خواب آتا ہے

اے رسا وصل کی شب ان سے ہو خلوت کیونکر
جب وہ آتے ہیں تو ساتھ ان کے حجاب آتا ہے

(۷۱)

دو گھڑی کے لئے انسان کو خواب آتا ہے — بند ہو جاتی ہیں آنکھیں جو شباب آتا ہے
وصل کے نام سے کیوں تم کو حجاب آتا ہے — آخر انسان ہیں کس دن کو شباب آتا ہے
سامنے ہر کس و ناکس کے حجاب آتا ہے — ان حسینوں پہ دلھن بن کے حجاب آتا ہے
بجھ گیا دل تو محبت کی امنگیں کیسی — بعد پیری کے کسی کو بھی شباب آتا ہے
ہاتھ پھیلا کے دعا کرتے ہیں برسوں عاشق — کن مرادوں سے حسینوں پہ شباب آتا ہے

پھر تو در تک بھی حسینوں کا ہے آنا مشکل — قید کرنے کے لئے ان کو شباب آتا ہے
جانتے ہیں یہ حسیں ہم پہ مرے گی دنیا — کیسے اتراتے ہیں جس وقت شباب آتا ہے

قتل کرتے ہیں زمانہ کو بتان بدخو
اے رسا تیغ بکف ان کا شباب آتا ہے

تضمین

بر غزل حکیم سید اصغر علی صاحب اصغر تحصیلدار گوالیار شاگرد فصیح الملک مرحوم

دیکھو دیکھو نہ ستاؤ دل شیدا اپنا — حشر ہوگا جو نکل جائے گا نالا اپنا
کہیں تھامے ہوئے پھرنا نہ کلیجا اپنا — منہ نہ کھلواؤ ڈھکا رہنے دو پردا اپنا
کیوں دکھاتے ہو زمانہ کو تماشا اپنا

نہ دکھایا جو جمال رخ زیبا نہ سہی — ان کو ہر بات نہیں ہے جو گوارا نہ سہی
آئینہ کے بھی برابر مرا رتبا نہ سہی — سامنے آنے پہ تکرار ہے اچھا نہ سہی
وہ دکھا دیں مجھے چلمن ہی سے جلوا اپنا

غیر کے گھر قدم ناز نہ رکھا نہ سہی — میں ہی جھوٹا ہوں نہیں ہے اگر ایسا نہ سہی
جھانکنا روزن در سے ہے گوارا نہ سہی — سامنے آنے پہ تکرار ہے اچھا نہ سہی
وہ دکھا دیں مجھے چلمن ہی سے جلوا اپنا

جلوۂ مہر تکتا ہوں میں اب آتا ہی نہیں — ماہ کو دیکھ کے کہتے ہیں کہ بھاتا ہی نہیں
ایسا آیا ہے غرور ان کو کہ جاتا ہی نہیں — اُن کی نظروں میں حسیں کوئی سماتا ہی نہیں
جب سے تصویر میں دیکھا ہے سراپا اپنا

ڈھنگ آنے کا تمھارے ہے کہ تڑپانے کا — یا ہے انداز مرے سر پہ بلا لانے کا
یہ طریقہ بھی طریقہ ہے کوئی آنے کا — ابھی آئے ہو تقاضا ہے ابھی جانے کا
کیا جمایا ہے کہیں اور ہی نقشا اپنا

ہم کریں ترک وفا یہ تو نہ ہوگا ہم سے — وہ تمھیں ہو جو کیا کرتے تھے جھگڑا ہم سے
ایک دنیا ہے خفا تم ہو خفا کیا ہم سے — تم جو بدلے ہو تو بدلا ہے زمانا ہم سے
اک فقط رنگ طبیعت نہیں بدلا اپنا

ایسی کیا بات ہے جس بات پہ چاہے تمھیں — ایسے انساں کی ذرا ہم بھی زیارت کرلیں

کون سی بات ہے دنیا سے نرالی اس میں   ایسے کیا چاند لگے ہیں اسے ہم بھی دیکھیں
تم دکھاؤ تو سہی چاہنے والا اپنا

دل مرا حسرت دیدار سے پامال ہے آج   مجھ کو ہر ایک گھڑی ہجر کی جنجال ہے آج
اشک حسرت سے ہر اک آنکھ مری لال ہے آج   حسرت دید میں آنکھوں کا بُرا حال ہے آج
اب تو للہ دکھا دو رخ زیبا اپنا

گرم کیا صحبت احباب رہی آٹھ پہر   دل میں ہر وقت رہا عیش و مسرت کا گذر
ہر گھڑی رہتے تھے یہ ماہ جبیں پیش نظر   عیش و عشرت میں کٹی اپنی جوانی اصغر
دیکھیے کٹتا ہے کس طرح بڑھاپا اپنا

قصیدۂ تہنیت سالگرہ

ہز ہائی نس نواب سر حامد علی خان بہادر والیٔ رامپور

ایک دن دل نے کہا مجھ سے یہ ہو کر بیقرار (مطلع) بخت خفتہ کی طرح سوتا ہے کیا غفلت شعار

دیکھ آنکھیں کھول کر نیرنگی قدرت کے رنگ   دیکھ ہر شے میں عیاں ہے صنعت پروردگار
سرمۂ اہل نظر ہے خاک شہر رامپور   بن گیا ہے صورت گل دشت کا ہر ایک خار
ذرہ ذرہ میں نظر آتی ہے انجم کی جھلک   قطرہ قطرہ بن گیا دریائے ناپیداکنار
شاخ نخل طور آتی ہے نظر ہر شاخ گل   وادی پر خار میں ہے وشت ایمن کی بہار
قطرۂ شبنم نہیں یہ گوہر نایاب ہے   جا چکا دور خزاں عالم میں ہے دور بہار
ہے شب تاریک روشن روز روشن کی طرح   شام تیرہ میں ہے گویا صبح صادق کا شعار
سوجھتی ہے دیدۂ کم بیں کو بھی اب دور کی   سرمۂ چشم حقیقت بن گیا دل کا غبار
ہو گیا ہر سینۂ بے کینہ گویا آئینہ   دیکھتا ہے ہر کہ و مہ صنعت پروردگار
جس پہ زحمت تھی اب اُس پر رحمت حق چھا گئی   اس کا وحشت پر ہے قبضہ جس پہ تھی وحشت سوار
آس و امان کرم ہر ایک دل کی یاس کو   ناامیدی بھی ہے اب امید کی امیدوار
رنج جس دل میں نہاں تھا اب وہ دل ہے باغ باغ   داغ دل کے دے رہے ہیں تازہ پھولوں کی بہار
جام جم ہے ہاتھ میں مے نوش کے جام سفال   بن گئی ہے شوکت جمشید شان بادہ خوار
لے رسا اک مطلع رنگیں پڑھو تم اور بھی   جس کے ہر ہر لفظ سے پیدا ہو سامان بہار

(مطلع ثانی)

زیر دامان گل تر چھپ گیا ہر ایک خار
واہ رے رنگ چمن اللہ رے جوش بہار

آمد فصل بہاری کی مبارک باد میں
چار سو ہیں نغمہائے عندلیب دل فگار

لب پہ ہر گل کے صدائے خیر مقدم ہے بلند
ہو گئے تعظیم کو استادہ سرو جویبار

ہو گئی باد خزاں کافور صحن باغ سے
چھا گیا چاروں طرف گلشن کے ابر نوبہار

کھل گئیں غنچوں کی باچھیں جب سنے یہ چہچہے
کھل گئیں نرگس کی آنکھیں تھیں جو محو انتظار

ہیں یہ غنچے یا حسینان جہاں کا جمگھٹا
ہے صف گل یا چمن میں مہ جبینوں کی قطار

نوجوانان چمن کا اللہ اللہ رے غرور
نوعروسان چمن کا اللہ اللہ رے سنگار

بن گیا ہے سبزۂ خوابیدہ فرش مخملی
شامیانہ ہے گلستاں کا کہ ابر نوبہار

میں نے پوچھا دل سے یہ کیوں ہو گئی کایا پلٹ
کیوں یکایک ہو گیا یہ انقلاب روزگار

دل نے جوش خرمی میں یہ دیا مجھ کو جواب
لگ رہا ہے آج کل گلشن میں جشن نو بہار

سال آیا ہے ہمارے شاہ کا جو تیسواں
اس کا یہ سالانہ جلسہ ہے بفضل کردگار

کون ہے وہ شاہ عالی مرتبت والا ہمم
خسرو حامد علی خاں بادشاہ ذی وقار

پھر تو میں بھی یہ قصیدہ نذر کو لے کر چلا
میں نے بھی جا کر سنائی مدح یہ بے اختیار

(مطلع ثالث)

تیری ہے وہ شان عالی بادشہ عالی وقار
گر گیا نظروں سے شاہان زمن کا اقتدار

شوکت شاہنشہی کو فخر تیری ذات پر
تاج شاہی کو ہے فرق پاک سے اک افتخار

حکم تیرا ناسخ حکم سلاطین زمیں
تابع فرماں ہیں تیرے جس قدر ہیں تاجدار

ہے ترا دست کرم باب سخاوت کی کلید
ہے ترا دامان دولت بے کسوں کا پردہ دار

ہے تری چشم عنایت چشمۂ آب حیات
لطف تیرا مرہم داغ دل سینہ فگار

دیکھ کر ترک فلک کی ہو گئی ترکی تمام
تیری شوکت تیری صولت اے شہ عالی وقار

نیر اقبال دولت کوکب برج شرف
کامگار و نامدار و شاندار و تاجدار

قاطع ظلم و تعدی دافع جور و ستم
دشمن اہل جفا اہل وفا کا غمگسار

عدل تیرا بے نظیر و بے عدیل و بے مثال
لطف تیرا بے حد و بے انتہا و بے شمار

قاطع کفر و ضلالت دافع رنج و بلا
نام تیرا اے شہ عالی ہمم والا تبار

خلق تیرا خلق کو تسکین و راحت کی نوید　　لطف تیرا قاطع رنج و بلائے روزگار

تو مریضوں کا مسیحا دردمندوں کی دوا　　تو غریبوں کا ہے داتا غمزدوں کا غمگسار

گلشن امید کو تیرا کرم اک تازہ پھول　　پھول کو بخشش تری ہے اک نئی رُت کی بہار

دیتی ہے چشم کرم اس کو معافی کی سند　　سامنے جاتا ہے تیرے جب کوئی تقصیر دار

حامی دین متیں سر دفتر علم و یقیں　　ظل سبحانی لقب بندہ نوازی ہے شعار

ایک تیری ذات سے پاتے ہیں لاکھوں پرورش　　خلق پر تو مہرباں ہے تجھ پہ فضل کردگار

نام نامی ہے ترا حاجت روائے بیکساں　　ہے سخاوت سے تری اہل سخاوت کا وقار

اس قدر امن و اماں کی گرم بازاری ہوئی　　ہر بشر آرام سے کرتا ہے اپنا کاروبار

انقلاب چرخ تیرے عہد میں ہے پا بہ گل　　ایک مرکز پہ ہے قائم گردش لیل و نہار

دین کا جھنڈا ہے قائم ہند میں دم سے ترے　　ذات عالی سے تری اسلام کا ہے اقتدار

تیرا ثانی کوئی ہو سکتا ہے؟ ہو سکتا نہیں　　تو ہے یکتائے زمانہ تو ہے فرد روزگار

حق بجانب ہے جو تجھ کو ظل سبحانی کہوں　　تیرا دم ہے سایۂ لطف و عطائے کردگار

ایک تیری ذات سے قدر سخن قدر کلام　　ایک تیرے دم سے ہے اُردو زباں کا افتخار

ناخدائے کشتی اہل زباں جب تو ہوا　　کیوں نہ بیڑا پار ہو اس کا بفضل کردگار

مرحبا اے خسرو حامد علی خاں مرحبا　　کیا بڑھایا تو نے اس اُردو زباں کا اقتدار

ختم کرتا ہوں دعائے عمر شاہنشاہ پر　　التجا سن لے مری اے رحمت پروردگار

سایۂ افلاک ہے جب تک زمیں پر یا خدا　　اور دکھاتے ہیں یونہی سرگرمیاں لیل و نہار

رات ہو قربان جب تک دن پر اور دن رات پر　　شاہ خاور پر ہے جب تک دولت انجم نثار

سایۂ ممدوح سر پر جاں نثاروں کے رہے　　اور سر پر شہ کے چھائے رحمت پروردگار

قطعات تاریخ

قطعہ تاریخ ولادت فرزند ارجمند منشی عبدالمجید صاحب آزل لاہوری

آزل کو خدا نے دیا ہے پسر　　الٰہی یہ شایستہ اقبال ہو

حیات خضر مرحمت ہو اسے　　ترقی پہ اقبال ہر سال ہو

رہیں خوش دعا دینے والے اسے　　جو بدخواہ ہو اُس کا پامال ہو

رسا کی بھی سن لو زراہ کرم　　آزل یہ مبارک خوش اقبال ہو

۱۳۲۹ھ

قطعہ تاریخ وفات منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی

گئے ہائے تسلیم ملک عدم کو — کہ دنیا میں اک شور ماتم مچا ہے
یہ وہ شاعری میں تھے استاد کامل — خدائے سخن جن کو کہنا بجا ہے
مٹے جاتے ہیں اہل فن کیسے کیسے — قیامت کا یہ ملک کو سامنا ہے
الٰہی انھیں باغ جنت عطا کر — یہی مدعا ہے یہی التجا ہے
رسا لکھ دو تاریخ کا تم یہ مصرعہ — بہت ہی الم مرگ تسلیم کا ہے
۱۳۲۹

متفرق اشعار

حسینوں میں شیوہ وفا کا نہ دیکھا — کبھی ہم نے ایسوں کو ایسا نہ دیکھا
دلیر و طلیش و احسن کو رسا مدت ہیں دیکھا ہے — مذاق شاعری جاتا رہا اُن سے جدا ہو کر
ایک دل ناز تھا جس پر وہ کیا نذر بتاں — ہائے اب کس کا سہارا ہے جو فریاد کریں
مجھ سے دیکھا نہیں جاتا کہ ستم ہو اس پر — میرے آگے وہ مرے دل پہ نہ بیداد کریں
ہم بتائیں کس کو ہمدم کیا کریں — ہم سے برگشتہ ہے عالم کیا کریں
وہ بھی تنگ آئے ہیں اپنے حسن سے — مر رہا ہے ایک عالم کیا کریں
آگ لگ جاتی ہے دونی چارہ گر — زخم دل پہ رکھ کے مرہم کیا کریں
مری فریاد پر انجان بن کر مسکراتے ہیں — قیامت ہیں وہ اس انداز سے بھولا بنے جاتے ہیں
قیامت سے نہیں کچھ کم خرام ناز ان کا بھی — قدم لیتے ہوئے آتے ہیں فتنے جب وہ آتے ہیں
کدورت مرنے والوں سے نہیں رکھتا ہی کوئی بھی — مری ہستی مٹا کر کیوں وہ تربت کو مٹاتے ہیں
نہ کیونکر رشک آئے ہم کو ان لوگوں کی قسمت پر — وہاں جن کی رسائی ہے وہاں جو آتے جاتے ہیں
گھڑی بھر کے لئے تو اپنے دل کو میں تسلی دوں — ذرا اے جذب دل تم لے تصور میں وہ آتے ہیں
ہم نے تم کو خوب دیکھا ہے مثال آئینہ — سامنے تم اور ہو کچھ پیٹھ پیچھے اور ہو
رُخ سے پردہ نہ اٹھا دیکھ پڑا رہنے دے — لے پری ہوش زمانے کے بجا رہنے دے
تیر کھینچا ہے تو پیکاں بت سفاک نہ کھینچ — اس کو تو میرے کلیجہ سے لگا رہنے دے
دل کو پامال نہ کر روح کو بے چین نہ کر — ایسی بیداد نہ کر ایسی جفا رہنے دے
یہ بھی کیا طرز دلربائی ہے — دل کی فریاد دلربا نہ سنے

نصیحت اپنی رہنے دے رہ الفت میں آ ناصح ۔۔۔ پڑی ہے تجھ کو سمجھانے کی اپنا دم نکلتا ہے

حشر میں بولے انھیں دیکھ کے مرنے والے ۔۔۔ وہ چلے آتے ہیں دل سے کے مکرنے والے

یہ دیکھا ہے بُری قسمت کا رونا لوگ روتے ہیں ۔۔۔ مجھے تقدیر روتی ہے مری تقدیر ایسی ہے

بلا سے غیر کے در پہ کریں گے ہم جبیں سائی ۔۔۔ اگر مرضی تری اے کاتب تقدیر ایسی ہے

عجب حیرت میں ڈالا ہے اس انداز خموشی نے ۔۔۔ کیا تصویر ہم کو بھی تری تصویر ایسی ہے

بوقت ذبح قاتل کا بڑھایا دل یہ کہہ کہہ کر ۔۔۔ کہ تو قاتل ہے ایسا اور تری شمشیر ایسی ہے

سو بار صدقے ہو کے یہی چاہتا ہے جی ۔۔۔ سو بار اور آپ کے قربان جائیے

سب قصہ سن کے عرض تمنا پہ یہ کہا ۔۔۔ بس ہو چکا دماغ پریشان جائیے

حال دل کہنے پہ وہ کیسے خفا ہونے لگے ۔۔۔ عرض مطلب پر نہیں معلوم کیا ہونے لگے

عشق کا چرچا کہیں ہے حسن کا چرچا کہیں ۔۔۔ تذکرے میرے تمھارے جا بجا ہونے لگے

خط لکھا میں نے اس میں نامہ بر کی کیا خطا ۔۔۔ اس پہ کیوں بگڑے وہ اس پر کیوں خفا ہونے لگے

دو قدم چل کے دکھا دو تو قیامت کا مزا ۔۔۔ حشر سے پہلے ہی اک محشر بپا ہونے لگے

الٰہی کس کی آمد ہے سر بالیں دم آخر ۔۔۔ یہ کس کی پیشوائی کو مری جان حزیں نکلی

کسی کی ادا گر کوئی بھا گئی ۔۔۔ غضب آ گیا اک بلا آ گئی

خزاں چل بسی فصل گل آ گئی ۔۔۔ چلو مے کشو وہ گھٹا چھا گئی

مدت سے اپنی جان پہ کھیلے ہوئے ہیں ہم ۔۔۔ یہ سر جدا ہے جسم سے یا تم رقیب سے

آپ سے حور جناں بھی مات ہے ۔۔۔ آپ کی کیا بات ہے کیا بات ہے

روز و شب فرقت کے دونوں ہیں بلا ۔۔۔ رات دن سے دن سے بدتر رات ہے

ہاتھ ملتا ہوں کہ کیوں حشر میں کی تھی فریاد ۔۔۔ ان کی نیچی ہے نظر مجھ کو پشیمانی ہے

آ گیا ہجر میں کوئی تو ذرا دل ٹھہرا ۔۔۔ پھر وہی میں ہوں وہی میری پریشانی ہے

جب نہ تھے سامنے میرے تو پریشانی تھی ۔۔۔ اب جو وہ سامنے آئے ہیں تو حیرانی ہے

فرصت ملے تو آنکھ ملے مجھ غریب سے ۔۔۔ آئینہ دور ہو کہیں ان کے قریب سے

بیٹھیں وہ اس کے سوگ میں اور میرے سامنے ۔۔۔ اللہ موت دے مجھے پہلے رقیب سے

یہ جسم ناتواں میرا اور اس پر یہ فغاں میری ۔۔۔ بڑی حیرت سے صورت تک رہا ہے آسماں میری

تمت

بنام خداوند جان آفریں

کلامِ رسا

یعنے

منشی محمد حیات بخش رسا کاسنوی مرحوم

(شاگرد رشید فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی)

کا مختصر دیوان

مرتبہ

جناب مولوی محمد اظہار الحسن صاحب

بی۔اے، ایل۔ایل۔بی۔ وکیل غازی آباد

یہ مجموعہ رسالۂ الناظر جنوری تا جون ۱۹۳۶ء میں بالاقساط
شائع ہونے کے بعد اب کتابی صورت میں پیش کیا جاتا ہے

باہتمام اسحٰق علی علوی مالک و پرنٹر

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

بار اول — اگست ۱۹۳۶ء — قیمت ۶؍

کلیات و دواوین

کلیات ولی ریختہ کے بابا آدم ولی دکنی کا کلام جس میں غزلیات، مستزاد، مخمسات، ترجیع بند، قصائد، مثنویاں، قطعات اور رباعیات کے علاوہ حضرت احسن مارہروی سے ۱۰۴ صفحے کا دیباچہ اور ۲۲ صفحے کی فرہنگ الفاظ قدیم اضافہ کی ہے غیر مجلد للعہ مجلد صہ

کلیات میر میر تقی میر کے چھ دواوین کا مجموعہ قیمت عہ

کلیات سودا مرزا رفیع السودا کے کلام کا مجموعہ بعد تصحیح ۲ جلدوں میں شایع ہوا ہے قیمت سے

دیوان اثر خواجہ میر درد کے بھائی سید محمد میر اثر کا نادر و نایاب کلام جو پہلی بار چھپا ہے۔ صہ و عہ

دیوان تاباں میر عبدالحی رضوی تاباں کا قابل قدر کلام جو پہلی بار شایع ہوا ہے قیمت عہ و عہ

دیوان میر درد خواجہ میر درد کا عارفانہ کلام معہ مقدمہ از جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی عہ

دیوان درد خواجہ میر درد کا عارفانہ کلام مع مقدمہ از منشی عبدالباری آسی الدنی۔ قیمت ۱۲

دیوان یقین معاصر میر انعام اللہ یقین کا دیوان پہلی بار طبع ہوا ہے مع مقدمہ از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی بی اے۔ عار

دیوان رنگین و انشا سعادت یار خاں رنگین اور سید انشاء اللہ خاں انشا کے ریختی کے دواوین۔ قیمت عہ

دیوان جان صاحب مشہور ریختی گو میر یار علی جان صاحب کا دیوان طبع اعلیٰ۔ قیمت عہ

کلیات آتش خواجہ حیدر علی آتش کا قابل دید کلام طبع جدید عہ

دواوین ناسخ شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کے دواوین کا مجموعہ۔ قیمت عہ

کلیات مومن حکیم مومن خاں دہلوی کا ہر صنف کا کلام۔ قیمت عہ

دیوان ذوق خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کا قابل دید دیوان جسے ان کے نامور شاگرد مولوی محمد حسین آزاد نے ایسی خوش اسلوبی سے مرتب کیا کہ ذوق کی جملہ خصوصیات نمایاں ہو گئیں۔ قیمت عار

دیوان غالب مرزا غالب کا کلام اس قدر مقبول ہے کہ ملک میں بیسیوں قسم کا چھپا ہوا ملتا ہے۔ صہ، عہ، صہ، ۸، ۴

الناظر کتب خانہ لکھنؤ

کلیات نظیر اکبر آبادی نظیر اکبر آبادی کا ہر قسم کا کلام۔ قیمت عہ

دیوان مہر مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی تلمیذ غالب کا قابل قدر دیوان۔ قیمت ۸/

دیوان مجروح مرزا غالب کے شاگرد رشید میر مہدی مجروح کا دیوان۔ قیمت ۸/

دیوان رند نواب سید محمد خاں رند شاگرد رشید آتش لکھنوی کا پختہ اور متین کلام۔ قیمت ۱۲/

نظم دل افروز منشی امیر اللہ تسلیم کا پہلا دیوان۔ قیمت ۱۲/

کلیات ظفر دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا پورا کلام جس میں چار دواوین ہیں۔ قیمت سے/

کلیات شاداں مہاراجہ چندو لال شاداں سابق وزیر اعظم ریاست حیدر آباد دکن کا دیوان۔ قیمت ۶/

صنمخانہ عشق منشی امیر احمد امیر مینائی کا دوسرا دیوان جس کا ہر ہر شعر تیر و نشتر ہے اور منشی صاحب کے کمال فن شاعری پر دلالت کرتا ہے۔ ۶/

مراۃ الغیب امیر مینائی کا پہلا دیوان جس کو ان کی قادر کلامی کا فخر کہنا چاہیئے۔ عہ

محامد خاتم النبیین امیر مینائی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ قیمت ۶/

آفتاب داغ۔ داغ دہلوی کا پہلا دیوان ۱۲/

گلزار داغ۔ داغ دہلوی کا دوسرا دیوان ۸/

مہتاب داغ۔ داغ دہلوی کا تیسرا دیوان۔ للعہ

یادگار داغ۔ داغ دہلوی کا چوتھا دیوان۔ ۶/

انتخاب داغ۔ داغ دہلوی کا پانچواں دیوان۔ عہ

مظہر عشق آفتاب الدولہ قلق مصنف مثنوی طلسم الفت کا دیوان۔ قیمت ۸/

کلیات صفدر نواب صفدر علی خاں کا سادہ اور صاف کلام۔ قیمت ۸/

کلیات وہبی۔ منشی شیو پرشاد وہبی کا کلام۔ ۱۲/

دیوان حالی مولانا حالی کا دیوان پہلی بار چھپا تو مقدمہ شعر و شاعری اسکے شروع میں تھا۔ پچیس سال بعد جب دوسرا ایڈیشن ہم نے چھپوایا تو مقدمہ الگ کر دیا۔ قیمت ۸/

کلیات اکبر لسان العصر مولوی سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کا قابل دید کلام ظرافت کی چاشنی نے مقبول خاص و عام بنا دیا ہے قیمت حصہ اول ۶/ حصہ دوم عہ حصہ سوم ۸/

کلیات نعت مشہور و معروف مداح رسول صلعم حضرت محسن کاکوروی کا کلام جن کا یہ قصیدہ بہت مشہور ہے "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" قیمت ۸/

دفتر حسرت مرزا آسمان جاہ بہادر انجم خلف واجد علی شاہ کا قابل دید دیوان۔ قیمت ۱۲/

تاج سخن نواب فصاحت یار جنگ جلیل کا قابل دید دیوان۔ قیمت ۸/

خطبات و مقالات	لسان نجم / صبح تبسم	قواعد و اصول	لغت	مثنویاں
[illegible]ی مضامین سرسید	نکات موزی	اصلاح زبان اردو	امیر اللغات مکمل	مثنویات میر
[illegible]ات مہدی	متفرقات	اصول اردو	فرہنگ آصفیہ جلد اول	خواب و خیال (اثر)
انتخاب [illegible]	مضامین سرسید	جان اردو	نور اللغات کامل	مثنوی میر حسن
انتخاب نقیب	مضامین محسن الملک	زباندانی	سرمایۂ زبان اردو	بحر المحبت (مصحفی)
انتخاب مخزن	مضامین چراغ علی	قواعد میر	زبدۃ اللغات	گلزار نسیم
بہترین انشا پرداز	مضامین وقار الملک	بحر الفصاحت	فرہنگ امثال	زہر عشق
پطرس کے مضامین	مضامین چکبست	معیار البلاغہ	لغات اردو ۲ جلد	طلسم الفت
تخیلات	مقالات	رکن عروض	لغات سعیدی	حزن اختر
پنکھڑیاں	مقالات سرسید	زر کامل عیار	لغات فارسی	ترانۂ شوق
پگلیاں ور گدگدیاں	مقالات شبلی	فکر بلیغ	لغات کشوری	قاسم و زہرہ
خیالستان	مذہبی مضامین شبلی	قواعد المنتخب	منیر اللغات اردو	فریاد داغ
حکایات متسانا	ادبی مضامین شبلی	معاون الشعرا	منیر اللغات فارسی	دفتر سحر
خطبات مدراس	تعلیمی مضامین شبلی	دستور الشعرا	سعیدی ڈکشنری	باغ فردوس
رسائل شبلی	تنقیدی مضامین شبلی	رسالہ تذکیر و تانیث	لغات النسا	قومی مثنوی
زرگل	سوانحی مضامین شبلی	نظام اردو	لغات الخواتین	راہ حق
سیپارۂ دل	مولانا شبلی	سرور کیفی	محاورات نسواں	**مرثیے**
گلدستۂ عید	مقالات حالی	شاعری کی ۲ کتابیں	محاورات ہندستان	
فسانۂ جوش	منشورات	نکات سخن ۲ حصے	بازاری زبان	کلیات مراثی میر منیر
قطرات اشک	مجموعۂ لکچر سرسید	قواعد اردو	غلط العوام	کلیات مراثی دبیر
[illegible]	مجموعۂ لکچر محسن الملک	قواعد عربی	گنج رواں	کلیات مراثی انیس
[illegible]	مجموعۂ لکچر نذیر احمد	عربی بول چال	نجم الامثال	واقعات کربلا
[illegible]	[illegible]	فارسی بول چال	جواہر اللغات فارسی	کلیات مراثی مونس
[illegible]	خطبات [illegible] ۲ حصے	ترکی بول چال	لغات جدید عربی	کلیات مراثی عشق
		سرگذشت الفاظ		

کلیات و دواوین		نظمیں		علوم و فنون		افسانے		جوہر قدامت	۱۲ر
کلیات ولی	للعہ	مجموعہ نظم آزاد	۸ر	فلسفۂ تعلیم	۔ے	ابن الوقت	۱۲ر	عروس کربلا	۱۲ر
کلیات میر	۱۲ر	مجموعہ نظم حالی	۸ر	فلسفۂ جذبات	۱۲ر	ایامیٰ	۱۲ر	یاسمین شام	۱۲ر
کلیات سودا ۲ جلد	۔ے	نظم بے نظیر	۱۲ر	بھکلے	۱۲ر	فسانۂ مبتلا	۱۲ر	تیغ کمال	۱۲ر
دیوان اثر	۸ر	مجموعہ کلام شبلی	۱۰ر	مبادی علم انسانی	۱۲ر	رویائے صادقہ	۱۲ر	ماہ عجم	۸ر
دیوان تاباں	۸ر	جذبات نادر	۱۲ر	مکالمات برکلے	۱۲ر	فسانۂ آزاد ۴ جلد	۔ے	طوفان حیات	۸ر
دیوان درد	۱۲ر	ہفت گلین (نثر)	۸ر	نفسیات ترغیب	۱۲ر	خدائی فوجدار	۱۲ر	شہید مغرب	۸ر
دیوان یقین	۱۲ر	خیاباں (،،)	۴ر	ارتقا	۸ر	جام سرشار	۱۲ر	حیات صالحہ	۱۲ر
کلیات آتش	۱۲ر	کلام نیرنگ	۱۰ر	تاریخ تمدن ۲ جلد	۔ے	منیٰ ان ولمن	۸ر	حجاج بن یوسف	۱۲ر
دواوین ناسخ	۱۲ر	بانگ درا (اقبال)	۔ے	روح الاجتماع	۱۲ر	مفتوح فاتح	۱۲ر	عروس مصر	۱۲ر
کلیات مومن	۱۲ر	بال جبریل (،،)	۔ے	انقلاب الامم	۱۲ر	قلبانا	۱۲ر	عبدالرحمن الناصر	۱۲ر
دیوان ذوق	۱۲ر	روداد قفس	۱۲ر	ریاست	للعہ	زوال بغداد	۱۲ر	شریف زادہ	۸ر
دیوان غالب مع شرح	۸ر	گنجینۂ معانی	۔ے	اساس التعلیم	۱۲ر	عزیزۂ مصر	۱۲ر	نیلی چھتری	۱۲ر
کلیات نظیر اکبرآبادی	۸ر	نغمۂ زار (حفیظ)	۱۲ر	جاپان کا تعلیمی نظم و نسق	۔ے	بابک خرمی	۱۲ر	بہرام کی گرفتاری	۸ر
کلیات ظفر	۔ے	سبد گل	۸ر	نظریۂ اضافیت	للعہ	لعبت چین	۸ر	لال کنٹور	۱۲ر
دواوین داغ ۳ جلد	۱۲ر	پیام روح (ناصر)	۔ے	وضع اصطلاحات	۔ے	طاہرہ	۱۲ر	خواب ہستی	۱۲ر
دواوین امیر ۲ جلد	۔ے	مطلع انوار	۸ر	علم المعیشت	۱۲ر	نیکی کا پھل	۸ر	یاسمین	۱۲ر
دیوان حالی	۱۲ر	لمعات اختر	۸ر	امداد باہمی	۸ر	فلورا فلورنڈا	۱۲ر	مجبور وفا	۱۲ر
کلیات اکبر ۳ حصے	للعہ	نقش و نگار (جلیل)	۸ر	القمر	۱۰ر	حرم سرا کا مال	۔ے	لیلیٰ	۱۲ر
کلیات نعت (محسن)	۱۲ر	مسدس حالی	۸ر	ریڈیو	۔ے	تارا کامل	۱۲ر	آستانہ کی حور	۱۲ر
تاج سخن (جلیل)	۱۲ر	عالم خیال (شوق قدوائی)	۱۲ر	بجلی کے کرشمے	۱۲ر	صبح زندگی	۱۲ر	سعید قلبانا	۱۲ر
دیوان شوق قدوائی	۱۲ر	نیرنگ جمال (،،)	۴ر	رموز حکمت	۔ے	شام زندگی	۱۲ر	سرگذشت کامل	۔ے
مکمل دیوان حسرت	۔ے	صبح وطن (چکبست)	۱۲ر	رس	۱۲ر	شب زندگی ۲ حصے	۱۲ر	شوکت آرا بیگم	۔ے
جہان آرزو	۸ر	دنیائے راز	۱۰ر	علم السیاست	۱۲ر	نور زندگی	۸ر	شمیم	للعہ
باقیات فانی	۱۲ر	شاعر کی باتیں (جوش)	۱۲ر	سرگذشت حیات	۱۲ر	مناظل السائرہ ۳ حصے	۱۲ر	نواب جمیل الغفار	۱۲ر